آزاد صدی مقالات

مرتبین

ڈاکٹر تحسین فراقی

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر

UNIVERSITY OF THE PUNJAB

شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور

آزاد صدی مقالات

(محمد حسین آزاد کے صد سالہ یوم وفات کے موقع پر
دو روزہ عالمی سیمینار میں پڑھے گئے مقالات)

مرتبین
ڈاکٹر تحسین فراقی
ڈاکٹر ناصر عباس نیّر

شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور
۲۰۱۰ء

آزادصدی مقالات

مرتبین:	ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر ناصر عباس نیّر
ناشر:	ڈاکٹر تحسین فراقی، صدر شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور
حروف چینی و صفحہ بندی:	ندیم اشرف کمپوزرز، لاہور
مطبع:	آر۔آر۔ پرنٹرز، لاہور
تاریخ اشاعت:	طبعِ اول، ۲۰۱۰ء
صفحات:	۴۵۶
تعداد:	۵۰۰
قیمت:	۵۰۰ روپے

Azad Centenary Papers

Edited by:	Dr. Tehsin Firaqi, Dr. Nasir Abbas Nayyer
Publisher:	Dr. Tehsin Firaqi, Chairman Department of Urdu, Panjab University Oriental College, Lahore

انتساب

اردو کے دو ممتاز آزاد شناسوں

ڈاکٹر محمد صادق (مرحوم) اور **ڈاکٹر اسلم فرخی** کے نام

حرفِ تشکر

شعبۂ اردو کے اساتذہ اور آزاد صدی مقالات کے مرتبین

آزاد صدی تقریبات کے ضمن میں

محترم وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی

پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران صاحب

کی غیر معمولی حوصلہ افزائی اور فراخدلانہ تعاون

پر

تہِ دل سے ان کے ممنون ہیں

فہرست

ضمیمہ

پیش گفتار

ادبیاتِ عالم کی تاریخ میں تین طرح کی شخصیات ملتی ہیں۔ ایک وہ جو تاریخ کی پیداوار ہوتی ہیں؛ دوسری وہ جو تاریخ کو پیدا کرتی ہیں؛ ایک تیسری قسم ان کے بین بین ہوتی ہے جو تاریخ کا دھارا موڑنے کی صلاحیت تو نہیں رکھتی مگر تاریخ کے تیز بہاؤ کے اندر اپنے ہونے کا ثبوت ضرور فراہم کرتی ہے اور تاریخ کی ایک جہت خاص یعنی ادب کے محضر پر اپنے انمٹ نقش ضرور ثبت کرتی ہے۔ پہلی قسم کی شخصیات اور ان کی ادبی کارگذاریوں کا مطالعہ، دراصل انسان کے تخلیقی وفکری اعمال میں تاریخ کے حاوی اور فیصلہ کن کردار کا جائزہ ہے۔ یہاں ہم تاریخ کے متنوع تصور کے ساتھ، تاریخ کے چاک پر ادبی رویوں، رجحانوں، تحریکوں، ہیئتوں، اسالیب وغیرہ کو مختلف صورتوں میں ڈھلتے اور متغیر ہوتے دیکھتے ہیں۔ جب کہ دوسری قسم کی ادبی شخصیات اور ان کی فنی کارگزاریوں کا تجزیہ، درحقیقت اس بے مثال انسانی جوہر کے نو بہ نو اظہارات کا مطالعہ ہے، جو تاریخ کے چاک کو حرکت میں لاتا ہے۔ یہ شخصیات تاریخ سے ماورا نہیں ہوتیں، مگر تاریخ کے دھارے کو بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ غور کیا جائے تو محمد حسین آزاد کا تعلق اُس تیسری قسم سے بنتا ہے جو نایاب ہو نہ ہو کمیاب ضرور ہوتی ہے۔ آزاد کا عرصۂ حیات (۱۸۳۰ء-۱۹۱۰ء)، نوآبادیاتی ہندوستان کی تاریخ کا وہ عہد ہے جب برطانوی حکمران اپنے ناجائز اور استحصال پسندانہ اقتدار کو جائز قرار دینے اور مستحکم کرنے کے لیے مختلف 'سٹیٹ اپریٹس' وجود میں لا رہے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں برطانوی استعمار کی فیصلہ کن فتح نے برعظیم کے باسیوں کے لیے ایک ایسی سیاسی، ثقافتی، تعلیمی اور فکری صورت حال کو جنم دیا تھا جس میں ان کے لیے آزادانہ فیصلے کرنے کا اختیار اور امکان کم سے کم تھا۔ چناں چہ اس صورت حال میں جو فکری رویہ توانا ہوا، وہ مطابقت پذیری کا تھا۔ اگرچہ احیا پسندی اور مزاحمت کے رویے بھی موجود تھے، مگر برطانوی استعمار کے "سٹیٹ اپریٹس" انھیں حاشیے پر دھکیلنے اور ان کی اثر پذیری کو زائل کرنے میں کوشاں رہتے۔ تاہم برعظیم کے یورپی آقا مطابقت پذیری کی دامے، درمے، قدمے، سخنے حمایت کرتے۔ سرسید، ان کے رفقا اور محمد حسین آزاد اسی رویے کے علم بردار تھے۔ اس اعتبار سے اردو کے عناصر خمسہ اپنے عہد کی تاریخ کی پیداوار نظر آتے ہیں، مگر ان کی تحریروں اور ان کے

اثرات کا مطالعہ کیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ہماری جدید ادبی تاریخ کی تشکیل میں ایک بنیادی کردار ضرور ادا کیا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ بیسویں صدی کے اردو ادب کے تمام رجحانوں اور تحریکوں کا بیج ہمارے مذکورہ مشاہیر کے یہاں موجود ہے۔ آج ان کی ادبی کارگزاریوں کا مطالعہ ہمیں اس آزادی اور روشنی کی از سر نو دریافت پر مائل کرتا ہے، جسے انھوں نے نوآبادیاتی صورت حال کی جبریت میں بھی، اپنی ثقافتی اوضاع سے کسی نہ کسی طور اخذ کر لیا تھا اور اپنی تحریروں میں بکھیر دیا تھا۔

۲۲ جنوری ۲۰۱۰ء کو آزاد کے انتقال پر ایک صدی مکمل ہوئی۔ اس ایک سو برس میں شاید ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا، جب آزاد کی تحریریں پڑھی نہیں گئیں یا ان پر گفت گو نہیں ہوئی۔ آب حیات (اپنی تمام تر تحقیقی فروگذاشتوں کے باوجود) اور نیرنگ خیال خاص طور پر مسلسل زیر مطالعہ اور زیر بحث رہنے والی کتب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ایک صدی میں آزاد ہمارے ادبی شعور کی مختلف پرتوں میں برابر سرایت کرتے چلے گئے ہیں۔ جدید نظم، جدید تنقید، جدید تحقیق، لسانیات، جدید تاریخ نویسی، درسی کتب کی تالیف، قواعد نویسی، غرض کون سا شعبہ ایسا ہے جس کے پس پشت آزاد اپنے ہونے کا ثبوت نہیں دیتے اور انشا پردازی میں تو ان کی حیثیت موجد و خاتم کی ہے۔ یوں تو آزاد کے معاصرین میں حالی، شبلی اور سرسید جیسے جید نثر نگاروں کے نام آتے ہیں مگر آزاد اپنے اسلوب کے اعتبار سے ان سب میں اپنی الگ امتیازی شان رکھتے ہیں۔ کہیں کہیں تو ان کی نثر کا ایجاز اعجاز کی حدوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ ایسی تخلیقی، جاندار اور زندہ نثر کے نمونے ہمارے نثری سرمایے میں نایاب کے حدود میں داخل ہیں۔ آزاد اپنی مسیحائی سے مردہ لفظوں کو زندہ اور زندہ اور توانا لفظوں کو زندہ تر اور توانا تر بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ اردو نثر میں مصلح تو متعدد ملیں گے، مگر مسیحا صرف ایک تھا -- آزاد ع آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند!

آزاد کی متنوع ادبی خدمات کا یہ احساس و اعتراف ہی تھا جس نے شعبۂ اردو کو 'آزاد صدی دو روزہ عالمی سیمینار' کے انعقاد کی تحریک دی۔ ہمارا ایقان ہے کہ اپنے مشاہیر کو یاد رکھنے کا مطلب روشنی کے اس منبع تک رسائی کو ممکن بنانا ہے، جسے اپنی روحوں میں بیدار کر کے یہ لوگ عظمت سے ہمکنار ہوئے اور شہرت عام اور بقائے دوام سے بہرہ ور ہوئے۔ ہمارا یہ بھی ایقان ہے کہ مشاہیر کی یاد ''مدلل مداحی'' نہیں ہونی چاہیے، اسے نئی تعبیر اور نئی معنویت کی دریافت میں بدلنا چاہیے تاکہ ہم اس راستے کے کسی نئے سنگ میل کی نشان دہی کر سکیں جسے ہمارے مشاہیر نے تخلیق کیا تھا۔ ہمیں امید ہے کہ سیمینار کے یہ منتخب مقالات ہمارے اس ایقان کو درست ثابت کریں گے۔

ہم نہایت انکسار اور گہری مسرت کے ساتھ اس امر کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں کہ شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی نے آزاد صدی کے حوالے سے پورے برعظیم میں پہلا عالمی سیمینار منعقد کیا۔ اس سیمینار میں بھارت، ایران، جاپان اور ترکی کے علاوہ پاکستان بھر سے ۳۵ مندوبین شریک ہوئے اور آزادیات کے حوالے سے اپنے مقالات

پیش کیے۔ مقالات کے موضوعات کا انتخاب ہم نے کیا تھا۔ ہم تمام مقالہ نگاروں کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہمارے مجوزہ موضوعات کو پسند کیا اور ان پر عمدہ اور منفرد مقالات تحریر کیے۔ ان موضوعات پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہو جائے گا کہ آزاد کی ادبی خدمات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر نئے زاویے سے بحث و گفتگو کی دعوت نہ دی گئی ہو۔ تکرار موضوعات سے بچنے کی حتی الوسع کوشش کی گئی۔ تاہم دو ایک مقامات پر ہم اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ہمیں اطمینان ہے کہ موضوع کی تکرار نے مطالب کی تکرار کی صورت اختیار نہیں کی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مقالات آزاد شناسی میں ایک قابل قدر اور وقیع اضافہ سمجھے جائیں گے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ کتاب میں شامل مقالات میں پیش کیے گئے مباحث سے مرتبین کا کاملاً اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے۔ مقالہ نگاروں کے موقف کو ان کا ذاتی موقف سمجھا جائے۔

آزاد صدی سیمینار میں کل چھے سیشن ہوئے جن میں اڑتیس مقالات پیش کیے گئے، مگر زیر نظر کتاب میں بوجوہ صرف تینتیس مقالات شامل کیے جا رہے ہیں۔ باقی مقالات کے شامل نہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ مقالہ نگار حضرات ان پر نظر ثانی کے لیے وقت نہ نکال پائے اور بغیر نظر ثانی کے انھیں شامل کتاب کرنا مرتبین کو گوارا نہ ہوا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض مقالات حد درجہ طوالت کے حامل تھے جس کے باعث انھیں کتاب میں شامل کرنا ممکن نہ ہوا۔

اس یادگار دو روزہ بین الاقوامی سیمینار کی ایک مفصل روداد بھی مع منظور شدہ قراردادوں کے قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر

شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۵ جولائی ۲۰۱۰ء

محمد حسین آزاد
خواندہ......شنیدہ......فہمیدہ

کلیدی خطبہ

ڈاکٹر اسلم فرخی

''یہ استاد کے پکھوے سے لگا نیا پکھیرو کون ہے؟ شاید پہلی دفعہ مشاعرے میں آیا ہے۔ بڑا سہما سہما بیٹھا ہے۔ ارے وہی نواب مرزا کی بغل میں۔''

''اچھا، اچھا۔ وہ...... تعجب ہے تم نہیں پہچانے۔ ادھر روشنی بھی کچھ کم ہے۔ بارہا دیکھا ہے تم نے۔ استاد کے یہاں بھی دیکھا ہے۔ اردو اخبار والے مولوی باقر کا بیٹا ہے۔ محمد حسین۔ مدرسے میں پڑھتا ہے۔ استاد کے یہاں کا حاضر باش ہے۔ استاد کے ساتھ سایے کی طرح لگا رہتا ہے۔''

''لاحول ولا قوۃ۔ اب پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ معلوم ہوتا ہے آنکھیں جواب دے گئی ہیں۔''

اتنے میں مشاعرے کا آغاز ہوگیا۔ شمع گردش کرنے لگی۔ نو مشقے 'مبتدی' پڑھنے لگے۔ اعلان ہوا۔ محمد حسین المتخلص بہ آزاد۔ تلمیذ خاص خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق۔ نوجوان نے ملتجی نظروں سے استاد کی طرف دیکھا۔ استاد نے کہا، ''ہاں میاں پڑھو۔'' محمد حسین نے غزل شروع کی۔

مشاعرے کا طریقہ راسخہ یہ ہے کہ جب نو مشقے اور مبتدی پڑھتے ہیں تو استادان فن چپکے بیٹھے رہتے ہیں۔ نہ ہاں نہ ناں۔ ایسا ہی اگر کوئی غیر معمولی شعر ہو تو سر ہلاتے ہیں۔ ورنہ منہ میں گھنگھنیاں دیے بیٹھے ہیں۔ اس مشاعرے میں ایک طرف مرزا نوشہ بیٹھے تھے۔ ان کے ایک طرف جہانگیر آباد والے مصطفیٰ خاں شیفتہ تھے۔ دوسری طرف لوہارو والے نواب ضیاء الدین احمد نیر رخشاں تھے۔ ان کے سامنے حکیم آغا جان عیش تھے۔ ایک طرف مولانا امام بخش صہبائی

اور ان کے تلامذہ تھے۔ حکیم مومن خان مومن کسی خیال میں محو اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ استاد ذوق کا پرا سب سے بڑا تھا۔ اس میں بعض شہزادے اور سلاطین زادے بھی تھے۔ میاں محمد حسین آزاد غزل پڑھتے رہے:

شب نشے میں جو رخ یار سے پردا اٹھا — لطف دور شب مہتاب سے کیا کیا اٹھا

حرم و دیر میں ہے شور قیامت یارب — رخ سے یہ کس بت بیباک کے پردا اٹھا

خلق سے اٹھ گئے پر سنگ در جاناں سے — روش نقش قدم پاؤں نہ اپنا اٹھا

راست رو آتے رہے کج روشوں میں ناکام — بے ثمر سرو ہے گر باغ میں سیدھا اٹھا

بل بے جذب دل مجنوں کہ سوئے نجد آکر — پھر نہ ہر گز قدم ناقہ لیلا اٹھا

شعر گوئی کا تو دعویٰ نہیں رکھتا آزاد
ہاں پر استاد کی خدمت میں ہے بیٹھا اٹھا

میاں آزاد کی بیس اکیس برس کی عمر، سبزہ آغاز، لباس میں مولویانہ انداز کی جھلک، چوڑا پھیلا ہوا چہرہ، ستواں ناک، روشن آنکھیں، کشمیری خط وخال، گورا رنگ، آواز میں نوجوانی کے زور کی جھلک، بہت ٹھہر ٹھہر کر شعر پڑھتے رہے، ہر شعر پر داد طلب نظروں سے محفل کی طرف دیکھتے مگر معمولی ہوں ہاں کی آوازیں آتی رہیں۔ مقطعے پر ان کے استاد بھائیوں نے بڑا غل مچایا۔ استاد خاموش رہے۔ ایک بڑے میاں کہنے لگے '' بالکل استاد کا سا رنگ ہے۔ انشاءاللہ ترقی کروگے۔ اسی طرح کہتے رہو۔''

محمد حسین آزاد استادوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ ہمدان سے کشمیر آئے تھے۔ بعد والوں نے کشمیر سے کشمیری دروازے کا رخ کیا۔ دلّی میں آباد ہو گئے۔ ان کے دادا مولوی محمد اکبر مکتب پڑھاتے تھے۔ آزاد نے بھی ابتدائی کتابیں انھیں سے پڑھی تھیں۔ ان کی بزرگی اور نیک نفسی کا شہرہ تھا۔ آزاد کے والد مولوی محمد باقر بڑے باصلاحیت، دور اندیش اور ہوش وگوش کے انسان تھے۔ دلّی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہاں تدریس کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ پھر وہاں سے مستعفی ہو کر سرکاری ملازمت اختیار کی۔ تحصیل داری تک پہنچے۔ حالاں کہ ملازمت اچھی تھی، تنخواہ بھی بہت معقول، یعنی ڈیڑھ سو روپے ماہوار جو اس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑی تنخواہ تھی لیکن مولوی باقر اور ان کے والد مولوی محمد اکبر اس ملازمت سے خوش نہیں تھے۔ دونوں انگریزی ملازمت کو غیروں کی غلامی سے تعبیر کرتے تھے۔ چناں چہ مولوی باقر نے ملازمت کے دوران ہی ایک چھاپہ خانہ قائم کر دیا۔ اخبار نکالا، اخبار بڑا مقبول ہوا۔ سارے شمالی ہند میں اس کا شہرہ ہو گیا۔ مولوی صاحب کے سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اخبار پر ان کا نام نہیں آتا تھا لیکن سب جانتے تھے کہ اخبار کے کرتا دھرتا وہی ہیں۔ انھیں ایک روشن خیال، بااصول اور مخلص صحافی کی حیثیت سے آج بھی جانا پہچانا جاتا ہے۔ دراصل مولوی صاحب کو آنے والے دور کے تقاضوں کا احساس ہو گیا تھا۔

اخبار نویسی سے ان کا مدعا عمومی آگہی اور تہذیبی سطح پر رونما ہونے والی اہم تبدیلیوں سے عوام کو آگاہ کرنا تھا۔

مولوی محمد باقر عملی انسان تھے۔ انھوں نے کشمیری دروازے میں مغل طرز کی بڑی سی حویلی تعمیر کروائی تھی۔ ایک حصے میں زنان خانہ تھا، ایک حصے میں پریس اور اخبار کا کاروبار تھا، ایک حصے میں پریس کے عملے اور دوسرے ملازموں کے رہنے کا انتظام تھا۔ مولوی صاحب نے ایک نیلام گھر بھی قائم کیا تھا۔ یہاں پرانا سامان اور اسباب نیلام ہوتا تھا۔ یہ بھی مولوی صاحب کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھا۔

مولوی صاحب بڑے ملنسار اور رسا آدمی تھے۔ بہادر شاہ ظفر سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق ان کے ہم مکتب تھے۔ دونوں میں دانت کاٹی روٹی تھی۔ بھائیوں جیسا سلوک تھا۔ پھر انگریزوں سے بھی صاحب سلامت تھی۔ دتی کالج کے انگریز پرنسپلوں سے میل ملاقات تھی۔ دتی کالج کی ملازمت میں حسن کارکردگی پر انگریز گورنر جنرل ولیم بینٹک کے ہاتھوں خلعت بھی حاصل کر چکے تھے اور ایک ذاتی مناقشے میں زخمی بھی ہو چکے تھے۔

روداد اس مناقشے کی کچھ یوں ہے کہ مخالف اور دشمن تو ہر بھلے آدمی کے ہوتے ہیں۔ مولوی محمد باقر کے عروج کو دیکھ کر خار کھانے والے بھی بہت تھے۔ دتی کالج میں کچھ لوگ ان کی جان کے لاگو ہو گئے۔ ایک شام جھٹ پٹے کے وقت کسی نے ان کی حویلی کے دروازے پر آواز دی۔ کوئی ملازم موجود نہیں تھا۔ آواز سن کر مولوی صاحب خود باہر نکلے۔ ڈیوڑھی میں ایک دشمن جاں تاک میں کھڑا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پے در پے چھری کے کئی وار کیے اور رفو چکر ہو گیا۔ مولوی صاحب تیورا کر گر پڑے۔ دھماکا سن کر اندر سے کوئی دوڑا آیا۔ مولوی صاحب کو اٹھایا۔ وار کرنے والے نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ علاج معالجے سے مولوی صاحب تن درست ہو گئے۔ وار کرنے والا پکڑا گیا۔ عدالت سے سزا ہوئی۔

مولوی محمد باقر کو ایک اور مناقشے کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس مناقشے میں ان کے حریف قاری جعفر علی تھے۔ دتی کے دو امیروں کی چپقلش کی وجہ سے مولوی صاحب اور قاری صاحب دونوں ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ جانی دشمنی ہو گئی۔ دتی کے شیعہ حضرات میں دو گروہ ہو گئے۔ باقری اور جعفری۔ بڑی گندگی اچھلی۔ ایک دوسرے کے خلاف دل آزار اور توہین آمیز کتابیں لکھی گئیں۔ اشتہار چھپے، فتوے جاری ہوئے۔ بڑا ہنگامہ رہا۔ شہر میں مشہور تھا کہ دونوں کو شاہی دربار کے دو با اثر امرا کی پشت پناہی حاصل ہے اور یہ مناقشہ انھیں دو با اثر امیروں کی باہمی چپقلش کا نتیجہ ہے۔ ادب و شعر کی دنیا میں بھی اس مناقشے کی گونج نمایاں ہوئی۔ مولوی محمد باقر کے حمایتی تھے استاد ذوق، استادِ شاہ۔ اور مرزا غالب کی راہ و رسم قاری جعفر علی سے تھی۔ بڑی تیزم تازی ہوئی۔ آخر کار وقت کے زبردست ہاتھ نے اس مناقشے کو بھی لپیٹ کر رکھ دیا۔ داستان ہی داستان رہ گئی۔

جس سال مخالفوں نے مولوی محمد باقر کی زندگی کا چراغ گل کرنے کی کوشش کی تھی اسی سال قدرت نے ان

کے کاشانے میں ایک ایسی شمع روشن کردی جس کی روشنی لازوال ثابت ہوئی۔ دور دور تک پہنچی اور دلوں کو منور کر گئی۔ ان کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شاداں و فرحاں دادا نے محمد حسین نام تجویز کیا۔ سب نے دل و جان سے پسند کیا۔ محمد حسین کی والدہ امانی خانم ایک نو وارد نجیب الطرفین ایرانی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں لیکن محمد حسین کو جلد ہی ماں کی شفقت سے محروم ہونا پڑا۔ نوعمر بچہ جان چھڑ کنے والی ماں کے بغیر بڑا گھبرایا۔ اداس اداس رہنے لگا۔ ہر وقت ماں کا پیارا پیارا چہرہ نظروں کے سامنے رہتا۔ فارسی کے محبت بھرے، شیریں فقرے کانوں میں گونجتے اور رس گھولتے رہتے۔ دنیا اندھیر ہوگئی۔ اس جان لیوا صدمے میں پھوپی نے سہارا دیا۔ محمد حسین کو پھول پان کی طرح رکھا۔ ہر دل داری کی لیکن کمی کا ایک احساس محمد حسین کی زندگی میں ہمیشہ جاری وساری رہا۔

اصل میں غضب یہ ہوا کہ کسی نے جوش محبت میں بچے کو کفنائی ہوئی ماں کا آخری دیدار کرادیا۔ بچے نے چیخ ماری اور کہا ''یہ میری امی نہیں ہیں۔ یہ میری امی نہیں ہیں۔'' مہینوں وہ روتا اور یہی رٹ لگائے رہتا ''میری امی کو بلاؤ۔ میری امی کو بلاؤ۔'' ایسے موقع پر پھوپھی محمد حسین کو کلیجے سے لگا لیتیں، بھتیجے کے ساتھ خود بھی آنسو بہاتیں۔ محمد حسین پھوپی کو روتے دیکھ کر چپ چاپ آنسو پونچھ لیتے۔ مولوی محمد اکبر نے بھی پوتے کے ساتھ بڑی شفقت برتی۔ ساتھ بٹھاتے، ساتھ کھلاتے۔ تھوڑا بہت پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ بھی شروع کیا تاکہ محمد حسین کا دل بہل جائے، دھیان بٹ جائے، دل ٹھہرے اور ماں کے غم میں کمی آجائے لیکن محمد حسین کے دل میں ماں سے محرومی کی جو گرہ پڑ گئی تھی وہ پڑ گئی۔ ذہن کے نہاں خانے میں یہ پہلا ان مٹ نقش تھا۔ آگے چل کر ایسے ہی کتنے ان مٹ نقوش ابھرے اور ذہن کو کمزور کر گئے۔

دوسرا غضب یہ ہوا کہ امانی خانم کے انتقال کے بعد مولوی محمد باقر نے بہ تقاضائے بشری دلی کالج کے ایک استاد ماسٹر حسینی کی بہن سے نکاح کر لیا۔ آنے والی تک چڑھی نخرے چینی۔ نکاح سے پہلے ہی سن گن لے لی تھی کہ سسرال میں کلیجے کی پھانس تو ہے نہیں، نندگلی کی گندالبتہ ہے۔ ہاتھ اختیار بھی اسی کا ہے اسے زیر کر لینا کیا مشکل ہے۔ چنانچہ اس نیک بخت نے گھونگھٹ اٹھاتے ہی سب سے پہلے تو نند کو آنند کا سپنا دکھا کر طاق پر بٹھایا، سارا کام خود سنبھال لیا۔ پہلے گھر میں چاندنی کھلی رہتی تھی، اب کتے لوٹنے لگے۔ گھر کا گھروا ہو گیا۔ مولوی اکبر یہ سارا تماشا دیکھتے رہے مگر دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ نند بیچاری آٹھ آٹھ آنسو روتی۔ اپنے آپ کو گھونٹتی رہتی۔ مولوی محمد باقر کو گھر کی بدلی ہوئی حالت کا احساس نہیں ہوا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ مرد جب گھر آتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ گرما گرم کھانا تیار ہے، حقہ بھرا ہوا ہے، مسہری پر پھول رکھے ہوئے ہیں، بیوی بنی سنوری مہکتی مسکراتی صدقے واری ہونے کو بے قرار ہے تو وہ دنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتا ہے۔

رہ گئے محمد حسین تو سوتیلی ماں نے آتے ہی انھیں قہر کی نظروں سے دیکھا۔ اٹھتے بیٹھتے کچوکے دیتی رہتیں،

''ماں یاد آ رہی ہوگی۔ گھر میں دل نہیں لگتا ہوگا۔ ہے تو چھوٹا مگر بلا کا کھوٹا ہے۔'' محمد حسین یہ سب سنتے، کلیجہ مسوس کر رہ جاتے۔ ذہن میں ایک اور گرہ پڑ گئی۔ نفرت کا ایک اور نقش بن گیا۔ اپنی مجبوری کا احساس کچھ اور بڑھ گیا۔ لاکھ پھوپھی دلداری کرتیں مگر محمد حسین کو چین نہیں آتا تھا۔

مولوی اکبر نے پوتے کی مکتبی تعلیم شروع کر دی۔ خالق باری پڑھائی، کریما پڑھایا، مامقیماں پڑھایا، گلستان پڑھی، بوستان پڑھی۔ قدیم نصاب میں اور کچھ ہو نہ ہو یہ خوبی ضرور تھی کہ طالب علم ابتدا ہی سے شعر و ادب کی لذت کو محسوس کر لیتا تھا۔ کریما اور مامقیماں سے ذہن میں شعری آہنگ کا در کھل جاتا تھا۔ گلستان کی چٹخارے دار نثر سے نثر کی ادبیت اور افادیت کا احساس ہوتا تھا۔ بوستان کی دل کش اور زندگی آموز حکایتوں کی شعریت، بچوں کے ذہنوں میں ادبی آہنگ اور شعری افادیت کی جوت جگا دیتی تھی۔ محمد حسین کو ویسے بھی شعر و شاعری اور سعدی کی نثر سے دلچسپی تھی۔ دلچسپی کیا تھی، قدرت نے انھیں غیر معمولی ادبی صلاحیت عطا کی تھی۔ جو پڑھتے، بہت سوچ سمجھ کر پڑھتے اور اس پر غور کرتے۔ کبھی کبھی باپ بھی ان کے پڑھنے لکھنے کا جائزہ لیتے اور مطمئن ہو جاتے۔ پھر مولوی اکبر نے انھیں عربی شروع کرا دی کہ اس زمانے کا یہی دستور تھا مگر محمد حسین کو عربی کے مقابلے میں فارسی زیادہ پسند تھی۔ ان کے بزرگوں اور ان کے گھر کی زبان تھی۔ آخر کار ایک دن مولوی محمد اکبر بھی انھیں درس دیتے دیتے استادِ ازل کے حضور پہنچ گئے۔ نوعمر محمد حسین کے ذہن میں ایک اور گرہ پڑ گئی۔ شفیق دادا سے انھیں بڑی محبت تھی۔ دیکھتے رہتے کہ وہ فرصت کے اوقات میں ایک قصیدے کی نقلیں تیار کرتے رہتے تھے۔ اس قصیدے کا تیسرا شعر انھیں بہت پسند تھا۔ اکثر پڑھا کرتے تھے۔ محمد حسین کو بھی یہ قصیدہ یاد ہو گیا تھا۔

شفیق دادا نے ہونہار پوتے کو خوش نویسی بھی سکھائی تھی۔ خوش نویسی اس زمانے میں جزو تعلیم تھی۔ گھر کے پریس کی وجہ سے محمد حسین آزاد کو کاپی لکھنے کی مشق بھی کرائی گئی تھی تاکہ ہاتھ سدھ جائے اور ہنگامی صورت حال میں وہ کاتب کا فریضہ بھی انجام دے سکیں۔ محمد حسین نے یہ کام بھی خوشی خوشی سیکھ لیا۔

سوتیلی ماں محمد حسین کو دیکھ دیکھ کر انگاروں پر لوٹتی رہتیں۔ انھیں بیٹے کی بڑی تمنا تھی۔ نجانے کیسے کیسے تعویذ گنڈے کیے، منتیں مرادیں مانیں، دلی کی ہر درگاہ میں حاضر ہوئیں، سیانوں سے جھاڑ پھونک کرائی، چپکے چپکے حکیموں کو بھی دکھایا مگر گود ہری ہونا تھی نہ ہری ہوئی۔ دن رات کے جلاپے نے اندر ہی اندر گھلا دیا اور آخر کار اسی جلاپے میں ایک دن وہ ناشاد اور نامراد نگوڑی ناٹھی دنیا سے چلی گئیں۔ محمد حسین کے ذہن میں مرگ زیست کے بے وقت انتشار نے ایک اور گرہ ڈال دی۔

کچھ دن کے بعد مولوی صاحب نے اپنی ایک خانہ زاد سے نکاح کر لیا۔ یہ گھر کی پروردہ دبی پچی بیوی تھیں۔ نند کی مطیع اور فرماں بردار بن کر رہیں۔ اولاد کی تمنا انھیں بھی تھی مگر یہ محمد حسین سے کھنساتی نہیں تھیں، خیال کرتی

تھیں لیکن محمد حسین باندی کو بیگم بنتے دیکھ کر کچھ اور اداس ہو گئے۔ ان کی ماں تو وہی امانی خانم تھیں۔ انھیں کا دھیان رہتا تھا۔ انھیں کی یاد میں دل تڑپتا تھا یا پھر پھوپی تھیں۔ اللہ آمین کرنے اور جان چھڑکنے والی۔ محمد حسین کے لیے گھر کے معنی تھے پھوپی جان۔

مولوی محمد باقر اور استاد ذوق میں برادرانہ تعلقات تھے۔ استاد مولوی صاحب پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ ان کا کلام مولوی صاحب ہی کے یہاں جمع ہوتا تھا اور انھیں کے اخبار میں گاہے گاہے شایع بھی ہوتا تھا۔ میاں محمد حسین باپ کے ساتھ کبھی کبھی استاد کے یہاں جایا کرتے تھے۔ ایک دن استاد نے نوعمر محمد حسین آزاد کی آنکھوں میں تنہائی اور یتیمی کے کرب کو محسوس کر لیا۔ استاد تھے، فن کار تھے، انسان شناس تھے، جذبات انسانی کو خوب سمجھتے تھے۔ اسی دن سے استاد کے برتاؤ میں غیر معمولی شفقت پیدا ہو گئی۔ شفیق تو وہ پہلے بھی تھے، اب حد سے زیادہ شفیق ہو گئے۔ اپنے بیٹے میاں اسمٰعیل کی طرح چاہنے لگے۔ تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔ محمد حسین بھی استاد کے بندۂ بے دام ہو گئے۔

مولوی محمد باقر کو آنے والے دور کے تقاضوں کا پورا احساس تھا۔ انھوں نے دلّی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہاں معلمی کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ محمد حسین کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہوگئی تھی۔ مولوی صاحب نے انھیں کالج کی عربی جماعت میں داخل کرا دیا۔

کالج کیا تھا، ایک نئی دنیا تھی۔ مشرق و مغرب کا سنگم۔ مغرب کو بالا دستی حاصل ہو رہی تھی۔ مشرق بے چارہ، پس ماندہ اپنی روایت کی زورا زوری سے مقابلہ تو کر رہا تھا لیکن بے دلی سے۔ کالج کے استادوں میں انگریز مستشرقین بھی تھے، مسلمان عالم بھی تھے، ہندو پنڈت بھی تھے۔ استادوں کی ایک کہکشاں تھی۔ سارے استاد اپنے اپنے فن میں طاق۔ طلبہ بھی ذہانت اور صلاحیت میں براق۔ نذیر احمد تھے جو بعد میں شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد ہوئے۔ یہ عربی جماعت میں محمد حسین کے ساتھ تھے۔ مولوی ذکاء اللہ تھے جو بعد میں خان بہادر شمس العلما مولوی ذکاء اللہ ہوئے اور محمد حسین کے ساتھ ساری زندگی بھائیوں کی طرح رہے۔ خواجہ ضیاء الدین تھے۔ بعد میں وہ بھی شمس العلما ہوئے۔

کالج میں محمد حسین کے جوہر خوب کھلے۔ محنتی تھے، مستعد تھے، علم حاصل کرنے میں ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔ گھر کے اخبار اور استاد ذوق کے یہاں حاضر باشی نے ذہن کو اور زیادہ روشن کر دیا تھا۔ کالج میں مضمون نویسی کا سالانہ مقابلہ ہوتا تھا۔ محمد حسین کو اس مقابلے میں دو بار انعام ملا۔ انھیں لڑکپن ہی سے اہل وطن کی تعلیم و تربیت کا خیال تھا۔ حصول علم میں ان کی مستعدی اور شوق کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ نئے اور اعلیٰ خیالات ملک میں پھیلائے جائیں۔ گھر کے اخبار سے یہ خدمت شروع ہو چکی تھی۔ کالج میں بھی اسی کا خیال رہا۔

ایک بار ایک انگریز ماہر تعلیم ڈاکٹر مودیٹ کالج کے معائنے کے لیے آئے۔ ڈاکٹر مودیٹ کی ایک عمدہ یادگار، ان کی کتاب ــمعینــ الجراحینــ ہے جو علم الابدان کا توضیحی اور تشریحی اٹلس ہے۔ اعضائے انسانی کی

تصویریں اور نقشے آج کے اٹلسوں سے پہلو مارتے نظر آتے ہیں۔ ایک صفحے پر اردو میں تشریح، مقابل کے صفحے پر انگریزی میں تشریح۔ اردو درسیات میں ایک سنگ میل۔ ڈاکٹر موویٹ نے کالج کے معائنے میں طلبہ سے سوالات بھی کیے۔ محمد حسین سے پوچھا، ''تم تعلیم سے فارغ ہو کر کیا کرو گے؟'' انھوں نے کہا، ''میں تحصیل علوم کروں گا اور جو خیالات ہیں اور ہوں گے، انھیں اپنے اہل وطن میں پھیلاؤں گا۔''

یہ سب باتیں تو اپنی جگہ صحیح تھیں مگر ایک گڑبڑ بھی ہوئی۔ کالج میں شیعہ دینیات کے استاد تھے، قاری جعفر علی۔ مولوی محمد باقر کے پرانے حریف۔ محمد حسین اکثر ان کے کلاس میں ایسے سوال اٹھاتے کہ قاری صاحب کو جواب دیتے بن نہیں پڑتی تھی۔ کلاس میں کھینچا تانی کی فضا قائم ہو جاتی تھی۔ روز روز کی اس تھکا فضیحتی سے تنگ آ کر قاری صاحب نے محمد حسین کو اپنی کلاس میں آنے سے منع کر دیا۔

اب کیا ہو؟ دینیات کے نصاب کی تکمیل کیسے ہو؟ سنّی دینیات کے استاد دلّی کے مشہور عالم سید محمد دہلوی تھے۔ انھوں نے ایک دن محمد حسین کو بلایا۔ کہنے لگے ''ہم نے سنا ہے تم تقریر بہت عمدہ کرتے ہو۔ ذرا ہمارے سامنے تو اپنے خیالات کا اظہار کرو۔'' محمد حسین نے تقریر کی۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے۔ بولے ''ہم سے پڑھنا ہو تو ہماری جماعت میں آ جاؤ۔'' پرنسپل نے بھی اس تبدیلی کی اجازت دے دی۔ محمد حسین خوشی خوشی سنّی دینیات کی جماعت میں شریک وہ گئے اور نصاب کی تکمیل کر لی۔ اس طرح انھیں مسلمانوں نے دو بڑے اہم فرقوں کی بنیادی معلومات حاصل ہو گئیں۔ قاری صاحب کی چیرہ دستی سے ذہن میں جو گرہ پڑنا شروع ہو گئی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔

یہ بڑی مصروفیت اور ریاضت کا دور تھا۔ ذہنی تشکیل اور زندگی کے شعور سے بھرپو شناسائی کا دور تھا۔ صحافت، شعر و ادب اور علمی دید و دریافت کا دور تھا۔ محمد حسین ایک طرف کالج کی پڑھائی میں مصروف رہے۔ دوسری طرف چھاپے خانے کے انتظام اور اخبار کی مصروفیت اور تیسری طرف استاد ذوق کے یہاں کی حاضر باشی۔ ہر طرف مصروفیت، محنت اور مستعدی۔ چھاپے خانے میں چھپنے والی کتابوں پر ان کا نام آنے لگا۔ اخبار پر بھی مہتمم کی حیثیت سے نام شایع ہونا شروع ہو گیا۔ رہ گئے استاد ذوق تو محمد حسین کو ان سے سچ مچ عشق تھا۔ چھٹے اور پہنچے۔ استاد بھی غیر معمولی شفقت فرماتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ ماں کی محبت سے محروم بچہ ہے۔ باپ کو دم مارنے کی فرصت نہیں۔ ان کا بھی یہ حال کہ کالج کی چھٹی کا پورا دن استاد کے یہاں گزارتے۔ صبح سات آٹھ بجے پہنچ جاتے۔ استاد اس وقت بیت الخلا میں ہوتے۔ پاؤں کی چاپ پہچانتے تھے۔ وہیں سے آواز دیتے ''تم ہو۔'' پھر ہنستے ہوئے باہر آتے۔ ''ہاں تو میاں محمد حسین اس دن تم نے ہمارا وہ شعر پڑھا تھا۔ یاد ہے۔ اچھا تو اب اسے یوں بنا لو۔'' ایک دن اسی طرح ہنستے ہوئے برآمد ہوئے۔ بولے ''میاں محمد حسین! آج تینتیس برس کے بعد اصلاح دینی آئی ہے۔'' حافظ ویران استاد کے شاگرد خاص بھی بیٹھے تھے۔ انھوں نے پوچھا۔ ''حضرت کیوں کر۔'' استاد بولے ''ایک دن شاہ نصیر مرحوم کسی شاگرد کو اصلاح دے

رہے تھے۔ اس میں مصرع تھا:

کھاتی کمر ہے تین بل اک گدگدی کے ساتھ

ابتدائی مشق تھی۔ اتنا خیال میں آیا کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہیے۔ جب سے اکثر یہ مصرع کھٹکتا رہتا تھا۔ آج وہ نکتہ حل ہوا۔ ''محمد حسین نے عرض کی۔ ''حضرت پھر کیا فرمایا۔'' استاد بولے ''کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ۔ کمر کو اوپر ڈال دو۔'' محمد حسین نے پھر عرض کی، ''پھر وہ کیوں کر۔'' استاد نے کہا، ''تین چار مصرعے الٹ پلٹ کیے تھے۔ ایک اس وقت خیال میں ہے:

بل ہے کمر کہ زلف مسلسل کے پیچ میں
کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

استاد کی بارگاہ اس عہد کا ایک ایسا دبستان شعر و ادب تھا جس سے استفادہ کرنے والے ادبی اور فنی نکات سیکھتے تھے۔ شعر کے حسن و قبح سے آگاہ ہوتے تھے۔ خیال، جذبے، تجربے اور زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں کی پہچان کرتے تھے۔ استاد بالعموم اپنے چھوٹے سے گھر کی چھوٹی سی انگنائی میں کھری چارپائی پر بیٹھے حقہ گڑگڑاتے رہتے تھے۔ کتاب دیکھتے رہتے تھے، اشعار لکھتے رہتے تھے، شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے رہتے تھے۔ شام کو گھر سے باہر تیس ہزاری باغ یا نہر کے کنارے گھنٹوں ٹہلتے تھے۔ محمد حسین اکثر ساتھ ہوتے۔ ایک شام اسی طرح استاد کے ساتھ ٹہل رہے تھے، استاد غزل کہتے جاتے تھے۔ اچانک انھوں نے کہا ''میاں محمد حسین تم بھی تو کچھ کہو۔'' محمد حسین نے کہا ''جی قبلہ کیا عرض کروں۔'' استاد بولے ''کچھ ہوں ہاں۔ کچھ غوں غاں۔ اسی طرح کہنا آتا ہے۔'' محمد حسین نے ہمت کرکے مصرع پڑھا:

سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

استاد نے خوش ہو کر کہا، ''ٹھیک ہے۔ دیکھو شعر یوں ہوا:

آ جائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے
سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

استاد کی صورت میں میاں محمد حسین کو ایک مرکز مل گیا تھا۔ بس دو ہی کام تھے۔ کالج کی پڑھائی اور استاد کے کلام کی چیٹک۔ دن رات یہی جستجو، جس کسی سے استاد کا کوئی شعر سنا، کتاب یادداشت میں ٹانک لیا اور استاد سے تصحیح چاہی۔ ایک دن ان کے چھاپے خانے میں تذکرہ ہوا کہ رات استاد کے ملازم نے سورج مکھی پر شعر پڑھے۔ بڈھا تھا مگر غضب کے شعر پڑھے۔ دوسرے دن انھوں نے پوچھا ''محمد بخش۔ سورج مکھی پر کیا شعر پڑھے تھے۔'' وہ مکر گیا۔ بڑی مشکل سے قبولا۔ پھر بولا۔ بچوں کے سامنے شعر نہیں پڑھتے۔ بڑی خوشامد درآمد سے یہ مطلع پڑھا

ماتھے پہ ترے جھمکے ہے جھومر کا پڑا چاند
لا بوسہ چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

میاں محمد حسین نے یہ مطلع استاد کو سنایا۔ بولے ''اوہو۔ ہو۔ تمھیں کہاں سے ملا۔ بڑا پرانا کلام ہے۔'' ایسے بے شمار اشعار میاں محمد حسین نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور استاد کو سنائے۔ استاد کلام جمع کرنے کے معاملے میں بے پروا تھے۔ غزلوں اور قصیدوں کے کاغذ تھیلیوں میں بھر کے رکھ دیے جاتے یا میاں محمد حسین کے والد کے سپرد کر دیے جاتے۔ مولوی محمد باقر اور استاد میں صلاح مشورے بھی ہوتے رہتے۔ دیوان کس طرح مرتب ہو، کون کون سے حروف میں غزلیں نہیں ہیں، ان میں کچھ کہہ لیا جائے۔ باتیں بہت ہوتیں لیکن نہ استاد کو فرصت تھی اور نہ مولوی محمد باقر کو۔ میاں محمد حسین سب کچھ غور سے سنتے اور گرہ میں باندھ لیتے۔ استاد کو بھی ان کی فنی اور شعری صلاحیت پر بھروسا ہو چلا تھا۔ کچھ کہتے تو انھیں بھی سناتے۔ اپنے فن پر اظہار خیال کرتے۔ اشعار کی تراش خراش پر گفتگو کرتے اور رموز و نکات سمجھاتے۔ ایک دن بادشاہ کے غسل صحت کے جشن کے لیے قصیدہ کہہ رہے تھے:

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر
عیاں ہو خامے سے تحریر نغمہ جائے صریر

کہنے لگے حافظ کا یہ شعر بھی اس میں تضمین کریں گے:

مئے دو سالہ و معشوق چاردہ سالہ
مرا بس ست ہمیں صحبت صغیر و کبیر

پھر جب قصیدے میں یہ قطعہ لکھا تو سنایا:

ہوا ہے مدرسہ یہ بزم گاہِ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھے ہیں بدر منیر
اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر وکبیر

پھر محمد حسین کی طرف دیکھ کر کہا، ''اب بھئی وہ شعر۔'' محمد حسین نے کہا، ''اب کیا ضرورت رہی۔'' استاد نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں، پھر کہا ''یہ اُدھر ہی کا فیضان ہے۔''

اس قصیدے میں جب استاد نے یہ شعر پڑھا:

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی فیل مست بے زنجیر

تو محمد حسین نے بے اختیار ہو کر کہا، ''سبحان اللہ، یہ رنگینی اور یہ زور، ظہوری کا ساقی نامہ مات ہو گیا۔''
استاد چپ رہے پھر کہا، ''اس میں زور آتا جاتا ہے، میں گھلا جاتا ہوں۔''

استاد کے یہاں جو معاصر شعرا، ادیب اور عالم آتے، میاں محمد حسین ان کی باتیں بھی بڑے غور سے سنتے۔ لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ شعر خوانی بھی ہوتی تھی۔ استاد اور اپنے والد کے ساتھ ایک آدھ مشاعرے میں بھی گئے۔ پھر مشاعرے میں غزلیں بھی پڑھنے لگے۔ آزاد تخلص قرار پایا۔ تلمیذ خاص خاقانی ہند حضرت ذوق ہو گئے۔ استاد کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ انھیں کے رنگ میں کہتے تھے اور انھیں کے تلمذ سے پہچانے جاتے تھے۔

آزاد کی استاد پرستی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ اگر کوئی شخص استاد کے کلام پر اعتراض کرتا تو وہ فوراً منھ توڑ جواب دیتے۔ استاد کے خلاف کچھ نہیں سن سکتے تھے۔

وقت اچھا گزر رہا تھا۔ استاد کی شفقت نے باپ کی مصروفیت اور بے توجہی کو بھلا دیا تھا۔ ذہن میں بچپن سے جو گرہیں پڑی ہوئی تھیں ان کے اثرات آہستہ آہستہ کم ہوتے جا رہے تھے۔ کالج کی پڑھائی بھی ختم پر آ گئی تھی۔ دہلی اردو اخبار کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ شہر کے نوجوان اور باصلاحیت سخن وروں میں ان کا بھی شمار ہونے لگا تھا لیکن وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ استاد بیمار پڑے اور ایسے بیمار پڑے کہ ہاتھوں میں آ گئے۔ جس رات کی صبح ان کا انتقال ہوا، اس رات کو سرِ شام آزاد بھی استاد کے پائنتی موجود تھے۔ انتقال سے تین گھنٹے پہلے شعر کہا تھا:

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

آزاد کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی، مرنا سب کو ہے مگر آزاد، استاد کے اس قدر جلد اٹھ جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کے لیے استاد، استاد بھی تھے، باپ بھی تھے، شفیق و ہمدم بھی تھے، سب کچھ تھے۔ استاد کے گزر جانے سے آزاد کا احساس تنہائی کچھ اور بڑھ گیا۔ پرانی گرہیں ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ ایک نئی گرہ اور ابھر آئی۔

باپ نے بیٹے کو گم صم دیکھ کر کچھ دن غور و فکر میں گزارے۔ پھر وہی تدبیر کی جو بزرگ کرتے چلے آئے ہیں۔ آزاد کی شادی کر دی۔ کوچہ چیلاں میں ایک ایرانی النسل خاندان تھا۔ اسی خاندان کے مرزا محمد علی کی بیٹی آغائی بیگم سے شادی ہو گئی۔ آزاد کا احساس تنہائی کچھ کم ہوا۔ لیکن یہ زمانہ ایسا نہیں تھا کہ آدمی گھر گھسنا ہو کر رہ جائے۔ آزاد اخبار اور چھاپے خانے کا کام بھی دیکھتے، اخبار کے لیے مضمون بھی لکھتے، لوگوں سے بھی ملتے جلتے، مشاعروں میں بھی جاتے مگر استاد کی یاد بے قرار رکھتی۔ جدھر سے گزرتے استاد کی رفاقت اور شفقت یاد آتی۔ استاد کے اکلوتے بیٹے وقار الدولہ محمد اسماعیل فوق کے ساتھ مل کر استاد کا دیوان مرتب کرنے کا کام شروع کیا۔ یہ کام آہستہ آہستہ جاری رہا۔ استاد کے فیضِ صحبت کے باوجود آزاد اپنے کلام سے مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ دلی کے ایک استاد حکیم آغا جان عیشؔ کو اپنا کلام

دکھانے لگے۔ یہ وہی حکیم آغا جان عیش تھے جنھوں نے ایک مشاعرے میں غالب کے روبرو اپنی غزل میں یہ قطعہ پڑھا تھا:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
زبانِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

خیر سے دو بیٹیاں بھی ہو گئی تھیں۔ دل کے بہلانے کے لیے یہ کھلونے بہت تھے مگر پھر بھی ذہن میں جو گرہیں تھیں، جو خلش تھی وہ برقرار رہی۔ کبھی کبھی کلیجے میں ایک ہوک اٹھتی اور آزاد تڑپ جاتے۔

تاریخ نے نیا ورق الٹا۔ دس مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں ہندوستانی فوجی، انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ گیارہ مئی کو دلّی میں بھی ان کا عمل دخل ہو گیا۔ چار پانچ مہینے تک ہندوستانی فوجیوں کی افراتفری رہی پھر انگریزوں نے اہلِ دہلی کی دنیا تہ و بالا کر دی۔

آزاد اس سارے عرصے میں اردو اخبار کو سنبھالے رہے۔ شہر کا حال احوال لکھتے رہے۔ انگریزوں کے خلاف مضامین لکھتے رہے۔ نثر بھی لکھی، نظم بھی لکھی لیکن ان کے والد شاہ پرست ہونے کی وجہ سے آزادی کی جدوجہد میں بڑے سرگرم رہے۔ مجتہد ہونے کی حیثیت سے انھوں نے انگریزوں سے جہاد کرنے کے فتوے پر دستخط بھی کیے۔ بہادر شاہ کے حکم سے انگریز فوجیوں کا مقابلہ بھی کیا۔ ان کی حویلی فرنگی حکومت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا بڑا مرکز بن گئی تھی۔ لوگ آ رہے ہیں، جا رہے ہیں، فوجی تیاریوں اور کارروائیوں کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ شروع کے دنوں میں انھوں نے دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی۔ ٹیلر ان کا پرانا دوست اور مربی تھا لیکن بات چھپ نہ سکی اور ٹیلر کو جان بچانے کے لیے مقامی لباس پہن کر باہر نکلنا پڑا۔ لوگ تاک میں تھے۔ ادھر ٹیلر مولوی باقر کی حویلی سے باہر نکلا اور ادھر گھات میں بیٹھے ہوئے حملہ آوروں نے اسے ہلاک کر دیا۔ بعد میں اس قتل کی بڑی عجیب داستانیں مرتب ہو گئیں۔ ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی۔ کہنے والوں کی زبان کو کون روک سکتا ہے؟ مولوی صاحب نے اخبار کا نام بھی بدل کر اخبار الظفر کر دیا تھا۔

مقامی لوگوں میں نہ کوئی تنظیم تھی، نہ اتحاد تھا، نہ ایک دوسرے پر اعتبار تھا۔ سارا کام توکل پر چل رہا تھا مگر توکل کے لیے بھی ''پائے اشتر را بہ بند'' کی ہدایت ہے۔ انگریز باہر سے بھی بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے اور اندرون شہر بھی ان کے جاسوس چھوٹے ہوئے تھے جو پل پل کی خبریں انھیں پہنچا رہے تھے۔ ان میں خاص الخاص مولوی رجب علی تھے جو بعد میں ارسطو جاہ کے خطاب سے نوازے گئے تھے۔ دلّی کے خبر تراشوں کا یہ کہنا تھا کہ اندرون شہر اسلحہ کے

میگزین کو اڑانے کا کام انھیں کی کوشش سے ہوا تھا۔ اس دھماکے میں بے شمار دلّی والے زخمی بھی ہوئے اور مارے بھی گئے۔ مولوی رجب علی، مولوی محمد اکبر کے شاگرد تھے۔ دلّی کالج میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہاں معلم بھی رہے تھے۔ مولوی محمد باقر سے ان کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے لیکن دونوں کی راہیں بظاہر الگ تھیں۔

مولوی محمد باقر، شاہ پرست مشہور تھے۔ رجب علی انگریز پرست۔ غدر کے دوران انگریزوں کو اندرون دہلی کا سارا احوال خفیہ طور پر لکھ کر بھیجتے رہتے تھے۔ دلّی میں ایک مولوی رجب علی ہی انگریزوں کے جاسوس نہیں تھے، سارا قلعہ معلی جاسوسی میں ماخوذ تھا۔ عہد حاضر کے ایک انگریز مورخ ولیم ڈیل رمپل (William Dalryample) نے مولوی محمد باقر پر بھی انگریزوں کے جاسوس ہونے کا الزام عاید کیا ہے۔ ڈیل رمپل کے مطابق مولوی محمد باقر نے ایک خط میں انگریزوں کو یہ اطلاع دی تھی کہ انھوں نے بہادر شاہ کو مشورہ دیا تھا کہ شہر کے دروازے کھول دیے جائیں اور انگریز فوج کو آزادانہ شہر میں داخل ہونے دیا جائے۔ بہادر شاہ نے اس مشورے کو قبول کر لیا تھا لیکن حکیم احسن اللہ خاں نے اس پر عمل نہیں ہونے دیا کیوں کہ وہ سنی مسلمان ہیں اور میں شیعہ ہوں۔ خدا معلوم کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ اس کا فیصلہ مورخوں اور محققوں کا کام ہے۔ صرف یہ بات صحیح ہے کہ جاسوسی سے مولوی محمد باقر کا کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور شاہ پرستی نے انھیں برباد کر دیا۔

ادھر انگریز دلّی میں داخل ہوئے اور ادھر قتل عام شروع ہو گیا۔ سارے معروف انگریز دشمن مارے گئے۔ مولوی محمد باقر بھی انگریزی فوج کا نشانہ بن گئے۔ سچ یہ ہے کہ آزادی وطن کی راہ میں شہید ہو گئے۔

مولوی رجب علی مولوی محمد باقر کو بچا نہیں سکے۔ وہ انگریزوں میں بہت بااثر تھے لیکن جوش انتقام کے سامنے اثر، سعی، سفارش، کچھ کام نہیں آتا۔ اس گیرودار میں مولوی رجب علی نے بہتوں کی مدد کی لیکن وہ مولوی محمد باقر کی دست گیری نہ کر سکے۔ آزاد پر جو کچھ گزری ہوگی اس کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی گرہ تھی۔ سائبان سر سے اٹھ گیا۔ بے سہارا ہو گئے۔ مرنا برحق، مرنا سب کو ہے۔ مگر ایسی موت۔ خدا دشمن کو بھی ایسی موت نہ دے۔

ادھر تو یہ سانحہ۔ ادھر فتح یاب لشکر کے سپاہی میاں محمد حسین کی حویلی میں در آئے۔ بندوقیں چھتیالیں۔ ''نکلو جلدی نکلو ورنہ گولی مار دی جائے گی۔'' نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ جائیں تو کہاں جائیں۔ سجے سجائے مکان کے در و دیوار پر حسرت سے نظر ڈالی۔ کیا اٹھائیں، کیا چھوڑیں۔ ادھر فوجیوں کی للکار، ادھر اضطرار، سامنے استاد کی غزلوں کا جنگ رکھا تھا۔ وہی اٹھا کر بغل میں مارا۔ خیال آیا کہ محمد حسین زندگی ہے تو سب کچھ مل جائے گا مگر استاد کہاں سے زندہ ہوں گے جو اپنے کلام کو مرتب کریں۔ بائیس نیم جانوں، استاد کے کلام کے جنگ اور اللہ کا نام ساتھ لے کر حویلی سے نکل کھڑے ہوئے۔

سارے شہر میں قیامت برپا تھی۔ تلے تیس اوپر بیس مچی ہوئی تھی۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں تھا۔ سب بھاگ رہے تھے۔ امیر امرا جنھیں محافظ میسر تھے، اپنے اپنے ٹھکانوں میں بیٹھے جل تو جلال تو کا وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ غریب غربا لوٹ مار کے ڈر سے جان بچا کر سر ہتھیلی پر رکھے مختلف سمتوں میں رواں دواں تھے۔ میاں محمد حسین بھی اپنے قافلے کے ساتھ برف خانے کے قریب ایک جگہ بیٹھ گئے۔ پتھر پر چٹنی پسی۔ پتھروں کے چولھے پر کچی پکی روٹیاں تیار ہوئیں۔ جیسے تیسے حلق سے اتار لی گئیں۔

یہ قافلہ یہاں دم بھی نہ لینے پایا تھا کہ توپ کا ایک گولہ بالکل پاس آ کر گرا۔ بڑا زوردار دھماکہ ہوا۔ عورتیں حواس باختہ ہو کر چیخنے لگیں۔ میاں محمد حسین کی چھوٹی بچی کو سکتہ سا ہو گیا۔ ہاتھوں میں آ گئی۔ اسی دھماکے کی نذر ہو گئی۔ یہ بھی ذہنی گرہوں میں ایک اور اضافہ تھا۔

مولوی رجب علی، مولوی باقر اور ان کی حویلی کو تو نہیں بچا سکے لیکن انھوں نے ایک معتبر آدمی کے ذریعے میاں محمد حسین کو پیغام بھجوایا کہ ایک سکھ فوجی افسر کے یہاں پناہ کی خاطر چلے جاؤ۔ قاصد نے انھیں اور ان کے کنبے کو سکھ فوجی افسر کے یہاں پہنچا بھی دیا۔ وہاں ایک اصطبل میں سر چھپانے کی جگہ مل گئی۔ پھر مولوی رجب علی نے اطلاع بھجوائی کہ اہل و عیال کو سونی پت روانہ کر دو۔ تمھارے منشی کا گھر وہیں ہے، وہاں سب حفاظت اور اطمینان سے رہیں گے۔ سونی پت دلّی اور پانی پت کے درمیان ایک قصبہ ہے۔ محمد حسین کا کنبہ اُفتاں خیزاں سونی پت روانہ ہو گیا۔ خود ان کے لیے مولوی رجب علی نے یہ پیغام بھجوایا کہ تم بھی دلّی سے کوچ کرو۔ تمھاری گرفتاری کی بھی تجویز ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وارنٹ نکل جائے۔ مناسب یہ ہے کہ تم سیدھے لکھنؤ چلے جاؤ۔ میرے دونوں بیٹے وہیں موجود ہیں۔ وہ تمھاری نگہداشت کریں گے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ محمد حسین آزاد نے لکھنؤ کی راہ لی۔ دلّی چھوٹ گئی۔ ''شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا۔''

ہول جول اور افراتفری کے اس زمانے میں دلّی اور لکھنؤ تک کا پاپیادہ سفر۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر، پتّا کھڑکا، بندہ بھڑکا۔ تن بہ تقدیر، جان ہتھیلی پر لیے، فراق و مہجوری کے مارے، اللہ کے سہارے، سفر جاری رہا۔ آزاد لکھنؤ پہنچ گئے۔ مولوی رجب علی کے بیٹوں کی پناہ میں آ گئے۔ یہ دونوں صاحب زادے لکھنؤ میں وہی خدمت انجام دے رہے تھے جو ان کے والد نے دلّی میں انجام دی تھی۔

محاذ لکھنؤ میں بھی کھلا ہوا تھا مگر دلّی والی ابتری نہیں تھی۔ مولوی رجب علی کے بیٹوں نے آزاد کی بڑی دلداری کی۔ اُن کے ادبی شغف اور شعری دلچسپی کے پیش نظر انھیں لکھنؤ کے شاعروں سے ملوایا۔ میر تقی میر کے بیٹے میر کلّو عرش کے یہاں لے گئے۔ عرش شاعر تو بس واجبی ہی واجبی سے تھے مگر بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ سارا شہر اُن کا احترام کرتا تھا۔ ان کا یہ شعر مشہور تھا:

آ سیہ کہتی ہے ہر صبح بہ آواز بلند
رزق سے بھرتا ہے رزاق دہن پتھر کے

ملاقات ہوئی تو آزاد چپکے بیٹھے رہے۔ کیا کہتے۔ کیوں کر کہتے کہ ''اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں'' عرش نے اس ملاقات میں ایک قطعہ بھی لکھ کر مولوی رجب علی کے صاحب زادے کو پیش کیا:

سیّد عالی نسب والا حسب — نام میں اسمِ امیر المومنیں
رُخ سے روشن ہے چراغِ آفتاب — حکم میں ہے آسماں زیرِ زمیں
تجھ کو بھی کونین پر ہے اختیار — جدِ اقدس مالکِ دنیا و دیں
تھے علیؑ جیسے سخی مشہورِ خلق — آپ سا بھی اہلِ ہمت اب نہیں

ہمت عالی کرے گی کامیاب
عرش ہے از بس پریشان و حزیں

سیّد حسن عسکری عرف میر کلو تخلص عرش ولد میر تقی میر ملک الشعرائے ہندوستان۔ ''امیدوار پرورش'' عرش نے ''امیدوار پرورش'' لکھ کر حسن طلب کے بجائے شاعرانہ دریوزہ گری کا اظہار کیا ہے۔

آزاد نے سودا کے پس ماندگان کی جستجو بھی کی۔ جو صاحب ملے وہ مفلوک الحال تھے، غالباً یکہ چلاتے تھے۔ مولوی رجب علی کے صاحبزادے انھیں میر انیس کے یہاں بھی لے گئے۔ یہاں بھی آزاد بجھے بجھے سے بیٹھے رہے۔ پتا نشان کیا بتاتے۔ غریب الوطن بے سہارا انسان تھے۔ گفتگو میں بادل نخواستہ شریک ہو گئے۔ ''تا مرد سخن نگفتہ باشد'' کا سبق یاد تھا اس لیے بات چیت کرنے لگے۔ باتوں میں انھوں نے اپنے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کا یہ مطلع پڑھا:

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہرے گا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا

میر انیس نے دریافت کیا، ''یہ شعر کس کا ہے؟'' آزاد نے کہا، ''استاد ذوق کا۔'' ذہنی اور روحانی خلفشار کے اس دور میں بھی آزاد نے شعر پڑھا تو استاد کا۔

لکھنؤ میں آزاد کا قیام ان کی زندگی کا بڑا بھیانک واقعہ تھا۔ بیوی، بچی اور پھوپھی کی یاد آتی تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتے۔ حویلی، پریس، اخبار دن رات نظروں میں گردش کرتے رہتے۔ باپ کی حسرت ناک موت کا خیال آتا تو دل میں ہوک سی اٹھتی۔ اپنی مجبوری، بے بسی اور بے یقینی کی کیفیت ہر وقت تڑپاتی رہتی۔ ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں گم رہتے۔ مولوی رجب علی کے صاحب زادے ان کا بڑا خیال کرتے لیکن دل تھا کہ اندر ہی اندر گھلا جا رہا تھا۔ فکروں،

پریشانیوں اور ذہنی گرہوں کی وجہ سے آزاد بہت جھک گئے تھے۔ چہرے پر افسردگی کی لہریں ابھر آئی تھیں۔ کہاں کے آزاد۔ کہاں کی آزادی ''ظاہر میں تو آزادی تھی باطن میں گرفتاری۔''

ہر طلوع ہونے والی صبح بے نور نظر آتی۔ ان جانے خوف اور تذبذب کی پیغام بر ہوتی۔ ہر آنے والی رات ''رات گزرے گی کس خرابی سے'' پڑھتی ہوئی آتی۔ آخر کار مارچ ۱۸۵۸ء میں انگریزوں نے لکھنؤ فتح کرلیا۔ آزاد کے لیے جاں کنی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوگیا۔ خاموشی سے بے یقینی، وسواس اور خوف کی سختیوں کو جھیلتے رہتے۔ استاد کا مطلع پڑھتے رہتے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اور آنسو بھرآنکھوں سے آسمان کو تکتے رہتے۔

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو لارڈ کیننگ نے الہ آباد میں دربار کیا۔ ملکہ وکٹوریا کی طرف سے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ کمپنی بہادر کی حکومت ختم ہوئی۔ ملکہ کی حکم رانی کا دور شروع ہوا۔ معافی سب کے لیے تھی۔ آزاد کو اعلان کی خبر ملی تو سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ امید بندھی کہ اب خیر سے دلّی جانا ہوگا۔ نئے سرے سے زندگی کی جدوجہد شروع ہو گی۔ سر چھپانے کا ٹھکانا ڈھونڈنا پڑے گا۔ روزگار تلاش کرنا ہوگا...... کیا گزرتی ہے کیسی پڑتی ہے۔

آزاد اسی فکر میں تھے کہ مولوی رجب علی کے صاحب زادے نے مژدہ سنایا کہ ''مبارک ہو، آپ کے روزگار کا بندوبست ہوگیا ہے۔ فی الحال دلّی جانا آپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ سکھوں کی ایک ریاست ہے، جند۔ وہاں کی راہ لیجیے اور ملازمت شروع کر دیجیے۔ ابا جان نے سارا انتظام کر دیا ہے۔ خیر سے جائیے۔ اللہ حافظ و ناصر۔''

آزاد جند جانے کے حق میں نہیں تھے۔ سکھوں کی ریاست۔ ان جانا ماحول، اجنبی فضا، ریاستی سازشیں۔ ایک اور ہجرت۔ لیکن فقیروں کو انتخاب کا حق نہیں ہوتا۔ کیا کرتے اور کیا کہتے۔ اللہ کا نام لیا۔ لکھنؤ کو خیر باد کہا، دلّی کو یاد کرتے ہوئے:

خاک دہلی سے جدا ہم کو کیا یک بارگی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار

پڑھتے ہوئے جند چلے گئے۔ فروری ۱۸۵۹ء میں محافظ دفتر فوج داری مقرر ہوگئے۔ روزگار سے لگ گئے۔

آزاد نے جند میں دس مہینے کی ملازمت کا دور صحن باغ سے دوری بلبلِ شکستہ پر کی طرح گزارا۔ دلّی تو ان کے لیے ملیامیٹ ہو چکی تھی۔ لکھنؤ غنیمت تھا۔ ہم صورت دو چار نظر آ جاتے تھے۔ جند میں اجنبی چہرے اور نامہربان خلقت چاروں طرف نظر آتی۔ کرخت لہجے، درشت انداز، نامانوس طور طریقے۔ دن تو کسی نہ کسی طرح دفتر میں گزر جاتا

لیکن رات آتی تو اپنے ساتھ یادوں کی برات لے کر آتی ۔ یہ اطلاع مل گئی تھی کہ گھر والے خیریت سے ہیں۔ سلامت ہیں لیکن اوسوں سے پیاس کہاں بجھتی ہے۔ اطلاع نے دل میں اور آگ لگادی۔ کاش ہم سب ساتھ ہوتے۔ ایک دوسرے کی غم خواری کرتے۔ وقت سیدھے سبھاؤ گزر جاتا۔ فضا اور ماحول کی اجنبیت اور بے مہری نے ذہن کی گرہوں کو اور زیادہ الجھادیا۔ مولوی رجب علی پھر کام آئے۔ وہ خود تو لاہور میں گورنر کے میر منشی تھے لیکن اپنے وطن جگراؤں سے ایک اخبار مجمع البحرین بھی شایع کرتے تھے۔ انھوں نے آزاد کی پریشانی دیکھ کر انھیں جگراؤں بلالیا۔ مجمع البحرین ان کے سپرد کر دیا۔ آزاد کے اہل وعیال بھی سونی پت سے جگراؤں آ گئے۔ بچھڑے ہوؤں کا ملاپ ہو گیا مگر آزاد کے دل کی کلی نہیں کھلی۔

آزاد دلی کے طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کا شمار دلی کے رودار لوگوں میں ہوتا تھا۔ خود آزاد بھی بذات خود طبع آزاد کے حامل تھے۔ کسی کے دست نگر نہیں تھے۔ جگراؤں میں انھیں مولوی رجب علی کے ملازم کی حیثیت حاصل ہوئی۔ بڑی تکلیف دہ صورت حال تھی۔ مولوی رجب علی ان کے والد کے دوست تھے۔ اس وجہ سے بھی آزاد کو ان کی ماتحتی بہت کھلتی تھی۔ مگر کرتے کیا۔ دلی میں ان کے ذہن میں بڑے بڑے منصوبے تھے۔ یوں تعلیم عام کروں گا، تصنیف وتالیف کا قلم دان سنبھالوں گا، اردو ادب کو طرز نو سے آشنا کروں گا، انشا پردازی کے جوہر دکھاؤں گا۔ جگراؤں میں سارے منصوبوں پر اوس پڑ گئی۔ انا بھی مجروح ہوئی۔ بات بات پر سبکی کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن ان ساری ذہنی اور روحانی پریشانیوں کے باوجود آزاد نے ہمت نہیں ہاری۔ جہاں کہیں کوئی تنکا نظر آیا اسے سہارا بنا کر آگے بڑھنے کی کوشش کی۔

جگراؤں کے قریب ہی لدھیانے کا شہر تھا۔ پنجاب کے ناظم تعلیمات دورہ کرتے ہوئے وہاں آئے اور ڈاک بنگلے میں مقیم ہوئے۔ آزاد کو دورے کی اطلاع تھی۔ چنانچہ وہ لدھیانے گئے اور ناظم تعلیمات سے ملے۔ محکمے کے لیے اپنی خدمات بھی پیش کیں لیکن بات کچھ بنی نہیں۔

آزاد جند کی طرح جگراؤں سے بھی عاجز آ گئے۔ دونوں جیم ناموافق ہوئے۔ ان کے ایک بہنوئی لاہور میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں ملازم تھے۔ ان سے کہا سنا اور پھر جگراؤں کی سکونت اور کام ترک کر کے لاہور آ گئے۔ بہنوئی کی وجہ سے پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں امیدواری کرنے لگے۔

مولوی رجب علی نے اس بات کو پسند نہیں کیا لیکن وہ خاموش رہے۔ آزاد نے تین ماہ تک بلا تنخواہ امیدواری کی اور پھر بہ زمرہ منشیان ملازم ہو گئے، تیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ اللہ تعالی نے عزت وآبرو سے گزارے کا انتظام کر دیا۔

لاہور میں قدم جمتے ہی آزاد کے فروغ علم اور تصنیف وتالیف کے منصوبوں میں از سرنو جان پڑ گئی۔

لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک کتاب آئینہ صحت مرتب کی۔ اشاعت کے لیے سرکار میں پیش کی لیکن حوصلہ افزا جواب نہیں ملا۔ کتاب کا نام ہی نام رہ گیا۔ آزاد کو ایک دور اندیش اور ہوش مند انسان کی حیثیت سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ پنجاب میں فروغ علم کا ایک ایسا دور شروع ہو رہا ہے جس کی بنیاد مغربی خیالات اور مغربی علوم پر رکھی جا رہی ہے۔ پرانا محل گرتا ہے نیا محل بنتا ہے۔ وہ اس تعمیر و ترقی میں اپنی خداداد صلاحیتوں سے قومی بیداری کا فریضہ انجام دینے کے خواہش مند تھے لیکن تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔ ہوا یہ کہ ان کا تبادلہ اوور سیر کی حیثیت سے ملتان کر دیا گیا۔ افسروں نے ان کے کام اور ان کی مستعدی کو سراہا اور انھیں ترقی کے ساتھ ملتان روانہ ہونے کا حکم دے دیا مگر آزاد ملتان جانے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی علمی اور پیشہ ورانہ جدوجہد کا آغاز لاہور میں کیا تھا۔ دلّی کے بعد اس نئے ابھرتے ہوئے علم و ادب کے مرکز کو اپنا امید گاہ بنایا تھا۔ اسے چھوڑ کر وہ ایک اور ہجرت کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔

اب کیا ہو۔ ایک عزیز سیالکوٹ میں تھے، ان سے جا کر ملے۔ کشمیر کی سیر کی۔ پھر لاہور واپس آ کر پرانی اور کمیاب کتابوں کا کاروبار شروع کیا۔ لشتم پشتم گزر ہوتی رہی۔ مولوی رجب علی اس آڑے وقت میں پھر کام آئے۔ وہ گورنر پنجاب کے میر منشی تھے اور انھیں ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو دفتر سے جاری ہونے والے فرامین کی نقلیں تیار کرے۔ آدمی درکار تھا، پڑھا لکھا، ہوشیار اور معتبر۔ آزاد میں یہ ساری خوبیاں تھیں۔ چنانچہ وہ فرامین کی نقلیں تیار کرتے رہے۔ یہ بھی زندگی کا ایک حوصلہ شکن تجربہ تھا۔ جس کی تحریر آنے والے دور میں سرمہ اہل نظر بننے والی تھی، وہ نقل مطابق اصل کے خیال میں مبتلا رہا۔ مجبوری اسی کا نام ہے۔ تقریباً سال بھر اسی نقلی کام نے آزاد کو اپنی گرفت میں دبائے رکھا۔

تقدیر پھر یاور ہوئی اور اب انھیں محکمہ تعلیم میں اہلمدِ تنخواہ کی ملازمت مل گئی۔ یہ محکمہ تعلیم پنجاب کے ملازموں کی اہلمدیِ تنخواہ نہیں تھی۔ ولی سے لے کر مرزا دبیر تک کی تنخواہ سخن کی فرد مرتب کرنے کا ابتدائیہ تھی۔ دل نے آواز دی ''اب تم صحیح ٹھکانے پر پہنچ گئے ہو۔ اپنی صلاحیت کے جوہر دکھاؤ۔ قلم کی آبیاری سے گلشن ادب میں نئے نئے پھول کھلاؤ۔ آگے بڑھو۔ کام کرو۔''

آزاد نے دل کی آواز کا پورا احترام کیا۔ فروغ تعلیم کے تمام منصوبوں میں سرگرمی سے کام کرنے لگے۔ نمائش پنجاب کی فہرست تیار کر دی۔ جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک اور کتاب نصیحت کا کرن پھول تصنیف کی۔ اگرچہ اشاعت کی نوبت بہت بعد میں آئی لیکن قلم رواں دواں ہو گیا۔

لاہور میں ''انجمن اشاعت علوم مفیدہ'' کا قیام عمل میں آیا تو آزاد دل و جان سے اس میں شریک ہو گئے۔ جلسوں میں جا رہے ہیں، نئے خیالات اور تجویزیں پیش کر رہے ہیں، لیکچر دے رہے ہیں، مضمون پڑھ رہے ہیں،

انجمن کے صدر اور گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر کو اردو پڑھا رہے ہیں۔ انجمن کے جلسوں میں ان کے لیکچر بہت مقبول ہوئے۔ معلومات کا وفور، زبان، لہجے اور انداز بیان کا سرور، سننے والے مسحور ہو جاتے۔ نجانے کیا جھگڑا پڑا کہ ملازمت جاتی رہی مگر انجمن نے اپنے یہاں لیکچر دینے کے لیے ملازمت کی پیش کش کی۔ آزاد یہ پیش کش قبول کر لیتے لیکن کچھ اور ہی گل کھلا۔ افغانستان اور وسط ایشیا اس زمانے میں بھی انگریزوں کے لیے دردِ سر تھے۔ روس کا ہوا بھی تھا۔ حکومت نے ایک جائزہ مشن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ مشن کے اراکین عام آدمیوں کی طرح جائیں، عام آدمیوں میں گھل مل جائیں، فضا اور ماحول کا جائزہ لیں، روسی اثرات اور غلبے کی روداد مرتب کریں، امیروں کی رفتار گفتار اور سیاسی جھکاؤ پر نظر ڈالیں۔ غرض کہ ایک تفصیلی جائزہ لیں اور واپس آ کر اطلاع دیں۔ ایک مشن مرتب ہوا۔ آزاد کو مشن کی رکنیت پیش کی گئی۔ انھوں نے قبول کر لی۔ وجہ یہ تھی کہ انھیں اپنی وفاداریِ سرکار کا ثبوت بھی فراہم کرنا تھا۔ وہ تو معافی یافتہ معتوبین میں تھے اس لیے ضروری تھا کہ کوئی ایسا کام کر جائیں جس سے ان کی مشکوک وفاداری کا الزام ختم ہو۔ جائزہ مشن میں شمولیت اس الزام کو ختم کرنے کا بہترین موقع تھا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ آزاد کو سیاحت اور فارسی زبان کی محبت، دونوں نے اکسایا کہ موقع بہترین ہے۔ توران کے برفوں کی سفیدی اور جیحوں سیحوں کی وادیاں دیکھ آؤ۔ چنانچہ آزاد تیار ہو گئے۔ ''اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے۔''

سفر کی مدت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اس لیے مناسب یہ سمجھا کہ بال بچوں کو دلی میں اپنی سسرال میں چھوڑ جائیں۔ جائزہ مشن بصیغۂ راز تھا مگر واہ رے دلی کے خبر تراش اور افواہ ساز۔ ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی کہ مولوی محمد حسین آزاد انگریزوں کے ایما پر فیروز شاہ کو زہر دینے ترکستان جا رہے ہیں۔ فیروز شاہ، بہادر شاہ کے بیٹے تھے جو ۱۸۵۷ء میں اپنی تلوار کے جوہر دکھا چکے تھے اور انگریزوں کے ہاتھ نہیں آئے تھے۔ کسی نہ کسی طرح بچ بچا کر ترکستان پہنچ گئے تھے۔ انگریز انھیں اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ یہ اس زمانے کی ابلاغیات کا شاہ کار تھا۔ باتوں کے طوطے مینا اسی طرح بنتے ہیں۔

آزاد نے اپنے اس سفر میں کابل کی سیر کی۔ بخارا اور سمرقند گئے۔ (بخیال ہندوش) بدخشاں گئے۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کے قدیم مرکز دیکھے۔ مدرسے، کارواں سرائیں، عالم، فاضل دیکھے، بازاروں کی گہما گہمی دیکھی، داستانیں سنیں، قدامت کے آثار دیکھے، معاشرتی پستی اور فکری پس ماندگی دیکھی، سیاسی انتشار، افتراق اور روس کی بالادستی محسوس کی، تورانی فارسی کا محاورہ سنا اور سیکھا۔ طالب علم کا روپ دھار کر گئے تھے، علمی تحقیق اور جستجو میں لگے رہے۔ صحیح سلامت گئے، صحیح سلامت آئے۔

واپس آ کر رپورٹ دینے کلکتے گئے۔ کلکتہ راجدھانی تھا۔ انگریز حاکموں کا شہر تھا۔ آزاد آخری سانسیں لیتی ہوئی جاں بلب تہذیب، ثقافت اور لرزہ براندام ولایت بالا کو دیکھ آئے تھے۔ علم سے بے بہرہ، حالات حاضرہ سے

بے خبر، روایت اور قدامت میں ڈوبے ہوئے عوام کی ذہنی پس ماندگی پر افسوس کرتے اور دل میں ایک نئی کسک محسوس کرتے ہوئے آئے تھے۔ کلکتہ دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بلند بالا کوہساروں کی رفعت دیکھ آئے تھے۔ سمندر کی وسعت دیکھی تو کائنات کی بے کرانی کا احساس ہوا۔ بھاپ سے چلنے والے جہاز دیکھے تو علم اور ذہن انسانی کے عمل اور افادی قوت کے برمحل صرف نے متاثر کیا۔ جہاز میں بیٹھے تو آب رواں پر سجے ہوئے گھر کا سماں نظر آیا۔ سڑکوں پر گیس کی روشنی دیکھی تو راہ میں جھلملاتے قمقموں کی زنجیر کا عالم نظر آیا۔ تنظیم اور ترتیب دیکھی۔ کالج میں وہ انگریز اساتذہ کو دیکھ چکے تھے۔ پرنسپل ٹیلر ان کے گھر آتا جاتا تھا۔ لاہور میں بھی انھیں انگریزوں سے واسطہ پڑا تھا۔ بعضوں کو اردو بھی پڑھائی تھی۔ ڈاکٹر لائٹنر سے بھی یاد اللہ تھی مگر کلکتے میں شوکت انگلشیہ اپنے عروج پر نظر آئی۔ آزاد نے دربار شاہی تو نہیں دیکھا تھا، چرچے ضرور سنے تھے۔ یہاں نائب السلطنت کا موثر لیکن سادہ جاہ وحشم دیکھا۔ زندگی کے نئے رنگ ڈھنگ، فکر کا نیا آہنگ، علوم کی لہر بہر، سرکاری امور کی بجا آوری میں ذمہ دارانہ احساس کا مشاہدہ کیا۔ آراستہ اور مرتب کتب خانے دیکھے۔ کرائے کی گاڑیوں میں کرائے کا نرخ نامہ آویزاں دیکھا۔ ہر قدم پر نت نئے کرشمے دیکھے۔ سب کچھ دیکھا۔ چشم حیرت سے دیکھا۔ وسط ایشیا کی سیاحت کے دل دوز مناظر ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ یہاں اور وہاں کا تقابل کرتے رہے۔ دل ہی دل میں شرمندہ ہوتے رہے۔ اپنا گھٹنا کھولنا آپ ہی لاجوں مرنا۔

کبھی وطن اور اہل وطن کی پس ماندگی کا خیال آتا۔ جہالت، ہٹ دھرمی، ذہنی انتشار، بے بضاعتی، نئے علوم اور نئی فکر سے بے خبری۔ احوال عالم سے ناشناسائی، ماضی کے فخر میں گرفتار، لکیر کے فقیر، جیسے جیسے سوچتے، جتنا جتنا سوچتے، لڑکپن کا عزم تازہ ہو جاتا۔ ''میں اہل وطن کو نئے نئے خیالات سے آگاہ کروں گا۔ ادب اور شعر کے ذریعے سے ذہنی انقلاب برپا کروں گا۔ انگریزی علم وحکمت کے خزانوں کے قفل کھولوں گا۔ خزانوں کو قوم کے سپرد کر دوں گا۔'' یہ سوچتے تو وقتی طور پر ذہن کی بہت سی نفسیاتی گرہیں کھلتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ کلکتے کے سفر اور حال احوال نے ان کے ذہن میں عرفان حقائق کے نئے چراغ روشن کر دیے۔

آزاد کے کلکتے جانے سے اڑتیس برس پہلے عندلیب گلشن ناآفریدہ مرزا اسد اللہ خاں غالب بھی کلکتے گئے تھے۔ وہ ۱۸۲۸ء میں اکتیس برس کی عمر میں کلکتے پہنچے تھے۔ مرزا محمد حسین آزاد کلکتے پہنچے تو چھتیس برس کے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں اپنی عمر کے عشرہ چہارم میں تھے۔ غالب نے کلکتے میں تہذیب مغرب کے رنگ ڈھنگ اور فکر و آہنگ کو دیکھا تو ایک تیر کلیجے میں ترازو ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ (اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے) مشاہدہ کلکتہ کے اثرات ان کی تخلیقی انفرادیت اور فکری عظمت میں نمایاں ہیں۔ آزاد نے دانش وفکر فرنگ سے جو کچھ حاصل کیا اسے اپنی ادبی کاوشوں کا سرنامہ بنا کر اہل ملک کو انداز نوی سے آشنا کیا۔ دونوں نے قدامت میں جدت کا پیوند لگا کر طرح نو کی بنیادیں استوار کیں۔

کلکتے سے واپسی کے بعد پھر وہی فکر معاش۔ انجمن پنجاب نے اپنا سیکریٹری مقرر کرلیا۔ انجمن کے جلسوں میں متعدد مضمون پڑھے۔ ان مضامین کا لب لباب، اہل وطن کی ترقی کی کوششیں اور علوم جدیدہ کی معرفت تھی۔ ان میں سے بعض مضمون ان کی آنے والی تصانیف کا پیش خیمہ تھے۔ حکومت پنجاب کے حکم پر طلبہ کے لیے تاریخ کی کتاب مرتب کرنے میں مصروف ہوئے۔ سرکاری اخبار کے نائب مدیر مقرر ہو گئے۔ بڑی مصروفیت اور کارکردگی کے نمایاں اظہار کا زمانہ تھا۔ اردو فارسی کی ریڈریں مرتب کیں۔ اردو کی ریڈروں نے اردو کی نصابی کتابوں میں لازوال حیثیت حاصل کرلی۔ پھر قصص ہند کا دوسرا حصہ تصنیف کیا۔ برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت کے منتخب واقعات، تخت طاؤس اور جشن ماہتابی کا نقشہ اس طرح کھینچا کہ پڑھنے والوں نے تخت اور جشن دونوں کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔ فن کارانہ معجز بیانی اسی کو کہتے ہیں۔

نصابی کتابوں میں تخلیقی اظہار کی ندرت، نثر کی شیرینی اور لطافت - امر واقعہ کے بیان میں صداقت اور متانت دھوم ہوگئی۔ بچوں کے کھلونے بھی ایسے دل کش اور نادر ہو سکتے ہیں۔ محکمہ تعلیم میں آزاد کی دھاک بیٹھ گئی۔ ڈائریکٹر سے لے کر ڈاکٹر لائٹنر تک سبھی معترف ہو گئے۔

محنت شاقہ اور دیدہ ریزی کا پھل بھی ملا۔ آزاد، شمالی ہند کے بہترین تعلیمی ادارے گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ مولوی علمدار حسین، کالج میں عربی کے پروفیسر تھے۔ وہ بے چارے بیمار ہو گئے۔ چھٹی لے لی۔ تین مہینے کی چھٹی تھی۔ آزاد کا تقرر پہلے پہل تین ہی مہینے کے لیے ہوا۔ مولوی علمدار حسین بیماری سے جانبر نہ ہو سکے۔ آزاد مستقل پروفیسر ہو گئے۔ روزگار کی بے یقینی کا دور ختم ہوگیا۔ عز و وقار میں اضافہ ہوا۔ آزاد، پروفیسر آزاد ہو گئے۔ سرکاری اخبار کی ادارت اضافی ذمہ داری تھی۔ وہ کام بھی ہوتا رہا۔

کچھ دن بعد ڈاکٹر لائٹنر بھی ولایت سے لوٹ آئے۔ دونوں میں اور زیادہ ربط ضبط ہوگیا۔ لائٹنر آزاد کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اردو انھیں سے پڑھی تھی۔ سارے شہر میں مشہور ہوگیا کہ آزاد نے لائٹنر کو مٹھی میں کرلیا ہے۔ ستارہ عروج پر ہے۔ کالج کے سیاہ سفید کے مختار بنے بیٹھے ہیں۔ ڈائریکٹر بھی ان سے خوش، پرنسپل بھی راضی۔ حاسدوں نے کہا، آزاد کی پانچوں گھی میں ہیں۔ شہر بھر میں دھوم ہے کہ پرنسپل کو شیشے میں اتار لیا ہے۔ لیاقت، صلاحیت اور محنت پر کسی نے نظر نہیں کی۔ دلوں کا بخار نکالنے کے لیے پیچھے پڑ گئے۔ ''ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔''

ڈاکٹر لائٹنر نے ایک کتاب مرتب کی سنین اسلام۔ اس میں مسلمانوں اور ان کے ادب کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ تاریخ عالم میں ان کا مقام متعین کیا گیا ہے۔ یہ کام لائٹنر جیسا عالم ہی انجام دے سکتا تھا۔ انگریزی کتاب کو اردو میں قلم بند کرنے کا کام آزاد کے سپرد ہوا۔ ان کی انشا پردازی کا شہرہ سارے ملک میں تھا۔

آزاد نے بھی جان لڑا دی۔ اپنی انشا پردازی کا سارا زور صرف کر دیا۔ کتاب شائع ہوئی تو بڑی واہ واہ

ہوئی۔ دوسری جلد کی تیاری شروع ہوئی۔ لائٹنر نے سارا مواد مرتب کیا۔ آزاد کے حوالے کر دیا۔ آزاد اہل وعیال کے جنجال میں گرفتار۔ کالج میں علوم شرقیہ کی تدریس کے ذمہ دار۔ پھر اپنی دن رات کی نوشت وخواند کا طومار، اوپر سے سنین الاسلام کی بیگار، کام شروع کیا مگر آہستہ آہستہ۔ لائٹنر ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے عادی۔ ہوں کریں اور ہاں ہو جائے۔ مزاج کے اعتبار سے اردو غزل کے محبوب تھے۔ بارہ ابھرن، سولہ سنگھار اور مست مئے پندار۔ قتل عاشق پر ہمہ تن تیار۔ ''قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا'' ہیکڑی ایسی کہ رخصت لے کر ولایت گئے۔ واپس آئے تو قائم مقامی کرنے والے پروفیسر کو برخاست کرا دیا۔ ان کا بس چلتا تو سنین اسلام کے کاغذ بھیجتے ہی چھپی ہوئی کتاب کا مطالبہ کر دیتے۔ ایک طرف سے کھینچ، دوسری طرف سے ڈھیل۔ یاروں نے اس کش مکش سے پورا فائدہ اٹھایا۔

پر کا کوا بنانے اور آسمان میں تھگلی لگانے والے غضب ہوتے ہیں۔ دو دلوں میں اتحاد واتفاق دیکھتے ہیں تو جی جان سے کوشش کرتے ہیں کہ آپس میں بگاڑ ہو جائے۔ دنیا تماشا دیکھے۔ ان کا الو سیدھا ہو۔ سخن سازوں اور لگائی بجھائی کرنے والوں نے نجانے کیا پٹی پڑھائی کہ اچھے دل برے ہو گئے۔ لائٹنر آزاد کے نام سے بیزار ہو گیا۔ اسکولوں کے ایک ڈپٹی مولوی کریم الدین کو سارا مواد حوالے کیا۔ انھوں نے حکم کی تعمیل میں دن رات ایک کر دیا۔ دوسرا حصہ چھپ گیا۔ آزاد معتوب ہو گئے۔ ایسے معتوب کہ چھٹیوں میں لاہور سے باہر جانے پر بھی پابندی عائد ہو گئی۔

ایک دن دلّی کے ایک پرانے واقف کار آزاد سے ملنے آئے۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے۔ گزرے دن یاد کیے۔ ان صاحب نے کہا، ''بھائی آزاد! میں اس غرض سے تمھارے پاس آیا ہوں کہ تمھیں دلّی لے جاؤں۔ ایک بڑے مشاعرے کا ڈول ڈالا ہے۔ تمھاری شرکت ہو جائے گی تو مشاعرہ چمک جائے گا۔ میرے ساتھ چلے چلو۔'' آزاد نے عذر معذرت کی۔ اپنی مصروفیت کا اظہار کیا۔ بات بنانا چاہی مگر بنی نہیں۔ جب پانی سر سے گزر گیا اور وہ صاحب روٹھ کر جانے لگے تو آزاد نے روہانسی آواز میں کہا، ''بھائی۔ کیوں کر کہوں۔ لاہور سے باہر جانے کا حکم نہیں ہے۔ پرنسپل کی قید میں ہوں'' ان صاحب نے کہا، ''ہاں سنا تو میں نے بھی تھا مگر اب تصدیق ہو گئی۔ اچھا۔ خدا حافظ و ناصر۔''

ڈاکٹر لائٹنر عالم فاضل تھے۔ لسانیات اور علوم اسلامی پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہ پچاس زبانیں جانتے ہیں۔ لندن کے کنگز کالج میں قانون اسلامی کے استاد رہ چکے تھے۔ مشرق کی بیداری کے خواہاں لیکن کانوں کے کچے اور:

نہ برق میں یہ کرشمہ نہ شعلے میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

لپکتا ہوا شعلہ اور چلتی ہوئی تلوار تھے۔ شعلہ لپکتا ہے تو اپنے پرائے کو نہیں دیکھتا۔ تلوار سہراؤ کرتی ہے تو کیا اپنا کیا بیگانہ، سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے۔ لائنر آزاد سے بگڑے تو ایسے بگڑے کہ ہر موقعے پر زک دینے کی پوری کوشش کی۔ کوئی کسر چھوڑی نہیں لیکن جس کو اللہ رکھے اس کو کون چکھے۔ آزاد بھی پورے ادب لحاظ کے ساتھ ترکی بہ ترکی جواب دیتے رہے۔

''کرتا تھا جواں مرد گزارا خوش و ناخوش۔'' آزاد بھی خوش و ناخوش گزارا کرتے رہے۔ ذہن میں گرہیں اور گتھیاں پہلے سے موجود تھیں، کچھ اور کا اضافہ ہو گیا۔ آزاد سچ مچ مختل خیال ہو گئے لیکن انھوں نے ہار نہیں مانی۔ ذہن کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ ادب و شعر کو طرحِ نو سے آشنا کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ ''ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی ملتی ہے۔'' قدرت نے ایک موقع فراہم کر دیا۔

اسکولوں کے اردو نصاب کی کتابیں گورنر پنجاب کے ملاحظے کے لیے پیش ہوئیں۔ گورنر نے خوشنودی کا رسمی اظہار نہیں کیا۔ یہ لکھا کہ ان کتابوں میں حصہ نظم برائے نام اور نامناسب ہے۔ انگریزی نظموں کی طرح بچوں کی نظمیں لکھوائی جائیں اور نصاب کی کتابوں میں شامل کی جائیں۔

کرنیل ہالرائڈ ناظم تعلیمات کو اپنی ترقی کے لیے اس ہدایت میں بندھی بندھائی، کسی کسائی مضبوط سیڑھی واضح طور پر نظر آئی۔ وہ آزاد کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ انھیں بلایا۔ صلاح مشورے ہوئے۔ آزاد کو ناظم صاحب کی تجویز میں اردو شاعری کے روشن مستقبل کی جھلک نظر آئی۔ زور و شور سے تیاری ہوئی اور پھر بڑی دھوم دھام سے ایک جلسہ ہوا جس میں لاہور کے سارے نامی سخن گو شریک ہوئے۔ انگریز افسروں نے بھی شرکت کی۔ ناظم نے انگریزی میں تقریر کی اور یہ تجویز پیش کی کہ ہر مہینے ایک مشاعرہ منعقد ہو۔ شعرا مقررہ موضوع پر کلام پیش کریں۔ سال کے آخر میں بہتر کلام پیش کرنے والے شعرا کو انعام و اکرام سے بھی نوازا جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر یہ تجویز کامیاب ہو گئی تو ۱۸۷۴ کا سال ملکی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

آزاد کی تقریر بڑی زبردست تھی۔ فکر انگیز تھی۔ ''طرحِ نو افگنیم کہ ماجدت پسند افتادہ ایم'' کا نعرہ مستانہ بھی تھی۔ انھوں نے بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ ''اے اہلِ وطن تمھاری شاعری چند محدود احاطوں میں نہیں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرانے کی کوشش کرو۔ نہیں تو ایک زمانہ تمھاری اولاد ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہو گی۔'' پھر آزاد نے اپنی تجویز کی تائید اور اپنے موقف کی وضاحت کے لیے ایک مثنوی شب قدر کے عنوان سے پڑھی۔ اس مثنوی میں رات کی آمد اور کیفیات کو دل کش شعری انداز میں پیش کیا گیا تھا۔

ارباب حکومت جلسے کی کامیابی اور مثبت اثرات سے مطمئن ہو گئے۔ مشاعرے شروع ہو گئے۔ نظمیں لکھی

جانے لگیں۔ ادھر تو یہ ہوا ادھر دوسری طرف رنگ قدیم کے پرستاروں نے وہ ہنگامہ کیا کہ جیسے بارود میں آگ لگ گئی ہو۔ ''ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔'' معلوم ہوا کہ جیسے ایوان شعر میں زلزلہ آ گیا ہے۔ لاہور کے پنجابی اخبار نے ہر مشاعرے کی دھجیاں اڑائیں۔ اعتراض، تمسخر، طنز، تضحیک۔ آزاد کی شخصیت میں کیڑے ڈالنا، ان کے علم و فضل کا خاکہ اڑانا، شعری رجحانات کو بدلنے کی کوشش کو اردو شاعری کی تباہی اور بربادی سے تعبیر کرنا۔ کیا کچھ نہیں ہوا۔ آزاد خاموش رہے۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لفظیات کی تازگی اور شعری پیکروں کی ندرت سے انداز قدیم کے حبس کو دور کرنے کی کوشش میں مصروف رہے اور کامیاب بھی ہوئے۔ ملک کے روشن خیال بزرگوں نے آزاد کی مساعی جمیلہ کی داد بھی دی۔ سر سید احمد خان نے نیچر کی شاعری پر بڑا اچھا مضمون لکھا اور آزاد کی مثنوی خوابِ امن کی تحسین بھی کی۔ سوسنار کی ایک لوہار کی، اسی کو کہتے ہیں۔ یہ بڑا مسکت جواب تھا۔

خواجہ الطاف حسین حالی بھی ان دنوں لاہور میں تھے۔ چار مشاعروں میں وہ بھی شریک ہوئے۔ بعد ازاں ان کا تبادلہ دلی ہو گیا۔ پر کا کوا بنانے والے اس موقعے پر بھی نہیں چوکے۔ مشہور کر دیا کہ مولانا حالی کی نظمیں بہت مقبول ہوئی ہیں۔ اس مقبولیت سے آزاد کے سینے پر سانپ لوٹ گیا ہے۔ پنجابی اخبار کے مالک و مدیر حالی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار میں حالی کی مدح اور آزاد کی قدح کا حق ادا کر دیا۔ یاروں نے اپنی سی بہت کی لیکن آزاد اور حالی میں بگاڑ نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ ''پا کباز ادبی مورخوں'' کے لیے آزاد کو مطعون کرنے کا حیلہ ہاتھ آ گیا۔ تاریخ ادب کے اوراق پر آزاد دشمنی کی ایک گہری شکن پڑ گئی۔ ''آزاد حاسد ہیں۔ کم بیں ہیں۔ دوسروں کے کمالات کو دیکھ نہیں سکتے اور نجانے کیا کیا۔'' وقت نے ساری شکنیں مٹا دیں:

سب شور ما و من کو لیے سر میں مر گئے
یاروں کو اس افسانے نے آخر سُلا دیا

یاران فسانہ خواں سو گئے لیکن حالی کو حیات جاوید مل گئی۔ آزاد کو آب حیات حاصل ہو گیا۔ تلخیوں اور بدمزگیوں کے کاغذوں کے پرزے ہوا میں اڑتے اڑتے غبار پس غبار بن گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی کرم اور بھی ہوا۔ مشاعروں کے اس دور میں آزاد کے کرم فرما ڈاکٹر لائٹنر رخصت پر ولایت گئے ہوئے تھے۔ اگر موجود ہوتے تو نجانے کیا گل کھلاتے اور ان کی کرم فرمائی سے کیا کیا شگوفے پھوٹتے۔

آزاد اردو شاعری میں طرز نو کی داغ بیل ڈالنے کے بعد تدریس اور تصنیف کے کاموں میں منہمک ہو گئے۔ آب حیات اور دربار اکبری کے کچھ اجزا انجمن مفید عام قصور کے رسالے میں شایع کیے۔ ذاتی دکھوں میں مبتلا رہے۔ وہ پھوپی جنھوں نے ماں بن کر پالا تھا، اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ پھوپی کیا گزریں، ماں کی مامتا، دادا کا پیار، باپ کی شفقت اور استاد کی عنایت سب کا خاتمہ ہو گیا۔ گھر ویران ہو گیا۔ سر پر کوئی سہارا نہ رہا، دو بچے بھی گزر

گئے۔

لائٹنر کی کرم فرمائیاں جاری رہیں۔ آزاد جو بھی درخواست دیتے، لائٹنر اسے مسترد کردیتے۔ بال کی کھال نکالتے۔ گڑے مردے اکھاڑتے۔ آزاد کو نااہل ثابت کرنے کی تگ ودو کرتے رہتے۔ ادھر آزاد کا یہ حال کہ ایک سر ہزار سودے۔ سرکاری اعتراضوں کے جواب لکھتے۔ حریفوں کے وار سے بچتے۔ اپنے لکھنے پڑھنے میں لگے رہتے۔ دنیا راتوں کو چین کی نیند سوتی وہ کاغذوں پر آنکھوں کا تیل ٹپکاتے، حرفوں کو اجالتے، مٹے ہوئے نقوش کو زندہ کرتے۔ مکان میں آگ لگ گئی۔ ان کی بہو کی انا بے چاری جل مری۔ صدمے پر صدمہ اٹھاتے رہے۔ نفسیاتی گتھیاں الجھتی گئیں۔ پراگندہ روزی تو نہیں تھے، پراگندہ دل ضرور تھے۔ لکھنے پڑھنے کا سہارا نہ ہوتا تو نجانے کیا ہوتا مگر لکھنے پڑھنے کا سہارا بھی کب تک؟ بہرحال زندگی گزرتی رہی۔ آب حیات اور نیرنگ خیال کی تکمیل ہوگئی۔

آزاد نے لڑکپن سے جو ادبی اور شعری روایتیں سنی تھیں، استاد ذوق سے پیش روؤں اور ہم عصروں کے جو تذکرے اور چرچے کانوں تک پہنچے تھے، دلی اور لکھنؤ میں اساتذۂ فن کی خدمت میں حاضر ہوکر جو کچھ حاصل کیا تھا، اردو زبان اور زبانوں کی تشکیل اور تعمیر کا جو احوال مختلف علما سے معلوم ہوا تھا، شعرائے قدیم کے تذکروں سے جو کچھ اخذ کیا تھا، وہ اس سب کو ذہن میں منضبط کرتے آئے تھے۔ خدا خدا کرکے اس انضباط نے اردو زبان وشاعری کی ایک مبسوط تاریخ کی شکل اختیار کرلی۔ آب حیات نام تجویز ہوا اور یہ حیات بخش مرقع ادب اہلِ ذوق کے سامنے آ گیا۔

آب حیات کے ساتھ ساتھ ایک اور مجموعہ بھی منظر عام پر آیا۔ نام تھا نیرنگ خیال۔ انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے چراغ شوق روشن ہوا تھا۔ تمثیلی مضامین پر مشتمل تھا۔ **تلک الامثال نضربها لعلهم یتفکرون**۔ تمثیل کے شاعرانہ پیرائے اور بیان میں زندگی کے حقائق کے انکشاف وادراک کی ادبی کاوش۔ بعض مضامین رسایل میں بھی شایع ہوچکے تھے۔ اب انھیں ایک مجموعے کا روپ دیا گیا۔ آب حیات کے ساتھ شایع کردیا گیا۔

حسب دستور چشم بدبیں نے آب حیات کی تاریخی حیثیت، ثقافتی اہمیت اور جمالیاتی لطافت سے اغماض برتا۔ ''ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔'' آزاد اس کے عادی ہوچکے تھے۔ وہ حسب دستور چپکے رہے۔ نیرنگ خیال پر سرقے کا الزام عاید ہوا کہ آزاد نے انگریزی انشا پردازی کے خیالات سے اخذ واستفادہ کیا ہے، حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی، چنانچہ وہ سارق ہیں۔ مگر ''کم نظر بیتابی جانم ندید۔'' اعتراض کرنے والوں نے یہ نہیں دیکھا کہ نیرنگ خیال کے انگریزی سرورق پر انگریز مصنفوں سے اخذ واستفادہ کا اعتراف موجود تھا۔

خار کھانے والے انگاروں پر لوٹ گئے لیکن دل بڑھانے والوں، اردو نثر کے نئے میلانات ورجحانات سے دلچسپی رکھنے والے اہل فکر ونظر، اردو کی نئی لسانی اور ادبی تحقیق وتنقید کے بالائے بام آنے کے منظر سے بہرہ مند

ہونے والے صاحبان علم و کمال نے آزاد کی کوششوں کو بہت سراہا۔ کہا اور لکھا کہ آزاد نے اردو شاعری کی تاریخ، تذکروں کی یخ بستہ دنیا سے ہٹ کر ادبی تاریخوں کے انداز سے مرتب کی ہے۔ زبان کی ابتدا، تعمیر اور ترقی کا جائزہ لیا ہے، اردو شاعری کے ادوار قائم کیے ہیں، لسانی تغیرات کی نشان دہی کی ہے، ہر دور کے لباس اور اوضاع کو بیان کیا ہے، ہر دور کے ممتاز سخن وروں کی فکر و نظر کا جائزہ لیا ہے اور متعدد شاعروں کے منھ بولتے خاکوں سے انھیں ہمارے دل و دماغ میں نقش کر دیا ہے۔ آب حیات اردو شاعری کی تاریخ ہی نہیں خود ادب بھی ہے۔

نیرنگ خیال نے اردو میں انشا پردازی کے نئے رجحان کا اضافہ کیا۔ ایک نئی اور خوب تر روایت کے امکانات واضح کیے۔ نیرنگ خیال کے مضامین نے اردو افسانے کی راہ ہموار کی۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ بڑا فن کار ترجمے کو تخلیق کے پیکر میں اس طرح ڈھال سکتا ہے کہ ترجمہ اصل کا ہم پہلو ہو جاتا ہے۔

دونوں کتابوں کی اشاعت سے آزاد کی ادبی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔ پروفیسر آزاد کے شاہ کار اردو ادب کی شاہ کار قرار پائے۔ جلد ہی دونوں کتابیں پنجاب یونی ورسٹی کے نصاب میں داخل کر لی گئیں اور آزاد کو دوسری اشاعت کا اہتمام کرنا پڑا۔ انھوں نے اہل وطن سے فروغ علم کا جو وعدہ کیا تھا، ان دونوں کتابوں کی اشاعت سے اس کی تکمیل ہو گئی۔

آب حیات اور نیرنگ خیال کے بعد آزاد نے اکبری دربار سجانا شروع کر دیا۔ سخن دان فارس پر بھی نظر ڈالی۔ آب حیات اور نیرنگ خیال یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہو گئی تھیں۔ انھیں دوبارہ چھپوانا شروع کیا۔ آب حیات میں اضافے کیے۔ امتحانی کام، زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ بڑی تمنا تھی کہ آب حیات کو حیدرآباد دکن والے سر سالار جنگ کے نام معنون کریں۔ خود جائیں اور کتاب کے کچھ حصے سنائیں مگر سالار جنگ ہی نہ رہے۔ یہ تمنا بھی حسرت میں تبدیل ہو گئی۔ بڑی محنت اور کش مکش کا دور تھا۔ شہرت بڑھتی جاتی تھی۔ ذہن پسا جاتا تھا، دل بیٹھا جاتا تھا۔

بڑا صدمہ یہ پہنچا کہ جس گورنمنٹ کالج میں انھوں نے عزت و آبرو کے پندرہ سال گزارے تھے، اس گورنمنٹ کالج سے مفارقت ہو گئی۔ وہاں سے پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج بھیج دیے گئے۔ یہ ان کے لیے بڑا جان لیوا احساس شکست تھا۔ وہ کالج کے بڑے مقبول استاد تھے۔ طلبہ اور اساتذہ دونوں میں ہر دل عزیز تھے۔ طلبہ کو برف خانے لے جا کر لیمن پلواتے تھے۔ ان سے ہنستے بولتے تھے۔ دلداری کرتے تھے۔ کالج میں ان کی ایک حیثیت اور انداز تھا۔ چوغہ پہن کر آتے مگر ایک آستین خالی رہتی۔ پیچھے لٹکتی رہتی۔ گھوڑا بھی ساتھ ہوتا تھا۔ مگر گھوڑے پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ ساتھ ساتھ آتا تھا۔ اردو کی پہلی کتاب میں مولوی صاحب کے گھوڑے کا بیان بھی ہے۔ ساری روایتیں ختم ہو گئیں۔ اورینٹل کالج جانے میں انھوں نے سبکی محسوس کی۔ مگر کیا کرتے۔ بندگی بے چارگی، ذہنی دباؤ اور

انتشار کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

ایران جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ بزرگوں کا وطن تھا جیحوں و سیحوں کی وادیوں میں گھوم پھر چکے تھے۔ سرزمین فارس دیکھنے کی تمنا تھی۔ ایران کے عالموں، ادیبوں اور شاعروں سے ملنے کا شوق تھا۔ زبان اور محاورے کی درستی منظور تھی اور وہاں سے اپنے کتب خانے کے لیے نادر، نایاب، قدیم کتابیں لانے کا منصوبہ تھا۔ عالم خیال میں ایران کے دل کش مناظر دیکھتے رہے اور خاموشی سے تیاری کرتے رہے۔

غضب یہ ہوا کہ جوان جہان، بیاہی تیاہی بیٹی امۃ السکینہ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ امۃ السکینہ آزاد کی چہیتی بیٹی تھیں۔ لائق اور فہیم تھیں۔ تصنیف و تالیف کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ باپ پر جان چھڑکتی تھیں۔ ان کی شادی پٹیالے کے خلیفہ خاندان کے ایک لائق نوجوان خلیفہ محمد کاظم سے ہوئی تھی۔ ہر طرح خوش اور مطمئن تھیں لیکن خدا نہ چاہے تو بندے کی کیا چلے۔ آزاد نے سناؤنی سنی تو سناٹے میں آ گئے۔ تمام عمر کی ناکامیاں ابھر آئیں۔ نفسیاتی گرہوں اور گتھیوں کا کساؤ اور دباؤ ناقابل برداشت ہو گیا۔ دماغ سن اور ذہن ماؤف ہو گیا۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔ گھر والوں نے طے کیا کہ انھیں پٹیالے لے جایا جائے۔ چنانچہ وہ نہانے کے لیے غسل خانے گئے۔ ایسے گئے کہ گھنٹوں غسل خانے ہی میں بند رہے۔ زبردستی باہر نکالے گئے۔ ریل کا وقت کب کا گزر چکا تھا۔ اگلے دن لے جائے گئے۔ اس طرح کہ حال سے بے حال بات میں بے ربطی، انداز میں ناہمواری۔

یہ صدمہ بھی سہہ لیا۔ استاد کا مطلع پڑھتے اور آہ بھرتے:

موت ہی سے کچھ علاج دردِ فرقت ہو تو ہو
غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو

مگر موت مانگے سے نہیں ملتی۔ پھر وہی کالج۔ وہی نئے ماحول اور فضا کے اجنبی در و دیوار، وہی دربار اکبری، وہی سخن دان فارس، وہی زندگی کا رنگ ڈھنگ۔ ایران جانے کا منصوبہ بنایا تھا، اس کی تیاری کرنے لگے۔ جس نے سنا اس نے ٹوکا۔ اس حال اور اس ذہنی کیفیت میں کالے کوسوں کا سفر، گھر والوں نے لاکھ منع کیا مگر آزاد نے کسی کی نہیں سنی۔ رخصت کی درخواست دے دی۔

درخواست پیش ہوئی ڈاکٹر لائنر کے سامنے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار ہو گئے تھے۔ انھیں ایسا موقع خدا دے۔ درخواست یک قلم مسترد کر دی۔ اپنے نزدیک زبردست کی چھاتی پر مونگ دل دیے۔ ایک ہی وار میں چت کر دیا۔ آزاد ذہنی پراگندگی کا شکار تھے لیکن ایسے گئے گزرے بھی نہیں تھے۔ سیر کے لیے سوا سیر ہو گئے۔ ان دنوں پنجاب کے گورنر تھے سر چارلس آکچیسن۔ انجمن پنجاب قائم ہوئی تھی تو لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ آزاد سے صاحب سلامت تھی۔ آزاد نے انھیں کو پکڑا۔ ملاقات کی، اپنے ساتھ ہونے والی

ناانصافی کا تذکرہ کیا۔ گورنر صاحب مطمئن ہو گئے۔ آزاد کی رخصت منظور ہوگئی۔ لائٹنر نے منہ کی کھائی۔

سفر کی تیاری ہوگئی۔ لاہور سے کراچی آئے، عربیا نامی جہاز پر سوار ہوئے، گوادر، بندر عباس، بحرین ہوتے ہوئے بوشہر پہنچ گئے۔ شاید آزاد گوادر سے گزرنے والے اردو کے پہلے ممتاز ادیب تھے۔ بوشہر سے شیراز۔ ''اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا۔'' مگر انھیں ''ترک شیرازی'' کی نہیں اہل علم اور کتابوں کی جستجو تھی۔ اصفہان گئے۔ ''اصفہان نیمہ جہاں گفتم۔'' طہران گئے، کاشان گئے، مشہد گئے، بزرگوں کے مزاروں پر فاتحہ پڑھی، تاریخی آثار دیکھے، ایرانی محاورہ سنا، موسموں کی بوقلمونی دیکھی۔ اہل علم کی خدمت میں حاضری دی، فیض حاصل کیا، چھکڑا بھر کتابیں خریدیں، بارعلم سے لدے پھندے ہرات اور قندھار کے راستے واپس ہوئے۔ ہرات اور قندھار میں انھیں بڑی تکلیف ہوئی۔ رات کو سوتے میں اونٹ سے گر گئے۔ بڑی چوٹ آئی مگر اللہ نے خیر کی۔ افغانیوں نے بہت تنگ کیا۔ موقع ملتا تو مار ہی ڈالتے۔ کم وبیش ایک برس کی سیاحت کے بعد آزاد صحیح سلامت گھر پہنچے۔

اہل لاہور کا اصرار تھا کہ آزاد سفر کا حال بیان کریں۔ اشتہار جاری ہوا۔ آزاد کی شہرت سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ لیکچر کا اعلان ہوا تو شائقین دور ونزدیک سے آئے۔ البرامکہ کے مؤلف مولوی عبدالرزاق لیکچر سننے کانپور سے لاہور آئے اور لیکچر کا حال احوال قلم بند کر گئے۔ اللہ اکبر کیا لیکچر تھا۔ حاضرین مسحور ہو گئے۔

اورینٹل کالج میں تدریس کا مشغلہ پھر شروع ہوگیا۔ دربار اکبری، سخن دان فارس، دیوان ذوق کی تدوین وترتیب کی، چاہا کہ ایک زرعی فارم قائم کریں۔ حکومت نے زمین دینے سے انکار کر دیا۔ پھر یہ خیال آیا کہ ایک کتب خانہ قائم کیا جائے۔ حکومت نے لاہور میں شاہ محمد غوثؒ کی درگاہ کے پہلو میں ایک قطعہ زمین عطا کر دیا۔ آزاد عمارت بنوانے میں مصروف ہو گئے۔ ذہن کا یہ عالم کہ اگر خدانخواستہ آسمان پر بادل چھا جاتے تو وہ آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے ''یا اللہ بارش نہ ہو'' بادلوں کی طرف رخ کر کے صدا لگاتے۔ ''جاؤ۔ کہیں اور برسو۔ آزاد کے کام میں کھنڈت کیوں ڈال رہے ہو۔ کتب خانے کی تعمیر رک جائے گی۔''

خدا خدا کر کے کتب خانے کی تعمیر مکمل ہوگئی۔ آزاد نے اپنی ساری کتابیں یہاں رکھ دیں۔ نادر قلمی کتابیں بھی تھیں۔ مطبوعہ بھی تھیں۔ بڑے بڑے افسروں نے کتب خانے کا معائنہ کیا۔ اچھے خیالات کا اظہار کیا مگر جب ذہنی پراگندگی بڑھتی گئی تو کتب خانے میں آنے والوں کی مجال نہیں تھی کہ کسی کتاب کو ہاتھ لگالیں۔ ادھر کسی نے کتاب دیکھی اور وہ بگڑے۔ یہ سلسلہ کب تک چلتا۔ ناچار کتب خانہ بند کرنا پڑا۔ حکومت کی طرف سے نوٹس آیا کہ کتب خانہ کھولا جائے۔ یہاں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ آخر کار میونسپل کمیٹی نے تعمیراتی اخراجات ادا کر کے عمارت اپنے قبضے میں لے لی۔ حکومت کی طرف سے سرپرستی جاری رہی۔ شمس العلما کا خطاب مل گیا۔ وہ پہلے شمس العلما تھے۔ مگر چشمہ آفتاب بے نور ہو رہا تھا۔ عجب طرح کا خلل دماغ تھا۔ ابھی اچھے بھلے بیٹھے ہیں، بات چیت کر رہے ہیں، علم وفضل کے دریا بہا

رہے ہیں اور اچانک بے کہے سنے بے ڈھنگے پن سے اٹھے اور کسی طرف چل دیے۔

نواں کوٹ میں ایک مجذوب کا مسکن تھا۔ وہاں اکثر جاتے تھے۔ وہ مجذوب نہ کسی سے بات کرتے تھے نہ کسی سے کوئی چیز لیتے تھے۔ آزاد جاتے تو دونوں میں خوب گھٹتی۔ دونوں ایک دوسرے کے اداشناس تھے۔

ملازمت سے سبکدوشی کا وقت آ پہنچا۔ پنشن کے لیے تگ ودو ہوئی۔ پنشن بھی مقرر ہوگئی مگر آزاد کو پنشن وصول کرنا میسر نہیں ہوا۔ ضلع لاہور کے جج نے ان کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر ان کے بیٹے آغا محمد ابراہیم کو ان کی جائداد کا متولی مقرر کر دیا۔ پنشن بھی وہی وصول کرتے تھے۔ ایک آنریری اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے سردار نریندر سنگھ۔ عدالت نے انھیں آزاد کی ذات کا نگراں مقرر کر دیا۔ چلو چھٹی ہوئی عدالت نے بھی ان کے جنون پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ کچھ دن دارالمجانین میں بھی گزارے لیکن:

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

آغا ابراہیم باپ کی حالت نہ دیکھ سکے۔ گھر لے آئے۔ نجانے جی میں کیا سمائی۔ بے کہے سنے، دلّی چل دیے۔ لاہور میں ڈھنڈیا پڑ رہی ہے۔ کہاں گئے، کب گئے، کیسے گئے۔ کیا الوپ انجن ہو گئے۔ لوگوں نے سارا شہر چھان مارا۔ کہیں ہوں تو ملیں۔ خدا خدا کر کے دلّی سے خبر آئی کہ وہاں ہیں۔ پہلے تو کہیں ٹھہرنے کے روادار نہیں تھے۔ دن بھر مارے مارے پھرتے تھے۔ کبھی قطب صاحب کی سیر کر رہے ہیں، کبھی قدم شریف میں ہیں، کبھی حضرت سلطان جیؒ میں بیٹھے ہیں۔ مولوی ذکاءاللہ بچپن کے دوست اور ہم جماعت تھے۔ منت سماجت کر کے اپنے گھر لے گئے۔ بڑی نازبرداریاں کیں۔ دوستی کا حق ادا کر دیا۔ ادھر آزاد کا یہ مزاق کہ بات بات پر ضد، نئے سے نیا اشتلہ۔ ذکاءاللہ، دوست کی دوستی میں سب کچھ برداشت کرتے۔ یار کی یاری سے کام، یار کے فعلوں سے کیا کام۔

ایک دن ذکاءاللہ خط بنوا رہے تھے۔ آزاد بھی بیٹھے تھے۔ یکا یک کھڑے ہو گئے۔ موتراش سے کہا۔ ''ادھر ہٹ، استرا مجھے دے۔'' یہ کہہ کر استرا لے لیا اور ذکاءاللہ کا خط بنانے لگے۔ اتنے میں آ گئے، مولوی نذیر احمد۔ آزاد اور ذکاءاللہ کے پرانے ہم جماعت اور دوست۔ آزاد خط بناتے رہے۔ نذیر احمد خون کے سے گھونٹ پیتے رہے۔ جب آزاد خط بنا چکے اور وہاں سے چلے گئے تو نذیر احمد نے ذکاءاللہ کو ٹوکا ''تم بھی عجیب آدمی ہو۔ اس جنونی کے سامنے گلا رکھ دیا۔ اور جو وہ گردن اڑا دیتا تو'' ''دوست ہو تو ذکاءاللہ جیسا۔ بولے۔'' آزاد ہمارا دوست ہے۔ ہماری گردن نہیں اڑا سکتا۔''

نذیر احمد منھ پھٹ تھے۔ دھاکڑ تھے، لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ جو جی میں آتا برملا کہتے۔ مشہور ہے کہ ایک دفعہ ان کی ملاقات ہندوستان کے مشہور وائسرائے لارڈ کرزن سے ہوئی۔ لارڈ کرزن نے گفتگو کے دوران کہا،

''ہندوستانی جھوٹے ہوتے ہیں۔'' نذیر احمد نے برجستہ جواب دیا، ''اور آپ جھوٹوں کے بادشاہ ہیں۔'' ایسا برجستہ گو اور قادرالکلام بھی اپنے ہمدم دیرینہ اور قدیم ہم جماعت کی استادی اور انشا پردازی کا قایل تھا۔ قایل کیا تھا، لوہا مانتا تھا۔ لاہور میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ نذیر احمد بھی شریک ہوئے۔ آزاد کو خبر ملی تو وارفتگی کے باوجود ان سے ملنے پہنچے۔ باتیں ہوتی رہیں۔ کبھی الجھی ہوئی، کبھی سلجھی ہوئی۔ اس دوران نذیر احمد نے کہا، ''سرسید کی فرمائش ہے۔ کانفرنس میں ایک لیکچر میرا بھی ہوگا، اگر آپ ایک نظر اسے دیکھ لیں تو مجھے اطمینان ہو جائے۔'' آزاد نے پوچھا ''کہاں ہے وہ لیکچر۔'' نذیر احمد نے لیکچر آزاد کے سامنے رکھ دیا۔ آزاد نے وہیں اسے دیکھنا شروع کر دیا۔ کوئی گھنٹے بھر میں پورا لیکچر دیکھ ڈالا۔ جگہ جگہ کاٹ چھانٹ کرتے گئے۔ کوئی صفحہ اصلاح سے نہیں بچا۔ پھر بولے، ''بھئی نذیر! تم اردو لکھنی بھول گئے ہو۔'' آزاد کی اصلاح دیکھ کر نذیر احمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگے، ''اس ملک میں اب بھی ایک آدمی ایسا موجود ہے جو مجھ بوڑھے بچے کو اصلاح دے سکتا ہے۔'' یہ آزاد کی ادبی عظمت کا منھ بولتا ثبوت تھا۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔

جب دلّی میں بہت دن ہو گئے تو آغا محمد ابراہیم گئے اور لاہور لے آئے لیکن:

رخصت اے زنداں! جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

آر جار جاری رہی۔ لاہور سے نکلے۔ نجانے کن کن مصیبتوں سے علی گڑھ پہنچ گئے۔ رات کا وقت تھا۔ سرسید کو اطلاع ہوئی، ایک صاحب باہر کھڑے ہیں۔ کچھ ہولا جبطا سے معلوم ہوتے ہیں۔ خدا معلوم کہاں سے خاک اڑاتے آرہے ہیں۔ آزاد نام بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں سرسید سے ملنے لاہور سے آیا ہوں۔ سرسید باہر نکلے تو حیران رہ گئے۔ آزاد ہی تھے۔ پنڈلیوں پر پٹیاں لپٹی ہوئی۔ پیر سوجے ہوئے، آنکھیں ڈگر ڈگر کر رہی ہیں۔ منھ سے بات نہیں نکلتی۔ اندر لے گئے۔ نہلوایا دھلوایا کپڑے بدلوائے۔ ذرا ہوشوں میں آئے تو مکالمہ شروع ہوا۔ علامہ ابوالفضل کی روح میرے پاس آئی تھی۔ دین الٰہی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ اس نے مجھ سے یہ سوال کیا۔ میں نے یہ جواب دیا۔ پھر ابوالفضل نے یہ کہا۔ میں نے یوں کہا۔ غرض یہ کہ ایک طویل مکالمہ سنایا۔ اسی قسم کی اور باتیں بھی کرتے رہے۔ سرسید نے انھیں بڑی محبت سے اپنا مہمان رکھا۔ پوری نگہداشت کی۔ پھر ایک معتمد ملازم کے ہمراہ انھیں واپس بھجوا دیا۔

یہ تو ابوالفضل سے مکالمہ تھا۔ ان کے ذہن میں یہ وہم بھی حقیقت اختیار کر گیا تھا کہ وہ راجا جے چند کے اوتار ہیں۔ یہ راجا جے چند قنوج والے تھے مگر انھیں دیوتا کا روپ اور مرتبہ حاصل نہیں تھا۔ جے چند تاریخ ہندوستان کا وہ راجا ہے جس کی بیٹی سنجوگتا کو دلّی کا راجا پرتھوی راج بھرے سوئمبر سے اٹھا لے گیا تھا۔ خدا معلوم یہ وہم کیسے جاگزیں ہوا۔ عالم جنوں میں آزاد چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھتے رہتے تھے اور خود ہی جلد بناتے۔ ان میں سے بعض میں راجا جے

چند کا تذکرہ ہے۔ عجب انداز تھا۔ سیدھے سبھاؤ خیالات کا اظہار کرتے جا رہے ہیں۔ بیان مربوط، خیالات منظم، انشا پردازی کی شان، طرزِ آزاد کی انفرادیت اور اچانک بہکے تو پھر بہکے۔ چارلس آچیسن کا تذکرہ ہونے لگا، مولوی رجب علی کی ''مدح سرائی'' ہونے لگی، بیٹے بہو کا شکوہ ہونے لگا، مولوی محمد باقر کے قتل کی روداد سنانے لگے، مشائین اور اشراقین کا موازنہ ہونے لگا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذہن کے خزانے کی دولت خفتہ اچانک اور بے محابا منظرِ عام پر آ گئی ہے۔ اپنی چھب دکھا رہی ہے اور دیکھنے والوں کے دل و دماغ پر بجلیاں گرا رہی ہے۔ مزاج میں وہ جو نفاست تھی، پاکیزگی تھی، لکھنے کا خصوصی اہتمام تھا، قلم دان میں مختلف قسم کے قلم رکھے ہیں۔ رنگ برنگی روشنائیاں ہیں، عمدہ کاغذ کے دستے قاعدے سے رکھے ہیں، فرش پر صاف ستھری چادر، اس پر پتلا سا گدا۔ سارا اہتمام جاتا رہا۔ خلل دماغ سب کو کھا گیا۔

عالم جنوں میں بڑا سہارا یہی تصنیف و تالیف کا ذوق اور شہر کی سیر تھا۔ صبح جب آزاد سیر کے لیے نکلتے تو دفتروں کو جانے والے انگریز اور ہندوستانی افسر انھیں دیکھ کر اپنی گاڑیاں رکوا لیتے یا بڑی احتیاط سے گزرتے۔ یہ آزاد کا احترام تھا۔ علم اور آگہی کا احترام تھا۔ یہ عزت و احترام کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔

باہر یہ مان جان اور گھر میں یہ بے وقری کہ آنے جانے والے حیران۔ خواجہ میر درد کے نواسے خواجہ ناصر نذیر فراق آزاد کے شاگرد رشید تھے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے استاد کا خیال آیا۔ بے اختیار ہو گئے۔ دلی سے لاہور گھر آنگن تھا۔ پہنچ گئے۔ جا کر دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آزاد کے پوتے آغا محمد یوسف نکلے۔ وہ فراق کو کیا پہچانتے۔ جب انھوں نے کہا ''آپ کے دادا جان کی زیارت کو دلی سے حاضر ہوا ہوں۔'' تو انھوں نے کہا ''امام باڑے کے برآمدے میں کھانا کھا رہے ہیں۔ آیئے وہیں چلیے۔'' فراق برآمدے میں گئے تو دیکھا کہ ایک طرف چھوراکھ، ایک طرف کچھ کوئلے اور کوڑا پڑا ہوا ہے۔ بوریے پر ایک زدہ حال نڈھال بوڑھا کھانا کھا رہا ہے۔ قدیم وضع کے صاف ستھرے مولویانہ لباس کے بجائے کثیف کپڑے۔ سامنے مٹی کی رکابی رکھی ہے جس میں شوربہ ہے۔ چنگیر میں روٹیاں ہیں۔ ایک نوالہ توڑتا ہے، شوربے میں ڈبوتا ہے، منھ میں رکھ کر دیر تک چباتا ہے، پھر بڑی مشکل سے نگل لیتا ہے۔ فراق نے بڑھ کر سلام کیا۔ ہمت کر کے اپنا نام بتایا۔ آزاد نے کہا ''میں تو نہیں پہچانتا۔ تم ہو کون؟'' فراق نے بڑے ادب سے کہا۔ ''حضور آپ کا شاگرد ہوں۔'' آزاد نے یہ سن کر کہا ''اچھا میرے شاگرد ہو تو دوڑ کر میرے لیے گرما گرم جلیبیاں لے آؤ۔'' فراق از راہ سعادت مندی جھپٹ کر باہر نکلے، حلوائی کی دکان پر پہنچے۔ دوپہر کے وقت گرما گرم جلیبیاں کہاں سے آئیں۔ بچی کھچی ٹھنڈی جلیبیاں لے آئے۔ استاد کے سامنے رکھ دیں۔ انھوں نے ایک جلیبی اٹھائی۔ بولے ''میرے ہلتے ہوئے دانتوں سے یہ ٹھنڈی جلیبیاں کیا کھائی جائیں گی۔'' فراق نے اصرار کیا، ''استاد ایک آدھ چکھ لیجیے۔'' ان کا اتنا کہنا تھا کہ آزاد تھے پرسے اکھڑ گئے۔ گھور کر دیکھا۔ بولے ''جاؤ یہاں سے۔'' آغا

یوسف نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ پھر آغا کہنے لگے،''حضرت قبر کا عذاب مردہ ہی جانتا ہے۔ حالت یہ ہے کہ روٹی دسترخوان میں لے جایئے تو دسترخوان جلا دیتے ہیں۔ سالن چینی کی رکابیوں میں جائے تو رکابیاں توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ تانبے کی رکابیوں میں کھانا دیا جائے تو رکابیاں بازار میں بیچ آتے ہیں یا کسی راہ چلتے کو دے دیتے ہیں۔ سیکڑوں برتن اس طرح غارت ہو چکے ہیں۔ صاف ستھرے کپڑوں سے بیر ہے۔ ادھر پہنائے گئے اور ادھر انھوں نے پھاڑے۔'' یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ آزاد خلال کرتے ہوئے ادھر آ نکلے۔ فراق کو دیکھ کر بولے،''ہیں۔ تم دلّی سے کب آ گئے۔ واللہ میں نے تمھیں اس وقت نہیں پہچانا تھا۔ ہاں میاں! تمھارا نام ناصر نذیر ہے۔'' فراق نے موقع غنیمت سمجھ کر عرض کیا،''میں نے ایک سلام کہا ہے۔ وہ آپ کو سناتا ہوں۔'' آزاد نے کہا،''ہاں میاں پڑھو۔'' فراق سلام پڑھنے لگے۔ آزاد سنتے رہے۔ کوئی شعر پسند آتا تو کہتے خوب کہا ہے۔ پسند نہیں آتا تو کہتے''یہ کچھ نہیں۔'' فراق مقطع پڑھ چکے تو آزاد نے کہا،''تمھارا سلام بہت اچھا ہے۔ کہیں کہیں جو میں نے، کہہ دیا تھا کہ یہ کچھ نہیں، یہ شعر کی بندش کے لحاظ سے کہا ہے۔'' دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور بازار کی طرف چلے گئے۔

شہر میں عجیب عجیب افواہیں اڑتیں۔''اصل میں وظیفہ الٹ گیا۔ وظیفے بہت پڑھتے تھے۔''''بیٹے بہو کی بدسلوکی سے بالکل پاگل ہو گئے ہیں۔''''کسی کو اپنے مسودوں میں ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔''''دربار اکبری کا مسودہ راوی میں پھینک آئے۔'' اولیا اللہ کے بارے میں آب حیات میں بیہودہ اور بے سروپا باتیں لکھی تھیں۔ یہ اسی کا شاخسانہ ہے۔'' کسی بگڑے دل نے کہا''بڑھاپے میں استاد کا کلام مرتب کرنے بیٹھے۔ کلام مرتب کرتے کرتے استاد کو اصلاح دینے لگے۔ اصلاح میں ایسے ڈوبے کہ دنیا و مافیہا سے غافل ہو گئے۔ ہوشوں سے جاتے رہے۔'' جتنے منھ اتنی باتیں۔ مارنے والے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے۔ کہنے والے کی زبان کوئی نہیں پکڑ سکتا۔

بیٹے بہو کی بدسلوکی افسانہ ہی افسانہ تھی۔ آغا محمد ابراہیم اکلوتے بیٹے تھے۔ جی جان سے باپ کی خدمت کرتے تھے۔ حکیم سے علاج کرانے دلّی لے گئے۔ کوئی فایدہ نہیں ہوا۔ ملازمت سے مجبور تھے۔ چھٹی ختم ہوگئی تو باپ کو ساتھ لے کر لاہور واپس چلے۔ بیٹے کی جاں فشانی، باپ کی رستم رانی، جگادھری کے اسٹیشن پر چپکے سے اتر گئے۔ الٹے پیروں دلّی چل دیے۔ بیٹے کے منھ کو لو کا لگا گئے۔ کہنے والوں نے ردا چڑھایا''ارے میاں! خود پڑے سوتے رہے۔ باپ کی کوئی نگہداشت نہیں کی۔''

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک دن گھر میں بیٹھے تھے۔ جنون کا زور تھا۔ آواز آئی،''محمد حسین کو توال کے یہاں سے سواریاں آئی ہیں۔'' انھوں نے کوتوال کا لفظ تو سنا نہیں۔ دوڑ پڑے۔''بیوی آ گئیں۔ بیوی آ گئیں۔'' بیوی کو مرے ہوئے کئی برس گزر چکے تھے۔ سب نے تھمبو کی مگر وہ عالم وارفتگی میں''بیوی۔ بیوی۔'' کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ آنے والی بی بی نے پلنگ کے نیچے چھپنا چاہا مگر انھوں نے زبردستی باہر کھینچ لیا۔ منھ دیکھا تو بھوں چکے رہ

گئے۔ ''یہ تو میری بیوی نہیں ہیں۔'' کہتے ہوئے واپس لوٹے۔ بچپن کے ''یہ تو میری امی نہیں ہیں۔'' کی یاد تازہ ہوگئی۔ شہر بھر میں تھڑی تھڑی ہوئی۔ آغا ابراہیم کی بڑی بدنامی ہوئی۔ بدنامی تو ہونا ہی تھی۔

دیوانگی سے قطع نظر آزاد آغا ابراہیم کو بہت چاہتے تھے۔ استاد کے نام پر نام رکھا تھا۔ استاد کے نام پر بھی فدا تھے۔ بیٹے کے بھی فدائی تھے۔ بچپن میں پیار سے ابرو کہتے تھے۔ ہر جگہ ساتھ لیے پھرتے تھے۔ رڑکی کالج میں داخل کرا دیا۔ پھر بیٹے کی جدائی سے ایسے پریشان ہوئے کہ واپس لے آئے۔ بڑی دھوم سے شادی کی۔ بیٹے نے بڑے سلیقے سے زندگی گزاری۔ مولوی محمد باقر کے دلّی والے مکان کا ایک حصہ خرید لیا۔ لاہور میں اکبری منڈی میں آزاد منزل بنوائی۔ باپ کی کتابیں شایع کیں۔ سخن دان فارس اور دیوان ذوق انھیں کے اہتمام سے شایع ہوئیں۔ دربار اکبری کا مسودہ آزاد کے شاگرد تہذیب نسواں والے مولوی ممتاز علی کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے شایع تو کر دیا لیکن یہ شگوفہ بھی چھوڑا کہ کتاب کا ''تتمہ'' ناتمام اور غیر مرتب تھا۔ میں نے اسے مکمل کیا اور ترتیب بھی درست کی ہے۔'' اس بیان کا بڑا چرچا ہوا۔ اتفاق سے آغا ابراہیم کی ملاقات مولانا شبلی سے ہوئی۔ انھوں نے دریافت کیا'' یہ جو مولوی ممتاز علی نے دربار اکبری میں لکھا ہے کہ تتمہ ان کا تحریر کردہ ہے۔ کیا یہ صحیح ہے۔'' آغا ابراہیم نے کہا'' مسودہ موجود ہے۔ ملاحظہ فرمالیجیے۔ حقیقت خود عیاں ہو جائے گی۔'' اس پر مولانا شبلی نے کہا'' مجھے پہلے ہی شک تھا۔ یہ تحریر آزاد کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ ان کا طرز چھپائے سے نہیں چھپتا۔'' اس گفتگو کے بعد آغا صاحب نے دربار اکبری جیسی ضخیم کتاب خود ہی دوبارہ شایع کردی۔ باپ کی اور خدمت کیا کرتے۔ کتاب کا مقدمہ لکھ کر ساری حقیقت بھی واضح کردی تھی۔

یہ بھی آزاد کی بدقسمتی کہ اچھے شاگرد میسر نہیں آئے۔ ایک شاگرد خواجہ ناصر نذیر فراق تھے۔ دلّی کے دلدادہ۔ ٹکسالی زبان لکھتے تھے۔ سات طاقتوں کی کہانی ایسی لکھی کہ آزاد نے پڑھی تو ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے مگر فراق پرانی تہذیب کے نوحہ خواں تھے۔ طرز نو سے ناآشنا جو کچھ لکھا ہے، خوب لکھا ہے مگر استاد کے نام اور کام کو آگے نہیں بڑھایا۔ سر گزشت الفاظ والے مولوی احمد دین تھے۔ سر گزشت الفاظ آزاد کے نام معنون بھی ہے مگر مولوی صاحب آزاد سے فیض اٹھانے کے باوجود لسانیات کا مزید مطالعہ جاری نہ رکھ سکے۔ دوسری راہ پر چل دیے اور اقبال شناسی کا بڑا حوالہ بن گئے۔ ادب سے تعلق رکھنے والے دوسرے شاگرد مولوی ممتاز علی تھے۔ وہ اردو میں ادب نسواں اور ادب اطفال کا حوالہ بن گئے۔ تاہم وہ بھی استاد کے فیض کا صحیح اظہار نہیں کر سکے۔ ہزاروں شاگردوں کے استادالاساتذہ کی یہ محرومی اور ناکامی بھی قابل افسوس ہے۔ ''اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے۔''

''کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے'' کتابیں جمع کرتے رہے۔ بڑا شوق تھا۔ کوئی نادر کتاب مل گئی تو نقل کر ڈالی۔ کتب خانہ بنایا۔ ایران سے کتابیں لائے۔ سب کتب خانے میں رکھ دیں۔ کتب خانہ بھی دیوانگی کی نذر

ہوا۔ کتابیں پنجاب یونیورسٹی پہنچ گئیں۔ پرانے سکے جمع کرنے کا شوق تھا۔ ایک ہی دفعہ میں تین سو ساڑھے تین سو سکے جاتے رہے۔ وہ شوق بھی ختم ہوا۔ جنون نے کہیں کا نہ رکھا، ورنہ آزاد خوش مزاج تھے۔ ہمدرد تھے، طلبہ کا بڑا خیال کرتے تھے۔ اس میں ہندو مسلمان کی قید نہیں تھی۔ دوستوں اور غیروں سب کے کام آتے تھے سب کی مدد کرتے تھے مگر واہ رے جنون۔ سب پر پانی پھیر دیا۔

آزاد کے ذہن میں بچپن ہی سے گرہیں پڑنا شروع ہوگئی تھیں۔ وقت گزرتا گیا، گرہیں بڑھتی گئیں۔ سخت ہوتی گئیں۔ پہلے واہمہ تھا۔ پھر واہمے نے مراق کی شکل اختیار کر لی۔ مراق بڑھا تو خبط میں تبدیل ہوگیا۔ خبط مالیخولیا بن گیا اور آخر کار جنون ہوگیا:

جگر جورِ گردوں سے خوں ہو گیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

آزاد ساری زندگی ان کیفیات سے گزرتے رہے اور حالات کا مقابلہ کرتے رہے مگر چومکھی کب تک لڑتے۔ بیس برس اسی لڑائی میں گزر گئے۔ پورے بیس برس دیوانگی کی کیفیت طاری رہی۔ بیس برس زبان سے کہہ دینا بہت آسان ہے۔ جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے، روحانی کرب اور دمبدم کی اذیت کو وہی سمجھتا ہے۔ آخر کار ہمت ہار بیٹھے۔ دیوانگی نے غلبہ پالیا۔ اسیر جنون ہوگئے۔ بڑھاپے کے عوارض نے بالکل ہی پست کر دیا۔ دیکھنے والے فاعتبرو یا اولی الابصار پڑھتے ہوئے اردو ادب کے اس کوہ گراں کو زلزلوں سے پیہم لرزتے، تڑختے چٹختے، زمیں بوس ہوتے دیکھتے اور پناہ مانگتے رہے۔

عشرہ محرم کی ابتدائی تاریخ، نواب نوازش علی کے امام باڑے میں مجلس کی تیاری۔ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ کچھ اور آنے والوں کا انتظار ہے۔ اتنے میں ایک بڈھا، ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔ سارے جسم پر لرزہ، لمبی لمبی سانسیں، سر پر چکٹ ٹوپی، گلے میں پرانی دھرانی میلی کچیلی اچکن جس کی چولی کے آدھے بٹن ٹوٹے ہوئے۔ ڈبل زین کا کثیف پاجامہ۔ پیروں میں لیتڑے۔ سب نے اسے دیکھ کر منھ بنایا۔ وہ چپ چاپ اس طرف بیٹھ گیا، جدھر روشنی کم تھی۔ ذرا دیر بعد اس نے چلا کر پوچھا، ''مجلس ابھی شروع نہیں ہوئی؟'' کسی نے کہا، ''شروع ہونے والی ہے۔'' ذرا دیر بعد اس نے پھر یہی سوال کیا اور چیخ کر کہا، نہیں شروع ہوتی تو نہ ہو۔ ہم اپنا سلام پڑھے دیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی کانپتی ہوئی آواز میں سلام شروع کر دیا:

اے مجرئی پھرا سرِ سرور کہاں کہاں
قرآں لیے پھرے ہیں ستم گر کہاں کہاں

پھرتا تھا نیزے پر سرِ سرور کہاں کہاں
تھا آفتاب حشر سے محشر کہاں کہاں

مشکیزہ بھر کے نہر سے عباسؓ لے ہی آئے
کہتے ہی رہ گئے وہ ستم گر کہاں کہاں

قربان جاؤں دلبر مشکل کشاؐ کے میں مشکل کشائی کرتے ہیں جا کر کہاں کہاں

بندے کو رکھیے اپنی غلامی میں یا امامؑ

آزاد ہو کے جائے گا در در کہاں کہاں

وہ تو سلام پڑھ کاغذ پھینک، یہ جا وہ جا، مجلس میں سناٹا چھا گیا۔ ''از زمیں تا آسمان اک سوختن کا باب تھا۔'' لوگ ذرا سنبھلے تو آوازیں بلند ہوئیں، ''اچھا تو یہ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد تھے۔'' ''آج انھیں بھی دیکھنے کی سعادت حاصل ہوگئی۔'' بہتوں کی آنکھیں نم ناک ہوگئیں۔

بیماری بڑھتی گئی۔ دکھ بڑھتے گئے۔ بے قراری بڑھتی گئی۔ ۱۹۱۰ء کے عشرے کی رات تھی۔ قید جنوں اور قید حیات دونوں سے چھوٹ گئے۔ ''نہ جنوں رہا نہ پری رہی۔'' عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ گیا۔ خود چلے گئے...... اردو ادب کو آبِ حیات پلا گئے۔

محمد حسین آزاد اور ۱۸۵۷ء

ڈاکٹر شمیم حنفی

تاریخ سے میرے احساسات کا رشتہ یقین اور بے یقینی کے درمیان، بالعموم، کچھ معلق سا رہا ہے۔ میں شکر گزار ہوں اس مذاکرے کے محرک، پروفیسر تحسین فراقی اور ان کے رفیقوں کا کہ انھوں نے مجھے جس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دی، اس کے واسطے سے، مجھے یہ موقع ملا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے اپنی اجتماعی تاریخ کے سب سے اہم واقعے (۱۸۵۷ء) کا جائزہ لے سکوں۔ ۱۹۴۷ء نے زمین کی تقسیم کی تھی، ۱۸۵۷ء نے زمانے کو بانٹ دیا۔ ہمارے اجتماعی شعور پر اس سانحے کا سایہ بہت گہرا ہے اور ہمارا حال بھی اس سے آزاد نہیں ہے۔

۱۸۵۷ء کی ڈیڑھ سو سالہ یادگار سے متعلق (۲۰۰۷ء میں) بہت سی نئی کتابیں لکھی گئیں اور اس واردات کا جائزہ کئی سطحوں پہ لیا گیا۔ ایک نئی حکومت کے قیام کے ساتھ نئے اسالیب فکر، زندگی کے نئے آداب اور ایک ہمہ گیر نشاۃ ثانیہ سے ہمارا تعارف، نئے علوم اور ادب کی نئی صنفوں کا چلن، معاشرتی اصلاح اور قومی تعمیر کی نئی کوششیں، ایسے ماضی اور روایت کی تعبیر و تفہیم کا ایک نیا سلسلہ۔ کسی نہ کسی سطح پر آزاد اس سب سے متعلق رہے ہیں لیکن جیسا کہ اکثر تاریخوں اور مورخوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس تمام تر علمی تگ و دو کے نتیجے میں جو تحقیقی کام سامنے آیا، اپنی ساری قدر و قیمت کے باوجود، ایک عنصر کی کمی کا احساس بھی ہوتا ہے، یہ ہے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور سائنسی حقیقتوں سے بوجھل اس غیر معمولی واقعے میں انسانی عنصر کے جائزے کی کمی۔ ۱۸۵۷ء بیک وقت ایک خیال یا idea بھی ہے اور ایک جیتی جاگتی واردات یا ایک image بھی۔ ہم میں سے بہتوں کے لیے یہ محض ''تاریخ'' ہے لیکن محمد حسین آزاد کے لیے یہ ایک نجی تجربہ بھی تھا۔ ان کی حیثیت ۱۸۵۷ء کے تماشے کے ایک کردار کی بھی ہے جو اس تماشے کی ہولنا کی کا گواہ ہی نہیں، بجائے خود ایک شکار بھی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں آزاد کا تجربہ، انسانی ہستی اور اس کے گردو پیش کی دنیا کے بہت سے اسرار کا احاطہ کرتا ہے اور کئی واسطوں سے اس کے مفہوم تک پہنچا جا سکتا ہے لیکن ہماری تاریخ کا بیشتر حصہ اور ہمارے مورخین کی اکثریت، ایسی باتوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتی۔ تاریخ یا تو انسانی تہذیب کے معماروں سے سروکار

رکھتی ہے یا پھر اس کے مجرموں سے۔ ایسے افراد جنھیں تاریخ کے تماشے اور اسٹیج پر حاشیہ نشینوں کی حیثیت حاصل ہو اور بہ قول، کونتزری، جو تاریخ کے مضافات میں بستے ہوں، انھیں ہماری تاریخ اور مورخ، اکثر خاطر میں نہیں لاتے۔ ۱۸۵۷ء کے سیاق میں دیکھا جائے، تو محمد حسین آزاد اور ان کے والد مولوی محمد باقر کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی بات ہوئی۔ ۱۹۵۷ء میں ناصر کاظمی اور انتظار حسین نے ۱۸۵۷ء کا جو خیال کا نمبر، ترتیب دیا، اس میں بھی مولانا فضل حق خیرآبادی سے لے کر مولا بخش ہاتھی تک کا تذکرہ موجود ہے، مگر مولوی محمد باقر اور ان کے تاریخ گزیدہ اور درد رسیدہ بیٹے محمد حسین آزاد کا تذکرہ یکسر غائب ہے۔ ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں جو ادب لکھا گیا اور چھوٹی بڑی نظمیں جو سامنے آئیں (اور جن تک میری رسائی ہو سکی) ان میں طویل ترین نظم جو اپنے انجام کی غم آلودگی کے باوجود کسی رزمیے کا ٹھاٹ رکھتی ہے، راہی معصوم رضا کی نظم ۱۸۵۷ء ہے، تقریباً تین سو صفحوں پر مشتمل۔ لیکن یہاں بھی آزاد اور مولوی محمد باقر کا اتا پتہ نہیں ملتا۔ ہر چند کہ اس طویل ''رزمیے'' کے تعارف میں راہی نے اپنے موقف کی نشاندہی اس طرح کی تھی کہ:

> میں نے (نظم کے لیے بہ طور موضوع) ۱۸۵۷ء کا انتخاب کیوں کیا؟ میں نے آخر سو سال بعد (یہ نظم ۱۹۵۹ء میں تکمیل کو پہنچی) پلٹ کر اس شکست خوردہ انقلاب کی طرف دیکھنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ انیسویں صدی کی اس لڑائی سے آج بیسویں صدی میں کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتا ہوں؟ میں آخر کہنا کیا چاہتا ہوں؟ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ع انسانوں کی جیت ہوئی ہے جیت ہمیشہ ہوگی! یہ نظم میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے نہیں لکھ سکتا تھا۔ مگر اس دن وہ لڑائی ختم ہوگئی جو ۹ مئی ۱۸۵۷ء کو شدت کی ایک مخصوص منزل تک پہنچ گئی تھی۔ --۱۸۵۷ء اس نظم کا موضوع نہیں ہے۔ اس کا موضوع کوئی سنہ نہیں ہے۔ اس کا موضوع انسان ہے جو کبھی نہیں ہارتا۔ انسان کے نہ ہارنے کا یقین مجھے انسان کی طویل تاریخ نے دلایا ہے۔

آزاد نے بھی اپنی معروف نظم ''تاریخ انقلاب عبرت افزا'' میں ۱۸۵۷ء کی واردات کو ایک تاریخی واقعے سے زیادہ، انسانی فتح و کامرانی اور شکست و ہزیمت کے ایک تماشے کے طور پر دیکھا تھا۔ اس نظم میں یہ واقعہ ایسے زماں اور مکاں، دونوں کی سطح سے اوپر اٹھ کر، ایک ازلی اور ابدی انسانی تجربے کی شکل میں ہمارے احساسات پر وارد ہوتا ہے:

کو ملک سلیمان و کجا حکم سکندر — شاہان اولی العزم و سلاطین جہاں دار
کو سطوت حجاج و کجا صولت چنگیز — کو خان ہلاکو و کجا نادرِ خوں خوار
نے شوکت و حشمت ہے نہ وہ حکم نہ حاصل — کس جا ہے جہاں اور کہاں ہیں وہ جہاں دار
کو رستم و سہراب و کجا سام و نریمان — اس معرکے میں کند ہے ایک ایک کی تلوار
کو حکمت لقمان و کجا علم فلاطون — خیل حکما و علمائے اولی الابصار

ہوتا ہے ابھی کچھ سے کچھ اک چشم زدن میں
ہاں دیدۂ دل کھول دے اے صاحب ابصار

ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصاریٰ
تھی صاحب اقبال و جہاں بخش و جہاں دار

تھی صاحب علم و ہنر و حکمت و فطرت
تھی صاحبِ جاہ و حشم و لشکر جرار

اللہ ہی اللہ ہے جس وقت کہ نکلی
آفاق میں تیغِ غضبِ حضرت قہار

سب جوہر عقل ان کے رہے طاق پہ رکھے
سب ناخن تدبیر و خرد ہو گئے بیکار

کام آئے نہ علم و ہنر و حکمت و فطرت
پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو یہیں مار

یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا
ہے گردش گردوں بھی عجب گردش دوّار

نیرنگ پہ غور اس کے جو کیجیے تو عیاں ہے
ہر شعبدۂ تازہ میں صد بازیِ عیار

ہاں دیدۂ عبرت کو ذرا کھول تو غافل
ہیں بند یہاں اہل زباں کے لب گفتار

آنکھیں ہوں تو سب کھل گئی دنیا کی حقیقت
مت کیجیو دلا اس کا بھروسہ کبھی زنہار

عبرت کے لیے خلق کی یہ سانحہ بس ہے
گر دیوے خدا عقل سلیم و دل ہشیار

کیا کہیے کہ دم مارنے کی جائے نہیں ہے
حیراں ہیں سب آئینہ صفت پشت بہ دیوار

حکام نصاریٰ کا بدیں دانش و بینش
مٹ جائے نشاں خلق میں اس طرح سے یک بار

اس واقعے کی چاہی جو آزاد نے تاریخ
دل نے کہا: قل فاعتبرو یا اولی الابصار

۱۲۷۳ھ

(اردو صحافت اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص۱۰۵-۱۰۴ معصوم مرادآبادی، خبردار پبلی کیشنز، دہلی)

کچھ عجیب اتفاق ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرنے والے ایک اور بڑے واقعے (۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی، تقسیم اور فسادات) کے بارے میں ۱۸۵۷ء کی بہ نسبت شعر و ادب کا بہت کثیر سرمایہ جو سامنے آیا، اس کی بابت ممتاز شیریں کا تاثر یہ تھا کہ واردات بڑی تھی مگر اتنا بڑا ادب نہیں پیدا کیا جا سکا۔ ۱۸۵۷ء کو براہ راست طریقے سے تخلیق ادب کا موضوع بنانے کی روایت بھی معلوم نہیں کیوں بہت محدود رہی۔ پروفیسر محمد مجیب کا ڈراما آزمائش انتظار حسین کا افسانہ جل گرجے اور راہی معصوم رضا کی طویل نظم ۱۸۵۷ء کو الگ کر دیا جائے تو خاصا سناٹا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے بھی اپنے سہ ماہی جریدے تاریخ میں آزاد کی ایک نظم کے بس کچھ شعر نقل کر دیے ہیں۔ بلا تبصرہ (جلد اول، شمارہ ۳۴)۔ یوں آزاد نے جس ذہنی اور جذباتی ماحول میں یہ نظم کہی ہوگی، اس سے متعلق تفصیلات پر غور کیا جائے تو اس نظم کی معنویت اور اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس نظم میں سراسیمگی اور

مرعوبیت کی وہ فضا تقریباً ناپید ہے جس سے ۱۸۵۷ء کے بعد کا ادب پہچانا جاتا ہے۔ دسمبر ۲۰۰۰ء میں ایتا وگھوش نے دیپیش چکرورتی سے ۱۸۵۷ء کے موضوع پر ایک مکالمے کے دوران، اس واقعے پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ ہندوستانی عوام پر ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی نے اتنا گہرا اور حواس باختہ کر دینے والا اثر کیوں ڈالا یا اس واقعے کے بعد ہندوستانی معاشرے کی تقریباً تمام سطحوں پر جو mindset یا ذہنی خاکہ نمودار ہوا، اپنی ترکیب کے لحاظ سے، وہ یکسر کولونیل تھا۔ سرسید، نذیر احمد، حالی، ذکاءاللہ، علی گڑھ تحریک کے چھوٹے بڑے مویدین، ان میں سے کوئی بھی اپنے شعور کو اس کے اثرات سے پوری طرح آزاد نہیں رکھ سکا۔ غالب نے ہر چند کہ آئین روزگار کی بالادستی کا اعتراف سرسید کی تحریک کے آغاز سے پہلے کیا تھا:

پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار
گشتہ آئین دگر تقویم یار

لیکن زمانے کے تغیر اور ارتقا کے عمل کی بابت، ان کا مجموعی زاویہ نظر بہت الجھا ہوا، ہاں اور نہیں کی کشمکش سے ہمیشہ دوچار اور اپنے ماضی اور اپنے حال میں یکساں طور پر گرفتار دکھائی دیتا ہے۔ مزاجوں کے فرق کے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ محمد حسین آزاد کا بھی ہے، گومگو کی وہی کیفیت، ماضی اور مستقبل کے مابین ویسی ہی کھینچ تان کا ماحول جو غالب کے شعور میں ایک مستقل ہنگامہ بپا کیے رہتا ہے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے سیاق میں غالب کا سوانح اور مکاتیب پر نظر ڈالی جائے تو ''مردہ پروردن مبارک کار نیست'' کے بلند بانگ ہدایت نامے کی جگہ، ایک تھکی ماندی، بے بس اور اداس روح کی سرگوشی سنائی دیتی ہے۔ ذرا اس عبارت سے جھانکتے ہوئے غالب کو دیکھیے:

> بھائی، تم آتے ہو چلے آؤ۔ نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھنا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان نکلنا سن جاؤ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ۔
>
> آغا باقر کا امام باڑہ، اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے ایک بنائے قدیم، رفیع، مشہور، اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا۔ یہاں دو سڑکیں دوڑتی ہیں، ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک آہنی سڑک، محل ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ گوردی کا پارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعے کے آگے جہاں لال ڈگی ہے، ایک میدان نکالا جائے گا۔ محبوب کی دکانیں، بھیلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے آثار عمارت باقی نہ رہے گی۔ آج جاں نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھینے شروع ہو گئے ہیں۔

(خیال ۱۸۵۷ء نمبر ص ۲۹۹)

ابھی ذرا دیر پہلے امیتاو گھوش اور دیپیش چکرورتی کے مابین جس مکالمے کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا، اس کا تجزیہ سوکیشی کامرا (Sukeshi Kamra) نے اپنے تحقیقی مقالے "Reading 1857 The Government Report and Indigenous Narrative" میں بڑی وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔ امیتاو گھوش کی گفتگو کے ایک زاویے پر انھوں نے خاص طور سے نظر ڈالی ہے۔ گھوش کا خیال تھا کہ ۱۸۵۷ء کے واقعے سے ابھرنے والا اصل سوال یہ ہے کہ اس وقت شکست کی جو صورت حال رونما ہوئی تھی، اس کے پیش نظر لوگوں کے سامنے سوائے اس کے کیا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ اپنے آپ کو اس صورت حال کے سپرد کر دیں۔ ہماری اجتماعی زندگی میں شکست کی یہ واردات ایک تاریخی لمحے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس شکست نے ہمیں اندر سے بھی منتشر کر کے رکھ دیا تھا اور اجتماعی تشخص کے سوال کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ اس تاریخی لمحے میں مذہب و ملت کے فرق و امتیاز کے بغیر، تمام ہندوستانی ایک ہاری ہوئی قوم کے فرد تھے۔ آزاد نے بھی اس پورے سانحے کو اسی سچائی کے ساتھ قبول کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ، ان کی پریشان اور انتہائی جذباتی شخصیت میں، اپنی بیرونی زندگی اور باطنی زندگی، دونوں کو سنبھالنے کی جو غیر معمولی جدوجہد دکھائی دیتی ہے، وہ ایک سطح پر اپنے انفرادی تشخص کو محفوظ رکھنے کی جدوجہد بھی ہے۔ غالب کی طرح، آزاد نے بھی زمانے سے اس قسم کی ذہنی صلح نہیں کی جس کے نشانات ہمیں ان کے مصلحانہ جوش رکھنے والے ہم عصروں کی زندگی اور تہذیبی رویوں میں دکھائی دیتے ہیں۔

غالب اور آزاد، دونوں کے یہاں معاشرتی اور فکری سطح پر، وسعت اور کشادگی کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ آزاد کے لیے اس عنصر کی حیثیت ایک نجی ورثے کی بھی تھی۔ مولوی محمد باقر ایک روشن طبع صحافی تھے، اپنی عملی اور فکری زندگی میں کسی بھی فرقہ وارانہ اور مذہبی تفریق اور تعصب سے بالاتر۔ ولیم ڈیل رمپل نے اپنے مقالے "Religious Rhetoric in the Delhi Uprisingg of 1857" میں دلی اردو اخبار کے ۱۴ جون ۱۸۵۷ء کو شائع ہونے والے ایک ایسے کالم کا حوالہ دیا ہے جس کا خطاب صرف ہندوؤں سے تھا اور جس کا مقصد ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو انگریز کے خلاف مشتعل کرنا تھا۔ ڈیل رمپل کے بیان کے مطابق اس کالم میں مولوی محمد باقر نے کہا تھا کہ دلی کے شہریوں کو اس وقت اپنے مشترکہ برطانوی دشمن کے خلاف صف آرا ہونے کی ضرورت ہے کہ یہ دشمن ہندو رزمیے راماین کے بدکردار راون کی مثال ہے۔ مولوی صاحب نے لکھا تھا کہ اے میرے ہم وطنو! اگرچہ انگریزوں کی حکمت عملی اور چال بازی کے علاوہ ان کی ساری دنیا کو زیر کرنے اور اپنا مطیع و فرماں بردار بنائے رکھنے کی خواہش اور اپنے خزانوں کو مزید وسعت دینے کی کوشش، تمھیں دل شکستہ کر سکتی ہے۔ لیکن اے میرے ہندو بھائیو! اگر تم اپنی مقدس مذہبی کتابوں پر نظر ڈالو تو تم دیکھو گے کہ اس سرزمین پر کیسی کیسی شاندار سلطنتیں قائم ہوئیں اور پھر ان کا وجود کس طرح دیکھتے دیکھتے ہی معدوم ہو گیا۔ یہاں تک کہ راون اور اس کے عفریتوں کی فوج کو راجہ رام

چندر جی نے مار بھگایا-- سوائے اس آدی پرش کے یہاں کوئی بھی مستقل نہیں ہے-- عہد جدید اور ۱۸۵۷ء کے دور کا احاطہ کرنے والی ایک معروف مورخ پروفیسر شیریں مولوی نے اپنی مرتبہ کتاب Facets of the Great Revolt 1857 (اشاعت دسمبر ۲۰۰۸ء) میں ڈیل رمپل کے اس حوالے کو گمراہ کن بتایا ہے اور مولوی محمد باقر سے منسوب بیان میں متعدد، دانستہ یا نادانستہ غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے لفظوں میں اس اپیل کا خطاب مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں سے تھا۔ ڈیل رمپل کے ترجمے میں اس عبارت سے چھیڑ چھاڑ کی گئی ہے اور مسلمانوں سے متعلق تمام حوالے بالا رادہ حذف کر دیئے گئے ہیں (ص ۲۳-۲۲) مثال کے طور پر اپنے دینی بھائی مسلمانوں سے یہ کہا گیا ہے کہ اگر واقعی وہ اضطراب محسوس کرتے ہیں تو انھیں قرآن، تفسیر اور حدیث سے سبق لینا چاہیے اور وہ لوگ جو ہندو دھرم کے ماننے والے ہیں انھیں اپنے گیان اور دھرم سے اپنے دلوں کو روشن کرنا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔

خیر، یہ ۱۸۵۷ء کی داستان کا ایک متنازعہ باب ہے اور اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ ۱۸۵۷ء کی داستان کا جو حصہ آزاد کے اپنے سوانح کا حصہ بن گیا اس کے بارے میں بھی بہت سی باتیں سامنے آ چکی ہیں اور ان پر ایک دلدوز افسانے کا گمان ہوتا ہے۔ یہ افسانہ اپنے اندر تذبذب اور تشویش کی کچھ انتہائی ہیجان خیز ڈرامائی عناصر بھی رکھتا ہے۔ مولوی محمد باقر کی غیر معمولی شخصیت اور ان کی شہادت کے باوجود، اس داستان کے اصل ہیرو ہمارے مولانا محمد حسین آزاد ہی ہیں۔ اپنے تمام ہم عصروں سے زیادہ دکھی اور اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے درد اور دہشت کا شکار بننے والے دلی کی بربادی اور ۱۸۵۷ء کی دارو گیر کے بعد آزاد جب دلی چھوڑنے کا قصد کرتے ہیں تو انھیں سب سے زیادہ فکر دیــوان ذوق کے اوراق کو جمع کرنے کی ہوتی ہے۔ گویا کہ وہ اپنے ماضی کو ساتھ لے کر ایک غیر یقینی مستقبل کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ آزاد کے واسطے سے، اور ان کی زندگی کے پس منظر میں ۱۸۵۷ء پر نظر ڈالی جائے تو یہ واقعہ اپنے تاریخی خدوخال کے باوجود صرف تاریخ نہیں رہ جاتا۔ آزاد کی طرح ان کے سوانح کا جائزہ لینے والوں کے لیے بھی ایک تجربہ بن جاتا ہے۔ اس تجربے کے نہ جانے کتنے پہلو، جو احاطہ تاریخ میں نہیں آ سکے تھے اور سینہ بہ سینہ روایتوں میں زندہ تھے، رفتہ رفتہ ہمارے حافظے سے بھی غائب ہو گئے۔ آزاد کی ایک پرنواسی (پروفیسر بلقیس موسوی، علی گڑھ) نے کچھ دنوں پہلے (دسمبر ۲۰۰۷ء) آج کـــل، دہلی کے ایک شمارے میں مولوی محمد باقر (دہلوی) پر ذاتی نوعیت کا ایک مضمون شایع کیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا:

اماں آزاد کی باتیں کچھ اس طور سے کرتیں کہ کبھی کبھی تو یہ گمان ہونے لگتا گویا میں نے آزاد کو دیکھا ہے، سنا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مسٹر ٹیلر کا واقعہ بھی آنکھوں دیکھا لگتا تھا۔ یہ تو مدتوں بعد پتہ چلا کہ آزاد کے انتقال کے وقت اماں محض پانچ سال کی تھیں۔

ہر چند کہ یہ موقع نہیں ہے آزاد کے بارے میں تفصیلات میں جانے کا۔ بعض باتیں میں وہ جانتی

ہوں جو کبھی سننے میں نہیں آئیں۔

انیسویں صدی دیوزادوں کی صدی تھی، ہماری اپنی تہذیبی، تخلیقی اور معاشرتی روایت کے حساب سے۔ان دیوزادوں میں بھی دو شخصیتیں جو مجھے تاریخ کے سیلاب میں نہائی ہوئی پھر بھی مرموز دکھائی دیتی ہیں، غالب اور آزاد کی شخصیتیں ہیں۔اور آزاد کے سیاق میں ۱۸۵۷ء بھی ایک رمز ہے۔صرف تاریخی جائزے اور مطالعے کی مدد سے اس رمز کو سمجھنا محال ہے۔ذاتی اور اجتماعی تاریخ کی دراز دستیوں کے نتیجے میں آزاد نے اپنی عمر کا ایک چوتھائی حصہ جو عالمِ جذب میں گزارا اور اس عالم میں جو کتابیں لکھیں، وہ ایک الگ باب ہے اس افسانہ مرموز اور ہوش ربا کا۔

سرسید اور محمد حسین آزاد - رابطے اور اثرات

ڈاکٹر اصغر عباس

سرسید نے جب اپنے حلقے میں تہذیب اور سائنسی فکر کے درمیان ایک بار آور رشتے اور حقائق سے ہم آہنگی کی بات شروع کی تو ان کے خلاف مناظرانہ ادب حرکت میں آ گیا۔ اس کی شدت آگرہ اور اودھ میں زیادہ تھی۔ حال یہ ہو گیا تھا کہ بقول عبدالحلیم شرر در و دیوار سے لعنت و نفرین کی صدائیں اٹھنے لگی تھیں لیکن اسی زمانے میں پنجاب کے سواد اعظم نے ان کے لائحہ عمل کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور حالی نے لکھا ہے کہ اہل پنجاب سرسید کی منادی پر اس طرح دوڑے جیسے پیاسا پانی پر۔ ان میں اقبال کے استاد میر حسن بھی تھے جو تا حیات سرسید کے جادو کا شکار رہے۔ ان میں سرسید کے افکار و اعمال کے ایک باثر حامی محمد حیات خان تھے جن کی تصنیف تاریخ افغانستان کا تاریخی نام محمد حسین آزاد نے نکالا تھا۔ ان میں علی گڑھ تحریک کے ایک معروف رفیق خلیفہ محمد حسین وزیر ریاست پٹیالہ تھے جو محمد حسین آزاد کے سرپرست تھے اور جنھیں سرسید نے لکھا تھا کہ محمد حسین آزاد ان کے بھتیجے کی مانند ہیں۔ ان میں سرسید تحریک کے ایک باعمل اور پرجوش مددگار محمد برکت علی خان تھے جو آزاد کے مربی تھے اور جنھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے قیام کے لیے زبردست کوششیں کی تھیں۔ ان میں پنجاب کے اسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کے ایک کلیدی ممبر پنڈت من پھول تھے جو لاہور میں آزاد کے نگہبان فرشتے کی حیثیت رکھتے تھے اور انھی کی رہنمائی میں آزاد نے وسط ایشیا کا سفر کیا تھا اور حکومت ہند کو رپورٹنگ کی تھی۔ پنجاب میں سرسید کی پیشوائی کرنے والوں میں ایڈیٹر پنجابی اخبار سید شمس الدین اور منشی ہرسکھ رائے مالک اخبار کوہ نور اور اس کے ایڈیٹر سید نادر علی شاہ سیفی بھی تھے اور پھر سرسید کی انجمن کے ایک روشن چراغ محمد حسین آزاد بھی تھے جنھوں نے ان کے پہلے اور دوسرے سفر پنجاب کے موقع پر اپنی نثر و نظم سے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا۔ انجمن پنجاب کے ایک اہم شاعر الطاف حسین حالی بھی تھے جنھوں نے کہا ہے خدا کی برکتیں پنجاب اور پنجاب والوں پر جنھوں نے ہر سفر میں تجھ کو آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ پنجاب کے مذکورہ اکابر، اہل فکر، اسکالر اور صحافیوں کی وجہ سے یہاں سرسید کے خیالات نظریات اور ان کی نادر و نایاب

ذہانت کا زبردست چرچا تھا۔

محمد حسین آزاد اور سرسید کے روابط کا پہلا نقش ہمیں سرسید کے نام آزاد کے یکم اکتوبر ۱۸۷۳ء کے ایک غیر مطبوعہ فارسی خط سے ملتا ہے جس کی نقل ہمیں علی گڑھ آرکائیوز سے دستیاب ہوئی ہے۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کی مراسلت پہلے سے تھی۔ ہمارے اس قیاس کی توثیق آغا محمد طاہر کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ ''سرسید مرحوم کے خط میاں باوا کے نام بہت ہیں مگر افسوس کہ تمام فارسی میں ہیں۔ اسی لیے انھیں آزاد کے اردو مکاتیب کے مجموعہ میں شامل نہیں کیا گیا''۔ اس فارسی خط سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے ہی آزاد نے سرسید تحریک کے ایک مخالف ڈپٹی امداد العلی کا رسالہ دیکھا ان میں اپنے فرض کا احساس جاگ اٹھا وہ اس کا جواب لکھنے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ وہ اس خط میں لکھتے ہیں کہ نئی بات یہ ہے کہ رسالہ امداد الآفاق جو کہ تمام ترہفوات وطامات سے بھرا ہوا ہے نظر سے گزرا اسے دیکھ کر دل خون ہو گیا اور سینہ تنور طوفان بن گیا۔ اسی وقت آیا اور سرسری طور سے دیکھ کر ایک مضمون لکھا اور اخبار کے سپرد کر دیا تا کہ پہلا ہفتہ اس کی اشاعت سے خالی نہ رہے۔ اسی خط میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس دوران کچھ مضامین وقت کی مناسبت کے لحاظ سے روزنامہ میں شائع ہوئے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ کی رائے میں مصالح امور کے موافق ہے یا نہیں۔ میں نے اظہار نامہ میں مصلحت نہیں دیکھی بلکہ طرز تحریر میں بھی بقدر امکان اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ کہیں اہل سنت تشیع کی تہمت نہ لگائیں اور اہل لکھنو میں سے بعض جو مخالفت کر رہے ہیں دوسرے طریقے سے ہمارے خلاف کھڑے نہ ہو جائیں۔

خلیفہ محمد حسین وزیر ریاست پٹیالہ کے نام آزاد کا ایک طویل غیر مطبوعہ خط ہمیں دستیاب ہوا ہے۔ یہ خط تمام تر سرسید کے سلسلے میں ہے۔ اسی لیے اسے خلیفہ محمد حسین نے علی گڑھ بھیج دیا تھا اس خط میں سرسید اور ان کی تحریک کے سلسلے میں آزاد کے جوش وجذبے کی چمک دیدنی ہے۔

سرسید اور آزاد کے رابطے کی ایک گمشدہ کڑی وہ غیر مطبوعہ خط بھی ہے جو آزاد نے ایران جاتے ہوئے سرسید کو لکھا ہے لکھتے ہیں ''۲۰ اکتوبر بروز جمعہ ہے۔ جہاز میں سوار ہوتا ہوں۔ دس دن میں بوشہر پہنچوں گا۔ ۳۰ اکتوبر تک وہاں ٹھہروں گا۔ کوئی امر قابل تحریر ہو تو کرنل راس صاحب ریزیڈنٹ بوشہر کی معرفت مرحمت فرمائیں۔'' اسی خط میں انھوں نے ان لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے سفر ایران کے سلسلے میں آزاد کی مالی اعانت کی پیش کش کی تھی۔

۲۷ دسمبر ۱۸۷۳ء کو جب سرسید پہلی بار لاہور پہنچے اور دو دن بعد راجہ دھیان سنگھ کے دیوان خانے میں جس میں گورنمنٹ کالج لاہور ابھی قائم ہوا تھا ان کے خیر مقدم کے لیے جلسہ عام ہوا تو حالی لکھتے ہیں کہ لاہور اور امرتسر اور اس کے نواح کا اتنا بڑا مجمع انھیں تاحیات یاد رہے گا۔

۳۰ دسمبر ۱۸۷۳ء کو مطالب مفیدہ انجمن پنجاب کی جانب سے ان کا استقبال سنسکرت اور انگریزی کے عالم

بابو نوین چندر سیکرٹری انجمن پنجاب نے کیا۔ محمد حسین آزاد نے سپاسنامہ پیش کیا جس میں سرسید کی دانشورانہ خدمات کا اعتراف بڑے والہانہ انداز اور اپنے خیالات کو احساسات کا پیکر عطا کرتے ہوئے کیا گیا۔ اس میں آزاد نے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ، اس کے ترجمان اخبار اور اس کی کتابوں اور تہذیب الاخلاق کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مدرسۃ العلوم پر جو کام ہو رہا ہے، ممالک ایشیا میں پہلا مدرسہ ہے جو جمہور قوم کے اجتماع سے قائم ہوگا۔ اس سپاسنامہ میں وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ جو چراغ روشن ہوئے وہ ابھی تک دور سے جھلملاتے ہیں مگر امیدیں اپنے نشان اڑا رہی ہیں اور شک نہیں کہ آئندہ جب تک ہند میں علم و شائستگی کی روشنی رہے گی، آپ کا نام ان نشانوں پر لعل و یاقوت کی روشنائی میں چمکے گا۔

۲۲ جنوری ۱۸۸۴ء کو جب سرسید نے پنجاب کا دوسرا نتیجہ خیز سفر کیا تو ان کے استقبال میں آزاد پیش پیش تھے۔ ۲ فروری ۱۸۸۴ء کو پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں سرسید کو ایوننگ پارٹی دی گئی اس موقع پر آزاد نے امریکن شاعر لانگ فیلو کی نظم ایکسلسیئر Excelsior کا ترجمہ پیش کیا جس میں ترقی کرنے اور ہمت دلانے کا مضمون ہے جس کا ترجیع بند ہے:

آہستہ سر اٹھاکے، کہا ہاں بڑھے چلو

سرسید کے دوسرے سفر پنجاب کے موقع پر لاہور کی کئی تنظیموں نے انھیں اپنے جلسوں میں سپاسنامے پیش کیے۔ آغا محمد باقر کا بیان ہے کہ ''ان سب سپاسناموں کو آزاد نے بڑی عقیدت سے لکھا تھا۔'' ان میں لاہور کی پردہ دار بی بیوں کی جانب سے جو سپاسنامہ آزاد نے رقم کیا تھا وہ خاصا دلچسپ ہے۔ اس کی آخری سطور یہ ہیں ''آپ پیر و مرشد ہیں، سید ہیں، آل رسولؐ ہیں اور سب کی بھلائی کے لیے محنت اور ہمت کرتے ہیں۔ یہ نذرانہ غریبانہ کہ ماتھے کا پسینہ اور آنکھوں کا تیل ٹپکا کر جمع کیا ہے آپ کے لائق نہیں، لیکن مان کا پان ہے اور سچی دل کی نیاز ہے۔ امیدوار ہیں کہ قبول ہو۔''

۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد جب برصغیر کا ایک بڑا حصہ لالہ کاری سے گل رنگ بنا ہوا تھا اور چاروں طرف ایک ہیبت ناک سناٹا طاری تھا اس پرملال پس منظر میں علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کی تاسیس نے کچھ آواز پیدا کی۔ اس سوسائٹی کے اراکین اور عمائدین نے بڑی فراست اور دانائی سے بندشوں اور مواقع کی پیچیدہ صورت حال میں اپنی راہ نکالی اور عصری سائنس اور علوم مفیدہ کی کتابوں کی ترجمے شروع ہوئے اور ۱۸۷۲ء تک آتے آتے اردو تراجم کی بھرمار ہوگئی۔ اسے دیکھ کر محمد حسین آزاد کو ہارون و مامون کا زمانہ یاد آ گیا۔ ان کتابوں میں یونان، مصر، چین، ہندوستان اور ممالکم کی تاریخ ایران بھی تھی جس کے اثرات ڈاکٹر محمد صادق نے آزاد کی تحریروں پر دیکھے ہیں۔ پنجاب کے کئی حساس صاحب قلم، دردمند اہل فکر اور صحافی، سائنٹفک سوسائٹی اور اس کے ترجمان اخبار کے ابتدائی ممبر تھے اور انھیں

حضرات نے بعد میں انجمن پنجاب کا چراغ روشن کیا۔ اس انجمن کے ایک فعال ممبر محمد حسین آزاد کے بارے میں آغا محمد اشرف لکھتے ہیں کہ یہ بھی انجمن میں انھیں باتوں کی تبلیغ کر رہے تھے جو ادب اور زندگی میں سرسید کی منزل مقصود تھی۔

استاذی المحترم سرور صاحب نے لکھا ہے کہ نئی نظم میں جو کچھ ہے وہ سرسید کے خیالات کی بازگشت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نیچرل شاعری یا نئی نظم کی تحریک سائنٹفک سوسائٹی کے اراکین کی تقاضائے طبیعت سے شروع ہوئی۔ نیچرل شاعری کے سلسلے میں جب محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب میں لیکچر دیا تو اس کی سرسید نے دل کھول کر داد دی اور اخبار سائنٹفک سوسائٹی نے اپنے اداریہ میں لکھا کہ ''ہمارا قدیمی خیال تھا کہ ہمارے ملک کی تعلیم وتربیت خصوصاً فن نظم جو درحقیقت ہر زبان کی جان ہے بہت ضعیف حالت میں ہے۔ ہم نہایت خوش ہیں کہ آج کل ہمارے اس پرانے خیال کی تائید میں پنجاب کے لائق فائق ڈاکٹر صاحب بہادر کی وجہ سے ایک جلسہ خاص اس مقصد سے ہوا کہ ہمارے ملک کی نظم کو ترقی دی جائے۔'' آزاد کی مثنوی خواب امن میں ایک کردار پیرِ کہن سال کا ہے۔ یہ چہرے مہرے اور عقل و دانش کے اعتبار سے میرے نزدیک سرسید کا کردار ہے غالباً اسی لیے آزاد نے یہ مثنوی سرسید کو بھیجی تھی۔ آزاد کے ناقدین نے ٹامس مور اور لارڈ لٹن کی نشاندہی تو کی ہے لیکن کسی نے امریکن شاعر لانگ فیلو اور سولھویں صدی کے اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے شاعر مانٹ گومیری کا ذکر نہیں کیا ہے، جس کی نظموں سے بھی آزاد کی نظمیں ماخوذ ہیں۔

نظم ہی میں نہیں آزاد نے نثر میں بھی انگریزی اثرات قبول کیے ہیں۔ ڈاکٹر صادق نے اس قبیل کے مضامین کی نشاندہی کی ہے لیکن آزاد سے کئی سال پہلے سرسید بھی انگریزی اثرات قبول کر چکے تھے۔ اس طرح کے مضامین کے سلسلے میں ڈاکٹر صدیق جاوید نے مفصل بحث کی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سرسید اور آزاد دونوں کے موثر مضامین وہ ہیں جو انگریزی ادیبوں سے ماخوذ ہیں۔ لیکن دونوں کے مضامین انگریزی کا لفظی ترجمہ نہیں ہیں بلکہ دونوں نے حالات کے مطابق انھیں اردو کے قالب میں پیش کیا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں دانشور انگریزی اثرات کو من وعن قبول نہیں کر رہے تھے۔

محمد حسین آزاد کے تحت الشعور پر عالم وارفتگی میں بھی اکبر اعظم، ابوالفضل اور سرسید چھائے ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے جس کا ذکر سرسید کے لٹریری اسسٹنٹ وحید الدین سلیم کے حوالے سے عبدالرزاق کانپوری نے کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ جنون کی حالت میں آزاد لاہور سے علی گڑھ آئے اور وہ بھی پیدل، پاؤں پر ورم آ چکا تھا۔ آبلوں پر کپڑے پھاڑ کر دھجیاں لپٹی تھیں۔ جب سرسید ہاؤس پہنچے تو نوکروں سے اطلاع کرائی کہ سید احمد سے کہہ دو کہ تمھاری ملاقات کے لیے آزاد لاہور سے آیا ہے۔ آزاد کا نام سنتے ہی سرسید چونک پڑے۔ دیکھا تو واقعی شمس العلماء آزاد ہیں۔ ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔ کرسی پر بیٹھتے ہی آزاد نے کہا کہ سید یہ بھی جانتے ہو کہ میں کیوں آیا ہوں۔ سرسید نے فرمایا کہ محض میرے ملنے کے لیے آپ نے یہ تکلیف اٹھائی ہے۔ کہا نہیں خاص بات یہ ہے۔ سنو۔ کئی

دن ہوئے اکبر اور ابوالفضل کی روح میرے پاس آئی تھی اور میرا اور ابوالفضل اور اکبر کا مذہب الٰہی پر دیر تک مکالمہ ہوا۔ ابوالفضل نے یوں کہا اور میں نے یوں جواب دیا۔ ایک ہفتہ کے بعد سرسید نے اپنے خادم کی حفاظت میں انھیں لاہور بھیجا۔

یہ مضمون سرسید اور آزاد کے روابط اور اثرات کے سلسلے میں نہ تو مفصل ہے اور نہ مربوط لیکن ان دونوں کے سلسلے میں جو حقائق پیش کیے گئے ہیں وہ ابھی تک پردۂ اخفا میں تھے اور اسی لیے اس اہم پہلو کے سلسلے میں ناقدین نے اپنے تخیل کی باگ کھلی چھوڑ دی ہے جن میں میرے بزرگ انیس ناگی صاحب کے مضمون آب حیات بقائے دوام اور میرے محترم فتح محمد ملک صاحب کے مضمون آزاد کا طرز احساس کا نام لیا جا سکتا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ آزاد کا سرسید کی طرز فکر سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ معروضاتِ بالا سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد بھی علی گڑھ تحریک سے اسی طرح جڑے ہوئے تھے جیسے حالی اور نذیر احمد، ذکاء اللہ اور شبلی تھے جبکہ سب کا اسلوب تحریر جدا ہے۔

آزاد کا اسلوبِ جنوں

آصف فرخی

(۱)

''جنون بھی ایک طرح لازمۂ شاعری ہے۔ بعض محققوں کا قول ہے کہ دیوانہ اور عاشق اور شاعر کے خیالات بعض بعض مقامات پر متحد ہو جاتے ہیں۔ شاعر کو لازم ہے کہ سب طرف سے مطمئن اور خیالات سے منقطع ہو کر اسی کام میں متوجہ اور غرق ہو جائے اور یہ بات سوائے مجنوں کے یا عاشق کے کہ وہ برادر مجازی اس کا ہے، ہر ایک شخص سے نہیں ہو سکتی۔ مجنوں کو اپنے جنون اور عاشق کو معشوق کے سوا دوسرے سے کچھ غرض نہیں۔ خدا یہ نعمت سب کو نصیب کرے......''

محمد حسین آزاد نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات

(2)

Who are these? Why sit they here in twilight?

Wherefore rock they, purgatorial shadows......

These are men whose minds the Dead have ravished.

Memory fingers in their hair of murders......

Carnage incomparable, and human squander

Rucked too thick for these men's extrication......

Thus their hands are plucking at each other.....

Pawing us who dealt them war and madness

Wilfred Owen, 'Mental Cases'

دریا کے رواں پانی کی طرح جہاں دو دھارے ایک دوسرے سے آ کر ملتے ہیں اور پانی میں دو رنگ رلے ملے بھی نظر آتے ہیں اور الگ الگ بھی، محمد حسین آزاد کی طویل تصنیفی زندگی میں دلچسپی اور جاذبیت اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ اپنے معاصرین کے بقول ''آقائے اردو'' اور ''اردو کے بہترین انشا پرداز'' تھے، اور ان پر ایک پورا دور نثر و نظم ختم ہو کر ایک نیا اور مختلف عہد شروع ہوا نظر آتا ہے بلکہ ہوش و گوش کی تصنیفات کے بعد انھوں نے عمر کا ایک پورا حصہ باقاعدہ اور تصدیق شدہ دیوانگی میں گزارا جس کے دوران اسی انہماک مگر ایک مختلف اسلوب کے ساتھ لکھنے لکھانے کا کام یوں جاری رکھا جس کی کوئی اور مثال اردو میں نہیں ملتی۔ محمد حسین آزاد کی تصنیفی زندگی یوں خود بخود دو علیحدہ اور غیر مساوی ادوار میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ان کے عالم ہوش کی کتابوں سے اردو ادب سے معمولی شد بد رکھنے والے قاری بھی واقف ہیں اور ان پر تنقید و تحسین کا طویل سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ہوش کی سرحد سے گزرنے کے بعد بھی تالیف و تصنیف کا ان کا شغل جاری رہا اور اس عالم کی کتابیں اپنی جگہ اور ایک مختلف نوعیت کے مطالعے کا موضوع ہیں، جن کی معنویت مختلف ہے اور جن کا نثری اسلوب جداگانہ لحن و انداز کا حامل۔

مختلف مصادر میں کسی قدر اختلاف کے باوجود عام خیال یہ ہے کہ آزاد کا سنہ پیدائش جون ۱۸۳۰ء ہے۔ اس حساب سے ۱۸۸۵ء میں ان کی عمر ۵۵ سال کی رہی ہوگی جب ان کے سوانح نگاروں کے مطابق ان میں جنون کے آثار ناقابل تردید حد تک نمایاں ہو گئے۔ اس حساب سے اگر دیکھا جائے تو ۱۹۱۰ء میں اپنی وفات تک انھوں نے اپنی ستر سالہ عمر طبعی کے پچیس سال دیوانگی کے عالم میں گزارے۔ یہ ان کی پختہ عمر کا خاصا بڑا حصہ ہے اور اس سے فوراً پہلے، وہ اسلوب و فکر میں پختگی کی جس منزل پر آن پہنچے تھے اس کا اثر ان کے عالم جنوں میں بھی کسی نہ کسی حد تک جاری رہا۔ دیوانگی کا یہ دورانیہ اور اس کے دوران ان کے قلم کی روانی ایک حیران کن امر بھی ہے اور ادبی معنویت سے مملو واقعہ بھی۔ اس کے اسباب و نتائج بھی مختلف ہیں اور ادبی ثمرات بھی۔ روشن اور رواں اسلوب کے ساتھ ساتھ آزاد کی نثر کا یہ تاریک رخ بھی موجود ہے اور یوں ان کی اہمیت اور معنویت کی دو الگ الگ جہتیں سامنے آتی ہیں۔ کسی سیارے کے تاریک رخ کی طرح آزاد کی اس دوسری جہت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ محض اس وجہ سے کہ ہم اپنی رصد گاہوں سے اس کا مفصل جائزہ نہیں لے سکتے۔ تاریکی میں ڈوبی ہوئی اور مختلف النوع جغرافیائی کیفیت کی حامل یہ اقلیم اپنے طور پر پکارتی ہے اور بلاتی ہے کہ چلے آؤ، ادھر بھی رخ کرو، یوں بھی دیکھو۔

نیٹشے نے لکھا ہے کہ جو پاتال میں دیر تک جھانک کر دیکھ لیتا ہے وہ پھر پاتال کا حصہ بن جاتا ہے۔ پاتال کی جھلک دکھانے کے لیے بلاوا دینے اور پھر پاتال کا جزو بنا دینے کی چکرا دینے والی یہ طاقت محمد حسین آزاد کے علاوہ کسی اور نثر نگار میں نظر نہیں آتی۔ وہ اپنے انداز جنوں کو نثر میں ڈھال لیتے ہیں اور ان کی دیوانگی میں بھی معنی ہیں۔ شیکسپیئر کے بقول:

There is a method in his madness

دیوانگی کے اس اسلوب کی مجھے بھی تلاش ہے اور اس کا ایک انوکھا امکان محمد حسین آزاد کے ہاں نظر آتا ہے اور اس کی نشان دہی کے لیے ان کے سوانح پر بھی نظر ڈالنا ہوگی اور ان کی تصانیف پر بھی۔

آزاد کے سوانح نگار ۱۸۸۵ء کو خط فاصل قرار دے کر ان کی دیوانگی کو امر واقعہ ثابت کر دیتے ہیں۔ چناں چہ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اس موضوع پر سب سے زیادہ مبسوط کتاب محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف کی جلد اول کے باب ''آزاد: عالم جنون میں'' کا آغاز یوں کیا ہے:

> ۱۸۸۵ء میں یا اسے کچھ قبل آزاد اپنی لڑکی کی وفات سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ ہوش مندوں کو جنون کا شبہ گزرا تھا لیکن یہ کیفیت عارضی تھی۔ سیر و سیاحت اور تصنیف و تالیف کی مصروفیات نے اس کے اثرات بہت کم کر دیے تھے، اثرات کم ضرور ہو گئے تھے لیکن ختم نہیں ہوئے تھے اور موقع پاتے ہی اس شدت کے ساتھ رونما ہوئے کہ آزاد کو پھر ان سے نجات نہ مل سکی......

اب اس نوع کا بیان بہت سے سوال اٹھاتا ہے جن کے تشفی بخش جوابات فراہم نہیں ہو سکتے۔ تاہم اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ دیوانگی کا عمل بتدریج بڑھنے والا سلسلہ تھا۔ عین ممکن ہے کہ بیٹی کی موت کے صدمے (bereavement) نے اس کو آج کی اصطلاح میں بندوق کی لبلبی دبا دی ہو (trigger off) یا ایک آہستہ ردعمل کی لے کو یک دم تیز کر دیا ہو، لیکن ظاہر ہے کہ یہ بھی قیاس آرائیاں ہیں اور اس انداز کی قیاس آرائیوں سے پرہیز لازم۔

لیکن اس معاملے میں سوانحی تفصیلات سے زیادہ قیاس آرائیاں ملتی ہیں، خاص طور پر جب سوانح نگار اس دیوانگی کا سبب بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق نے اس دیوانگی کی جڑ دیوان ذوق کی ترتیب میں آزاد کی غیر معمولی محنت وانہماک میں جا کر پکڑی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> آزاد کی دیوانگی کا راز دیوان ذوق کی ترتیب میں مضمر ہے......

''راز دیوانگی'' پالینے کی اس کوشش سے ڈاکٹر اسلم فرخی نے جزوی اتفاق کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ممکن ہو سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ دوسرے عوامل بھی کارفرما رہے ہوں گے۔ وہ لکھتے ہیں:

یہ خیال کسی حد تک صحیح ہوسکتا ہے لیکن اسے آزاد کی دیوانگی کا واحد سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل درست ہے کہ دیـــوان ذوق کی ترتیب میں آزاد نے غیر معمولی کاوش اور محنت سے کام لیا اور اس غیر معمولی محنت کی وجہ سے ان کے ذہن پر برا اثر پڑا۔ لیکن دیوانگی کی ابتدا پہلے ہی ہو چکی تھی۔ دوسرا حملہ پہلے حملے کی ایک شدید شکل تھا، نیا اور انوکھا حملہ نہیں تھا......

پہلے حملے اور دوسرے حملے کی تفصیلی وضاحت انھوں نے نہیں کی لیکن وہ یہ ضرور لکھتے ہیں:

اسباب جنون کا تجزیہ کرنے کے لیے ہمیں آزاد کی پوری زندگی پر نظر ڈالنا پڑے گی......

وہ ان ممکنہ اسباب کی نشان دہی کرنے لگتے ہیں تو اس کے محیط میں آزاد کی تقریباً پوری زندگی آ جاتی ہے۔ نو عمری میں آزاد کی محرومیوں کی تفصیل انھوں نے کتاب کے ابتدائی حصے میں رقم کی ہے، لیکن یہاں انھوں نے ۱۸۵۷ء سے ان واقعات کو ترتیب وار شمار کیا ہے:

۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۵ء تک کے پورے عرصے میں آزاد مطمئن، مسرور اور فکروں سے خالی نظر نہیں آتے۔ ۱۸۵۷ء نے انھیں شدید ذہنی، روحانی اور مادی اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے سانحات ایسے تکلیف دہ تھے کہ آزاد زندگی بھر ان کے ماتم دار رہے۔ باپ کا قتل ہو جانا، شیر خوار بچی کا توپ کے دھماکے سے دم توڑ دینا، عزیزوں کی جدائی، بادیہ پیمائی، غریب الوطنی، یہ سب باتیں ایسی نہیں کہ کوئی انسان بھی انھیں بھلا دے

مگر مشکل یہ ہے کہ آزاد جن مسائل کا شکار رہے، ۱۸۵۷ء ان کا نقطۂ انتہا نہیں ہے۔ یہ سلسلہ اس سے آگے بھی جاری رہا۔ محکمہ جاتی محنت، ملازمت میں مخالفت، کتابوں پر معاندانہ تبصرے اور اولاد کا صدمہ غرضیکہ ڈاکٹر صاحب نے پوری ایک فہرست گنوادی ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

ان سب باتوں نے مل جل کر ان کے ذہن پر بڑا برا اثر ڈالا اور آخر کار اپنی چہیتی بیٹی کے انتقال کی خبر سن کر ان کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آزاد کی دیوانگی کا سبب یہی صدمات تھے۔ مسلسل اور متواتر صدموں، مایوسیوں اور ناکامیوں نے انھیں مجنوں بنا کر چھوڑا۔ صدموں کی یورش اور غیر معمولی محنت، دماغ آخر کہاں تک ساتھ دیتا

ظاہر ہے ایسی کوئی فہرست مکمل نہیں ہو سکی اور نہ کوئی پوری طرح اندازہ لگا سکتا ہے کہ کس واقعے سے ذہن پر کیا اثر مرتب ہوا۔ آزاد کے سوانح نگاروں نے ان کی زندگی کے واقعات اور صدمات میں دیوانگی کے اسباب تلاش کرنے اور نشان زد کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اسباب کی تلاش بے سود ہے۔ دیوانگی اپنا سبب خود ہے۔ اس کو ڈھونڈنے کے لیے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ اسباب کی نشان دہی کے بجائے میں چاہتا ہوں کہ آزاد کی دیوانگی

کی مظہریات (phenomenology) اور اس کے وجودی مرکز کو دیکھا جائے۔ آزاد کے زمانے سے لے کر اب تک جدید نفسیات اور نفسیات مرضی کی ترقی جس نہج اور اصولوں پر ہوئی ہے، ان سے واضح ہو چکا ہے کہ دیوانگی اسباب کی پابند نہیں ہوتی۔ بظاہر معمولی اسباب یا بنا اسباب کے بھی لاحق ہو سکتی ہے اور نہ اسے صدمات کے ریکارڈ سے ناپا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اپنے زمانے کے مشہور ماہر نفسیات اور مصنف R. D. Laing نے اپنی کتاب The Politics of Experience میں برملا طور پر لکھا ہے:

Behind every mad person, there is a maddening situation.

ممکن ہے کہ ثقہ حضرات Laing کے نام پر ناک بھوں چڑھائیں کہ اپنے وقت میں تحلیل نفسی کا پیشوا معلوم ہونے والا یہ مصنف اب اتنا موقر نہیں رہا۔ لیکن آزاد کے سلسلے میں اس کی بات کو تقویت فتح محمد ملک کے دل چسپ مضمون ''آزاد کا طرز احساس'' سے ملتی ہے جس میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کو آزاد کی سائیکی کے دولخت ہو جانے سے منسلک کر کے دیکھا گیا ہے کہ ''ہے نا پاگل ہو جانے والی بات!'' واقعی ہے تو سہی، مگر کون سی بات؟ ۱۸۵۷ء کے غدر کا برپا کیا ہوا ثقافتی و تہذیبی انقطاع، جو شخصی و انفرادی سطح پر بھی اپنے نتائج چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، یا نقادوں کے اندازے؟ ۱۸۵۷ء کے واقعات آزاد کے لیے الم ناک تھے مگر ان واقعات کے بارے میں ان کا رویہ کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ وہ ان تبدیلیوں سے خود کو ڈھالنے کی کوشش بھی کرتے نظر آتے ہیں اور اسے ان کے مزاج کی resilience قرار دیا جا سکتا ہے یا پھر الم انگیز واقعات کے شعوری و لاشعوری sublimation کا وہ سلسلہ جو شخصیت کی تعمیر میں مد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس طور شخصیت کی تعمیر میں دراڑیں پڑ گئیں اور یوں خرابی کی صورت پیدا ہو گئی۔ لیکن یہ بھی اندازے ہیں، یقین سے کوئی بات اگر کہی جا سکتی ہے تو وہ آزاد کا جنون میں مبتلا ہونا ہے۔ یہ کیفیت جس فن کار پر گزرتی ہے وہی اسے جان سکتا ہے۔ رہ گئے ہم ایسے نقاد اور ان کے دور بیٹھے کے اندازے تو اس پر مجھے امریکی شاعر و ناقد جان کرورین سم کا پرانا مضمون یاد آنے لگتا ہے..... ''نقاد پاگل کیوں نہیں ہوتے'' (Why critics don't go mad)۔ پاگل ہونے کا راستہ بھی کھلتا ہے تو آزاد جیسے فن کار کے لیے۔

آزاد کی دیوانگی کے عالم اور اس دوران سرزد ہونے والی تصانیف کو ان کی تخلیقی و تصنیفی زندگی میں انقطاع (disruption) کے بجائے ایک اور جہت میں اس کے تسلسل کے طور پر دیکھنا بے سود نہ ہوگا۔ ان کی تخلیقی زندگی کا ایک اور مرحلہ جس میں اظہار و بیان کی کاوش پہلے کی طرح موجود ہے لیکن اظہار کے پیرائے مختلف اور ان کے مختلف ہونے میں ان کی معنویت پنہاں ہے، بدلی ہوئی معنویت جو مکمل طور پر داخلی کیفیت کے تابع نہیں ہے اور زبان کی کارفرمائی کے توسط سے قائم ہوتی ہے۔ یعنی زبان و اسلوب کا وہ منصب جو آزاد کی عالم ہوش کی تصانیف کا خاصہ تھا، ان تحریروں میں بھی فوقیت رکھتا ہے۔ اس کو یوں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ادیب کی شخصیت منہا ہو جاتی ہے، اس کی دماغی

حالت بھی درمیان سے ہٹ جاتی ہے اور نثری اسلوب پوری طاقت کے ساتھ کلام کرتا ہے۔ لیکن میں اس معاملے کو یوں دیکھنا چاہتا ہوں کہ نثری اسلوب ایک حساس پرچھائیں کی طرح حرکت کرتا ہے اور ذہن کی بھٹکتی ہوئی لرزشوں کو اپنے اندر سمو کر ایسی تصویر خلق کرتا ہے جس میں اسلوب دیوانگی کی ''موسیقی'' کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ سازِ جنوں بھی آزاد کا اعجاز ہے۔ آخری اور انتہائی کمال۔ اس بھٹکی ہوئی منزل پر آزاد اپنی مثال آپ ہیں۔ ہوش و خرد کی قربانی دیے بغیر کوئی دوسرا ادیب ان کا ہم سر ہو بھی نہیں سکتا تھا اور ہوش و خرد تو بہت سے لکھنے والوں کے ہاں رخصت ہوتا ہے، نثر کا لحن بھلا کس کے ہاں اس درجے پُر قوت ہو سکتا ہے کہ جنون کے پردۂ ظلمات میں بھی نمایاں رہے۔ دیوانگی کے عالم میں بھی آزاد بہر حال آزاد ہیں۔

ابھی ''دیدہ و شنیدہ'' آزاد کو ہم ہوش کی حد سے گزر کر دیوانگی کی کیفیت میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں، مگر یہ تصویر وقت کے ساتھ دھندلا گئی ہے اور اس کے خد و خال پوری طرح صاف اور واضح نہیں رہے۔ ''پاگل کر دینے والی بات'' جو پروفیسر فتح محمد ملک نے بیان کی ہے، اس کی بنیاد آزاد کا لاہور سے دلی پیدل سفر کے لیے نکل پڑنا، یوں ہی بغیر اطلاع کے وارد ہو جانا، نذیر احمد کا بدک جانا اور مولوی ذکاء اللہ کا آزاد سے حجامت بنوالینا جیسے واقعات پر قائم کی ہے۔ اسی طرح کے اور واقعات آزاد کے شاگردوں اور قریبی معاصرین نے قلم بند کر کے محفوظ کر دیے ہیں۔ پڑھانے کے دوران ربط اور تسلسل کی کمی جو پہلے پہل کالج کے شاگردوں کے مشاہدے میں آئی؛ روحانی تصرفات سے دلچسپی اور دعوے؛ غیر موجود شخصیات سے مکالمے؛ گھر والوں اور بعض ملنے والوں کے سامنے بے محابا گالم گلوچ؛ بعض لوگوں کو پہچاننے میں دھوکا، بلکہ کبھی مغائرت اور کبھی از حد بڑھا ہوا اخلاص؛ بے موقع فرمائشیں؛ خراب حلیہ اور اپنے حال پر بے توجہی؛ گھر سے یوں ہی نکل پڑنا اور کہیں کا کہیں پہنچ جانا اور اس کیفیت کے دوران ہوش کے ایسے وقفے (lucid intervals) کہ دیکھنے والوں کی پچھلی باتیں مشتبہ معلوم ہونے لگیں اور آخر آخر حال سے بے حال ہو کر بربادی و خرابی (degeneration) کا مکمل مرقع بن کر رہ جانا -- اس طرح کی کئی نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے ان میں سے چند ایک واقعات کو اپنی موقر تالیف میں درج کیا ہے لیکن اس معاصر دستاویزی شہادت کو محدود رکھتے ہوئے لکھا ہے:

> اس قسم کے اور بہت سے واقعات مختلف لوگوں نے لکھے ہیں، جن کو جمع کیا جائے تو ایک مختصری کتاب تیار ہو سکتی ہے، ہم طوالت کے خوف سے انھیں یہاں درج نہیں کر سکتے .....

بہر حال طول کلامی کا خطرہ مول لینا اور ایسی کتاب کا تیار کرنا اس ضمن میں مفید ثابت ہوتا۔ جن معاصرین نے اس دور میں آزاد کی مرقع کشی کی ہے انھوں نے واقعاتی احوال پر سارا زور صرف کیا ہے، وہ بھی افسوس و ہمدردی یا قدرے احساسِ تفنن کے ساتھ۔ ان واقعاتی شہادتوں کا احوال ادھورا ہے اور آزاد کی تشخیص مرض کے لیے نتیجہ خیز ثابت

نہیں ہوسکتا۔

اس ضمن میں جو دستاویز مکمل سند فراہم کرسکتی تھی وہ ملازمت سے برطرفی اور عدالتی حکم کی دستاویز ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنی کتاب میں اس کا حوالہ درج کیا ہے:

ضلع لاہور کے جج W.A. Harris ۱۸۵۸ء کی دفعہ ۳۵ کے تحت اپنے حکم مورخہ ۳ مئی ۱۸۹۰ء کے ذریعے سے آزاد کو دیوانہ قرار دے چکے تھے۔ آغا محمد ابراہیم ان کی جائیداد کے متولی اور سردار نریندر سنگھ آنریری اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور ان کی ذات کے نگراں مقرر ہوئے تھے......

اس عدالتی حکم نامے سے آزاد کی مکمل کیفیت ظاہر ہوسکتی تھی جو آج کسی clinical تشخیص میں ہماری رہ نمائی کرتی لیکن اس دستاویز کا محض حوالہ ہی موجود ہے، اس کی نقل نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے ''مقبوضہ آغا محمد باقر صاحب'' مگر اب کہیں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ ورنہ اس معاملے میں کلیدی دستاویز ثابت ہوسکتی تھی۔ افسوس کہ آزاد کی زندگی کے یہ آثار بے توجہی کی نذر ہوگئے۔

عدالتی اور طبی شہادتوں کی عدم دست یابی کے باعث ہم صرف ان محولہ بالا واقعاتی بیانات کو بنیاد بنانے پر مجبور ہیں، جن کی افادیت مشکوک نہیں مگر بہرحال محدود ہے۔ ان واقعات سے جن علامات کی نشان دہی ہوتی ہے، وہ اس طرح ہیں:

(۱) بے خوابی اور بدخوابی (مولوی خلیل الرحمٰن)

(۲) مراق بڑھتا گیا (مولوی خلیل الرحمٰن)

(۳) سب کے سامنے بیوی سے بدکلامی (مولوی خلیل الرحمٰن)

(۴) روحانی جذبات کا غلبہ (مولوی ممتاز علی)

(۵) ردی حالت (مولوی ممتاز علی)

(۶) بعض اوقات بالکل آپے سے باہر ہوکر خدا جانے کیا کیا سنا دیتے (آغا محمد طاہر)

(۷) پیدل سفر، لاہور سے دہلی اور علی گڑھ

(۸) گفتگو کبھی سلجھی ہوئی اور کبھی الجھی ہوئی، یہ خلل دماغ کا نتیجہ تھا...... (مولوی عبدالرزاق کان پوری)

(۹) لوگوں کو پہچاننے میں بعض مرتبہ اشتباہ (مختلف)

(۱۰) عملیات میں بڑھتی ہوئی دل چسپی (مولوی ممتاز علی)

تصانیف کی داخلی شہادت ان کے علاوہ ہے۔ ان بیانات کی روشنی میں یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محمد حسین آزاد کی یہ کیفیت schizophrenia کی کسی خاص قسم کا نتیجہ ہوگی۔ اس خیال کو تقویت تحریری شہادت سے یوں ملتی

ہے کہ ان تحریروں میں آزاد نے بعض مرتبہ اپنی زبوں حالی کا بیان کیا ہے لیکن اپنے بارے میں کسی ایسی بصیرت (insight) کے بغیر جو اس طرح کی کلینکل تفتیش میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے بجائے روحانی تصرفات کے دعوے اور کائنات گیر تخلیقی قوت کا اظہار کیا ہے جو حقیقت سے مطابقت نہ رکھتے ہوئے اس مرض کی خاص نشانی ہے۔ تحریروں کے دورانیے میں بھی منطقی استدلال کے بجائے آڑے ترچھے خیالات کی نمود داری ہے جو شطرنج کے گھوڑے کی سی چال چلتے ہوئے اس مرض کی ایک اور نشانی معلوم ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کی تصنیفات بھی مرض کی نشانی فراہم کرتی ہیں اور schizophrenic writing کی مثال ہیں، جس کی درجہ بندی ماہرین نفسیات نے تفصیل کے ساتھ کر رکھی ہے۔

آزاد کے عالم جنوں کے احوال دلچسپ بھی ہیں اور عبرت خیز بھی۔ دل چسپ میں نے یوں کہا کہ ان بیانات میں آزاد ایک کردار کی طرح اٹھتے بیٹھتے اور حرکات و سکنات کے دوران نظر آتے ہیں جس سے اس طرح کی تصویر سی آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے جیسے اردو کے سربرآوردہ ادیبوں کے قلمی مرقعے خود آزاد نے کئی نسلوں کے پڑھنے والوں کے لیے پیش کیے ہیں۔ اسی لیے یہ عجیب ستم ظریفی معلوم ہوتی ہے کہ ایسی چلتی پھرتی تصویر بن جانے کی صلاحیت آزاد میں خود کس درجے کی تھی۔ اس دلچسپی کے باوجود تشخیصی نقطۂ نظر سے معنی خیز وہ بیانات ہیں جن میں تصویری انداز کے بجائے علامات مرض کی نشان دہی ممکن ہو۔ چناں چہ ڈاکٹر محمد صادق نے مولوی خلیل الرحمٰن کے خط کا اقتباس درج کیا ہے:

> آزاد کی دیوانگی عجیب قسم کی تھی، پانچ منٹ دس منٹ بعض اوقات آدھا پونا گھنٹہ بہت اچھی طرح باتیں کر رہے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ پر کوئی اثر نہیں، حافظہ اور دل اچھا ہے۔ یکا یک دیوانگی شروع ہوگئی، لوگ دھوکے میں رہ جاتے اور حیران ہوتے تھے

یہ بیان بہت واضح ہے، مگر اس کا ماخذ ایک خط ہے جس سے خاص طور پر وقت کے تعین میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اس ضمن میں میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر محمد صادق سے یہ تسامح ہوا ہے کہ انھوں نے جس کیفیت کو آزاد کا عالم دیوانگی قرار دیا ہے، اسے جامد اور یکساں نوعیت کا حامل سمجھ لیا ہے۔ اس طرح متواتر تنزل (deterioration) اور مرض کی بتدریج بڑھتی ہوئی کیفیات کا جائزہ مرتب نہیں کیا گیا جس سے ان کے بارے میں کوئی حتمی نتیجہ اخذ کرنے میں سہولت ہوتی۔

آزاد کے عالم جنوں کا جہان معنی مختلف ہے۔ اس میں آزاد کے ساتھ ساتھ ہم ایسی باتوں سے روشناس ہوتے ہیں جن کا سراغ بھی ان کی عالم ہوش کی تصانیف سے کم کم ملتا ہے۔ روحانیات کی طرف حد سے بڑھتا ہوا شغف (مکاشفات اور فلسفہ الٰہیات) اس کیفیت کا سبب بھی ہے اور اس کا نتیجہ بھی۔ بسا اوقات روحانیات کا یہ

تصرف ایک ایسا پردہ بھی بن گیا ہے جس میں جنون کے آثار چھپ گئے ہیں۔ عالم جنون کی کئی تصانیف میں آزاد اپنے آپ کو ''پروفیسر آزاد'' کے نام سے مخاطب کرتے ہیں اور مکالمے ومجادلے کے مراحل سے گزرنے لگتے ہیں۔ اس ڈرامائی انداز کی ابتدا کا سراغ دربار اکبری سے ملتا ہے جہاں بعض مقامات پر اکبر کے دور کی جدلیات کے دوران اپنے مشاہدے کو جگہ دیتے ہیں۔ یہ محض اسلوب کی تکنیک نہیں، ایک نفسیاتی معاملہ بن کر اس وقت اور بھی نمایاں طور پر سامنے آنے لگتا ہے جب آزاد اپنے لیے شخص سوم مفرد کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے اپنے لیے ایک Persona خلق کر لیتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک نفسیاتی پرسونا مہاراجہ جے چند کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے جب وہ اپنے تاریخی تناظر سے منقطع ہو کر کسی شہاب ثاقب کی طرح آزاد کی منتشر ذہنی کہکشاں میں نمودار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کی رائے میں آزاد جب راجہ جے چند کا نام لیتے ہیں تو وہ آپنے آپ کو اس کا اوتار سمجھتے ہیں۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز ومعنی خیز پروفیسر آزاد کا خود اختیار کردہ یہ پرسونا ہے جس میں وہ اپنے آپ کو نظم دنیا کا اہم حصہ بلکہ تخلیق کائنات کا حامل اور شریک سمجھنے لگتے ہیں اور نثر کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے جہاں جانور اپنی اپنی صورتوں میں تخلیق کیے جا رہے ہیں اور درجے تفویض کیے جا رہے ہیں۔ اس انداز کو آزاد کا روحانی تصرف سمجھیے یا نہ سمجھیے، میں تو اسے ان کی نثر کا اعجاز سمجھتا ہوں، جو اپنے آپ میں اس قدر رچا ہوا ہے کہ محتاج معنی بھی نہیں۔

شخصیت کی طرح بعض واقعات بھی ایک معکوس صورت میں ان تصانیف میں نظر آتے ہیں۔ آزاد نے اپنی زندگی کے کئی واقعات، خاص طور پر ملازمت کے مسائل کا ذکر ایک oblique انداز میں کیا ہے مگر سب سے زیادہ درد انگیز ۱۸۵۷ء کا وہ تذکرہ ہے جس کے رنگ دیوانگی کے بغیر ان کی تصانیف میں نمایاں نہیں ہوتے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات جس طرح رونما ہوئے، اس سے آزاد کو ایک شدید دھچکا پہنچا اور ان کی زندگی کا orientation بدل کر رہ گیا۔ آزاد کے بیش تر سوانح نگاروں نے ان واقعات کے صدمے کو ان کی ذہنی کیفیت میں اختلال کی بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے مضمون ''آزاد کا اسلوب فکر'' میں ان واقعات کے اثر کو آزاد کی شخصیت میں پڑنے والی دراڑ کے طور پر دیکھا ہے جو انگریز حکمرانوں کی ملازمت سے مفاہمت یا compromise کے باوجود اندر ہی اندر پروان چڑھتی رہی:

> فاتح (یعنی انگریز) کے ساتھ آزاد کا تعاون محض بالائی سطح تک محدود اور سراسر مصلحت وقت کے تابع تھا۔ مگر آزاد کے باطن نے فاتح کو ہرگز قبول نہیں کیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو وقت کے سامنے جھکنے کے ساتھ ساتھ اپنے ضمیر کو سلا دینے میں خاصے مشاق ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آزاد کے اندر ایک کہرام سا برپا ہو گیا۔ ایک طرف وہ حکومت سے سمجھوتا کرنے پر مجبور تھے۔ دوسری طرف اپنے ضمیر کی آواز سے برسرِ پیکار ہو گئے تھے۔ چنانچہ بعد ازاں ان پر دیوانگی کی جو حالت طاری ہوئی، قیاس کہتا ہے کہ وہ دراصل

شخصیت کے دو نیم ہونے ہی کی باعث تھی......

(مشمولہ تنقید و احتساب ۱۹۶۸ء)

اس کے اثرات کا اظہار چاہے جو شکل بھی اختیار کرے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کا آزاد پر نہایت گہرا اور دیرپا اثر ہوا اور وہ تاعمر ان کو فراموش نہیں کر سکے۔ مولوی خلیل الرحمن نے ان واقعات کے ذکر ہی پر آزاد کے ردعمل کو ریکارڈ کیا ہے:

ایام غدر کے مصائب کا طبیعت پر بہت ہی زیادہ اثر تھا۔ نہ پوچھیے میں نے صبح کی ہوا خوری یا شام کی فرصت میں بار بار چھیڑا اور انجام آنسوؤں پر ہوا......

(بحوالہ ڈاکٹر اسلم فرخی، محمد حسین آزاد، احوال و آثار)

آزاد کا یہ ردعمل ظاہر ہے کہ فطری معلوم ہوتا ہے مگر یہ ردعمل ان کی گفتگو یا ذاتی encounter تک محدود رہتا ہے، ان کی تصانیف میں جگہ نہیں پاتا۔ چنانچہ ڈاکٹر اسلم فرخی نے نشان دہی کی ہے کہ آزاد نے اپنی زندگی کے اس ہنگامہ خیز دور سے متعلق کوئی بات وضاحت کے ساتھ نہیں لکھی۔ اس کے بعد وہ اس اغماض کی ممکنہ وجوہات کی نشان دہی بھی کرتے ہیں، جو ایک علیحدہ مطالعے کا موضوع ہیں اور اس ضمن میں ایک مفید مطالعہ رفاقت علی شاہد نے اپنے مقالے ''مولانا محمد حسین آزاد اور ۱۸۵۷ء'' میں پیش کرتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا ہے:

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مولانا آزاد نے کافی مصائب اور رنج برداشت کرنے کے باوجود ۱۸۵۷ء کے دوران خود پر بیتنے والے حالات، واقعات اور خیالات کو بہت تفصیل سے کہیں بیان نہیں کیا......

اس کے برخلاف رفاقت علی شاہد غالب کے رویے کو قرار دیتے ہیں جنھوں نے اپنے نہ صرف یہ کہ اپنے خطوط میں حوادث اور مسائل رقم کر دیے ہیں بلکہ دستنبو میں تمام واقعات کو اس طرح لکھ ڈالتے ہیں جسے آج کا کوئی ادیب رپورتاژ یا روداد (chronicle) قرار دے سکتا ہے۔ میری دانست میں یہاں آزاد کے معاصر اور رفیق نذیر احمد کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے، جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے بارے میں ''فاتح بیانیے'' کو فروغ دینے کی غرض سے مصائب غدر نامی کتاب کا ترجمہ کیا، جو غالباً ان کے لیے مفاہمت کی وہ صورت تھی جو سامنے آئی۔ علاوہ ازیں ابن الوقت میں غدر اور اس سے بڑھ کر اس کے ثقافتی مضمرات کو براہ راست موضوع بنایا۔ یہ بات بہر حال محل نظر ہے کہ نذیر احمد سے زیادہ engaging معاملہ مجھے غالب کا لگتا ہے اور میں غدر کو نذیر احمد کی عینک سے نہیں، غالب کی آنکھوں سے دیکھنے میں ایک گونہ عافیت پاتا ہوں:

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

سماجی درہمی اور بحران کا سامنا اپنی افسردگی کے ساتھ کرنے کے معاملے میں غالب ہماری رگ جاں سے قریب ہیں لیکن آزاد کی خاموشی اِن کی زندگی کا تجزیہ کرنے والے تمام لوگوں کی طرح مجھے بھی ایک عقدۂ غور طلب معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اسی سے منسلک معلوم ہوتی ہے کہ جب آزاد عقل وخرد کی سرحد عبور کر کے جنوں کی اقلیم میں داخل ہوئے تو وہ مفاہمت یا احتیاط جو ان کی خاموشی کا سبب بنی تھی، پیچھے رہ گئی اور غدر کے واقعات ایسا درد بن کر سامنے آئے جس کا مداوا نہیں ہو سکا تھا۔ عالم جنوں کی تصانیف میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کا اتنا ذکر ہے کہ آغا سلمان باقر نے اپنی کتاب میں ایک علیحدہ باب اس عنوان سے قائم کیا ہے (۱۸۵۷ء کے واقعات، وارفتگی کی تحریروں میں) اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے بھی اپنے تفصیلی مقالے میں نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ۱۸۵۷ء کے واقعات آزاد کے غیر مطبوعہ رسائل میں موجود ہیں۔ بیش تر مقام پر منتشر تصاویر ہیں جن میں ربط پیدا کرنا مشکل ہے۔ لیکن ان سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ آزد کے لاشعور میں یہ پر اذیت تصاویر عالم جنوں میں کس طرح ابھرتی ہیں......
>
> (ڈاکٹر تبسم کاشمیری، آزاد کا عالم دیوانگی، اوراق، فروری مارچ ۱۹۸۱ء)

میری دانست میں ان منتشر تصاویر کو معنی سے تہی قرار دینا درست نہ ہوگا کہ جہاں جہاں یہ منظر ابھر کر سامنے آیا ہے، یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس کا موجب ایسی تکلیف ہے جس کو فراموش نہیں کیا جا سکا اور آزاد کا حافظہ ذرا ذرا سی بات کو بھی کرب انگیز تفصیل کے ساتھ دہرائے چلا جا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر برباد ہو گیا، گھر لٹ گیا، باپ موت کے گھاٹ اتارے گئے اور آزاد بھی ہوش وخرد سے بے گانہ ہوئے مگر ان کی شخصیت کے کسی نہ کسی حصے میں غدر ایک unresolved تصادم کی طرح جاری ہے اور رہ رہ کر ٹیس بن کر اٹھتا ہے۔ بیان کی اس صورت تک آنے کے لیے انھیں دیوانہ بننا پڑا۔ آزاد کی یہ دیوانگی خود ایسا خوف ناک بیانیہ ہے کہ جس کا ذکر غدر کے کسی محضرنامے میں درج نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تاریخ سے شروع ہو کر پھر تاریخ کی حدود سے اتنا ماورا ہو جاتی ہے کہ پھر دیوانگی ہی آپ اپنی تاریخ ہے۔ تاریخ کی وہ واحد صورت جو آزاد کے لیے ممکن رہ گئی تھی۔

عالم جنوں کی تصانیف میں یہ منتشر اور غیر مربوط (خارجی طور پر) بیانیہ بھی ۱۸۵۷ء کے واقعات پر آزاد کے اس ردعمل کا نیم تاریک دوسرا رخ ہے جو اس سے پہلے کے دور میں ان کی خاموشی اور تحریر میں اس موضوع سے گریز سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ تضاد آزاد کی شخصیت کا ایک بنیادی schism ہے لیکن اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء کا ذکر آتے ہی ہم سب ایک نوع کے اجتماعی اور تاخیر سے برآمد ہونے والی رومانویت کا شکار ہو جاتے ہیں جہاں ہر پرچھائیں اپنے حجم سے بڑی نظر آنے لگتی ہے۔ آزاد کی زندگی کے جملہ مسائل اور بعد میں ظاہر ہونے والے ہر تضاد کو ۱۸۵۷ء کی اصطلاحوں میں بیان کرنا اور اس طرح حل کرنا ایک پر سہولت ذریعہ فراہم کر دیتا ہے۔ یہ ضرور ہے

کہ آزاد نے بہت تکلیفیں سہہ لیں اور ایسے حالات سے گزرے جنھیں ہوش ربا قرار دیا جا سکتا ہے لیکن دیوانگی صرف و محض ۱۸۵۷ء کے واقعات سے گزرنے کے عوامل و نتائج میں سے ایک ہو سکتی ہے، صرف و محض اسی سے سلسلے وار ٹھہرانا مشکل ہے۔ ایک طرح کی تخفیف پسندانہ غلط فہمی (reductive fallacy) جس سے پرہیز آزاد کے جنوں جیسے پیچیدہ مظاہر کا ابتدائی جائزہ بھی لینے کے لیے امر لازم ہے۔ دراصل آزاد کے عالم جنوں کی مظہریات (phenomenology) اپنے آپ سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہم سے ایسے تنقیدی آلات کا تقاضہ کرتی ہیں جو ہم ابھی تک بہم نہیں پہنچا سکے ہیں اور جن کی غیر موجودگی میں یوں ہی بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اس کے باوجود جن مہم جو تجزیہ نگاروں نے آزاد کی تخلیقی شخصیت کے اس منفرد حصے کے مطالعے کی ہمت کی ہے، ان میں خاص طور پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مفصل مقالے کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، جس میں وہ آزاد کی شخصیت میں ''پرسونا کی شکست و ریخت'' کے عمل کا ذکر کرتے ہیں اور عینی شواہد کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف کو بھی معرض گفتگو میں لاتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اس قسم کا تجزیہ بھی ایک سے زیادہ مرتبہ دہرایا ہے:

> ۱۸۵۷ء کے حادثات نے آزاد کے اعصابی خلیوں (nerve cells) کو شدید نقصان پہنچایا

ایک اور دلچسپ اور کئی اعتبار سے اہم مطالعہ آغا سلمان باقر کی مختصر کتاب آزاد کا عالم وارفتگی میں سامنے آتا ہے جس کی ایک اہمیت بعض غیر مطبوعہ ماخذ تک رسائی اور ان کا ذکر بھی ہے۔ آغا سلمان باقر آزاد کے اس دور کے لیے دیوانگی کے لفظ کو مسترد کرتے ہوئے اسے ''وارفتگی'' قرار دیتے ہیں۔ ''وارفتگی'' کا لفظ انھوں نے آغا محمد باقر کے اس بیان سے لیا ہے جہاں وہ اس کیفیت میں بھی پورے اہتمام کے ساتھ تصنیف و تالیف میں آزاد کی مشغولیت کا ذکر کرتے ہیں اور اسے ''آزادروی'' سے جوڑ لیتے ہیں جو ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق آزاد کا تخلیقی مزاج تھا:

> ان کی شخصیت کا غالب اور اہم ترین پہلو آزادی اور آوارہ خرامی کے رجحان سے متعلق تھا۔ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ آزاد کی آزادہ روی ان کے مخصوص حالات کا نتیجہ تھی

(ڈاکٹر وزیر آغا، نظم جدید کی کروٹیں)

''وارفتگی'' کی وضاحت کرتے ہوئے آغا سلمان باقر نے لکھا ہے:

> حقائق کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آزاد کا یہ عالم جنوں یا پاگل پن نہیں تھا بلکہ ذہن کی ایک ایسی ماورائی کیفیت کا وہ مقام تھا جہاں دنیا کے مادی نظریات دم توڑ دیتے ہیں اور زندگی کا مقصد اور روحانی نظریات عملی طور پر ذہن میں اپنی کیفیات مرتب کرنا شروع کر دیتے ہیں

ظاہر ہے کہ آزاد کے انہماک کو کئی طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔ ہر چند کہ جنوں میں میرے حساب سے کوئی عیب یا سامان رسوائی نہیں لیکن وارفتگی کا یہ لفظ بھی مفید معلوم ہوتا ہے، کہ اس کے ذریعے سرشاری و جولانی mood

swing کی اس کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو آزاد کی بعض تصانیف میں بھی نظر آتی ہے۔ آپ اسے کوئی بھی نام دے لیں، جنوں کا نام چاہے خرد رکھ دیں، یہ اپنی تفہیم کے لیے اپنی شرائط سامنے لے کر آتی ہے اور ہم اس کا مطالعہ اس انداز سے نہیں کر سکتے جس طرح رواروی میں ممکن ہوتا ہے۔ وارفتگی کی لہر ان کی معروف کتابوں میں بھی سامنے آتی ہے اور ان کے اسلوب نثر کا جز و خاص ٹھہرتی ہے تو کیا اس طرح ہم جنوں کو بھی آزاد کی شخصیت کا ایک رخ سمجھ لیں جس کی تکمیل آہستہ آہستہ ہوتی رہی اور ایک وقت آنے پر باقی عناصر پر غالب آ گئی۔ بہر حال، اسباب و علل جو بھی رہے ہوں، آزاد کی اس کیفیت نے جن تصانیف کو جنم دیا وہ ایک آزاد مطالعے کی مستحق ہیں اور ان کو نہ تو رسمی و روایتی سانچوں میں ٹھونسا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان سے سرسری گزرا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے سب سے پہلے تو ہمیں تعصب کی عینک اتارنا ہوگی اور آزاد کی زندگی کے بارے میں سوانحی معلومات یا نفسیاتی و سماجی تاویلات کو قائم بالذات نہیں بلکہ محض ایک ذریعہ سمجھ کر ان کتابوں کو ادب کے طور پر پڑھنا ہوگا اور اسی اعتبار سے ان کا تعین قدر کرنا ہوگا۔ جس کی بابت اس مقالے میں ابتدائی گفتگو کی گئی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آزاد کی سوانحی تفصیلات کے بارے میں ہمارے علم میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا لیکن سائیکاٹری کے علم میں روز افزوں ترقی کی بدولت اب یہ بات خارج از امکان نہیں کہ ایک ابتدائی حالت کے طور پر ہم آزاد کی مرضیات نفسی کو پہچان سکیں۔ سائیکاٹری میں DSM-III اور پھر DSM-IV جیسے درجے بندی کے نظام تشکیل میں آ چکے ہیں جو علامات مرض کی ترتیب سے مرض کی نشان دہی کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ آزاد کے ضمن میں ان کے دوستوں، شاگردوں کے رقم کردہ احوال سے کسی مفصل میڈیکل رپورٹ کی غیر موجودگی میں مدد لی جا سکتی ہے اور پھر فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنے کے لیے ان کی تحریریں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ان بیانات کو DSM-IV کے سامنے رکھ کر ترتیب دینے سے آزاد کی تشخیص ممکن ہو سکتی ہے۔

کسی بھی نتیجے پر پہنچنے کے ساتھ ساتھ اس طریقہ کار کی محدودات کا اندازہ بھی لگا لینا چاہیے۔ خاص طور پر گورڈن کلیرج (Gordan Claridge) کی تحقیق کی روشنی میں۔ کلیرج نے دس ایسے ادیبوں کا خصوصی جائزہ لیا جنھوں نے اپنی ذہنی بیماری کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے -- مارجری کیمپ، تھامس ہوکلیف، کرسٹوفر اسمارٹ، ولیم کاؤپر، جان کلیر، جان رسکن، آرتھر بین سن، ورجینیا ولف، انتونیا وائٹ اور سلویا پلاتھ۔ (نفسیاتی خلل اور تخلیقی قوت کے درمیان گہرے تعلق کے اس جائزے تک رسائی کے لیے میں رچرڈ بینٹل کی کتاب Madness Explained کا سپاس گزار ہوں جہاں سے مجھے اس کا حوالہ حاصل ہوا)۔ کلیرج نے اپنے تجزیے کی تفصیل لکھی ہے کہ ان ادیبوں کے بیان کردہ علامات جب opcrit کے کمپیوٹر تشخیصی پروگرام میں کوڈ کی گئیں تو زیادہ تر معاملات میں تشخیص اسکیزوفرینیا کی ہوئی لیکن کئی ایک جگہ bi-polar disorder بھی نکل کر آیا۔ کئی ادیب ایسے تھے جن

میں بیک وقت دونوں ہی بیماریوں کی تشخیص ہوئی اور اس بات کا انحصار اس امر پر تھا کہ کس طرح کی درجہ بندی اور معیار کا استعمال کیا گیا۔ آخری تجزیے میں، مجھے آزاد کا معاملہ بھی اسی طرح کا نظر آتا ہے اور ان کی تشخیص دونوں میں سے ایک مرض کے حساب سے کی جاسکتی ہے۔

رچرڈ بینٹل نے اپنی محولہ بالا کتاب میں کئی بار اس مشکل کا ذکر کیا ہے جو روایتی اندازے کے مطابق dementia precox اور manic depression کے درمیان تفریق کرنے میں پیش آتی ہے۔ آزاد کے مطالعے میں بھی یہی مشکل آڑے آتی ہے اور اس معاملے کی مزید چھان پھٹک کی ضرورت ہے کہ جنون کے حوالے سے آزاد کو اور آزاد کے حوالے سے جنون کو بہتر سمجھ سکیں۔

اسلوب کی چاشنی اور ادبی دل کشی کے باوجود تحریر جہاں اپنے مصنف کے ذہنی مرض کی تشخیص میں گواہ کی طرح شامل ہو جائے، محمد حسین آزاد بھی ادبی دنیا کے ان چند ادیبوں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں جن کی ''تحریر جنوں'' Schizophrenic writing جنوں آثار کے باوجود ادبی خصوصیات سے مبرا نہیں ہیں اور اپنی جانب توجہ مبذول کرتی ہیں۔ کسی نہ کسی حد تک آزاد سے مماثل ان میں سے بعض ادیبوں کا تذکرہ یہاں بے سود نہ ہوگا جن کے تناظر سے آزاد کی ان تحریروں کی تفسیر و تعبیر میں کسی قدر مدد مل سکے۔

تاریخی اعتبار سے پہلا اہم نام جو مجھے اس ضمن میں یاد آتا ہے، وہ کرسٹوفر اسمارٹ کا ہے۔ روحانیت کا شدید غلبہ اٹھارویں صدی کے اس شاعر کی دیوانگی کی نشانی ٹھہرا۔ چنانچہ ڈاکٹر جانسن نے لکھا ہے کہ میرا بے چارہ دوست اپنے دماغ کے خلل کا مظاہرہ کرتے ہوئے سڑک پر دوزانو ہو جاتا اور حمد و ثنا میں مشغول ہو جاتا۔ براؤننگ جیسے شاعر نے اس نابغہ روزگار کو یوں خراج تحسین پیش کیا جو اس کی کتاب کے اشتہار میں بھی درج کیا گیا ہے:

"(he) pierced the screen

Twixt thing and word, lit language straight from soul..."

قرض داروں کی عقوبت گاہوں اور پاگل خانوں میں برسوں محیط عرصے میں وہ برابر نظمیں لکھتا رہا جن کی بنیاد پر انگریزی ادبیات کے نقاد اسے اٹھارویں صدی کے اہم ترین شاعروں میں سے ایک قرار دیتے ہیں۔ اسمارٹ کے شعری وژن کو اس کے religious mania سے مکمل طور پر علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ حال آنکہ بعض نقادوں نے اسمارٹ کی فکر میں تھیولوجی کو خاص طور پر تحقیق و تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ بعض معاملات میں وہ اپنے بعد آنے والے اور پیغمبرانہ شان کے حامل شاعر رابرٹ بلیک کے قریب پہنچا ہوا معلوم ہوتا ہے حالاں کہ بلیک کی ذہنی حالت کو نفسیات کے مطابق کوئی نام دینا زیادہ مشکل کام ہے۔ فرانسیسی شاعر نرول Gerard de Nerval کا بھی یہاں نام لیا جاسکتا ہے۔ نثر نگاروں میں زیادہ اہم نام جرمن ادیب رابرٹ والزر (۱۸۵۷ء تا ۱۹۵۶ء) کا ہے جس کے چند ناولوں اور

افسانوں کی بدولت سوزن سونٹیگ جیسی نقاد اسے بیسویں صدی کے اہم ترین جرمن ادیبوں میں سے ایک قرار دیتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ والزر کے مختصر افسانوں، حکایتوں، تمثیلچوں کی فضا و اسلوب میں کافکا کے خاص انداز کی پیش روی ملتی ہے۔ کافکا اس ادیب کا معترف بھی تھا اور اس کی بعض ابتدائی تحریروں پر نقادوں کو والزر کا نام یاد بھی آیا۔ والزر کی ابتدائی تحریروں کو اختصار و سادگی پر، جو ظاہری طور پر غیر ادبی معلوم ہوتی تھی، رائے زنی کرتے ہوئے اس کے انگریزی مترجم کرسٹوفر مڈلٹن نے اسے اس عہد کے تاریخی ارتقاء کی ایک اہم کڑی کے طور پر دیکھا ہے اور ایک عجیب بات لکھی ہے:

What name should be given to this kind of intensity? When a new mode of imagining erupts into literature, it dislocates the rhetoric if its time, and is of subtler stuff than that rhetoric--"the infinite amires barefoot on this earth," says Hans Arp.

(مڈلٹن، دیباچہ ژاکوب فان گنٹن)

کئی کتابوں کی اشاعت کے بعد والزر کے مزاج میں شوریدگی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۹ء میں وہ از خود نفسیاتی مریضوں کی علاج گاہ میں داخل ہو گیا۔ دیوانگی کی مہر تصدیق ثبت ہو جانے کے بعد، آزاد کے برخلاف، اس کا لکھنا یکسر موقوف ہو گیا اور اس کے ایک دوست نے اس کی گفتگو سے یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ ''میں یہاں لکھنے کے لیے نہیں بلکہ پاگل ہونے کے لیے آیا ہوں۔'' (I'm not here to write, but to be mad.)

آخر ہم یہاں کس لیے آئے ہیں؟ لکھنے کے لیے یا پاگل ہونے کے لیے؟ آزاد کے نزدیک شاید یہ سوال ہی نہ اٹھتا ہو کیونکہ وہ دونوں حالتوں میں تفریق نہ کرتے۔ یہ تفریق شاید اینا کیون (Anna Kavan) بھی نہ کرتی (۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۰ء) جو ذہنی بیماری کے باوجود (یا باوصف) لکھتی رہی اور بعض مبصرین نے اسے ورجینیا ولف کے بعد ابھرنے والی خواتین ناول نگاروں میں نمایاں ٹھہرایا۔ کیون کی مشکلات میں ذہنی بیماری کے پیچاک کے علاوہ ہیروئن کی لت بھی شامل تھی اور غالباً یہی اس کے ناول ''Ice'' کے اچھوتے پن کا موجب بھی بنی ہو۔ اینا کیون کی ایک تحریر کا اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے محمد سلیم الرحمٰن نے اس بارے میں مختصر مگر جامع انداز میں لکھا ہے:

اینا پر گہری بے کیفی طاری رہتی تھی۔ اس وقت کے طبی حلقے اس طرح کی بے کیفی یا ڈپریشن کو بیماری تصور نہ کرتے تھے...... بار بار ذہنی امراض میں مبتلا رہنے سے اس کے جینے اور لکھنے کے اسلوب دونوں ہی بدل گئے۔ ہم اس کے فکشن میں ایسے فرد کے کرب سے دوچار ہوتے ہیں جو مسلسل تشویش، تجسس اور تنہائی کے

نرغے میں ہے اور اپنی شناخت کے بارے میں متذبذب ہے۔ ان سلسلہ وار واہموں کو تراش خراش کر فکشن میں ڈھالنا، یہی ایناکیون کا کمال ہے......

رابرٹ والزر سے کہیں زیادہ وقیع مطالعہ سوزن سونٹیگ نے فرانسیسی شاعر اور ڈرامہ نگار اینٹونن آرتو (Antonin Artaud) کا کیا ہے (۱۸۹۶ء تا ۱۹۴۸ء) جسے وہ ''ادبی جدیدیت کے سورمائی دور کی آخری عظیم مثالوں میں سے ایک'' قرار دیتی ہے۔ آرتو جیسے ادیب کے لیے مختصر طور پر کچھ کہنا میرے لیے ممکن نہیں، تاہم مختلف اصناف اور متفرق اسالیب میں اس کی تحریروں میں اس کی ذاتی اذیت نمایاں ہے اور وہ بقول خود، اپنے شعور سے اپنی بڑھتی ہوئی مغائرت کو اس طرح موضوع بناتا ہے کہ سونٹیگ کے مطابق، کسی دوسرے شخص نے ذہنی درد کے مائیکرو اسٹرکچر کا ایسا ان تھک اور مفصل رکارڈ نہ رکھا ہوگا۔ موضوع کی نشان دہی کے باوجود اس سے آرتو کی فکری و نظریاتی اہمیت واضح نہیں ہوتی اور نہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرئیلزم سے لے کر اپنے عہد کے ادبی آواں گارد کی یہ مبلغ مابعد جدیدیت کے لیے اتنا کلیدی ادیب کیوں ٹھہرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آرتو کے ''کیس'' نے مشیل فوکو کی اہم کتاب Madness and Civilization کی نظریاتی اساس فراہم کی اور جدید سماج کے تجزیے کے لیے گائلز ڈیلیوزی Gilles Deleuze اور فیلکس Felix Guattan بھی بروئے کار لا سکے۔ وان گو کے بارے میں لکھتے ہوئے آرتو نے شکایت کی تھی کہ معاشرہ اسے ناٹ باہر کرنے کے لیے خودکشی کرتا ہے (Suicided by society) لیکن اس کے باوجود وہ جدید ادب کے لیے اسی طرح ایک کلیدی شخصیت قرار دیا جاتا رہا ہے۔ جس کا خواب بھی آزاد کے ناقدین نہیں دیکھ سکتے۔ اس لیے کہ آزاد کی یہ تحریریں محفوظ رکھے جانے، شائع کیے جانے اور بالکل ابتدائی و بنیادی تجزیے کے عمل سے گزرنے سے بھی محروم رہیں۔ ہم ہوش مندوں کو نظر انداز کرنا جانتے ہیں، دیوانہ تو پھر دیوانہ ہے چاہے وہ دیوانہ محمد حسین آزاد جیسا نابغہ ہی کیوں نہ ہو۔

اوپر جن مغربی ادیبوں کے حوالے دیے گئے، ان کے برخلاف، آزاد کے آخری دور کی ان تحریروں سے اغماض اور بے توجہی عام ہے۔ نقادوں نے انھیں درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا، تجزیہ اور تفہیم تو دور کی بات۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ افسوس ناک رائے آزاد کے سوانح نگار ڈاکٹر محمد صادق کی ہے۔ ''آزاد کا عالم دیوانگی'' نامی مضمون میں ان تحریروں کی وجہ تسمیہ آزاد کی ''تحریر کی عادت کو راسخ'' ہو جانے کو قرار دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

میں نے مولانا کی ان تحریروں کو دیکھا ہے۔ نہایت خوبصورت خط میں لکھی ہوئی ہیں لیکن محض الفاظ کا ڈھیر ہے، نہ ربط ہے نہ معنی......

(آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین، لاہور، ۱۹۷۳ء)

نقاد کی رائے اتنی اٹل اور فیصلہ کن ہو تو اس کے بعد تنقیدی مکالمے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور اس میں کسی

ترمیم یا اضافے کی گنجائش تلاشِ بے سود۔ جہاں معنی فوری طور پر دستیاب یا سطح پر بکھرے ہوئے نہ ہوں اور ربط، متعین شدہ اصناف کی خارجی و ظاہری ترتیب سے علیحدہ داخلی ربط کی شکل میں نمودار ہوا ہو، جنون کا عطا کردہ غیر منطقی ربط ہی سہی، وہاں ان عناصر کی موجودگی سے صریح انکار، تجزیے کے منصب کی ادائیگی سے بچ نکلنے کا سہل ترین راستہ بن جاتا ہے۔ ربط و معنی کی ظاہری شکلوں سے اجتناب کے باوجود ان تحریروں میں ایک عنصر کی موجودگی سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا اور وہ ہے آزاد کا نثری اسلوب۔ میری ناچیز رائے میں صرف یہی ایک عنصر ان تحریروں کی اہمیت کے لیے کافی ہونا چاہیے۔

خارجی شواہد کے مطابق، زبان پر عبور نے اس عالم میں بھی آزاد کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا اور اس کا اندازہ ان کے قریبی دوستوں کو بھی تھا، چاہے وہ اس کے receiving end پر ہی کیوں نہ ہوں۔ مولوی عبدالرزاق کانپوری نے اس کیفیت کا ایک دل چسپ مرقع کھینچا ہے جو اس ضمن میں توجہ کے لائق ہے:

> جب لاہور میں ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس ہوا اور شمس العلما نذیر احمد بھی شریک ہوئے تو آزاد بھی مہمان خانے میں اپنے ہم مکتب دوست سے ملاقات کو تشریف لائے۔ بچپن کے یار تھے اور خدا جانے کس مدت میں ملے تھے، اس لیے دیر تک گفتگو ہوئی۔ کبھی سلجھی ہوئی اور کبھی الجھی ہوئی، یہ خلل دماغ کا نتیجہ تھا۔
> اسی اثنا میں مولانا نذیر احمد نے ازراہ کسر نفسی فرمایا کہ ''سر سید کی فرمائش سے کانفرنس میں میرا بھی ایک لکچر ہو گا۔ اگر آپ ایک نظر ملاحظہ فرمالیں تو مجھے اطمینان ہو جائے، یہ سنتے ہی کہا کہ وہ لکچر کہاں ہے؟ مولانا نے پیش کیا اور آزاد نے اسی جگہ دیکھنا شروع کیا اور ایک گھنٹہ کے اندر پورا لکچر دیکھ لیا۔ کوئی صفحہ ایسا نہ تھا جو اصلاح و ترمیم سے باقی رہا ہو، اخیر میں فرمایا۔ بھئی نذیر تم اردو لکھنا بھول گئے ہو، اس کے بعد اٹھے اور چلے گئے، یہ گویا ایک آندھی تھی جو آئی اور ہوا ہوگئی۔

آزاد کے عالم جنوں کی تصانیف میں کسی اعتبار سے یکسانیت نہیں ہے کہ ان کو ایک ہی طرح کے متن قرار دیا جاسکے، زبان کے اعتبار سے نہ انشا کے مطالب کے اعتبار سے، اپنی تحریر کے دوران کی عمومی کیفیت کے ساتھ ساتھ اور آزاد کی مجموعی ذہنی صورت حال اور بیماری کے زور و زوال کے ساتھ ساتھ اسلوب و بیان میں آنے والی تبدیلیوں کی غمازی ہوتی رہتی ہے۔ زبان خلط ملط بھی ہوتی ہے بدلتی بھی ہے، اسی طرح صنف بھی کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ اس امر پر چنداں تعجب نہ ہونا چاہیے کہ ان تحریروں میں نثر کے غالب حصے کے ساتھ ساتھ نظم بھی شامل ہے۔ خم کدۂ آزاد کے مؤلف آغا محمد طاہر (نبیرۂ آزاد) اپنی تالیف کے دیباچے میں آزاد کی شاعری کے مختلف ادوار کی نشان دہی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> اس کے بعد حضرت آزاد کی شاعری کا آخری دور ہے کہ شعر وسخن کا تیراک ۱۸۸۷ء کے قریب دریائے

حیرت میں ڈوب گیا۔ دیکھنے والے کہتے تھے مولانا مجذوب ہو گئے۔ اچھا یوں ہی سہی۔

حیرتِ جلوہ گری مہر لب خاموش ہے
آنکھ محوِ دید تھی اتنا مجھے بھی ہوش ہے

اس جذب کے زمانے میں ایک خاص کیفیت طاری ہوئی۔ مزاج اپنی پچاس سالہ گزشتہ کیفیت پر اتر آیا۔ طبیعت غزل پر دوبارہ آمادہ ہوگئی۔ فرق فقط اتنا ہی تھا کہ جوانی کی شاعری مطلوب خیالی کی تصویر تھی۔ یہاں حقیقت جلوہ نما ہوگئی۔ حیرت خود حیران تھی کہ آزاد کا بڑھاپا اور غزل کی جوانی طبیعت جوش وخروش دکھاتی جذباتی اور ولولہ انگڑائیاں لیتے ہوئے اٹھتے اور لڑکھڑاتے ہوئے چلتے، اس زمانے میں مولانا بے باکانہ غزلیں لکھتے تھے، مستانہ انداز میں ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے، شاہد حقیقی ہر وقت سامنے تھا۔ جوش جنوں میں سر بصحرا نکل کھڑے ہوتے......

یہ غزلیں خمکدۂ آزاد میں شامل ہیں لیکن اس نشان دہی کے بغیر کہ خاص اس دور اور اس مذکورہ کیفیت کا کلام کون سا ہے۔ آزاد کی اس جولانی طبع اور بڑھاپے کی رنگین غزل سرائی کا ایک تقابلی جائزہ ان کے قریبی ہم عصر شبلی نعمانی کی غزل سرائی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو اپنے تبحر علمی کے ساتھ خاص واردات قلبی کے بعد اس طرف رجوع ہوئے۔ محرکات ضرور مختلف ہیں مگر دونوں ادیبوں نے سہارا غزل کا تلاش کیا۔

ان غزلوں پر تو نہیں مگر صرف ایک نظم کے ساتھ آغا محمد طاہر نے تصنیف کے وقت کا تعین کیا ہے۔ اس مجموعے کا آغاز جس حمد سے ہوتا ہے، اس پر فٹ نوٹ میں درج ہے:

یہ موتی عالم جذب کے رشتے میں نظم ہوئے ہیں کہ لفظ لفظ وارفتگی طبیعت کا ایک عالم ہے۔ حضرت آزاد کو اپنی عمر میں یہی زمانہ سب سے زیادہ محبوب تھا۔ اس لیے اسی کو سرنامہ کرتا ہوں

نظم عالم جذب کی عکاسی بھی ہے اور اپنے آپ میں ایسی کیفیت کے ساتھ مکمل جو آزاد کی شاعری میں بالعموم نظر نہیں آتی۔ اس لیے ان کے اس دور کی تصانیف میں بھی الگ معلوم ہوتی ہے۔ آزاد کی شاعری پر عموماً کم ہی لکھا گیا ہے لیکن جو لکھا گیا ہے اس میں بھی نظم کا ذکر نہیں ملتا اور نہ اس کا ذکر مجھے عالم جنوں کا تذکرہ کرنے والے سوانح نگاروں اور تجزیہ نگاروں کے یہاں ملتا ہے۔

آزاد جنوں کے بطون میں اتر کر ہوش وخرد چاہے گم کر بیٹھے ہوں مگر وہ ایک چیز نہیں بھولے، اور وہ ہے اردو لکھنا۔ ان کے اسلوب کا یہی جادو ہے جو اس دور کی بعض کتابوں کو ان کے تصنیفی سرمائے کا ایسا حصہ بنا دیتا ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ جانورستان مختصر کتاب ہے اور آزاد کی مرتب کردہ درسی کتابوں کا ایک الٹا ہوا نقشہ (converse) جہاں وہ اپنے اسلوب کی نہیں، اس جہان مرغ و ماہی کی ایک تند خو پیروڈی کرتے ہوئے نظر آتے

ہیں۔اس متن میں باز کا بیان ہو یا مرغ کا، آزاد کا پر لطف اسلوب آخر تک ساتھ نہیں چھوڑتا۔ آزاد کے اسی اسلوب کی ادبیت، لسانی ونفسیاتی ہی نہیں، ادبی مطالعے کی مستحق ہے۔

ذہنی حالت میں روز بروز بڑھتے ہوئے انتشار کی باوجود تحریر کے طبیعی عمل سے آزاد کے انہماک اور کتاب تیار کرنے کے سلسلے میں تندہی میں ظاہری طور پر کوئی کمی نہیں آئی۔ چناں ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہیں:

> آزاد کے یہ مسودے آج کے مصنفوں کے لیے شمع ہدایت ہیں، آزاد نے ہر کتاب کو نہایت خوش خط اور دیدہ زیب انداز میں لکھا ہے تمام اعلام سرخ روشنائی اور جلی قلم سے لکھے گئے ہیں، کانٹ چھانٹ بالکل نہیں ہے، سارے مسودے مجلد ہیں اور جلد کی پیشانی پر کتاب کا نام لکھا ہوا ہے۔ مزید احتیاط کے طور پر جلد کے اندر بھی نام لکھ دیا گیا ہے، سطروں میں کوئی بے ترتیبی نہیں بلکہ پہلے پنسل سے لکیریں کی گئی ہیں اس کے بعد لکھائی شروع کی گئی ہے، کہیں کہیں حاشیے پر وضاحتی اشارے بھی ملتے ہیں، ان مسودوں کو دیکھ کر کوئی بھی شخص یہ اندازہ نہیں کرسکتا کہ یہ عالم جنوں کی یادگار ہیں، البتہ چند صفحے پڑھ لینے کے بعد یہ یقین پختہ ہوجاتا ہے......

مسودوں کی مزید تفصیل آغا سلمان باقر نے بھی لکھی ہے، جن کے پاس اب یہ سارے قلمی آثار موجود ہیں۔ان بیانات سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ بگڑتی ہوئی ذہنی حالت کے باوجود آزاد لکھنے کے عمل کو شعوری طور پر (جس حد تک ان پر اس لفظ کا اطلاق کیا جاسکتا ہے) اختیار کیے ہوئے تھے۔ان کی یہ تصانیف حادثاتی یا واقعاتی نہ تھیں بلکہ کتاب تیار کرنے کے عمل کا اسی طرح سے نتیجہ جیسے کہ آب حیات اور دوسری باضابطہ کتابیں۔ان کی تیاری میں مصنف کا وہی اہتمام کارفرما نظر آتا ہے، اگرچہ معنویت بتدریج کم ہوتے ہوئے بڑی حد تک داخلی ہو کر رہ جاتی ہے۔اس بیان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف یہاں بھی معزول شدہ دیوتا نہیں، اپنی پوری حیثیت میں براجمان ہے۔ان تحریروں کو اضطراری عمل کا اظہار یا الٹی سیدھی doodles کسی طرح نہیں سمجھا جاسکتا۔ زبان کی طاقت اور بیان کے اصول بھی اتنی آسانی کے ساتھ اسے چھوڑ نہیں دیتے۔ بلکہ ان تحریروں میں بعض ایسی ادبی خوبیاں بھی نظر آتی ہیں جو آزاد کے پہلے دور کی تصانیف کا خاصہ ہے۔اپنی کتاب کی دوسری جلد میں آزاد کی تمام تصانیف کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر اسلم فرخی نے ''عالم جنون کی تصانیف'' کے لیے ایک باب قائم کیا ہے اور اس میں مکاشفات آزاد کا ایک اقتباس بھی درج کیا ہے، جسے وہ آزاد کے ''مطلع بے خودی کی پہلی کرن'' قرار دیتے ہیں۔اس اقتباس کا موضوع ''عمل شیرگانی، اس کے لوازمات، احتیاط اور روایات'' ہیں حالانکہ کہ یہ کہیں واضح نہیں ہوتا کہ آزاد کے بیانیے کے باہر بھی ان کا کوئی وجود نہیں۔اس اقتباس کو درج کرنے کے بعد ڈاکٹر اسلم فرخی نے لکھا ہے:

> اس طولانی بیان سے بے ربطی افکار یا دیوانگی کا احساس نہیں ہوتا۔اس بیان کو مجذوب کی بڑ کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔اس میں تسلسل، نظم وضبط، توازن اور مسائل بہ عمل ذہنی کیفیت کی بڑی کامیاب تشریح ملی ہے۔اس بیان

سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ آزاد کے جنون کو عملیات سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا۔ مکاشفات میں یہی سنبھلی ہوئی کیفیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ عمل کی احتیاطیں بیان کی گئی ہیں۔ منہیات کا بیان ہے اور واردات ذاتی کی تشریح میں آزاد تخیل حقیقت کے روپ میں نمودار ہوئی ہے۔ اس میں وضاحت کا عنصر زیادہ نمایاں ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک مکاشفات آزاد کے پختہ اسلوب کو نمایاں کرتی ہے اور ان کی دیوانگی کے سبب کو نمایاں کرتی ہے جب کہ بعد کی کتابیں، اس کی شدت اور گوناگوں کیفیات سے عبارت ہیں۔ اس طرح دیوانگی کی تمام تصانیف کو ایک ہی معیار سے جانچنے کے بجائے ان کی درجہ بندی بھی کی جا سکتی ہے اور دیوانگی کے مظاہر کا مطالعہ بھی، جو ادبی اہمیت سے سراسر مختلف نوع کی چیز ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آزاد کی یہ تحریریں، مختلف النوع سطحوں پر مطالعے کا موضوع بن سکتی ہیں۔

مکاشفات کے بارے میں خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ داخلی شہادتوں کے مطابق ۱۸۸۵ء کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ یعنی جنون کے آثار نمایاں و پختہ ہونے کے بعد کی۔ ۱۹۰۳ء میں مولوی ممتاز علی نے لاہور سے شائع کیا۔ اس دور کی تصانیف میں سے اس کے بعد سپاک و نماک (سال تصنیف ۱۸۹۵ء، اشاعت ۱۸۹۷ء)، فلسفہ الٰہیات (۱۸۹۶ء کی تصنیف، اشاعت ۱۹۲۶ء) اور جانورستان (سال تصنیف نامعلوم، اشاعت ۱۹۲۸ء) مطبوعہ کتب میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان مطبوعہ کتب کی تفصیلات بیان کی ہیں اور لکھا ہے کہ ''باقی کے مسودے محفوظ ہیں۔'' اسی کتاب میں وہ وضاحت کر چکے ہیں کہ غیر مطبوعہ کتابوں کے مسودے جن میں ساری کتابیں عالم دیوانگی کی نہیں تھیں بلکہ کچھ ابتدائی اور نامکمل مسودے اور دو ایک تکمیل شدہ کتابیں بھی تھیں، آزاد کے اہل خاندان، خاص طور پر ڈاکٹر محمد باقر کی تحویل میں تھیں۔

عالم جنون کی تصانیف کی فہرست تیار کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے باون ایسی کتابوں کی نشان دہی کی ہے جن کا نام موجود ہے۔ ان کے صفحات کی تعداد، تحریر کی زبان اور کسی حد تک موضوع کا تعین بھی ہوسکتا ہے۔ ان میں ستاسی صفحات کی اور اردو، عربی میں لکھی جانے والی شگفت سے لے کر عربی میں لکھی جانے والی اور محض دو صفحات پر مشتمل السناب شامل ہیں۔ ان باون کتابوں کے علاوہ ۳۷ ایسے مسودے ہیں جن پر کتاب کا کوئی نام درج نہیں ہے اور جن کے بارے میں مزید کوئی تفصیل درج نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر صاحب کے تخمینے کے مطابق ''اس طرح عالم جنون کی غیر مطبوعہ تصانیف کی تعداد نواسی (۸۹) ہو جاتی ہے ''

مسودوں کی یہ تعداد کسی طرح معمولی نہیں۔ ان کتابوں کی ترتیب و تجزیے کو ڈاکٹر صاحب ''ایک اہم ادبی خدمت'' قرار دیتے ہیں اور آزاد کے مطالعے کا نقطۂ تکمیل بھی۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کی نوبت نہ آسکی اور شاید کبھی

نہ آ سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ نواسی مسودے اپنی آنکھ سے دیکھنے کا حوالہ دیا ہے۔ یہ ان مسودوں کی آخری خبر ہے۔ اس کے بعد ان کا کیا بنا، یہ کسی کو معلوم نہیں۔ آزاد نے یہ تصانیف ۱۸۸۵ء سے لے کر ۱۹۱۰ء کے درمیان لکھیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے ان کو ۶۴-۱۹۶۳ء کے لگ بھگ دیکھا۔ یعنی تصنیف کے تقریباً نصف صدی بعد۔ اس پورے عرصے میں یہ مسودے محفوظ رہے اور اس قابل بھی کہ ادب کا طالب علم ان کو پڑھ سکے، ان کا جائزہ لے سکے۔ ان کتابوں کے اس آخری مطالعے کو بھی اب تقریباً نصف صدی ہونے کو آ رہی ہے۔

میں نے ابھی ابھی جرمن ادیب رابرٹ والزر کا ذکر کیا تھا جس نے ذہنی اختلال کے باوجود ایک طویل عرصے تک لکھنے لکھانے کا عمل جاری رکھا۔ اس کی شائع شدہ کتابوں کے بعد محقق حضرات نے اس سلسلہ مطبوعات کو آگے بڑھایا۔ اس کے انگریز مترجم کرسٹوفر مڈلٹن نے محقق Jochen Greven کے ''Painstaking editorial work'' کا ذکر کیا ہے جس نے ان آٹھ سو نثر پاروں اور مکالموں پر کام کیا جو والزر نے ایک خفیہ طرز تحریر میں، جو اس کا ایک قسم کا نجی شارٹ ہینڈ تھی، لکھ رکھے تھے۔ گریون کی محنت شاقہ کے نتیجے میں ان میں سے تین سو نثر پارے شائع شدہ تحریروں کی ابتدائی صورت ہیں اور باقی ماندہ ایسے کہ ان کو پڑھا نہیں جا سکتا، یا وہ مکمل نہیں ہیں۔ یعنی والزر کی تحریروں کو جس حد تک محفوظ رکھا جا سکتا تھا، ان کو نقل کر کے شائع کیا گیا۔ کرسٹوفر اسمارٹ کے مسودے بھی تحقیق کے اسی عمل سے گزرے اور محققوں کی ایک پوری جماعت، جس کے سربراہ Marcus Walsh اور Kerina Williamson ہیں، ان نظموں کو مرتب کر کے شائع کیا جن میں سے بعض fragments سے زیادہ نہیں تھیں۔ آرتو کی تمام تحریروں پر مشتمل ''مکمل تصانیف'' فرانس کا موقر ادارہ گالی مار Gallimard کئی جلدوں میں شائع کرتا رہا ہے۔ اردو کے نامور انشا پرداز محمد حسین آزاد کم نصیب بھی ہیں کہ ان کی غیر مطبوعہ تصانیف نشر و اشاعت کی فراوانی و سہولت کے اس زمانے میں شائع ہو کر سامنے نہ آ سکیں اور اب بھی بڑی حد تک پردۂ اخفا میں ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آرکائیوز کے قومی ذخیرے میں یا کسی علمی ادارے میں، جن کا لاہور میں فقدان نہیں ہے، محفوظ رکھے جاتے تاکہ ان پر تحقیق کی جاتی۔ اب ان کے بارے میں دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ بھی غتر بود نہ ہو جائیں۔ آزاد اگر اپنے ہوش و حواس سے آزاد ہو گئے تھے تو ہم جو ان کے عقیدت مند ہیں، عقل و جنوں کے دوراہے پر کس جانب تیزی کے ساتھ گامزن ہیں، مگر اس کی سمت نمائی سے بھی کیا فائدہ کہ ہم نے اپنے حال پر افسوس کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

آزاد اور لائٹنر کے علمی روابط

محمد اکرام چغتائی

انیسویں صدی عیسوی کے بالکل اوائل ہی میں انگریز سلطنتِ مغلیہ کے مرکز شہر دہلی پر قابض ہو گئے اور چند ہی برسوں میں انھوں نے مضبوطی سے زمامِ انتظام و انصرام سنبھال لی، البتہ شعبۂ تعلیم کی اہمیت کو جانتے ہوئے بھی وہ فی الفور اسے اپنے دائرۂ اثر میں لانے سے اجتناب کرتے رہے۔ بالآخر انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ مفتوحین کے تعلیمی اداروں کو قائم رکھا جائے، مقامی مدرسین کے علم اور تجربے سے استفادہ کیا جائے، ہندوستانیوں کے علوم و فنون کی ترویج کے لیے مثبت اقدام کیے جائیں، لیکن یہ سب کچھ فاتحین یعنی انگریزوں کے مقرر کردہ سربراہ کی نگرانی میں ہونا چاہئے۔ یوں اس صدی کے تعلیم و تدریس سے وابستہ تقریباً سبھی ادارے اسی پالیسی کے تحت چلتے رہے اور ان کے حکومتی سربراہوں اور اساتذہ میں نہ صرف مدرسانہ بلکہ عالمانہ تعاون کی عمدہ مثالیں قائم ہوئیں۔ بیچ میں علوم مغربیہ اور مشرقیہ کے حامیوں (Anglicists and Orientalists) کے تلخ مباحث نے کچھ رخنہ اندازی ضرور کی[1]، لیکن مجموعی طور پر صورت حال معمول پر رہی اور یہ تعلقات خوش اسلوبی کے ساتھ فروغ پاتے رہے۔

دہلی کالج کے قیام (۱۸۲۵ء) سے ایک سال قبل (۱۷ جنوری ۱۸۲۴ء) دہلی کی لوکل ایجنسی کے سیکرٹری جان ہنری ٹیلر نے اپنے گشتی مراسلے میں شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ عبدالعزیز کا بطور صدر مدرس نام تجویز کیا[2] لیکن اسی سال ان کے انتقال کے سبب یہ ممکن نہ ہو سکا تو ان کے شاگرد مولانا محمد رشید الدین خاں دہلوی (م۔ ۱۸۲۷ء) کو اس عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ ٹیلر ہی اس کا سیکرٹری اور سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوا۔ وہ عربی فارسی سے ناواقف تھا، پھر بھی دہلی کالج کے علماء سے اس کے تعلقات انتہائی دوستانہ اور خوشگوار رہے۔ جب ۱۸۴۱ء میں صوبجات شمال مغربی کی حکومت کے سیکرٹری جیمز تھامسن کی اصلاحات کے نتیجے میں دہلی کالج میں سیکرٹری کے بجائے پرنسپل کی تقرری کا فیصلہ ہوا تو اس نے عہدے کے لیے بنگال کے ڈپٹی کلکٹر اور کلاسیکی زبانوں کے فرانسیسی اسکالر فیلکس بوترو (Felix Boutros، ۱۸۰۶-۱۸۶۴ء) کو منتخب کیا اور وہ یہاں چار سال (۱۸۴۱ء-۱۸۴۵ء) تک کام کرتا رہا[3]۔ اس دوران میں اس

کے مدرسِ شعبۂ فارسی امام بخش صہبائی دہلوی (۱۸۰۶ء۔۱۸۵۷ء) سے انتہائی قریبی دوستانہ تعلقات رہے۔ اُس کے بعد ڈاکٹر اشپرینگر (۱۸۱۳ء-۱۸۹۳ء) کا دور شروع ہوا۔ چونکہ وہ اسلامی تاریخ اور عربی زبان و ادبیات کا شائق تھا، اس لیے صدر مدرس مولانا مملوک العلی نانوتوی (۱۷۸۷ء۔۱۸۵۱ء) اور مولوی کریم الدین پانی پتی اس کے قریب ترین رفقائے کار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ تاریخ مسعودی، تاریخِ یمینی، تذکرہ طبقات شعرائے ہند، تذکرہ فراید الدہر وغیرہ ان سب کی مشترکہ کاوشوں ہی کا ثمر ہے [۴]۔ اشپرینگر کے لکھنؤ جانے کے بعد ٹیلر سے دیرینہ تعلقات کے باعث محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔ اُن کے اشتراک سے کوئی بڑا علمی کام تو سامنے نہیں آیا، لیکن تعجب ہے کہ یہی دوستانہ مراسم مولانا موصوف کو تختۂ دار تک لے گئے۔ چند برس بعد جب ۱۸۵۷ء کی ہنگامہ خیز فضا میں سکون کے آثار پیدا ہوئے تو ان کے فرزند محمد حسین آزاد اور ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو۔ لائٹنر کے مابین مستحکم علمی روابط قائم ہو گئے اور معمولی اتار چڑھاؤ کے باوجود یہ برسوں قائم رہے۔

لائٹنر (Gottlieb Wilhelm Leitner الملقب بہ مولوی عبدالرشید آفندی) ہنگری کے دار الحکومت Pesth میں ۱۴ اکتوبر ۱۸۴۰ء کو پیدا ہوا۔ کہا یہی جاتا ہے کہ وہ یہودی النسل گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، جو برسوں پہلے جرمنی سے ہجرت کر کے یہاں آن بسا تھا۔ اس کا باپ Johann Moritz Leitner شعبہ طب سے تعلق رکھتا تھا۔ ۱۸۴۹ء میں ہنگری میں سیاسی بے اطمینانی اور افراتفری کی لہر چل پڑی جس نے لوگوں کا سکون برباد کر دیا۔ لائٹنر کے والدین بھی ملک کو خیر باد کہہ کر ترکی میں سکونت پذیر ہو گئے اور اس کے باپ نے استانبول میں بطور معالج کام شروع کر دیا۔ یوں لائٹنر کی ابتدائی تعلیم یہیں مکمل ہوئی۔ ترکی اور عربی زبانوں میں اسے جو مہارت حاصل ہوئی، وہ یہاں کے مدرسوں کی دین تھی۔ انہی دنوں اس نے قرآن حکیم کا بیشتر حصہ بھی حفظ کر لیا تھا۔

پندرہ سال کی عمر میں یعنی ۱۸۵۵ء میں وہ ''درجہ اول کا ترجمان'' کے امتحان میں کامیاب ہو کر جنگ کریمیا میں کام کرتا رہا۔ ۱۸۵۸ء میں وہ انگلستان پہنچا، وہاں برطانوی شہریت حاصل کی اور کنگز کالج سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ازاں بعد وہ اسی کالج میں عربی، ترکی اور جدید یونانی کا استاد رہا اور تین سال اسی کالج میں اس کا تقرر بطور پروفیسر ہوا۔ ۱۸۶۲ء میں اس نے جرمنی کی فرائی برگ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کر لی۔

لائٹنر نے تقریباً ۲۳ برس ہندوستان میں گزارے (۱۸۶۴ء-۱۸۸۷ء)۔ اس دوران میں وہ خرابی صحت کا شکار رہا۔ بعض بین الاقوامی علمی اجتماعات میں بھی شریک ہوتا رہا (مثلاً مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس، ویانا ۱۸۷۳ء)۔ اس کا انتقال بون میں ۱۸۹۹ء میں ہوا [۵]۔

محمد حسین آزاد کے نو دریافت شدہ پنشن ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یکم جنوری ۱۸۶۴ء کو ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن، پنجاب کے ورنیکلر آفس میں ملازم ہوئے [۶]۔ انھیں یہ ملازمت جگراؤں ضلع لدھیانہ کے اپنے ہم مسلک

مولوی رجب علی کی تگ و دو سے حاصل ہوئی، جو برسوں لفٹنٹ گورنر کے میر منشی کے فرائض ادا کرتے رہے۔ لائٹنر بھی اسی سال لاہور پہنچے اور نومبر میں نئے قائم کردہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ آزاد اور لائٹنر کی ملاقات کب ہوئی، وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن قرین قیاس یہی امر ہے کہ چند ماہ بعد جب ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو انجمن پنجاب کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو وہیں وہ ایک دوسرے سے متعارف ہوئے ہوں گے۔ (۶ الف) لائٹنر اس انجمن کے بانی مبانی اور پہلے صدر تھے اور سالہا سال وہی اس کے روح رواں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقامی اخبارات انھیں انجمن کا ''چلتا پرزہ'' لکھا کرتے تھے (۷)۔ آزاد انجمن کے ابتدائی اجلاسوں میں شریک ہوتے رہے اور بسا اوقات اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا کرتے۔

لائٹنر کی زیر صدارت انجمن پنجاب، اس کے رسائل و اخبارات اور تمام بڑے شہروں میں قائم کردہ اس کی شاخوں نے علمی، تعلیمی، صنعتی اور ادبی اعتبار سے جو خدمات سر انجام دیں، وہ اس خطہ کی نشأۃ ثانیہ کا محرک ثابت ہوئیں۔ یہاں اس انجمن کے حوالے سے صرف دو معروضات پیش خدمت ہیں:

(الف) اس انجمن کے نام میں ''علوم مفیدہ'' (Useful Knowledge) اور اس کے اغراض و مقاصد میں ان علوم کی ترویج و ترقی پر زور دیا گیا ہے۔ بظاہر علوم مفیدہ سے مغربی یا یورپی بالخصوص سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق علوم و فنون شامل ہیں۔ سب سے پہلے ''ان علوم مفیدہ'' کے پھیلاؤ کے لیے ۱۸۲۶ء میں لندن میں ایک سوسائٹی قائم کی گئی اور اس کے تحت متعدد کتابیں شائع ہوتی رہیں (۸)۔ دہلی کالج کے دوسرے پرنسپل ڈاکٹر اشپرینگر اپنے قیام لندن کے دوران میں اس سوسائٹی سے منسلک رہے اور اس کی بعض سوانحی کتب کے لیے مضامین بھی لکھا کرتے تھے، چنانچہ دہلی کالج کا سربراہ مقرر ہوتے ہی اس نے ۱۸۴۱ء میں قائم ہونے والی ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کو بھی لندن کی اسی سوسائٹی کے تتبع میں ''علوم مفیدہ'' کے پرچار کا ذریعہ بنا دیا۔ رفتہ رفتہ ''علوم مفیدہ'' کی یہ اصطلاح اتنی مقبول ہوئی کہ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد جو بھی سوسائٹی تشکیل دی گئی، اس کے نام میں اس کو ضرور شامل کیا گیا۔ انجمن پنجاب (۱۸۶۵ء) اور سر سید احمد خاں کی سائنٹفک سوسائٹی (غازی پور، ۱۸۶۲ء) اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

(ب) اب تک انجمن پنجاب پر جو تنقیدی اور تحقیقی کتب و مقالات اشاعت پذیر ہوئے ہیں، ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا (۹)۔ پھر بھی کہیں کہیں تشنگی کا احساس پایا جاتا ہے اور اس کی بڑی وجہ انجمن سے متعلقہ بنیادی مصادر کی کمیابی اور نایابی ہے۔ ان کمیوں اور کسی حد تک خامیوں کو دو امریکی اسکالروں نے دور کیا ہے، جنھیں اسی انجمن کو موضوع تحقیق بنانے پر ۱۹۷۶ء اور ۲۰۰۰ء میں یونیورسٹی آف کولمبیا اور لندن یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ اسناد دی گئیں (۱۰)۔ ان کے ان تحقیقی مطالعات کی بناء برٹش لائبریری (لندن) میں محفوظ لاہور سے شائع ہونے والے وہ معاصر انگریزی جرائد و اخبارات ہیں جن کا ایک شمارہ بھی ہمارے ہاں کے کتب خانوں میں دستیاب نہیں۔ مثلاً

''پنجاب ایجوکیشنل میگزین'' اور لائٹنر کا جاری کردہ اخبار ''انڈین پبلک اوپینئن'' جو ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کا پیش خیمہ تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

یادِ ماضی کی تلخیوں بالخصوص غدر کے المناک واقعات اور والد کے عبرتناک انجام نے آزاد کو زندگی بھر خاصا مضطرب رکھا اور لاہور آنے کے بعد بھی انھیں یہ فکر دامنگیر رہی کہ کہیں یہ ''رازِ سربستہ'' افشا نہ ہو جائے کہ وہ اپنے والد کے اخبار ''دہلی اردو اخبار'' میں ''مجاہدینِ آزادی'' اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی حمایت میں مضامین میں چھپواتے رہے، لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں نہ صرف ان کے سر سے خطرے کی یہ لٹکتی ہوئی تلوار سرک گئی، بلکہ انھیں بدیسی حکمرانوں کے امورِ خارجہ کی جانب سے انتہائی حساس نوعیت کے سیاسی فرائض بھی سونپے گئے۔ ابھی ان کی ملازمت کو ڈیڑھ سال ہی گزرا تھا کہ انھیں ایک خاص مشن کے تحت وسط ایشیا بھجوایا گیا، جس کے مقصد کا کوئی واضح دستاویزی ثبوت تو موجود نہیں، لیکن اس کے سیاسی ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ آزاد ۲۷ مارچ ۱۸۶۶ء کو متعلقہ سرکاری محکمہ سے ہدایات لے کر وسط ایشیا کے سفر پر روانہ ہوئے۔ فرزندِ آزاد، محمد ابراہیم ابرو (۱۸۶۵ء۔ ۸ دسمبر ۱۹۲۰ء) کے ساتھ ایک ہی دفتر میں کام کرنے والے مولوی خلیل الرحمٰن (م۔ ۱۹۳۹ء) کا کہنا ہے کہ لائٹنر بھی ان کے ہمراہ تھے[11] لیکن اس کی رفاقت کا کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں کیا گیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ لائٹنر، آزاد اور ان کے ساتھیوں کو الوداع کہنے افغانستان کی سرحد تک گئے، جبکہ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق لائٹنر ''خاص خدمت کے انجام دینے کے واسطے مامور تھے اور کالج سے غیر حاضر تھے۔''[12]

آزاد کے سوانح نگاروں نے ان کے اس سفر پر بہت خامہ فرسائی کی ہے، لیکن پنشن ریکارڈ ان کے صرف ایک رفیقِ سفر کا ذکر کرتا ہے اور وہ ہے پنڈت من پھول۔ آزاد کی طرح یہ پنڈت بھی دہلی کالج کے فارغ التحصیل تھے۔ وہ لفٹننٹ گورنر کے میر منشی اور سرکاری حلقوں میں اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ آزاد کے ہمعصر سوانح نگار لالہ بالمکند گپت کا کہنا ہے کہ جب پنڈت من پھول کابل اور بدخشاں کو گئے تو آزاد کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔[13] متعلقہ اقتباس یہ ہے:

"He [Azad] then accompanied the late Pandit Manphul, Mir Munshi to the Punjab Government to Central Asia wither the Pandit had been sent on special duty, but the records relating to the deputation are not now forthcoming and satisfactory evidence as to whether or not Maulavi Muhammad Hussain accompanied Pandit Manphul in

any authorized official capacity is wanting."(۱۴)

اس دستاویز میں آزاد کی علمی اور تعلیمی خدمات کا اعتراف کرنے کے بعد یہ صراحت بھی کی گئی ہے کہ:

"But besides these Muhammad Hussain has performed certain political services for the Government which entitle him to consideration. As already stated, he accompanied the late Pandit Manphul to Central Asia in 1865."(۱۵)

پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار اورل شٹائن (Sir Aurel Stein) اپنے مکتوب بنام ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن (بابت ۲۸ جنوری ۱۸۹۲ء) میں لکھتے ہیں:

"It is generally known that the Maulawi was sent with the late Diwan Manphul's mission to Yarkand by the Foreign Department but no trace of its record could be discovered. His son, Maulawi Ibrahim, who was informed of this fact, has endeavoured to obtain it from the Civil Secretariat office, but up to this time he has not been able to furnish it."(۱۶)

درج بالا اقتباس میں آزاد کی سیاسی سرگرمیوں کا ذکر ہوا ہے، تو ان کا ایک اور رخ بھی ملاحظہ کیجیے، جس پر بہت کم اظہار خیال کیا گیا ہے:

"Within recent years he has rendered himself useful in giving information to the Special Branch of the Central Police Office of this Government in connection with Vernacular newspapers and other confidential work of a political character."(۱۷)

آزاد کے سفر وسط ایشیا کی روئداد بوقت ضرورت ان کے بیٹے کو تو نہ مل سکی، لیکن کئی دہائیوں کے بعد آغا محمد اشرف نبیرۂ آزاد کو سابقہ انڈیا آفس لائبریری کے نہاں خانوں سے متعلقہ فائل دستیاب ہوگئی اور اسے طبع بھی کرادیا گیا(۱۸)، لیکن بعض ناقدین اس کو مستند نہیں مانتے(۱۹)۔ بہر حال یہ طے ہے کہ آزاد کے اس وسط ایشیائی سفر میں لائٹنر ساتھ نہیں گئے تھے۔ پنڈت من پھول، ان کے رفیق سفر تھے، لیکن بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی جلدی واپس آ گئے۔ آزاد کے عالم وارفتگی کے تحریر کردہ ایک رسالے سے پتا چلتا ہے کہ وہ اس سفر میں مالی مشکلات کا شکار ہوئے تو

پنڈت من پھول نے ایک خاص مخبر نرائن داس کے ذریعے تین سو روپے کی رقم بھجوائی۔

تقریباً آٹھ ماہ وسط ایشیا میں سرکار کی جانب سے تفویض کردہ ذمہ داریاں نپٹا کر آزاد ۲۷ مارچ ۱۸۶۶ء کو کامیاب و کامران لاہور واپس پہنچے اور آتے ہی انھیں یونیورسٹی میں عربی اور ریاضی کے استاد اور اس کے اگلے برس انجمن پنجاب کا سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔ آزاد صدر انجمن یعنی لائٹنر کی ماتحتی میں اپنے فرائض کی بجا آوری میں مصروف تھے۔ اسی دور میں آزاد اور لائٹنر کے مابین قریبی تعلقات استوار ہوئے۔ پاکستانی زبانوں کے جرمن ماہر ارنسٹ ٹرمپ (Ernst Trumpp، م۔۱۸۸۴ء) مطلع کرتے ہیں کہ لائٹنر نے گلگت وغیرہ کوہستان شمالی کا پہلا سفر اسی سال یعنی ۱۸۶۶ء کے تین مہینوں (اگست تا اکتوبر) میں مکمل کیا[۲۰] اور ایک خاندانی روایت کے مطابق اس سفر میں آزاد ان کے ساتھ تھے[۲۱]۔ دو سال بعد لائٹنر یورپ سدھارے اور ایک سال بعد واپس آئے۔ ان دونوں مواقع پر آزاد نے ان کی خدمت میں الوداعی اور استقبالی سپاسنامے پیش کیے[۲۲]۔ ان میں انھیں ''محسن و مربی، شفیق خاص و عام، افلاطون پنجاب، خیر خواہ و مصلحت جوئے ملک پنجاب، مشفق مہربان'' اور انجمن میں پڑھے جانے والے مضامین میں ''ارسطوئے سکندر منزل و افلاطون رستم دل، ارسطو فطرت، حکیم دانشور'' جیسے توصیفی القابات سے یاد کیا ہے۔ نیز ''ہندوستان کی موئی مٹی میں ترقی اور نشو و نما کا خمیر'' ڈالنے پر ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

انجمن کے سیکرٹری کی حیثیت سے آزاد کو ہر طرح کے انتظامی اور مالی فرائض سے عہدہ برآ ہونا پڑتا تھا[۲۳] لیکن اس کے باوجود وہ گاہے گاہے اپنے لیکچرز کے ذریعے عامۃ الناس کو ''علومِ مفیدہ'' کی اہمیت جتاتے اور تعلیمی، علمی اور ادبی رویوں کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیتے رہے۔ اس ضمن میں اُن کے مضامین بعنوان ''تشویق و تحریص تعلیم و علوم'' (مارچ ۱۸۶۷ء) ''در باب اصلیت زبانِ اردو کی'' (۲۰ جنوری ۱۸۶۷ء) اور ''ترویج کتب ترجمہ علوم انگریزی'' (۲۶ اکتوبر ۱۸۶۷ء) لائق توجہ ہیں۔ بغور دیکھا جائے تو یہ مضامین سرکاری پالیسی اور لائٹنر کے مخصوص تصورات برائے ''احیائے علوم قدیمہ مشرقی'' اور ''عام ترقی علمی بوسیلہ زبان ہائے دیسی'' کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ۲۲ جون ۱۸۶۸ء کو آزاد انجمن پنجاب کے سیکرٹری کے عہدہ سے سبکدوش ہو گئے، لیکن اس ادارے سے ان کا تعلق منقطع نہیں ہوا اور وہ اس کے اجلاسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے رہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

آزاد اور لائٹنر کے شخصی، علمی اور حکمانہ تعلقات کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ لکھنے لکھانے میں بھی ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ آزاد کی مقبول ترین کتاب ''نیرنگ خیال'' کے متعلق تو برملا یہ رائے دی جاتی ہے کہ اس کا تمثیلی اندازِ بیان لائٹنر کے مشوروں کا مرہونِ منت ہے۔ سر عبدالقادر لکھتے ہیں: ''میں نے بعض لوگوں کی زبانی سنا ہے اور غالباً اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت بھی ہے کہ مصنف کو اس کتاب کا ڈھانچ ڈاکٹر لائٹنر سے ہاتھ آیا جو بذات خود یونانی

اور انگریزی ادبیات کا عالم تھا، اس لیے آزاد کو اپنے خزانۂ معلومات سے معتد بہ طور پر بہرہ مند کیا اور مولانا مرحوم نے اسی مواد کی بنا پر "نیرنگ خیال" کی عمارت تعمیر کی۔"(۲۵) اس اقتباس میں رائے دہندہ تذبذب کا شکار ہے۔ بہر حال ایک ایسی کتاب ضرور ہے، جو آزاد اور لائٹنر دونوں کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے اور وہ ہے "سنین اسلام"۔ (حصہ اول)۔ "پنجاب گزٹ" (۱۲ اپریل ۱۸۷۷ء) میں تصنیفات لائٹنر کے اشتہار کے مطابق ان کی اردو کتابوں کی تعداد دس ہے، جن میں یہ کتاب بھی شامل ہے۔ یورپ کے "علوم مفیدہ" کو اردو میں منتقل کرنے کے بارے میں لائٹنر نے اس کتاب (۱۸۷۱ء) کے انگریزی دیباچے میں مدلل اور پُر زور انداز سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ وہ لفظی ترجمہ کے بجائے adaptation کے قائل ہیں۔ اسی پیش لفظ میں وہ لکھتا ہے کہ جولائی ۱۸۷۰ء میں طلبائے عربی کا امتحان لیا تو پتہ چلا کہ وہ صرف ونحو میں طاق ہیں، لیکن عربوں کی تاریخ اور ادب سے نابلد ہیں۔ انہی "مولویوں" کے استفادے کے لیے انھوں نے اس کتاب کا مُبیضہ تیار کر کے آزاد کے حوالے کیا تاکہ وہ اپنے منفرد اسلوب نگارش سے اس کے مندرجات کو خوب سے خوب تر بنا سکیں۔ چنانچہ وہ اس دیباچے میں اعتراف کرتے ہیں کہ:

"I have to express my thanks for the assistance which Maulwi Muhammad Hussain has given me in the preparation of this work. It owes to him any elegance which its Urdu style may possess."(۲۶)

پانچ سال بعد یعنی ۱۸۷۶ء میں "سنین اسلام" کا حصہ دوم شائع ہوا اور لائٹنر کے انگریزی اخبار "انڈین پبلک اوپینین" کے مطبع سے منظر عام پر آیا۔ اس کے سرورق پر "بمدد مولوی کریم الدین" درج ہے۔ اس میں طبع اول کے انگریزی دیباچے کا کچھ حصہ بھی شامل ہے، لیکن اس میں آزاد سے متعلق متذکرہ پیراگراف حذف کر دیا گیا۔ اسی کتاب کے حصہ اول کا دوسرا ایڈیشن انجمن پنجاب نے ۱۸۸۰ء میں شائع کیا، جس میں لائٹنر نے مختصر انگریزی نوٹ میں مولوی فیض الحسن سہارنپوری اور مولوی غلام مصطفٰی کے تعاون کا شکریہ ادا کیا ہے اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دی ہے کہ حصہ دوم کا دوسرا ایڈیشن بھی تیاری کے مراحل میں ہے۔ "اخبار انجمن پنجاب" کے ایک شمارے (بابت ۱۱ مئی ۱۸۷۷ء) میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ "سنین اسلام" کا حصہ سوم بھی زیر تالیف ہے۔ مولوی محمد شفیع اپنے ایک مقالے "مولانا آزاد کے بعض مسودے" میں لکھتے ہیں کہ آزاد کے نجی کاغذات میں کچھ ایسے نا تمام اوراق محفوظ ہیں، جنھیں "سنین اسلام" کا مسودہ سمجھا جاتا ہے(۲۷)۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے آزاد کلیکشن میں بھی آزاد کا تحریر کردہ ایک ایسا مسودہ موجود ہے، جس میں بعض مغل حکمرانوں (مثلاً بابر، ہمایوں، اکبر) کے علاوہ دیگر تاریخی واقعات بھی قلمبند کیے گئے ہیں۔ ممکن ہے، زیر نظر مسودہ "سنین اسلام" کے دوسرے یا تیسرے حصے سے متعلق ہو، جو کسی وجہ سے اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔(۲۸)

خانوادۂ آزاد کے لکھاریوں اور آزاد کے سوانح نگاروں نے ''سنین اسلام'' (حصہ اول) ہی کو لائٹنر اور آزاد کے مابین وجہ نزاع اور دیرینہ دوستانہ تعلقات میں شدید کھچاؤ کا باعث قرار دیا ہے [۲۹]۔ ''مکاتیب آزاد'' میں تین سالوں میں (۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۱ء) لائٹنر کو ارسال کردہ چند خطوط میں بقول مرتب ''ہمیں ایک انگریز اور اس کے مقابلے میں ایک غیرت دار و خود اعتماد انسان کا کردار نظر آتا ہے۔ ان خطوں میں نوک جھونک اور تناتنی ہے، کشمکش ہے اور آزاد کی پریشانیوں کے دوررس نتائج کی نشاندہی ہے [۳۰]۔'' اس کے بعد آزاد نے ۱۸۷۶ء اور ۱۸۷۷ء میں لالہ ڈنی چند کو جو خطوط لکھے، ان میں لائٹنر سے ملاقاتوں بلکہ شملہ ساتھ جانے کا ذکر کیا گیا ہے [۳۱]۔ یہ امرِ مسلمہ ہے کہ آزاد اور لائٹنر میں بگاڑ پیدا ہوا اور مقامی اخبارات میں بعض ''بدخواہوں'' کے معاندانہ تبصروں نے بھی اس چنگاری کو ہوا دی۔ راقم کے خیال میں ان دونوں کے تعلقات میں تناؤ ضرور پیدا ہوا، لیکن اس کی نوعیت ایسی ہی تھی، جیسے شکستہ آئینے میں جڑ جانے کے بعد بھی ایک ہلکی سی لکیر باقی رہ جاتی ہے۔ اگر ان میں کوئی اختلاف تھا تو وہ دائمی نہیں تھا۔ مزید یہ کہ ''سنین اسلام'' (حصہ اول) ہی اس کا واحد سبب نہیں بلکہ کئی اور وجوہ بھی ممکن ہیں مثلاً:

(۱) لائٹنر کے چوبیس سالہ قیام ہند کے دوران میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ بیک وقت تین اہم عہدوں یعنی پرنسپل گورنمنٹ کالج، پرنسپل اورینٹل کالج اور رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی کے عہدوں پر فائز تھا اور صوبے کے شعبہ تعلیم میں اسے کُلّی اختیارات حاصل تھے۔ اس کی ذات میں ان بے پناہ اختیارات کے ارتکاز نے اس کا ذہنی توازن بگاڑ دیا۔ وہ کسی کی بات سننے کا روادار نہیں تھا۔ انتظامی امور میں اس کے آمرانہ رویے ظاہر ہونے لگے۔ اس کے ماتحت اداروں کے علاوہ محکمہ تعلیم اور حکومت پنجاب کے افسران کو بھی تشویش لاحق ہوئی، چنانچہ کرنل ہالرائڈ اور چارلز ایچیسن بھی کھل کر اس کی مخالفت پر اتر آئے [۳۲]۔ ہوا کا رخ دیکھ کر لائٹنر کے قریبی دوست بھی کنی کترانے لگے۔ یہ مخالفتیں اس قدر بڑھ گئیں کہ بالآخر لائٹنر کو مستعفی ہونے کے علاوہ اور کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ آزاد بھی اپنے اس پرانے مربی کی شہرت و اقتدار کے ڈھلتے ہوئے سورج کی کم روشنی کو بھانپ گئے اور اس سے ملنے ملانے سے گریز کرنے لگے۔

(۲) دیگر ماتحت عملہ کی طرح آزاد بھی لائٹنر کے غصیلے اور متکبرانہ رویے سے نالاں تھے، چنانچہ وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر صوبے کی بعض مقتدر شخصیات سے تعلقات بڑھانے لگے۔ اس کی ایک مثال نیرنگ خیال کا سیکرٹری پنجاب سر لیپل گریفن (مؤلف راجگان پنجاب، رئیسان پنجاب) کے نام انتساب ہے، جس کے ابتدائیہ بعنوان ''مافی الضمیر'' میں وہ اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اے ملک سخن کے بادشاہ! خاک کی کیا بساط ہے، مگر اونچے دامنوں میں لگ جاتی ہے تو وہ بھی اونچی ہو جاتی ہے۔ پھر وہ خاک نہیں، غبار دامن کہلاتا ہے۔ فقیر آزاد اپنی حقیر کتاب کو دامن اقبال سے وابستہ کرتا ہے۔ یہ

اوراق پریشاں کچھ نہ تھے اور کچھ نہیں ہیں مگر نامِ نامی سے منسوب ہوئے، اب سب کچھ ہیں۔''

۱۸۵۷ء کے بعد بعض علمائے دین کے علاوہ ہمارے دانشمندوں اور مصنفوں نے نئے حکمرانوں یعنی انگریزوں کے متعلق ایسے ہی خوشامدانہ ''گل ہائے عقیدت'' پیش کیے ہیں۔ ممکن ہے، یہ اس دور کے حالات و واقعات کا تقاضا ہو، جس کے تحت انھیں مجبوراً ایسا رویہ اپنانا پڑا۔ اگر اس جواز کو درست بھی مان لیا جائے تو پھر بھی آزاد اپنا زورِ قلم دکھا گئے۔ ان کا جو اندازِ تخاطب، پہلے لائٹنر کے لیے مخصوص تھا، اب وہ دوسروں کے لیے اختیار کیا جانے لگا۔

(۳) لائٹنر کی علم دوستی اور معارف پروری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بیشتر مصنفین کو انھوں نے مختلف موضوعات پر لکھنے کی تحریک دی اور ان کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کثیر تعداد میں ایسی کتابیں شائع ہوئیں جو ان کے نام معنون کی گئیں یا ان کے مصنفین نے لائٹنر کی اعانت اور تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے[۳۳]۔ علاوہ ازیں وہ اپنے ماتحت اداروں میں کام کرنے والے اہلِ علم کی تصنیفی سرگرمیوں میں بھرپور تعاون کرتا تھا۔ آزاد اور مولوی فیض الحسن سہارنپوری دونوں اس کالج میں ملازم تھے، آزاد تو لائٹنر کی ایک کتاب میں شریک رہے، جبکہ مولوی موصوف نے متعدد کتب لائٹنر کی فرمائش پر مرتب کیں، لیکن وہ کبھی کوئی حرفِ شکایت اپنی زبان پر نہیں لائے۔ لائٹنر تو تھا ہی بدمزاج، لیکن ممکن ہے، تعلقات کے ''بگاڑ'' میں آزاد کے رویے کا بھی کچھ عمل دخل ہو، جن کے دو رجحانوں کا چند سال بعد باقاعدہ آغاز ہونے والا تھا۔

(۴) بعض آزاد شناسوں کے خیال میں آزاد اور لائٹنر میں بگاڑ کا آغاز سرکاری اخبار ''ہمائے پنجاب'' میں محکمہ ڈاک کی بدعنوانی کے متعلق ایک مراسلہ شائع ہونے سے ہوا۔ آزاد اس اخبار کے مدیر تھے، اس لیے ان سے باز پرس کی گئی۔ وہ اپنا مؤقف بیان کرنے لاہور سے باہر جانا چاہتے تھے، لیکن لائٹنر (رجسٹرار یونیورسٹی و پرنسپل کالج) سے اجازت نہ ملنے پر انھیں جذباتی طور پر دھچکا سا محسوس ہوا۔

(۵) مشہور مثل ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ آزاد اور لائٹنر میں جو بھی اختلاف تھا، اس کا ذمہ دار لائٹنر ہی کو ٹھہرایا گیا، جبکہ عین ممکن ہے کہ صورتِ حال اس کے برعکس ہو۔ لائٹنر نے اپنے ایک انگریزی نوٹ میں آزاد کی ''سازشی فطرت'' (Talent for Intrigue) کا ذکر کیا ہے، جس کا وہ ہر جگہ مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ شاید آزاد کی یہی ''خوبی'' ان کے تعلقات میں کشیدگی کا سبب بنی ہو۔

(۶) آزاد نے اپنی مختلف النوع علمی، ادبی، تعلیمی اور سب سے بڑھ کر سیاسی خدمات کے پیشِ نظر حکومت پنجاب کو قطعہ اراضی کے لیے درخواست دی اور جب وہ حالتِ مجذوبیت میں چلے گئے، تو ان کے بیٹے محمد ابراہیم اس درخواست کی پیروی کرتے رہے۔ شاید ان کی یہ درخواست قبول ہو جاتی، لیکن اس دوران میں حکومتِ ہند نے ایسے قوانین بنا دیے جن کے تحت انھیں کوئی سرکاری اراضی نہیں دی جا سکتی تھی۔ ممکن ہے، اس درخواست کی نامنظوری کو بھی

لائٹنر کی مخالفت سمجھا گیا ہو، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ (۳۴)

(۷) آزاد دہلی سے لاہور آئے اور لائٹنر یورپ سے، لیکن ان دونوں کے تعلق کو علمی سطح پر مشرق و مغرب کے اتصال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ انجمن پنجاب کے صدر اور سیکرٹری کی حیثیت سے دونوں کی رفاقت نے لاہور کو نئے علم و ادب کا مرکز بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور پنجاب کے کونے کونے میں تعلیم کی روشنی پھیلانے میں ان کی مشترکہ مساعی کا خاصا عمل دخل ہے۔ اردو کی ترویج اور اس کو ذریعہ تعلیم بنانے میں ان دونوں کی تگ و دو لائق تحسین ہے۔ لائٹنر علوم شرقیہ کے بہی خواہوں میں تھا اور وہ زمانہ حال کے تقاضوں کے مطابق ان کی ترویج و ترقی کا خواہاں تھا۔ اس کی تمام کوششوں میں آزاد نے بھرپور ساتھ دیا، لیکن ایسا وقت بھی آیا کہ دونوں میں اختلاف ہو گیا اور وہ ایک دوسرے سے کھچے کھچے رہنے لگے۔ آزاد ۱۸۸۵ء کو ایران چلے گئے اور اگلے سال کے وسط میں واپس آئے۔ ۱۸۸۷ء میں لائٹنر مستعفی ہو کر انگلستان واپس چلا گیا اور یوں انھیں ملاقات اور اپنے مخالفین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ انہی حالات کے پیش نظر جیفری مارک ڈائمنڈ یوں تبصرہ کرتا ہے:

"However, the relationship between Azad and Leitner became strained over several issues, especialy criticisms of *Sinin-e Islam*. Azad sought to salvage their relationship that had benefited both men, writing a defense of *Sinin-e-Islam* in a statement to Leitner. Azad was certainly distraught by their disputes,and it affected him in his later years. Yet, this does not undermine their initial work together that shaped much of the agenda for the Anjuman and the movement for higher education in Urdu."(۳۵)

(۸) مولوی محمد خلیل الرحمٰن (م۔ ۱۹۳۹ء) یکم فروری ۱۸۸۹ء سے آزاد کی وفات (۱۹۱۰ء) تک ان سے ملتے رہے۔ وہ آزاد کے بیٹے آغا محمد ابراہیم ابرو کے ساتھ ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے اور آزاد کے بھی افراد خانہ کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے۔ وہ اپنے ایک مکتوب بنام ڈاکٹر محمد صادق (بابت ۱۷ دسمبر ۱۹۳۷ء) میں آزاد اور لائٹنر کے اختلاف کی ایک وجہ بتاتے ہیں:

''آزاد کو کالج کی خدمت لائٹنر نے دلوائی تھی۔ کشیدگی کی وجہ جہاں تک مجھے علم ہے، صرف یہ تھی کہ لائٹنر ایک فاضل ادب عربی تھا اور آزاد اس کوچے کے پورے آشنا نہیں تھے۔ بدمزگی بڑھ گئی بلکہ اس نے طول کھینچا۔ آزاد نے دوسرا راستہ اختیار کیا تو بچے۔ ''سنین اسلام'' کا زیادہ تر مواد لائٹنر نے دیا اور اسی کو آزاد نے مرتب

کیا۔اس کے متعلق کئی مرتبہ آزاد نے تذکرہ کیا۔''سنین اسلام'' کا پہلا حصہ غالباً ۱۸۷۴ء یا ۱۸۷۵ء [۱۸۷۱ء] میں چھپا۔دوسرا حصہ آزاد کا دیا ہوا میرے کتب خانے میں ہے اور ۱۸۷۶ء کا چھپا ہوا ہے۔''(۳۶)

(۹) آغا محمد باقر مرحوم (نبیرۂ آزاد) کے پاس ایک ایسی دستاویز (بزبان انگریزی) محفوظ تھی، (باب ۳۱ مارچ ۱۸۷۱ء) جس میں آزاد کو تیسری بار یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ انھوں نے ''سنین اسلام'' (مطبوعہ) کا مسودہ تو لوٹا دیا ہے، لیکن اسی کتاب کا جو حصہ ہسپانیہ، مصر اور مراکش میں عرب سلاطین، نیز ہندوستان اور ایران میں مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق تھا، وہ واپس نہیں کیا۔ممکن ہے، آزاد کا یہی ''عدم تعاون'' یا بار بار کی یاد دہانیوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھنا ہی اختلاف کا سبب ہو۔

اس دستاویز کی عبارت یہ ہے:

"Dr. Leitner will be obliged by Moulvi Muhammad Husain sending him all the papers belonging o Sanin-ul-Islam without any further delay. The Moulvi has only returned things that have already been printed and rough dictations of matters yet unpublished. Leitner wishes the written out history of the Arabs in Spain, Egypt and Morrocco to be returned, with regard to the history of Muhammadans in India and Persia, the Moulvi can do as he pleases but Dr. Leitner will insist on everything else being returned."

بحوالہ ڈاکٹر اسلم فرخی، مندرجہ بالا، ص ۲۲۵-۲۲۶۔

(۱۰) آزاد کی ایک درخواست پر لائٹنر نے ایک طویل نوٹ لکھا (بابت ۲۰ اپریل ۱۸۷۷ء)۔اس میں آزاد کے کردار کے بعض نئے پہلو سامنے آتے ہیں اور انھی کے باعث ان دونوں کے اختلافات میں اضافہ ہوا۔یہ طویل نوٹ درج ذیل ہے:

"So far as the increase in the number of students is concerned it has certainly risen to 88 but the work done has by no means been 'doubled', as the Moulvi gives only half an hour to each class making a total of four hours tuition, whereas formerly he occasionally taught five hours.

With every deference to the Moulvi's abilities he cannot compare himself as he has done either with a scholar of the reputation of Moulvi Zakaullah or with the Assistant Professor of this College, a Master of Arts, Bachelor of Laws and Pleader of the High Court, Calcutta. Indeed the Moulvi is as inaccurate as he is occasionally brilliant and no one who has any regard to fidelity of a ... would with the Principal's experience of Moulvi Muhammad Husain, entrust any literary work to that gentleman. The opinion on this point of Messers Alexander and Pearson may be ascertained with advantage.

That Moulvi Muhammad Husain has access to several papers cannot be doubted but that no one has equalled him in the fidelity of literary labour' may well be questioned.

The Moulvi first held a small post in the office of the D.P.I. which he lost owing to the commission of an irregularity. His subsequent mission to Central Asia has not given results which can in any way be compared to those of his colleagues Faiz Baksh, not to speak of his eminent chief Pandit Manphul. In this College his work as Assistant Professor has been generally well done, but here as elsewhere his talent for intrigue has interfered with his usefulness. So far from 'being degraded in the opinion of his countrymen by not receiving the rise of his fellow officials' by which probably the well-merited promotion of Moulvi Ziauddin referred to, his present position is considered as far as he Principal's knowledge extends to be above his a by the natives of Lahore and Delhi among whom his

character and antecenents seem to be well known. This however is not the opinion of the Principal to whom indeed the Moulvi owes his position. The Principal does not attach much weight to his promise to establish a model farm but if the grant will disconnect him from the Lahore Govt. College he would be glad to be relieved of a subordinate who has shown himself so unworthy of trust in spite of unremitting kindness as Moulvi Muhammad Husain. His loss would be easily and well supplied either by an exchange wih a scholar of the sobriety of thought and style of Moulvi Karimuddin or by the Oriental College in which there is ample provision of Arabic and Persian and which already teaches Natural Science, Engineering and Law to students of the Govt. College. The saving affected would be a tangible one even if Rs. 50/= of his salary were to be donated to increasing the pay of the Sanskrit Asstt. Professor who only receives Rs. 60/= and to giving an honorarium (though none is necessary) for the extra work imposed on the Head Moulvi and Head Munshi of the Oriental College.

P.S. The Moulvi does not remember where and in what capacities his service was passed previous to being appointed to the College on the 14th of May, 1870 or less than seven years ago, but the Principal believes that he was unemployed for a considerable time before his appointment to the Govt. College.

d/-G. W. Leitner

20th April, 1877."

بحوالہ محمد حسین آزاد از ڈاکٹر اسلم فرخی۔ درج بالا۔ ص ۳۰۱-۳۰۲-۳۰۳

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اب آخر میں سید جالب دہلوی کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''خدا بھلا کرے ڈاکٹر لائٹنر کا کرنیل ہالرائڈ وغیرہ نیک نہاد و شریف نواز افسران سررشتہ تعلیم پنجاب کا جنھوں نے ''قصص ہند'' حصہ دوم، ''نیرنگ خیال''، ''جامع القواعد'' اور ''مثنویات'' بھی مولانا آزاد سے لکھوا کر چھپوالیں اور ''آب حیات'' کی تالیف و اشاعت میں بالوسیلہ سہارا دیا اور دربار اکبری کی تیاری کا سامان پیدا کیا، ورنہ اگر مولانا کی دوسری تصانیف کی طرح کہیں ان کتب کا نکلنا بھی اہل ملک کی اعانت پر منحصر ہوتا تو شاید دہلی و لاہور کے باہر آزاد کا نام بھی نہ جانتا اور دوسری کثیر التعداد مثالوں کی طرح ان کا سرکاری خطاب شمس العلماء بھی محض وقعت رکھتا اور ان کے مسودات جھینگروں اور دیمک کی خوراک بننے کے سوا کسی کام نہ آتے۔'' (۳۷)

حواشی

۱۔ ان دونوں گروہوں کے سرکردہ افراد اور ان کے دلائل وغیرہ کے لیے رک:

Lynn Zastoupil and Martin Muir (eds.):

The Great Indian Education Debate: Documents relating to the Orientalist-Anglicist Controversy 1781-1843. Richmond, Curzon 1999.

۲۔ برٹش لائبریری (لندن) کے شعبہ ''اورینٹل اینڈ انڈیا آفس'' میں دستاویز نمبر ۲۵۶۹۴-۲۵۶۹۶ (۱۸۲۶ء-۱۸۲۷ء)

۳۔ تفصیل کے لیے رک: راقم کا مقالہ

"Dr. Aloys Sprenger and the Delhi College."

in: *The Delhi College. Traditional Elites, the Cultural State, and Education before 1857*. Edited by Margrit Pernau. New Delhi: OUP, 2006, p. 108.

۴۔ ایضاً، ص ۱۰۵-۱۲۴

۵۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار: جامعہ پنجاب کا مؤسس-ڈاکٹر لائٹنر (مجلہ تحقیق، ۱۹۸۲ء، ص ۱-۹) رک: راقم کا مقالہ در: راوی (گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور)۔ خصوصی شمارہ (دسمبر ۱۹۸۹ء)، ص ۱۴۵-۱۶۰ اور

Writings of Dr. Leitner. Ed. by M. Ikram Chaghatai. Lahore 2002.

۶۔ محمد حسین آزاد (نئے دریافت شدہ مآخذ کی روشنی میں)۔ ترتیب و تدوین محمد اکرام چغتائی۔ لاہور ۲۰۰۴ء۔

۶ (الف)۔ تقریباً پانچ ماہ آزاد، لائٹنر کو اردو پڑھاتے رہے۔ اس سلسلے میں لائٹنر نے آزاد کو جو سرٹیفکیٹ دیا، اسی کا اردو ترجمہ درج

ذیل ہے:

"۲۸ فروری ۱۸۶۵ء

مولوی محمد حسین گذشتہ پانچ مہینے سے میرے اردو منشی ہیں۔ میں ان کے کردار اور علم کا حد سے زیادہ معترف ہوں۔ وہ ہر اس تحریک کو اپنے وقت اور وسیع معلومات سے امداد دینے پر مستعد رہتے ہیں جس کا مقصد قوم کی اصلاح ہو۔ انجمن اشاعت اسلام مفیدہ میں میری صدارت میں انھوں نے جو مقالہ پڑھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنے موضوع پر کتنی قدرت حاصل ہے اور ان کی تنقیدی صلاحیت کسی یورپین عالم سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مولوی انتہائی علمی انسان ہیں۔ مختلف موضوعات پر مختلف لوگوں کی فراہم کی ہوئی معلومات میں ہمیشہ میں نے ان کی اطلاعوں کو سب سے زیادہ قابل اعتماد پایا ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ گورنمنٹ کی توجہ اب تک ایسے پُر جوش اور ذہین آدمی کی طرف کیوں منعطف نہیں ہوئی۔"

(مملوکہ آغا محمد باقر مرحوم، بحوالہ محمد حسین آزاد از ڈاکٹر اسلم فرخی، جلد اول۔ کراچی ۱۹۶۵ء، ص ۱۴۸)

۷۔ اخبار عام (لاہور)۔ بابت ۶ مارچ ۱۸۸۶ء۔

۸۔ رک اس سوسائٹی پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ از Monica C. Grobel (۱۹۳۲ء) اور

Janet Percival (comp.): *The Society for the Diffusion of Useful Knowledge, 1826-48*. London 1978.

۹۔ مثلاً صفیہ بانو: انجمن پنجاب، تاریخ و خدمات۔ کراچی ۱۹۷۸ء۔ بالخصوص آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد کا مقالہ مرحوم "انجمن پنجاب" اورینٹل کالج میگزین (۱۹۴۱ء) میں طبع ہوا۔ نیز "اخبار انجمن" کے مدیر اور مترجم چیف کورٹ منشی محمد لطیف کی یہ کتاب:

A brief account of the History and Operations of the Anjuman-i-Punjab from the Foundation to the end of the year 1877. no place, no date.

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ایک مکتوب (بابت ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انجمن پنجاب کی رپورٹوں، اخباروں اور رسالوں کی کھوج میں تھے۔ ممکن ہے وہ اس انجمن پر کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں، لیکن کسی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے خط (بنام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی) کا متعلقہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

"(۱) آپ نے انجمن پنجاب کی رپورٹ ۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۳ء کی نقل بھیجی ہے۔ مجھے ابتدائی سنین کی رپورٹ درکار ہے۔ یعنی ۱۸۷۲ء کی۔ ضرور تلاش کر کے بھیجیے۔

(۲) اس انجمن کے اصل بانی کون تھے؟ ڈاکٹر لائٹنر نے اورینٹل کالج یا یونیورسٹی کے قیام میں کیا کیا مساعی کیں؟ اور یہ

خیال اول اول کس نے پیدا کیا؟

(۳) جو رسالے یا اخبار اس انجمن یا اورینٹل کالج کی طرف سے شائع ہوتے تھے، ان کی کیا حالت تھی؟ اگر ان کا فائل چندروز کے لیے مستعار مل جائے تو بہت اچھا ہو۔

(۴) اردو زبان کے مشاعرے جو اس زمانے میں ہوئے (جس میں آزاد، حالی بھی شریک تھے) یہ کس کی تحریک سے ہوئے تھے؟ ان کا تعلق انجمن پنجاب یا اورینٹل کالج سے تھا یا نہیں؟''

(خطوط عبدالحق بنام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ لاہور ۱۹۷۶ء، ص ۵۷-۵۸)

۱۰۔ مکمل حوالے درج ذیل ہیں:

a) Price Perrill: *Punjab Orientalism. The Anujuman-i-Punjab and Punjab University, 1865-1888.* (1976)

b) Jeffery Mark Diamond: *Developing Indigenous and European Knowledge: The Vernacular Education Movement and Neo-Orientalism in the Punjab, 1849-1870.* (2002)

۱۱۔ ''وہ پنڈت من پھول اور لائٹنر کے ہمراہ ایران اور ترکستان گئے تھے۔''

۱۲۔ رک: رپورٹ مجموعی انتظام ممالک پنجاب وغیرہ بابت سال ۱۸۶۶ء۔ ۱۸۶۷ء۔ لاہور ۱۸۶۸ء، ص ۱۰۷۔

۱۳۔ زمانہ (کانپور) ۱۹۰۶ء و ۱۹۰۷ء۔

پنڈت من پھول میرٹھ کے قریب واقع گاؤں کے رہنے والے ایک غریب گوڑ برہمن کا بیٹا تھا۔ اس کا والد تلاش روزگار میں دہلی آیا۔ من پھول کا گھر کشمیری دروازہ میں تھا اور وہ دریبہ میں رہتا تھا۔ اس کے چھ بیٹے تھے۔ بڑا بیربل، لاہور میں فوت ہوا۔ دوسرا چندبل، پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھا۔ تیسرا سورج مل بی اے، بارایٹ لا، ایل ایل ڈی جموں کا گورنر تھا۔ وہ سات سال یورپ میں رہا۔ چوتھا ہمیش بل، جموں میں مرا۔ پانچواں نارائن مل، لاہور ہی میں رہا۔ پرانی جائدادوں کی خرید وفروخت کا کاروبار کرتا تھا۔ چھٹا گنیش بل، جے پور میں مقیم رہا۔

پنڈت من پھول نے ''قانون دیوانی'' کے زیرعنوان ایک رسالے کا ترجمہ کیا تھا، جو مطبع کوہ نور (لاہور) سے باہتمام منشی ہرسکھ رائے ۱۸۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ذیلی عنوان یہ ہے: ''مصدورہ نواب گورنر جنرل ممالک ہند برائے انتظام ماموراتِ دیوانی ملک پنجاب اور اضلاع سس ستلج۔ حسب الحکم صاحبان عالیشان بورڈ آف ایڈمنسٹریشن فاردی افریس آف دی پنجاب'' (صفحات ۵۲)

۱۴۔ محمد حسین آزاد (نئے دریافت شدہ مآخذ کی روشنی میں)۔ متذکرہ بالا، ص ۱۰۹۔

۱۵۔ ایضاً ص ۱۱۰

۱۶۔ ایضاً ص ۱۱۳

۱۷۔ ایضاً ص ۱۱۰

۱۸۔ انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت۔ کراچی ۱۹۵۹ء۔

آزاد ایک لیکچر میں بتاتے ہیں: ''بعضے حاضرین با تمکین کو یاد ہوگا کہ دو برس پہلے میں نے بموجب فرمائش طلبائے جماعت اول کے یہاں شعرائے ہند کی سوانح عمری اور شاعری اردو کی تحقیق و ترقی پر لیکچر دینا شروع کیا تھا۔ مدرسہ کے طلباء اور شہر کے شائقین کو بھی یہ سن کر شوق ہوا۔ صرف دو ہی ہفتہ میں اوس کا شہرہ اس قدر رہوا کہ اخبارات انگریزی میں اوس کا چرچا ہو گیا اور بعضے بعضے صاحبان یوروپین نے اوس میں آنے کی خواہش کی مگر مجھے اتفاقاً سفر پیش آیا۔ وہ سلسلہ برہم ہو گیا۔'' (اخبار انجمن پنجاب۔ ۲۰ جولائی ۱۸۶۷ء)

۱۹۔ دیکھئے: ایک کتاب، ایک جائزہ از نصرہ بشیر۔ (ماہ نو (کراچی)، خاص نمبر ۱۹۶۱ء، ص ۳۱-۳۶)

۲۰۔ لائٹز کی انگریزی کتاب ''ہندوستان کی زبانیں اور نسلیں'' پر تبصرہ از ٹرمپ (Ernst Trump) در: ''کلکتہ ریویو'' (۱۸۷۲ء) ص ۲۲۳-۲۵۰۔

ٹرمپ نے بھی ایک مقالہ بعنوان ''ہندوستانی قفقاز میں نام نہاد کافروں کی زبان کے بارے میں'' در: جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن) ۱۸۶۱ء۔

۲۱۔ رک: آزاد اور خانوادۂ آزاد۔ مرتبہ محمد اکرام چغتائی۔ لاہور ۲۰۱۰ء، (زیر طبع)۔

۲۲۔ رک: مقالات آزاد۔ مرتبہ آغا محمد باقر۔ جلد اول، لاہور، ص ۳۹۰-۳۹۶ و جلد دوم (۱۹۷۸ء) ص ۳۴۲-۳۵۱۔

۲۳۔ ''فرائض سکرٹریان: سکرٹریان سوسائٹی عملہ انجمن کی نگرانی کریں گے اور تقرری و موقوفی و تنزل اہل عملہ اس طور سے کریں گے جس سے ان کی دانست میں انسب کارروائی انجمن معلوم ہو۔

جملہ کاغذات سوسائٹی کی طرف سے اون کے دستخط سے جاری ہوں گے۔ کوئی خرچ خواہ کسی قسم کا ہو، بدون اون کی تحریری اجازت کے نہ کیا جاوے گا۔ نہ کوئی رسید بدون اون کے دستخط کے جائز سمجھی جاوے گی۔ نہ کوئی طلبی زر یا تقاضائے زر یافتنی انجمن بدون اون کے دستخط کے جاری ہو سکے گا اور کل خط و کتابت اور سوسائٹی کی اطلاعیں اون کے دستخط سے جاری ہوں گی۔

کارروائی انجمن کی عام نگرانی اور انضباط ذمہ سکرٹریاں ہوگا اور وہ دیکھیں گے کہ ہر ایک کام کا اجرائے وقت مناسب پر خوش اسلوبی سے ہوا۔'' (اخبار انجمن پنجاب، ۲۰ دسمبر ۱۸۷۸ء)

۲۴۔ رک: مقالات آزاد (جلد اول) متذکرہ بالا۔

۲۵۔ محمد حسین آزاد اور تنقید و تحقیق کا دبستان لاہور۔ مرتبہ محمد اکرام چغتائی۔ لاہور ۲۰۱۰ء (زیر طبع)

۲۶۔ ''سنین اسلام''۔ (حصہ اول)۔ لاہور، ۱۸۷۱ء۔

۲۷۔ رک: ادبی دنیا۔ خاص نمبر ۱۱۔ دور پنجم، شمارہ یازدہم۔ ص ۱۵۴۔

۲۸۔ فہرست مطبوعات آزاد۔ مرتبہ محمد اکرام چغتائی۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء، نیز رک: خزائن مخطوطات از سید عبداللہ در: اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۲۶ء، ص ۶۶۔

۲۹۔ رک: حکایات آزاد، مرتبہ آغا محمد باقر۔ حصہ دوم۔ لاہور ۱۹۶۱ء، ص ۶

۳۰۔ مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ لاہور ۱۹۶۶ء۔ دیباچہ

۳۱۔ رک: مکاتیب آزاد۔ متذکرہ بالا۔ ص ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۲۰، ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۲۹، ۱۴۰، ۱۴۳، ۱۴۵

۳۲۔ دیکھیے مسعود اختر زاہد کا مقالہ

"Orientalism's Last Battle in the 19th Century Punjab"

(in: *History, Politics and Society: The Punjab*. Edited by Massarrat Abid and Qalb-i-Abid. Lahore 2009, pp. 212-213).

۳۳۔ ایسی کتب میں چند کے حوالے درج ذیل ہیں:

الف) عمدۃ التواریخ (لالہ سوہن لال)۔ لاہور: مطبع حسنی، ۱۸۸۰ء

''در ظل حمایت جناب وحید الدہر علامۃ العصر ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر......''

ب) کتاب روضۃ الادباء (محمد الدین لاہوری)۔ لاہور: مطبع انجمن پنجاب۔ ۱۸۷۸ء۔

ج) رسالہ سلک جواہر (قاضی ظفر الدین)۔ لاہور: نیو امپیریل پریس۔ ۱۳۰۲ھ

د) رسالہ درفن شالبافی (مختار شاہ)۔ لاہور: مطبع کوہ نور۔ ۱۸۸۷ء

''بپاس خاطر فاضل جلیل عالم متبحر ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر''

ھ) دیوان حسان بن ثابت (بہ تصحیح و تحشیہ مولوی فیض الحسن سہارنپوری)۔ لاہور: مطبع انجمن پنجاب، ۱۸۷۸ء۔

و) ہدایت العلملۃ (مولوی عبدالحکیم درس اول فارسی اورینٹل کالج، لاہور۔ لاہور: مطبع انجمن پنجاب، ۱۸۸۰ء

ز) رسالہ منطق استقرائی (مولوی محمد حسین۔ میکلوڈ فیلو پنجاب یونیورسٹی کالج، اسسٹنٹ پروفیسر ریاضی و فلسفہ اورینٹل کالج لاہور، اڈیٹر ''اخبار انجمن پنجاب'')۔ لاہور ۱۸۸۴ء۔

ح) علم النفس والقوئ (مولوی انعام علی)۔ لاہور: مطبع انجمن پنجاب۔ ۱۸۸۵ء۔

۳۴۔ آزاد کے پنشن ریکارڈ کی ایک دستاویز (بابت ۲۰ جون ۱۸۹۲ء) کا متعلقہ اقتباس:

"As regards the latter part, we can do nothing in the matter. The Government has removed the name of M. Mohd. Husain ..... who had applied for land, as under the rules recently sanctioned by. [He is] not eligible for grant of land. The Maulavi has retired now and if his son wishes to move in the matter he should do so direct first this as."

تین روز بعد کے مکتوب بنام محمد ابراہیم کا ایک اقتباس:

"As regards the grant of land, I regret I can do nothing in the matter of Govt. recently removed the names of Maulavi Muhammad Husain Azad, several others from the list of applicants for land on the ground that they could not obtain land on favourable terms under the Rules recently sanctioned by the Govt. of India. But if you desire to move in the matter, you can address the Govt. direct, or through the prescribed channel, as your father no longer belongs to this Deptt."

۳۵۔ رک: ان کے مقالہ برائے ڈاکٹریٹ (۲۰۰۲ء) کا متذکرہ صدر حوالہ۔

۳۶۔ رک: محمد حسین آزاد (تلامذہ اور معاصرین کی نظر میں) مرتبہ محمد اکرام چغتائی۔ لاہور، ۲۰۱۰ء (زیر طبع)

۳۷۔ مکتوبات آزاد۔ لاہور ۱۹۰۷ء۔ دیباچہ۔

آزاد، انجمنِ پنجاب اور جدیدیت

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

یہ انیسویں صدی کے نصف آخر کی داستان ہے جب پنجاب نے دیکھا کہ ۱۸۴۹ء میں یہاں برطانوی راج مسلط ہوا۔ سنہ ستاون میں ہندوستانی بغاوت برپا ہوئی اور اس بغاوت کے ختم ہونے پر برطانوی راج زیادہ استقامت سے شروع ہوا۔ لاہور کہ ایک مغلیہ شہر کے طور پر معروف تھا، اب ایک کلونیل شہر کے طور پر نظر آنے لگا۔ مغربی طرز کی نئی عمارتیں کلونیل علامتوں کے طور پر ابھرنے لگیں۔ گورنمنٹ کالج و میڈیکل سکول جیسے تعلیمی ادارے اس شہر کے نئے کلونیل مظہر بن گئے اور اسی شہر میں ۱۸۶۵ء میں قائم ہونے والی ایک تنظیم 'انجمن پنجاب' بھی اسی شہر سے ابھرنے والی جدیدیت ہی کا ایک نشان تھی۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ انجمن پنجاب کا سیکرٹری جس شخص کو بنایا گیا وہ محمد حسین آزاد تھے جو سقوط دہلی کے بعد بچتے بچاتے لاہور پہنچے تھے اور یہاں ڈاکٹر لائٹنر کا قرب حاصل کر کے انجمن کی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ آزاد کے فرائض میں یہ شامل تھا کہ وہ انجمن کے ہفتہ وار اجلاس میں کسی علمی، ادبی، معاشرتی اور اصلاحی موضوع پر لیکچر دیا کریں گے۔ انھوں نے یہاں بہت سے لیکچر دیے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کے کئی لیکچر اردو شاعری کی تاریخ پر تھے۔ یعنی آب حیات کی ابتدائی صورت انجمن کے جلسوں ہی کے لیے تیار کی گئی تھی۔ بعدازاں ان ہی لیکچروں کی بنیاد پر آزاد نے اپنے لازوال اسلوب میں آب حیات تیار کی تھی۔ چناں چہ انجمن پنجاب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس تصنیف کی ابتدا انجمن کے جلسوں میں کی گئی تھی۔ اس مسئلے کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ انجمن نے آزاد کو اپنے جوہر دکھانے کے لئے اپنا پلیٹ فارم بھی مہیا کیا تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر کی صدارت اور لیفٹیننٹ گورنر سر ڈونلڈ میکلوڈ کی سرپرستی اور خصوصی توجہ کے باعث برطانوی سرکار کے اہم حلقوں میں آزاد کو متعارف اور معروف ہونے کا نادر موقع بھی ملا تھا اور مقامی حلقوں میں بھی ان کا وقار بلند ہوا تھا۔

''انجمن پنجاب'' میں آزاد کے لیکچران کے فرائض منصبی کی ضرورت تھی کہ جسے پورا کرنے کے لیے آزاد کو کام کرنا پڑتا تھا اور یہ بات انجمن کے مقاصد میں شامل تھی کہ جدید علوم وفنون، جدید تصورات، سائنسی حقائق اور جدید

زندگی کے دیگر موضوعات پر لیکچروں کے ذریعے لاہور کی پرانی زندگی میں نئے دور کی روشنی پھیلائی جائے۔ جدید طرز فکر کے ابتدائی اثرات کو انجمن فروغ دینا چاہتی تھی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے بعد انجمن پنجاب دوسری جگہ تھی جہاں لوگ جدیدیت کے ابتدائیے سے روشناس ہونے لگے تھے اور شہر میں نئے طرزِ احساس کی حرارت محسوس کی جانے لگی تھی۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں انجمن اور آزاد کی شہرت کا ایک اہم سبب آزاد کا وہ لیکچر تھا جو انجمن کے ایک جلسہ میں دیا گیا تھا۔ اس لیکچر کو جدید اردو شاعری کا ابتدائی ہدایت نامہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ انجمن پنجاب کے مشاعرے کیوں کر شروع ہوئے اور جدید شاعری کو پروان چڑھانے کے لیے کیا تجاویز دی گئیں ان پر کچھ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ مشاعرے مئی ۱۸۷۴ء کو شروع ہوئے اور تاریخی طور پر ان کا بہت گہرا اثر مرتب ہوا۔ برصغیر میں یہ مغربیت کے اثرات کا زمانہ تھا۔ مستشرقین اور برطانوی سرکار کے نمائندے ہندوستانی ادبیات میں نئی تبدیلیوں کے لیے مقامی ذہنوں کو متاثر کرنے میں مصروف تھے۔ ۱۸۷۴ء کے مشاعرے اسی سلسلے کی کڑی تھے، مگر انجمن کے ان مشاعروں سے پہلے بھی اردو ادب کی ایک روایت اس سلسلے میں موجود تھی جس کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ انیسویں صدی کے آغاز میں کلونیل حکمرانوں نے اپنے کلونیل مقاصد کے لیے اردو نثر کی منصوبہ بندی کر کے فورٹ ولیم کالج میں اردو کے ادیبوں سے اپنی درسی ضروریات کا مال تیار کروایا تھا۔ کلونیل سوچ کبھی مقامی بہبود اور سماجی تبدیلی کی سوچ نہیں ہوسکتی۔ اگر ایسا ہو جائے تو اسے حُسنِ اتفاق ہی سمجھیے۔ کلونیل سوچ نے تو اپنے مقاصد اور ضروریات کے لیے ماتحتوں کو دیے ہوئے فریم ورک کے مطابق اپنا کام چلانا ہوتا ہے۔ میر امن نے اسی فریم ورک کے مطابق باغ و بہار تالیف کی تھی۔ ۱۸۷۴ء میں حالی اور آزاد کی مشاعروں میں شرکت بھی اسی قسم کے فریم ورک کا نتیجہ تھی۔ فرق یہ تھا کہ کلونیل حکمرانوں نے اس بار نثر کی جگہ نظم کا انتخاب کیا تھا۔ اس بار لاہور میں مشاعرے سجائے گئے۔ کلکتہ میں میر امن تھے اور لاہور میں حالی اور آزاد اس مقصد کے لیے کوشاں تھے کہ نیچر کی شاعری چل نکلے۔

اس مقام پر میں یہ ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ انجمن کے مشاعرے آزاد یا حالی کے کہنے پر شروع نہ ہوئے تھے۔ وہ کسی بھی صورت میں مشاعروں کے محرک نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر نے مدارس کی درسی کتب کے لیے فطرت کی شاعری پر مشتمل نظمیں لکھوا کر نصاب میں شامل کرنے کے لیے ہالرائیڈ کو خصوصی ہدایات بھیجی تھیں اور ہالرائیڈ نے منصوبہ بندی کر کے آزاد اور حالی کی معاونت حاصل کی تھی۔ ان مشاعروں کی منصوبہ بندی پر میں اس سے پہلے مجلّہ بازیافت میں ایک مقالہ لکھ چکا ہوں جس میں متعلقہ دستاویزات فراہم کی گئی تھیں۔ اس لیے میں یہاں ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

آزاد نے ۱۸۷۴ء کے پہلے مشاعرے میں جو لیکچر دیا تھا وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور آج بھی اس کا

ذکر کیے بغیر جدید شاعری کا قصہ شروع نہیں کیا جاسکتا ہے۔

۱۸۷۴ء میں آزاد نے مشاعروں کی ابتدا میں ایک ''مضمون لیکچر'' پیش کیا تھا۔ یہ لیکچر اردو ادب کی تاریخ میں ایک یادگار سمجھا جاتا ہے۔ جب کبھی ۱۸۷۴ء میں انجمن کے مشاعروں کا ذکر آتا ہے تو یہ لیکچر خود بخود حوالے کے طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اس لیکچر کی اساس دو باتوں پر ہے۔ مشرقی شعریات کے بارے میں آزاد کی آرا سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی شاعری کے فنی محاسن زوال کا شکار ہو چکے ہیں۔ تخلیقی سرچشمے تھک ہار کر خشک ہو گئے ہیں۔ مضامین شعری از بس تکرار کے باعث فرسودہ ہیں۔ یعنی مضامین عاشقانہ ہیں جس میں کچھ وصل کا لطف، بہت سے حسرت وارماں، اس سے زیادہ ہجر کا رونا، شراب، ساقی، بہار، خزاں اور شکایت فلک ہے۔ یہ مطالب بالکل خیالی ہوتے ہیں۔ اردو میں استعمال ہونے والی تشبیہوں اور استعاروں کی بلند پروازی معنویت کے جوہر سے محروم نظر آتی ہے۔ یوں وہ مجموعی طور پر اردو شاعری کے مستقبل سے مایوس معلوم ہوتے ہیں اور اس مایوسی کی حالت میں وہ دکھ کے ساتھ یہ اظہار کرتے ہیں:

> تمہارے بزرگوں کی یادگار عنقریب مٹا چاہتا ہے اور تمہیں درد نہیں آتا۔ اے میرے اہل وطن ہمدردی کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔ جب مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔

اردو شاعری کے مستقبل سے افسردہ ہو کر وہ اس لیکچر کی دوسری اہم بات کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں اور نظم اردو کا مستقبل سنوارنے کے لیے جدید شاعری کے لیے کچھ تجاویز پیش کرتے ہیں:

> اب رنگ زمانے کا کچھ اور ہے اور ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے، ہار، طرے ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے۔

> کیسی مسرت آتی ہے جب میں زبان انگریزی میں دیکھتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب مضامین کو نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں اور حق یہ ہے کہ کلام میں جان ڈال دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں کیا؟ ہم سن کر ترسیں اپنے تئیں دیکھ کر شرمائیں۔

> نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوق میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں ان صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔

آزاد کی ان تجاویز کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے ہاں جدیدیت کے اصولوں کا کوئی مخصوص تصور نہیں ہے۔ صرف عمومی طور پر مغرب سے استفادے کا مبہم سا تصور ضرور موجود ہے جس کی بنیاد مغرب کے استفادے کا تقاضا کرتی ہے، اور اپنی نجات کا سامان اس میں تلاش کرتی ہے۔ اس سے زیادہ سوچنا شاید آزاد کے دور

میں ممکن ہی نہ تھا۔

آزاد نے انجمن کے مشاعروں میں نظمیں بھی پڑھیں ان نظموں کو پڑھ کر بھی چند سوال پیدا ہوتے ہیں:

ا۔ کیا انجمن کے مشاعروں سے آزاد کی تخلیقی دنیا میں حقیقتاً کوئی تبدیلی پیدا ہوئی؟

ب۔ مشاعروں کے اثرات سے انھوں نے جو شاعری لکھی کیا اس کی کوئی تخلیقی سطح بنتی ہے؟ کیا آزاد کوئی بڑا شعری نقش بنانے میں کامیاب ہوئے؟

ج۔ کیا ان کا لیکچر اور مشاعروں میں شرکت ان کے اندر سے برآمد ہونے والی کوئی چیز تھی یا یہ ان کے منصبی فرائض کا نتیجہ تھا؟

د۔ کیا ان کی شاعری محض فنکشنل (Functional) قسم کی چیز تھی؟

د۔ کیا انجمن کی شعری روایت ان کے اندر برقرار رہ سکی؟

میری رائے میں ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ اس میں کوئی بھی شک نہیں کہ انجمن کی جدید شاعری سے ان کے اندر برقرار رہنے والی تخلیقی تبدیلی پیدا نہیں ہوسکی تخلیقی معیار کے مطابق شاعری میں ناشاعری یا لاشعر لکھتے رہے۔ ان کی یہ شاعری فنکشنل قسم کی ایک چیز تھی۔

دراصل انجمن پنجاب میں آزاد کا کردار آزادانہ نہیں تھا۔ انجمن کے جلسوں اور مشاعروں میں آزاد نے جو کچھ کیا وہ کلونیل احکام کا نتیجہ تھا۔ اگر آزاد کی سوچ حقیقتاً جدیدیت کی طرف مائل ہوتی تو اس کے اثرات ۱۸۷۴ء کے بعد بھی قائم رہتے جب کہ ایسا نظر نہیں آتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شعری جدیدیت کا تعلق ان کے مزاج سے نہ تھا۔ ان کا مزاج ٹھیٹھ مشرقی تھا۔ اپنے عہد میں وہ حال سے زیادہ ماضی کے انسان تھے۔

اب آیئے ذرا یہ دیکھیں کہ پنجاب کے شہر لاہور میں رائج ہونے والی جدیدیت کس نوعیت کی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بدلتے ہوئے کلونیل منظر میں نئے تعلیمی اور علمی ادارے کلونیل ڈھانچے کی انتظامی معاونت کے لیے قائم کیے گئے۔ نیا انفراسٹرکچر فوجی حرکت کے لیے قائم ہوا۔ نہری پانی کا نظام کپاس کے حصول کے لیے تھا اور یہاں کی نئی نہری آبادیاں پنجاب کے نئے شہری تمدن کا ابتدائیہ بنیں۔ یہاں لوکل سیلف گورنمنٹ کا تصور پیش کیا گیا۔ انجمن میں جدیدیت کی ابتدائی شکل متعارف کرائی گئی اور اس جدیدیت کو کسی طور پر بھی مغربی جدیدیت سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ یہ معصوم سی جدیدیت تھی اور اس کا تصور ابھی مبہم تھا۔

کلونیل دانش کا بڑا مقصد مقامی باشندوں کو اپنے تہذیبی، علمی، تمدنی اور سائنسی مظاہر سے مرعوب کر کے یہ یقین دلانا ہے کہ ان کا تعلق ایک مجہول قسم کی تہذیب سے ہے اور ان کی تہذیب کے تخلیقی، فنی اور علمی منابع خشک ہو چکے ہیں۔ یہ کلونیل ازم ہی ہے جو انسان کی ذہنی ہیئت تبدیل کرتا ہے اور اس تبدیلی کے بعد کلونیل انسان کو اپنی تہذیب،

ثقافت اور تمدن پست نظر آنے لگتے ہیں اور کلونیل طبقے کے کتے اپنے ہم وطنوں سے بہتر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اگر سر سید کو انگریز کا کتا ہندوستانی انسان سے بہتر نظر آ سکتا تھا تو پھر حالی اور آزاد جیسے انسانوں کا اپنی ادبیات کے منظر نامے سے مایوس اور بیزار ہونا کچھ عجیب نہ تھا۔ حالی اور آزاد مشرقی ادب کے خلاف ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ شاعری میں خیال کے تصور سے باغی ہو گئے تھے اور خیال کو شاعری کا دشمن سمجھنے لگے تھے۔

اسی زمانے میں سرسید نے حالی کی نظم ''خواب امن'' پڑھ کر یہ مشورہ دیا تھا کہ اس نظم میں خیالی باتیں اب بھی بہت ہیں اور اسے نیچر کے اور زیادہ قریب ہونا چاہیے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سرسید پر کلونیل جدیدیت کا گہرا اثر تھا اور اب ذرا یہ دیکھیے کہ خیال شاعری کا وہ بنیادی عنصر ہے کہ جس کی قوت پر شعر کی بنیاد بنتی ہے مگر حالی اور آزاد جدیدیت کے دھارے میں بہہ کر خیال کی تخلیقی قوت ہی سے خوف زدہ ہوئے اور اس خوف زدگی کی حالت میں اس قوت سے محروم ہو کر اپنی شاعری کو ناشاعری بنا بیٹھے۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں جدیدیت کے نام پر حالی، آزاد اور سرسید احمد خان شاعری کے جس تصور کو پروان چڑھا رہے تھے اس نے شاعری کے بنیادی لوازمات سے انحراف کیا۔ اس دور میں شاعری کے نام پر ناشاعری کا بازار گرم ہوا۔ جدید اردو شاعری نے اس کے بعد بیسویں صدی کے اوائل میں اپنا سفر اس وقت دوبارہ شروع کیا جب اقبال کی قوت متخیلہ نے اس کو حیات نو بخشی اور ان کی نظم 'ہمالہ' منظر عام پر آئی۔

اب اس مرحلہ پر میں اپنا ایک اور سوال اٹھانا چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ کیا آزاد انیسویں صدی کی جدیدیت کی رو سے اپنی شناخت کر سکے تھے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے پہلے میں ماضی کے کچھ حوالوں سے رجوع کروں گا۔ ۲۹-۱۸۲۸ء میں غالب نے دلی کے زوال یافتہ جاگیرداری ماحول سے باہر نکل کر کلکتہ جیسے کھلے تہذیبی ماحول، جدید طرز حیات اور سائنسی فتوحات سے آراستہ شہر میں جدیدیت کا تجربہ کیا تھا یہ تجربہ ثقافتی صدمے کا اظہار بھی کرتا تھا اور ایک نئی زندگی کا حوصلہ بھی دے رہا تھا۔ یہی ثقافتی صدمہ سرسید نے لندن کے قیام میں محسوس کیا تھا۔ مگر آزاد کو ایسے کسی ثقافتی صدمے سے دوچار ہونے کا موقع نہ ملا تھا۔ اس لیے عملی طور پر وہ کسی ثقافتی تبدیلی کے عمل کو شدت سے محسوس نہ کر سکے تھے۔ وہ دلی سے بھاگ کر لاہور پہنچے تھے۔ جاگیرداری کلچر کے ایک شہر سے نکل کر اسی قسم کے دوسرے شہر میں چلے آنا ان کے اندر بھلا کیا تبدیلی لا سکتا تھا۔ دلی کی تباہی، باپ کی الم ناک شہادت اور خاندان کے آشوب سے گزر کر لاہور میں آباد ہو جانے والے آزاد پر کیا جدیدیت اثر انداز ہو سکی تھی؟ اگر ہوئی تو کس حد تک؟ سچ تو یہ ہے کہ ذہنی طور پر وہ جدیدیت کے کلچر کے انسان نہ تھے۔ وہ آب حیات کے کلچر کے آدمی تھے۔ باپ کے بعد بیٹی کی موت، ملازمت کے مسائل دفتریت کے سبب مقدمہ چلائے جانے اور ملازمت سے محروم ہونے کا خوف، لائٹنر سے پیدا ہونے والی تلخیوں کے عذاب اور سامراجی سرکار کے لیے زندگی بھر پرسونا (Persona) کے ساتھ مفاہمت واطاعت کا رویہ اپنا کر زندہ رہنا

ایک بڑا آشوب تھا۔ان تمام آشوبوں کو آب حیات کا کلچر فراموش کر دیتا تھا۔انشا کے قہقہے، سودا کے معرکے، ولی سے مکالمے اور ذوق کے قصے ان کے ناآسودہ زخموں کو مندمل کر سکتے تھے۔جدید شاعری اور لیکچر ان کے زخموں کا مداوا نہ کر سکتے تھے اور نہ ہی ان کے لیے گوشہ عافیت مہیا ہو سکتا تھا۔طمانیت اور سرشاری کی جو گھڑیاں آب حیات کا کلچر مہیا کر سکتا تھا وہ جدید شاعری میں کہاں مل سکتی تھیں۔جدید شاعری میں آزاد اپنے منصبی فرائض نبھاتے رہے۔اس سے زیادہ کچھ نہیں۔انجمن کا کام انجمن کا کام تھا، یہ آزاد کا مشن نہ تھا۔آزاد کا مشن تو بکھرتی، اجڑتی اور مٹتی ہوئی پرانی تہذیب کو اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنانا اور اس کے مناظر کو آب حیات کے ذریعے لوگوں تک پہنچانا تھا۔''انجمن پنجاب'' نئی مغربی روشنی کو فروغ دے رہی تھی اور آزاد پرانی روشنی کے جادو کو لفظوں میں منتقل کرنے والے تھے۔

سرسید دور میں فروغ پانے والی عقلیت آزاد کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکی، اور نہ ہی وہ سائنسی شعور کی عینک لگا کر دنیا کو دیکھ سکے۔سرسید کے رفقا پر عقلیت، مقصدیت اور افادیت غالب رہی، ادبی اقدار پر یہ تصورات بہت حاوی رہے اور یوں ادب حبس دم کی کیفیات سے گزرتا رہا۔اس دور نے ادب سے ذوق لطافت چھین کر مقصدیت وعقلیت کے تحفے دے دیے تھے۔جدیدیت کے یہ تحفے آزاد کے لیے قابل قبول نہ تھے۔

آزاد کی ادبی زندگی اور ان کی ادبی فتوحات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو سکے گا کہ جدیدیت کی تلاش میں ان کی ادبی توانائی کا ایک مختصر سا حصہ ہی صرف ہو سکا تھا، مگر ان کی پوری توانائی جس شعبہ میں صرف ہوئی تھی وہ ماضی کے ادب کی بازیافت کا شعبہ تھا۔ان کی سعی کھوئے ہوؤں کی جستجو میں تھی۔ان کا سارا عشق ماضی کا عشق تھا۔وہ حال میں زندہ تھے لیکن ماضی کے ادب پاروں میں مسحور اور محصور رہتے تھے۔

اس لیے میں سوچتا ہوں کہ شعری جدیدیت سے آزاد کا تعلق عارضی اور سطحی سا تھا۔اور یہ تعلق بھی جیسا کہ کہا جا چکا ہے منصبی نوعیت کا تھا۔اسی لیے یہ منصبی تعلق ختم ہونے پر فراموش ہوتا گیا۔جدیدیت حالی اور سرسید کی طرح ان کا آدرش نہ تھی۔سرسید کے پاس تو جو کچھ تھا ان کی جدیدیت تھی۔ان کے ادب، تہذیب، سماج اور مذہب کی اساس جدیدیت پر ہی تھی۔آج ان کی معنویت میں استحکام بھی اسی تصور پر قائم ہے اور یہی چیز ان کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کی جدیدیت آزاد کے ادبی اور تہذیبی منابع کا ایک محدود اور سطحی سا حصہ بن سکی تھی۔ ۱۸۷۴ء کے مشاعروں کا ان پر اگر کوئی اثر تھا بھی تو وہ بہت جلد اس اثر سے باہر نکل آئے تھے۔انیسویں صدی کے اردو ادب میں اگر کوئی ادبی شخصیت تخلیقیت سے شرابور تھی تو وہ آزاد ہی کی شخصیت تھی۔وہ واحد ادیب تھے جو ادب کی بات کرتے تھے۔

محمد حسین آزاد اور سنین الاسلام کا قضیہ

ڈاکٹر رفاقت علی شاہد

مولانا محمد حسین آزاد [۱۰ جون ۱۸۳۰ء تا ۲۱ جنوری ۱۹۱۰ء مطابق ۹ (۱) محرم ۱۳۳۶ھ] کا شمار جدید اُردو نثر کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ آب حیات، نیرنگِ خیال، قصصِ ہند حصّہ دوم، دربارِ اکبری اور سخن دانِ فارس؛ اُردو نثر میں ان کے فن کی لازوال اور تابندہ نشانیاں ہیں۔ ان معروف تصانیف کے علاوہ آزاد کی متعدد اور کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ انھی میں ایک نثری تالیف سنین الاسلام، حصّہ اوّل بھی ہے جسے عام طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔ آزاد کے فن و سوانح پر لکھی گئی کتب و مقالات میں سے بعض میں تو اس کتاب کا ذکر تک نہیں ملتا (۲) اور جن میں ذکر موجود ہے، ان میں سے بیش تر میں کتاب کے بارے میں مستند معلومات کم ملتی ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے پیش نظر مضمون میں سنین الاسلام کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے اور اس کی تالیف میں مولانا محمد حسین آزاد کے حصّے کا تعین کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ حصولِ مقصد کے لیے معاملے کے متعلقہ پہلوؤں پر معروضی تحقیقی نتائج پیش کیے گئے ہیں۔

تعارف:

ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر (۳) کا نام پنجاب میں ترقیِ تعلیم کے حوالے سے ناقابلِ فراموش ہے۔ وہ گورنمنٹ کالج، لاہور کے پرنسپل تھے۔ تب اُنھوں نے کوشش شروع کی کہ کلکتہ یونیورسٹی کی طرز پر پنجاب، خصوصاً لاہور میں بھی ایک یونیورسٹی قائم ہو۔ ان کی کوششوں سے ۱۸۷۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کالج (بعد ازاں اورینٹل کالج)، لاہور میں قائم ہوا جو بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی کے قالب میں ڈھلا۔ پنجاب یونیورسٹی کالج قائم ہوا تو اس کا پہلا پرنسپل بھی ڈاکٹر لائٹنر کو مقرر کیا گیا۔ اسی طرح پنجاب یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار بھی وہی تھے۔ (۴)

جولائی ۱۸۷۰ء میں اُنھوں نے وظیفے کے اُمید وار عربی مولویوں کا امتحان لیا تو اُنھیں معلوم ہوا کہ زبان

دانی کی حد تک تو ان اُمید واروں کا علم مناسب ہے لیکن عرب کی تاریخ اور اَدبیات کے اہم ترین پہلوؤں سے یہ بے خبر ہیں، چناں چہ ڈاکٹر لائٹنر کو ایسے اُمید واروں کی راہ نمائی کے لیے ایک کتاب کی ضرورت کا احساس ہوا۔ اسی احساس نے سنین الاسلام کی تسوید کا ڈول ڈالا۔

سنین الاسلام کی تسوید کے سلسلے میں ڈاکٹر لائٹنر نے سب سے پہلے عربوں کی تاریخ کا سنین وار خاکہ مرتب کیا، پھر اسی نہج پر عربوں کی اَدبیات کا خاکہ بھی تیار کیا اور پھر اُردو عبارت آرائی کے بعد کتاب تیار ہوئی۔

ڈاکٹر لائٹنر کے مطابق وہ چاہتے تھے کہ عربی زبان واَدبیات کے طالب علموں پر واضح کریں کہ عربوں کی تاریخ اور اَدب کو تاریخِ انسانیت اور افکارِ عالم میں اہم مقام حاصل ہے، کس طرح عربوں کی تاریخ، مسلمانیت [۵] میں پروان چڑھی اور کس طرح اس کی اَدبیات نے اس کے عقیدہ دہندوں کو متاثر کیا۔ اُنھوں نے عالمی تاریخِ تہذیب میں مسلمانوں کی تاریخ کا مقام واضح کرنے کی کوشش بھی کی۔ ان سب کوششوں کا نتیجہ سنین الاسلام کی صورت میں سامنے آیا۔ ڈاکٹر لائٹنر نے اُمید ظاہر کی کہ یہ کتاب اُردو داں یورپی طالب علموں اور اُردو آنرز کے طلبہ کے لیے بھی فائدے مند ثابت ہوگی۔ اُنھیں احساس تھا کہ اب تک اس طرز کی کتاب اُردو میں شائع نہیں ہوئی۔ [۶]

سنین الاسلام کے نفسِ مضمون اور موضوع کی وضاحت سنینِ اِسلام، جلد اوّل (طبع دوم) کے سرِورق کی درج ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے:

> ''سنینِ اِسلام۔ جس میں مختصر حال اسلام کی تاریخ اور علم کا، اس تشریح کے ساتھ مندرج ہے کہ تاریخ عالم کے سلسلہ میں اسلام کی تاریخ اور اس کے علوم وفنون کس درجہ پر ہیں۔''

یہی عبارت سنینِ اِسلام، حصۂ دوم کے سرِورق پر بھی ہے۔

سنین الاسلام، حصۂ اوّل کی پہلی اشاعت پیشِ نظر ہے لیکن اس کے اُردو اور انگریزی سراوراق موجود نہیں۔ سنینِ اِسلام، حصۂ اوّل کی دوسری اشاعت اور سنینِ اسلام، حصۂ دوم بھی پیشِ نظر ہیں۔ ان تینوں نسخوں کی مدد سے کتاب کے تفصیلی کوائف درج کیے جاتے ہیں۔

سنین الاسلام، حصۂ اوّل کی پہلی اشاعت [۷] ۱۶×۲۴ سم سائز کے ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں کتاب کے ۱۲۸ صفحات کے علاوہ فہرست، سراوراق اور انگریزی دیباچۂ مؤلف کے چار چار صفحات بھی شامل ہیں۔ متن کے لیے قدرے جلی قلم، جب کہ پاورق حواشی کے لیے خفی قلم استعمال کیا گیا ہے۔ مسطر اگرچہ سولہ سطری ہے لیکن جہاں طویل حاشیے کتابت ہوئے ہیں، وہاں خفی قلم ہونے کے باعث سطور کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے۔ اُردو سرِورق کے بعد ''فہرست مطالب'' ہے۔ اس کے بعد کتاب کا متن نئے شمار نمبر ایک سے شروع ہوتا ہے۔ ص ۱۲۳ پر ''تمت'' تحریر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کتاب کا اصل متن ختم ہوگیا ہے۔ اسی صفحے کے پاورق اور صفحہ ۱۲۴ پر حاشیے کی

عبارت ہے۔ص ۱۲۵ تا ۱۲۸ میں ''فہرست سلسلہ وار......'' ہے۔اس کے تحت خلفاے راشدین، خاندانِ اُمیہ اور خاندانِ عباسیہ کے حکمران بادشاہوں کی فہرست مع ہجری و عیسوی سنہ تخت نشینی درج کی گئی ہے۔اس کے بعد چار صفحات کا انگریزی دیباچۂ مؤلف ہے۔

سنین الاسلام ،حصۂ اوّل کی اشاعتِ ثانی ۱۸۸۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔اس اشاعت میں کتاب کا نام سنینِ اسلام درج ہے۔اس کے سرِ ورق کی عبارت یہ ہے:

''الحمدللہ کہ دریں ایام میمنت انجام نسخۂ مفید ہر خاص و عام، المسمّٰی بہ۔سنینِ اِسلام ۔جس میں مختصر حال اسلام کی تاریخ اور علم کا اس تشریح کے ساتھ مندرج ہے کہ تاریخِ عالم کے سلسلہ میں اسلام کی تاریخ اور اس کے علوم و فنون کس درجہ پر ہیں۔جس کو ڈاکٹر جی ڈبلیو لیٹنر صاحب بہادر ایم اے، پی ایچ ڈی پرنسپل گورنمنٹ و اورینٹل کالج و رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی کالج، لاہور نے۔واسطے استفادہ مولویوں کے۔تالیف فرما کر ۱۸۷۱ء میں مشتہر فرمایا تھا اور اب دوبارہ چھاپنے کی۔پنجاب یونیورسٹی کالج کو اجازت بخشی۔حصۂ اوّل۔عرب کی تاریخ، ایام جاہلیت سے اختتام خاندان عباسیہ تک۔مطبع انجمن پنجاب میں کمال صحت اور احتیاط کے ساتھ طبع ہوا۔''

کتاب کے انگریزی سرِ ورق کے مطابق اس کا سال اشاعت ۱۸۸۰ء ہے۔انگریزی سرِ ورق البرٹ پریس، لاہور میں طبع ہوا۔

سنینِ اسلام ،حصۂ اوّل، اشاعت ثانی کی کتابت اشاعتِ اوّل کی نسبت خفی قلم سے کی گئی ہے، اس لیے فی صفحہ سطور کی تعداد پہلی اشاعت کی نسبت بڑھ گئی ہے۔اس سے کتاب کی ضخامت خاطر خواہ طور پر کم ہوگئی ہے۔اشاعتِ ثانی کل ۱۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں متن کے ۹۸ صفحات، سرِ اوراق اور انگریزی دیباچے کے چار چار صفحات شامل ہیں۔اس اشاعتِ ثانی میں کتاب کی فہرست شامل نہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ ایسا سہو سے ہوگیا ہوگا۔کتاب کی باقی ترتیب اشاعتِ اوّل کے مطابق ہے۔اس اشاعت میں بھی ڈاکٹر لائٹنر کا وہ انگریزی دیباچہ من و عن شامل کیا گیا ہے جو اشاعتِ اوّل میں ہے، البتہ اس کے آخر میں "Notice Regarding Second Edition" کی مختصر عبارت ہے جس میں اطلاع دی گئی ہے کہ کتاب کے حصۂ اوّل کی پہلی اشاعت [سنین الاسلام ،حصۂ اوّل] ۷۰۰ کی تعداد میں چھاپی گئی تھی جو جلد ہی ختم ہوگئی اور اب یہ دوسری اشاعت مولوی فیض الحسن اور مولوی غلام مصطفیٰ کی اعانت سے تیار ہوئی ہے، جن کا شکریہ مولف پر واجب ہے۔اسی میں یہ اطلاع بھی درج ہے کہ حصۂ دوم [سنین اسلام ،حصۂ دوم، مطبوعہ ۱۸۷۶ء] کی دوسری اشاعت بھی طباعت کے لیے تیار ہو رہی ہے، جس کے ایک ہزار نسخے طبع کیے جائیں گے۔اشاعت ثانی کے اس اضافی نوٹ کے آخر میں ۱۳ دسمبر

۱۸۷۹ء کی تاریخ درج ہے۔ (۸)

سنینِ اسلام، حصۂ دوم کے سرِ ورق کی عبارت درج ذیل ہے:

''سنینِ اسلام -- جس میں مختصر حال اسلام کی تاریخ اور علم کا، اس تشریح کے ساتھ مندرج ہے کہ تاریخِ عالم کے سلسلہ میں اسلام کی تاریخ اور اوس کے علوم وفنون کس درجہ پر ہیں -- واسطے استفادہ مولویوں کے -- مؤلفہ ڈاکٹر جی ڈبلیو لیٹنر صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور بمدد مولوی کریم الدین ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس امرت سر -- حصۂ دوم -- فتحِ بغداد سے زمانۂ حال تک، سواء مفصل تاریخ ہندوستان کے -- مطبع انڈین پبلک اوپنین میں چھپا -- سنہ ۱۸۷۶ع مطابق ۱۲۹۳ ہجری۔''

کتاب کے انگریزی سرِ ورق میں ذیل کی عبارتیں زیادہ ہیں:

"[With historical and other Maps and drawings of celebrated cities -- and buildings] ...... PART II -- (The History of Muhammadanism from 711 [in Spain] to the reign -- of Sultan Abd-ul-Aziz of Turkey, with the exception of -- the detailed Muhammadan History of India)."

کتاب کے اُردو اور انگریزی سرِ ورق ہلکے سبز رنگ کے قدرے باریک کاغذ پر طبع ہوئے ہیں۔ اُردو سرِ ورق کے بعد کے صفحے پر یہ ''اعلان'' ہے کہ:

''اس کتاب میں بہت غلطیاں کاتب سے واقع ہوئی ہیں، اس لیے ایک صحت نامہ اس کے آخر میں لگایا ہے۔ پڑھنے والے کو چاہئے [کذا۔ چاہیے] کہ وہ غلطیاں پہلے درست کرلیوے، فقط۔''

اس صفحے کا باقی حصہ سادہ ہے۔ صفحہ ۲ سے ۱۸ تک ''فہرستِ مطالبِ سنینِ اسلام، حصۂ دوم'' ہے۔ اس کے بعد نئے نمبر شمار سے صفحات کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلے صفحے پر، جس پر نمبر شمار درج نہیں، یہ ''اطلاع'' درج ہے:

''اس کتاب میں درمیان سنوں بادشاہانِ اسلام، جن کا ذکر اس میں آیا ہے: کاتب سے بہت غلطیاں واقع ہوئی ہیں۔ اگر کسی مقام پر درمیان سنوں اس فہرست اور متن کتاب کے فرق ہو تو اس فہرست کے سنوں کو صحیح سمجھیں اور کتاب کے متن کو درست کرلیویں، فقط۔''

اس کے بعد ''تبصرہ'' کے عنوان سے درج ذیل عبارت ہے جو سنین الاسلام، حصۂ اوّل اور سنینِ اسلام، حصۂ اوّل میں بھی شامل ہے:

''سال ہجری پندرھویں یا سولھویں تاریخ ماہ جولائی ۶۲۲ء سے شروع ہوتا ہے اور شمار اس کا چاند کی حرکتوں پر مقرر ہے اور سال عیسوی کا حساب سورج کی حرکتوں پر منحصر ہے۔ اگر سنہ ہجری سے سنہ عیسوی معلوم کرنا چاہو

تو طریق اوس کا یہ ہے کہ سنہ ہجری میں سے فی صدی ۳ عدد منہا کر کے باقی ماندہ کو ۵ء۶۲۱ میں جمع کر دو، یا سنہ ہجری کو ۹۷ء میں ضرب دے کر حاصل ضرب کو ۵ء۶۲۱ میں جمع کر لو۔ ان دونوں صورتوں میں جو حاصل جمع آوے، وہ سنہ عیسوی متصور ہوگا۔''

اس عبارت کے بعد نئے زائد صفحہ۲ (زائد کل صفحہ ۱۸) کا بقیہ حصہٗ سادہ ہے۔ صفحہ۳ سے ۲۰ تک اس حصے کے نفس مضمون سے متعلق ویسا ہی گوشوارہ درج ہے جیسا حصہٗ اوّل کے آخر میں شامل ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے: ''فہرست اون بادشاہان اسلام کی جنھوں نے بعد فتح بغداد کے اور ملکوں اور شہروں میں اسلام کو شایع [کذا۔ شائع] کیا، جن کا ذکر حصہٗ دوم سنینِ اِسلام میں لکھا گیا ہے۔'' اس کے بعد نئے شمار نمبر سے صفحہ ۱ تا ۳۲۰ میں کتاب کا متن ہے۔ متن کے اختتام کے بعد ۱۲ صفحات میں ''صحت نامہٗ حصہٗ دویم سنینِ اِسلام'' ہے۔ کتاب کا اُردو حصہٗ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ انگریزی حصے میں الٹی طرف سے انگریزی سرِ ورق کے بعد سات صفحات میں نقشے اور کتاب کی فہرستیں ہیں، صفحہ ۸ سادہ ہے، جب کہ اگلے تین صفحات میں حصہٗ اوّل کے انگریزی دیباچے کی خاص خاص عبارتیں درج کی گئی ہیں۔ یہ عبارتیں بیش تر تالیف کتاب کے مقاصد پر مشتمل ہیں۔ ان میں آزاد، مولوی فیض الحسن اور مولوی غلام مصطفےٰ کے شکریے والی عبارتیں شامل نہیں۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ سنین الاسلام، حصہٗ اوّل کی پہلی اشاعت ۱۸۷۱ء میں ہوئی۔ ذخیرہٗ آزاد، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور میں اس کا جو نسخہ محفوظ ہے، وہ سر اوراق سے محروم ہے۔ ایسی صورت میں اس نسخے کی طباعتی تفاصیل معلوم ہونا مشکل ہے۔ خوش قسمتی سے کچھ ایسے معتبر شواہد مل جاتے ہیں کہ جن کی مدد سے یہ تفاصیل معلوم ہو جاتی ہیں۔

سنین الاسلام، حصہٗ اوّل کے سنہ طباعت سے متعلق متعدد شواہد ملتے ہیں۔ سنینِ اِسلام، حصہٗ اوّل (طبع دوم) کے سرِ ورق پر درج ہے کہ اس کی اشاعت اوّل ۱۸۷۱ء میں ہوئی۔ گارساں دتاسی نے اپنے مقالے میں ۱۸۷۱ء کی جن مطبوعات کی نشان دہی کی ہے، ان میں سنین الاسلام، حصہٗ اوّل بھی شامل ہے۔(۹) جیفری ایم ڈائمنڈ (Jeffery M. Diamond) نے اپنے انگریزی مضمون میں سنین الاسلام، حصہٗ اوّل کی طباعتِ اوّل کا حوالہ دیا ہے۔ اُنھوں نے حوالے میں اس کی جو اشاعتی تفاصیل درج کی ہیں، ان کے مطابق یہ حصہٗ اوّل ۱۸۷۱ء میں لاہور کے انڈین پبلک اوپینین پریس میں طبع ہوا۔(۱۰) یاد رہے کہ سنینِ اسلام، حصہٗ دوم بھی مطبع انڈین پبلک اوپینین میں طبع ہوئی تھی۔ یہ پریس اسی نام کے انگریزی رسالے (Indian Public Opinion) کے نام پر قائم ہوا تھا۔ یہ رسالہ ۱۸۶۶ء میں ڈاکٹر لائٹنر نے لاہور سے شروع کیا تھا۔(۱۱) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پریس بھی ڈاکٹر لائٹنر کی ملکیت ہوگا۔

سنین الاسلام اور سننِ اسلام کی تیاری میں مددگاروں کے بارے میں مطبوعہ کتابوں میں چند دل چسپ حقائق سامنے آتے ہیں۔ سننِ اسلام کے حصۂ دوم کی اُردو سرِ ورق پر مولوی کریم الدین کا نام ڈاکٹر لائٹنر کے مددگار کے طور پر درج ہے، جب کہ حصۂ اوّل کی طبع ثانی کے سرِ ورق پر کسی کا نام بطور مددگار درج نہیں، پھر یہ کہ حصۂ دوم کے صرف اُردو کے سرِ ورق پر مولوی کریم الدین کا نام درج ہے، انگریزی کے سرِ ورق پر ان کا نام موجود نہیں۔ اسی طرح حصۂ اوّل کے انگریزی دیباچے میں آزاد، مولوی فیض الحسن اور مولوی غلام مصطفیٰ کی اعانت کا شکریہ ادا کیا گیا ہے لیکن حصۂ دوم میں نہ کوئی دیباچہ ہے اور نہ مولوی کریم الدین کی اعانت کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ حصۂ اوّل کی طبع اوّل کے سراوراق موجود نہیں ورنہ معلوم ہوتا کہ ان پر آزاد کا نام بھی درج ہے یا نہیں۔

سنین الاسلام اور سننِ اسلام:

سوانح آزاد اور دیگر مآخذ میں سنین الاسلام کے نام کے سلسلے میں تسامحات ملتے ہیں۔ بیش تر مآخذ میں سنین الاسلام حصۂ اوّل کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کا نام لکھنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔ کچھ مآخذ میں اس کا صحیح نام ''سنین الاسلام'' [۱۲] ہی لکھا ہوا ہے لیکن کچھ مآخذ میں اسے ''سننِ اسلام'' [۱۳] سے موسوم کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا آزاد کے اشتراک سے ڈاکٹر لائٹنر نے جو متن تیار کیا، وہ سنین الاسلام کے نام سے شائع ہوا، اور بعد میں جب اس پر اعتراضات ہوئے اور آزاد کا تعلق ڈاکٹر لائٹنر سے پہلے جیسا قریبی نہ رہا تو اسی کی دوسری اشاعت ''سننِ اسلام'' کے نام سے ہوئی۔ سنین الاسلام کو سننِ اسلام لکھنے والوں میں سے بیش تر کی نظر سے طبع اوّل نہیں گزری، لہٰذا ان کی معلومات طبع دوم پر یا ثانوی مآخذ پر مبنی ہیں۔

مولانا محمد خلیل الرحمٰن نے لکھا ہے کہ سنین الاسلام، حصۂ اوّل غالباً ۱۸۷۴ء یا ۱۸۷۵ء میں چھپی۔ اُنھوں نے حصۂ دوم کی اپنے کتب خانے میں موجودگی بتائی ہے۔ [۱۴] معلوم ہوتا ہے حصۂ اوّل ان کی نظر سے نہیں گزرا، ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ حصۂ اوّل ۱۸۷۱ء اور ۱۸۸۰ء میں دو بار چھپا۔ اسی طرح ڈاکٹر صادق نے بھی حصۂ اوّل کا سال اشاعت ۱۸۷۴ء لکھا ہے، جو ظاہر ہے کہ درست نہیں۔ اُنھوں نے اس کے دوسرے حصے کی طباعت دو سال بعد (۱۸۷۶ء) لکھی ہے۔ [۱۵] سننِ اسلام، حصۂ دوم کا یہ سال طبع تو درست ہے لیکن جس انداز میں ڈاکٹر صادق نے اس کا تذکرہ کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر سے حصۂ اوّل و دوم نہیں گزرے۔ اسی طرح ڈاکٹر صادق نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''ڈاکٹر لائٹنر کا بیان ہے کہ اُنھوں نے اسے مولوی کریم الدین کے تعاون سے لکھا۔'' [۱۶] حالاں کہ ڈاکٹر لائٹنر نے ایسا کوئی بیان کہیں نہیں دیا، نہ لکھا۔ ڈاکٹر صادق نے اگر سننِ اسلام، حصۂ دوم خود دیکھی ہوتی تو انھیں معلوم ہوتا کہ مولوی کریم الدین کی اعانت کا ذکر اس کے سرِ ورق پر ہے، لائٹنر کے انگریزی دیباچے میں

نہیں۔ آغامحمد طاہر نبیرۂ آزاد کی نظر سے بھی سنین الاسلام یا سنینِ اسلام نہیں گزری۔ اس کا اندازہ ان کے درج ذیل بیانات سے ہوتا ہے:

''سنینِ اِسلام ...... شاید اس وقت کسی درس میں شامل ہوگئی تھی، پھر دوبارہ نہ چھپ سکی۔ مولانا کی محنت خاک میں مل گئی۔ آج کسی کو معلوم بھی نہیں کہ وہ کتاب کیا ہوئی۔''(۱۷)

''تاریخِ سنین الاسلام بڑی محنت سے لکھوائی تھی مگر ایک دفعہ سے دوبارہ نہ چھپ سکی۔ اچھی چیز تھی مگر ڈاکٹر صاحب کے نام نے مولانا کی محنت کو خاک میں ملا دیا۔ اگر مولانا خود اپنے نام سے چھپواتے تو کئی بار شائع ہو چکی ہوتی۔''(۱۸)

سنین الاسلام اور سنینِ اِسلام کے سرِ اوراق پر صاف لکھا ہے کہ یہ مولویوں کے لیے تیار ہوئی ہے۔ سنین الاسلام صرف ایک بار نہیں، بل کہ انیسویں صدی میں کم سے کم دو بار ضرور شائع ہوئی۔ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ آج اسے کوئی نہیں جانتا۔ اس کتاب کے بارے میں جو اہلِ قلم جانتے ہیں، ان کی فہرست اس مضمون کی کتابیات سے ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ یہ بھی لازم نہیں کہ سنین الاسلام اگر مولانا کے نام سے شائع ہوتی تو کئی بار شائع ہو چکی ہوتی۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو آغا طاہر اور آغا باقر نے مولانا آزاد کی وفات کے بعد ان کی جو کتابیں شائع کیں، وہ ''کئی بار'' کیوں شائع نہیں ہوسکیں؟ کیا وہ آزاد کے نام سے شائع نہیں ہوئیں؟

سنین الاسلام کا زمانہ تسوید و اشاعت:

ڈاکٹر لائٹنر نے سنین الاسلام میں شامل اپنے انگریزی دیباچے میں لکھا ہے کہ جولائی ۱۸۷۰ء میں اُنھوں نے عربی مولویوں کا امتحان لیا اور ان کا نتیجہ آنے پر سنین الاسلام کی تسوید کا ارادہ کیا۔(۱۹) اس سے معلوم ہوا کہ سنین الاسلام کی تسوید کا کام جولائی ۱۸۷۰ء کے بعد شروع ہوا۔ جیفری ڈائمنڈ نے نومبر ۱۸۷۰ء میں محررہ ڈاکٹر لائٹنر کے ایک ایسے خط کا حوالہ دیا ہے جس میں کتاب کا ابتدائی ''تاریخی خاکہ'' لکھنے کا ذکر ہے۔(۲۰) گویا ڈاکٹر لائٹنر نے جولائی سے نومبر ۱۸۷۰ء کے درمیان کتاب کا ابتدائی سنہ وار تاریخی خاکہ مرتب کر لیا تھا۔ سنین الاسلام، حصۂ اول کی طباعت نسخ کب مکمل ہوئی اور یہ کب شائع ہوئی؟ اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اتنا تو طے ہے کہ اس کی طباعت و اشاعت ۱۸۷۱ء ہی میں ہوئی۔

مولانا آزاد کا ایک خط ڈاکٹر لائٹنر کے نام ملتا ہے جو ۱۸ مارچ ۱۸۷۱ء کا مکتوبہ ہے۔ اس خط میں کتابت شدہ کاپیوں کی تصحیح اور آگے کے مسودے کا ذکر ہے۔(۲۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر نے تسوید کے ساتھ ساتھ کتاب کی طباعت کا کام بھی شروع کرا دیا تھا، اسی لیے ۱۸ مارچ ۱۸۷۱ء تک کتاب ایک طرف تو طباعت کے مراحل

میں تھی اور دوسری طرف اس کا مسودہ بھی لکھا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنی کتاب میں ڈاکٹر لائٹنر کے ایک یاد دہانی نوٹس کا انگریزی متن مع اُردو ترجمہ درج کیا ہے جس میں آزاد سے سنین الاسلام سے متعلق تمام کاغذات واپس کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ سنین الاسلام کی تاریخ اشاعت سے متعلق یہ نوٹس کافی حد تک نتیجہ خیز ہے، اس لیے اس کا اُردو ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''تیسری یاد دہانی

ڈاکٹر لائٹنر شکر گزار ہوں گے اگر مولوی محمد حسین 'سنین الاسلام' کے متعلق تمام کاغذات کسی مزید تاخیر کے بغیر واپس کر دیں گے۔ مولوی نے صرف وہ چیزیں، جو چھپ چکی ہیں؛ اور وہ نامکمل عبارتیں، جو ابھی شائع نہیں ہوئیں؛ واپس کی ہیں۔ ڈاکٹر لائٹنر کی خواہش ہے کہ اندلس، مصر اور مراکش میں عربوں کی تاریخ کا تمام تحریر شدہ مواد واپس کر دیا جائے۔ ہندوستان اور ایران میں مسلمانوں کی تاریخ کے متعلق مولوی کو اختیار ہے کہ جو چاہے کریں لیکن ڈاکٹر لائٹنر باقی تمام چیزوں کی واپسی پر مصر ہیں۔''(۲۲)

اس نوٹس سے علم ہوتا ہے کہ یہ تیسری یاد دہانی ہے جو ۳۱ مارچ ۱۸۷۱ء کو لکھ کر بھیجی گئی۔ اس سے پہلے آزاد کے ۱۸ مارچ ۱۸۷۱ء کے جس خط کا ذکر ہے، مرتب مکاتیب آزاد کے مطابق وہ انجمن پنجاب کے منشی کرم الٰہی کی جانب سے یاد دہانی کے خط کے جواب میں لکھا گیا تھا۔(۲۳) اس تناظر میں منشی کرم الٰہی کے یاد دہانی کے خط کو بھی نوٹس سمجھنا چاہیے۔ ان دونوں نوٹسوں میں سنین الاسلام سے متعلق جن امور کا ذکر ہے، انھیں دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: ۱۔ مسودے کی واپسی کا تقاضا ۲۔ کتاب کے چھپنے اور مطبع کے پروفوں کا ذکر۔ پہلے طباعت سے متعلق امور کا جائزہ لیتے ہیں۔ منشی کرم الٰہی نے ۱۸ مارچ کے نوٹس میں تحریر کیا:

''آقائے ولی نعمت صاحب بہادر [ڈاکٹر لائٹنر] فرماتے ہیں کہ یہ کاپیاں جس وقت چپراسی لے کر حاضر خدمت ہوتا ہے، ان کو فوراً بواپسی حامل ہذا صحیح کر کے واپس دیویں، تا کہ کارروائی میں ہرج نہ ہو۔''(۲۴)

اس کے جواب میں اسی تاریخ کو آزاد نے ڈاکٹر لائٹنر کو لکھا:

''یہ کاپیاں مطبع میں بارہ بجے آ گئی تھیں، اُسی وقت میرے پاس آ جاتیں تو مقابلہ بھی اطمینان سے ہو جاتیں [کذا۔ ہو جاتا] مگر ناوقت آئیں۔ مقابلہ بھی اضطراب میں ہوا اور دل کو فکر نے پریشان بھی کیا۔ جو اصل کے ورق کہ میں نے کل بھیجے ہیں، اگرچہ وہ آپ کو سنائے نہیں مگر میں نے اچھی طرح دیکھ لیے ہیں۔ پرسوں کالج میں کاپی یا پروف سنا دوں گا۔''(۲۵)

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸ مارچ ۱۸۷۱ء کے نوٹس اور اس کے جواب میں مطبع کی کاپیوں اور مسودے کی کتابت کا ذکر ہے، جب کہ ۳۱ مارچ ۱۸۷۱ء کے نوٹس میں چیزوں کے چھپنے کا ذکر ہے۔ اس سے بظاہر تو

یہی معلوم ہوتا ہے کہ سنین الاسلام حصۂ اول کے چھپنے کا ذکر ہے لیکن یہ نتیجہ حتمی نہیں۔ ڈاکٹر لائٹنر کے تیسرے نوٹس میں چھپی ہوئی چیزوں کا ذکر ہے، واضح طور پر کتاب کی طباعت کا ذکر نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ۱۸ مارچ ۱۸۷۱ء کے نوٹس میں آزاد سے کاپی کے پروف دیکھنے کا ذکر ہے اور اسی طرح کا ذکر ۳۱ مارچ ۱۸۷۱ء کے نوٹس میں بھی ہے لیکن دوسری طرف ۳۱ مارچ ہی کے نوٹس میں چیزوں کے چھپے ہونے کی اطلاع بھی ہے۔ اگر یہ کتاب کے چھپنے کی اطلاع ہے تو آزاد نے کس کے پروف پرسوں دیکھنے کا وعدہ کیا تھا اور کسی مسودے کی واپسی کی بات ہو رہی ہے جو ابھی چھپا نہیں؟ ایک امکان یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن پروفوں کا ذکر ہو رہا ہے، وہ سنین الاسلام کے حصۂ دوم سے متعلق ہوں، لیکن ایک تو اس کا واضح قرینہ موجود نہیں اور دوسرے: اگر حصۂ دوم کی کتابت اتنی تیزی سے جاری تھی تو اس کی طباعت پانچ سال بعد ۱۸۷۶ء میں کیوں ہوئی؟ نومبر ۱۸۷۰ء میں سنین الاسلام کی تسوید ہو رہی تھی، اگر ۳۱ مارچ ۱۸۷۱ء تک ہم اس کی طباعت مکمل ہونا فرض کر لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سنین الاسلام حصۂ اوّل کی تسوید و طباعت اگست ۱۸۷۰ء سے مارچ ۱۸۷۱ء تک، یعنی تقریباً آٹھ ماہ میں مکمل ہوگئی۔ ایسی صورت میں حصۂ دوم کی تیاری و طباعت کا کام زیادہ سے زیادہ سال ڈیڑھ سال میں مکمل ہو جانا چاہیے تھا جو تقریباً پانچ سال میں مکمل ہوا۔ حصۂ دوم کی تسوید میں مولانا آزاد کی سست روی کو ڈاکٹر لائٹنر سے تعلقات میں بگاڑ کا سبب بتایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسی وجہ سے ڈاکٹر لائٹنر نے انھیں سنین الاسلام کی تسوید کے عمل سے علاحدہ کر دیا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر نے کتاب کی جلد طباعت و اشاعت کے لیے کوئی بہتر انتظام کیا ہوگا۔ اس کے باوجود حصۂ دوم کا حصۂ اوّل کی اشاعت کے پانچ سال بعد شائع ہونا قابلِ غور ہے۔

مندرجہ بالا شواہد سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ لائٹنر کے ذہن میں یہ منصوبہ تھا کہ سنین الاسلام ایک ہی جلد میں اور جلد سے جلد شائع کی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ان کی کوشش تھی کہ مسودے کی تسوید، نظر ثانی، کتابت، پروف خوانی اور طباعت کا کام ساتھ ساتھ چلتا رہے اور جب کتاب مکمل ہو جائے تو فوراً اس کی شیرازہ بندی کرا کے اسے شائع کر دیا جائے۔ وہ ابتدائی مسودہ لکھوا کر آزاد کے حوالے کرتے، آزاد اس کی نوک پلک سنوار کر ڈاکٹر لائٹنر کو سناتے اور ان کی منظوری کے بعد مسودہ کتابت کے لیے دے دیا جاتا۔ کتابت کے بعد آزاد اس کے پروف دیکھتے اور تصحیح کے بعد کاپی چھپ جاتی۔ یہ عمل کسی نہ کسی طرح جاری تھا کہ اسی دوران ڈاکٹر لائٹنر کے تعلقات آزاد سے کشیدہ ہو گئے اور ڈاکٹر لائٹنر نے کسی مناسب معاون کا فوری انتظام نہ ہو سکنے کے باعث تاخیر سے بچنے کے لیے مطبوعہ مواد میں سے ایک حد تک انتخاب کر کے سنین الاسلام، حصۂ اوّل کے نام سے کتاب شائع کر دی۔

ان شواہد اور بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سنین الاسلام، حصۂ اوّل اپریل تا دسمبر ۱۸۷۱ء کے دوران شائع ہوئی۔ ڈاکٹر لائٹنر کے نام مولانا آزاد کا ایک خط ملتا ہے جس میں سنین الاسلام پر اعتراضات کا ذکر

ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کی تحریر کے وقت سنین الاسلام شائع ہو چکی تھی اور اس پر اعتراضات ہو چکے تھے۔ اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں اور یہ معلوم کرنا دشوار ہے اس خط کی تاریخ تحریر یا زمانہ تحریر کیا ہو سکتا ہے، (۲۶) اس لیے احتیاط کے پیش نظر اس خط کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہیں۔

مولوی محمد شفیع نے سنین الاسلام، حصۂ اوّل کی تسوید میں مولانا آزاد کے مآخذ میں سے حبیب السیر اور مولوی محمد باقر (والد آزاد) کی ہادی التواریخ کی نشان دہی کی ہے۔ (۲۷)

سنین الاسلام کی تسوید میں آزاد کا حصہ:

سنین الاسلام، حصۂ اوّل کی تسوید و تیاری میں مولانا محمد حسین آزاد کا حصہ کس قدر ہے؟ اس پر متعدد ماہرین نے خامہ فرسائی کی ہے لیکن اس معاملے میں تحقیق سے کم ہی کام لیا ہے۔ زیادہ تر نے جذباتی بیانات دے کر معاملے کو مزید الجھانے کی کوشش کی ہے۔ خانوادۂ آزاد کے راویوں نے ڈاکٹر لائٹنر پر سیدھے سیدھے الزامات عائد کیے ہیں کہ انھوں نے مولانا آزاد کی محنت اور کاوش کو اپنے نام سے شائع کر لیا۔

سنین الاسلام کی تسوید کے سلسلے میں جتنے بیانات ملتے ہیں، آسانی کی خاطر انھیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: اوّل: خود آزاد اور ان کے معاصرین کے بیانات، دوم: خانوادۂ آزاد کے راویوں کے بیانات، اور تیسرے: دیگر محققین اور سوانح نگاروں کے بیانات۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے آزاد کے بیان دیکھیے۔ سنین الاسلام سے متعلق آزاد کے بیانات ان کے خطوط میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر لائٹنر کی طرف سے دوسرے نوٹس کے جواب میں آزاد کے خط کا اقتباس اوپر نقل ہوا ہے۔ اس میں مطبع کی کاپیوں کے پروف دیکھنے اور مزید مسودہ بھجوانے کی بات کی گئی ہے۔ (۲۸) اس سے یہ امر تو واضح ہو جاتا ہے کہ آزاد، سنین الاسلام، کا مسودہ لکھتے بھی تھے اور کتابت شدہ کاپیوں کے پروف کی بھی پڑتال کرتے تھے۔ اسی خط میں آزاد نے لائٹنر کو مسودہ نہ سنا سکنے کی بات لکھی ہے اور پرسوں پروف مطبع میں آ کر دیکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کتابت شدہ پروف کی تصحیح بھی کرتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کتاب کا مسودہ لائٹنر کو سناتے تھے اور غالباً ان کی منظوری کے بعد مسودہ کتابت کے لیے دیا جاتا تھا۔

آزاد کے بعد اس سلسلے میں ڈاکٹر لائٹنر کے دو بیانات ملتے ہیں جن سے معاملے کی کافی حد تک وضاحت ہوتی ہے۔ اس میں ایک تو تیسری یاددہانی کا ۳۱ مارچ ۱۸۷۱ء کا لکھا ہوا نوٹس ہے جو اوپر درج ہو چکا ہے۔ اس کی متعلقہ عبارتیں یہاں مکرر درج کی جاتی ہیں:

''ڈاکٹر لائٹنر شکر گزار ہوں گے اگر مولوی محمد حسین، سنین الاسلام کے متعلق تمام کاغذات کسی مزید تاخیر

کے بغیر واپس کر دیں گے۔ مولوی نے صرف وہ چیزیں، جو چھپ چکی ہیں اور وہ ناکمل عبارتیں، جو ابھی شائع نہیں ہوئیں؛ واپس کی ہیں۔ ڈاکٹر لائٹنر کی خواہش ہے کہ اُندلس، مصر اور مراکش میں عربوں کی تاریخ کا تمام تحریر شدہ مواد واپس کر دیا جائے۔ ہندوستان اور ایران میں مسلمانوں کی تاریخ کے متعلق مولوی کو اختیار ہے کہ جو چاہے کریں لیکن ڈاکٹر لائٹنر باقی تمام چیزوں کی واپسی پر مصر ہیں۔''(۲۹)

باقی سارا ترجمہ تو ٹھیک ہے لیکن ''ناکمل عبارتیں'' سے بات واضح نہیں ہوتی، البتہ اس کی اصل انگریزی عبارت سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ اصل انگریزی نوٹس میں اس جگہ "rough dictations" لکھا ہے جس کا ترجمہ ناکمل عبارتیں کیا گیا ہے۔(۳۰) ظاہر ہے "Rough Dictations" کے مفہوم کی صحیح ترجمانی ''ناکمل عبارتیں'' سے نہیں ہو سکتی۔

سنین الاسلام، حصۂ اوّل میں ڈاکٹر لائٹنر کا چار صفحات کا انگریزی دیباچہ بھی شامل ہے۔ اس میں درج ذیل سطور آزاد سے متعلق ہیں:

"I have to express my thanks for the assistance which Maulvi Muhammad Hussain has given me in the preparation of this work. It owes to him any elegance which its Urdu style may possess."(۳۱)

ڈاکٹر لائٹنر کے ان بیانات میں ذیل کے نکات توجہ طلب ہیں:

۱۔ ڈاکٹر لائٹنر نے آزاد سے سنین الاسلام سے متعلق ''تمام کاغذات'' بغیر کسی تاخیر کے واپس مانگے تھے۔

۲۔ ڈاکٹر لائٹنر نے "rough directions" واپس مانگیں جو آزاد کے پاس تھیں۔

۳۔ ڈاکٹر لائٹنر نے اندلس، مصر اور مراکش میں عربوں کی تاریخ سے متعلق مواد کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔

۴۔ ہندوستان اور ایران میں مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق مواد کی واپسی کا ڈاکٹر لائٹنر نے مطالبہ نہیں کیا۔

۵۔ دیباچے میں ڈاکٹر لائٹنر نے آزاد کی مدد (assistance) کے لیے شکریہ ادا کیا ہے۔

۶۔ کتاب میں اُردو کے اسلوب میں نفاست کو آزاد کا مرہون منت ٹھہرایا ہے۔

پہلے نکتے سے پتا چلتا ہے کہ آزاد کے پاس سنین الاسلام کے مسودے کا کافی حصّہ موجود تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آزاد وقت پر مسودہ تیار کر کے واپس نہیں کرتے تھے، اس لیے ان کے پاس کافی مسودات جمع ہو گئے تھے۔ دوسرے نکتے سے واضح ہوتا ہے کہ خام زبانی عبارتیں (rough dictations) بھی آزاد کے پاس تھیں۔ اس سے یہ وضاحت بخوبی ہوتی ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر، آزاد یا کسی اور کو عبارتیں املا کراتے تھے۔ نوٹس میں جن مسودات کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا ہے، وہ انھی خام زبانی عبارتوں پر مشتمل ہوں گے۔ اس سے یہ بھی

معلوم ہوتا ہے کہ خام زبانی عبارتوں اور چھپ جانے والے مواد کے مسودے الگ الگ حیثیت رکھتے تھے۔ گویا ڈاکٹر لائٹنر جو عبارتیں املا کراتے تھے، آزاد انھیں مسودے کی شکل بھی دیتے تھے جس کی بنیاد پر بعد ازاں طباعتی مواد تیار کیا جاتا۔ اگلی دوشقوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران اور ہندوستان کو چھوڑ کر بقیہ علاقوں میں عربوں کی حکومت کا مواد ڈاکٹر لائٹنر نے واپس مانگا تھا۔ ظاہر ہے یہ مواد ڈاکٹر لائٹنر نے dictate کرایا تھا، اس لیے وہ اسے اپنی ملکیت سمجھتے تھے، لیکن ایران اور ہندوستان کے متعلق مواد کی واپسی کا اس نے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ گویا ڈاکٹر لائٹنر کا اس مواد سے کوئی تعلق نہیں تھا، ورنہ وہ دیگر مواد کے ساتھ اس مواد کی واپسی کا بھی مطالبہ کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران اور ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت سے متعلق مواد ڈاکٹر لائٹنر نے دیگر مواد کی طرح زبانی املا نہیں کرایا، بل کہ مواد آزاد کی صواب دید پر چھوڑ دیا تھا، گویا یہ مواد آزاد کو تحریر کرنا تھا۔ آخری دو نکات ڈاکٹر لائٹنر کے انگریزی دیباچے کے ہیں۔ ان میں دوسرے اور آخری نکتے سے عموماً سروکار رکھا گیا ہے اور اسی نکتے کے نتیجے میں یہ کہا جا تا رہا ہے کہ آزاد نے صرف سنین الاسلام، حصۂ اول کے مسودے کی عبارت آرائی کی ہے، اسی وجہ سے ڈاکٹر لائٹنر نے کتاب کی اُردو عبارت کی نفاست کے لیے آزاد کو مرہونِ منت ٹھہرایا ہے لیکن اسی دیباچے میں اور اسلوب آزاد کی بات سے پہلے ڈاکٹر لائٹنر نے کتاب کی تیاری میں آزاد کی معاونت کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ظاہر ہے محض عبارت آرائی کو کتاب کی تیاری میں مدد کرنے سے عبارت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی یاد رہے کہ کتاب کی اشاعت کے وقت آزاد اور ڈاکٹر لائٹنر کے تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے۔ ایسے میں ایک انگریز حاکم سے اُس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ اپنے اس ماتحت کی خدمات کا کھل کر اعتراف کرتا جس کو وہ سخت سست کہتا ہو۔ اس تناظر میں ڈاکٹر لائٹنر کا کھل کر آزاد کی وسیع پیمانے پر مدد کر اعتراف نہ کرتے ہوئے محض اتنا لکھنا بھی بامعنی ہے کہ کتاب کی تیاری میں آزاد نے ان کی مدد کی۔ اس میں دوسری یاد دہانی میں اصل ورق سنانے کی بات کا اضافہ کر دیں تو واضح ہوتا ہے کہ لائٹنر کی dictation والا مسودہ اور آزاد کا تیار کردہ ''اصل'' مسودہ علاحدہ علاحدہ حیثیت کے حامل تھے اور آزاد کا ''اصل'' مسودہ، لائٹنر کے dictation والے مسودے کی ترقی یافتہ شکل تھی۔

اس ساری تفصیل سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ لائٹنر کتاب کا مسودہ پہلے آزاد کو یا کسی اور کو زبانی املا کراتے تھے، پھر یہ dictation آزاد کے حوالے کی جاتی تا کہ وہ اسے مسودے کی صورت میں ڈھالیں۔ آزاد مسودہ بنا کر ڈاکٹر لائٹنر کو سناتے تھے اور غالباً ان کی منظوری کے بعد مسودہ کتابت کے لیے دیا جاتا۔ کتابت ہو جانے کے بعد اس کے پروف کی اصل سے پڑتال بھی آزاد کرتے تھے۔ ان کی تصحیح کے بعد کاپی طباعت کے لیے تیار ہوتی تھی۔

ان شواہد اور بحث کے بعد اب یہ نتیجہ نکالنا آسان ہو جاتا ہے کہ سنین الاسلام حصۂ اول کی تسوید میں

آزاد کا حصّہ زیادہ اور لائٹنر کا اس سے کم ہے۔ پوری کتاب میں لائٹنر کا حصّہ اتنا ہے کہ اُنھوں نے کتاب کا مواد زبانی لکھوایا اور کتاب کے مواد کی ترتیب و پیش کش ان کی مرضی کے مطابق کی گئی، جب کہ مواد کی زبانی تحریر، اسے مسودے کی صورت میں تحریر کرنا، لائٹنر کی مرضی کے مطابق مسودہ بنانا اور پروف کی تصحیح کرنا، یہ سب آزاد کرتے تھے۔ جہاں تک مواد کی تلاش و ترتیب کا سوال ہے (کہ کتاب میں لائٹنر کا یہی حصّہ ہے) تو آزاد پوری طرح اس کے اہل تھے کہ کتاب میں شامل مواد خود جمع کر سکتے اور اسے سلیقے سے کتابی صورت میں ترتیب دے سکتے۔ دوسری صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر کو جب سنین الاسلام کی ضرورت کا احساس ہوا تو وہ اس کتاب کی تیاری کے لیے آزاد کو حکم دے سکتے تھے یا فرمائش کر سکتے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لائٹنر اس کتاب کو خود اپنے نام سے شائع کرنا چاہتے تھے اور چوں کہ بہت مصروف آدمی تھے، اس لیے اس کتاب کی تسوید کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکتے تھے۔ غالباً اسی سبب سے اُنھوں نے زبانی املا کا طریقہ اختیار کیا اور اپنے حصے کا نسبتاً تھوڑا کام کر کے باقی تمام ذمے داریاں آزاد کو سونپ دیں۔

مولوی محمد شفیع نے ذخیرۂ کتب آزاد، پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں حبیب السیّر اور ہادی التواریخ کے ان نسخوں کی نشان دہی کی ہے، جن پر آزاد نے مختلف حوالے نشان زد کیے ہیں۔ اُنھوں نے سنین الاسلام کے قلمی مسودۂ آزاد میں ایک جگہ حبیب السیّر کے حوالے کا بھی لکھا ہے، چناں چہ اُن کے مطابق ان دونوں کتابوں پر یہ نشان سنین الاسلام کے سلسلے میں لگائے گئے ہیں۔[۳۲] مزید برآں، سنین الاسلام، حصّۂ اوّل کے سرِ ورق پر درج ہے: ''جس میں مختصر حال اسلام کی تاریخ اور علم کا......'' گویا اس کتاب میں اسلام کی تاریخ کے علاوہ علوم میں مسلمانوں کی خدمات کا بھی ذکر ہے، لیکن کتاب ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں محض اسلامی تاریخ سے سروکار رکھا گیا ہے، علوم میں اسلامی خدمات کا ذکر اس میں موجود نہیں۔ اگر ڈاکٹر لائٹنر نے یہ مواد بھی زبانی املا کرایا ہوتا تو یقین ہے کہ کتاب میں شامل ہوتا۔ اس کا بدیہی مطلب یہ ہے کہ اس حوالے سے تمام مواد آزاد نے مہیا کرنا تھا۔ یوں ایران و ہندوستان میں اسلامی بادشاہوں کی تاریخ اور علوم میں اسلامی خدمات کی تفصیل اس کتاب کے لیے آزاد نے تحریر کرنی تھی۔ اس سے قطع نظر کہ آزاد نے یہ چیزیں لکھیں یا نہیں، یہ طے ہو جاتا ہے کہ لائٹنر کے مہیا کردہ زبانی مواد کے علاوہ خود آزاد نے بھی کتاب کے خاصے بڑے حصے کا مواد خود مہیا، ترتیب اور تسوید کرنا تھا۔ اس سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ سنین الاسلام، حصّۂ اوّل کی تصنیف میں آزاد کی حیثیت غالب شریک کی تھی، محض معاون کی نہیں۔

دو اور معاصر حوالے دیکھتے چلیے۔ پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر (سر) آرل شٹائن نے ۱۸۹۲ء میں آزاد کی پنشن کی درخواست مرتب کر کے ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کو روانہ کی۔ اس درخواست کے ساتھ آزاد کی خدمات پر مشتمل ایک مصدقہ یادداشت (میمورنڈم) بھی منسلک ہے۔ اس یادداشت کے مطابق سنین الاسلام،

(غالباً حصۂ اوّل)، ڈاکٹر لائٹنر کے ایما سے مولانا آزاد نے مرتب کی۔[۳۳] اس بیان میں ڈاکٹر لائٹنر کے ایما سے آزاد کے کتاب مرتب کرنے کی بات ان معنوں میں درست ہے کہ کتاب کا مواد آزاد نے تحریر و ترتیب دیا۔ یہ بیان اسی دور کے ایک انگریز حکمران افسر کا ہے، اس لیے اہم ہے۔ دوسرا حوالہ مولوی خلیل الرحمٰن کا ہے۔ ان کے مطابق:

''سنین الاسلام کا زیادہ تر مواد لائٹنر نے دیا اور اس کو آزاد نے مرتب کیا۔ اس کے متعلق کئی مرتبہ آزاد نے تذکرہ کیا۔''[۳۴]

اس سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ کتاب کا مواد لائٹنر نے مہیا کیا اور آزاد نے اسے نہ صرف لکھا، بلکہ تراش خراش کر کے بہترین انداز میں اسے ترتیب دیا۔

خانوادۂ آزاد کے بیانات میں سب سے پرانا بیان آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد کا ہے۔ سنین الاسلام کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''حضرت آزاد نے نہایت کاوش سے اس کتاب کو ترتیب دیا اور ڈاکٹر لائٹنر کے نام سے وہ کتاب شائع ہوئی ... ڈاکٹر لائٹنر کا قاعدہ تھا کہ اپنی رائے کا اظہار کر دیتے۔ مولینا اس مضمون کو بنا سنوار کر لے جاتے۔ ڈاکٹر صاحب کو پسند آیا تو بہت خوب، ورنہ مولوی صاحب دوبارہ لکھیں۔''[۳۵]

''تاریخ سنین الاسلام بڑی محنت سے لکھوائی تھی ... اچھی چیز تھی مگر ڈاکٹر صاحب کے نام نے مولانا کی محنت کو خاک میں ملا دیا۔''[۳۶]

آغا طاہر کے ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مکمل یقین تھا کہ سنین الاسلام کامل و اکمل آزاد کی تصنیف ہے لیکن لائٹنر نے کتاب اپنے نام سے چھاپ کر مولانا کی محنت خاک میں ملا دی۔ آغا طاہر کا یہ بیان اگرچہ جذباتی محسوس ہوتا ہے لیکن یہ درست ہے کہ آزاد نے سنین الاسلام کی تسوید میں کافی محنت اٹھائی تھی، لیکن یہ عندیہ دینا درست نہیں کہ لائٹنر کا اس کتاب کی تسوید میں کوئی حصّہ نہیں تھا۔ آغا طاہر کے بیان کا دوسرا حصّہ کہ لائٹنر رائے کا اظہار کرتے اور آزاد مسودہ بنا کر لے جاتے، ہمارے نتیجے کی تائید کرتا ہے جس پر مفصل بحث پیچھے گذر چکی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آغا طاہر کو یہ بات کسی نے بتائی ہوگی۔ ممکن ہے آزاد کے کسی قریبی بزرگ نے یا آغا ابراہیم خلف آزاد یا پھر کسی اور نے اور انھیں آزاد نے یہ بتایا ہوگا۔

اس سلسلے میں دوسرا بیان آغا محمد اشرف کا ہے۔ ان کے مطابق:

''ڈاکٹر لائٹنر اپنے ماتحتوں سے اُردو میں کتابیں لکھوا کر اپنے نام سے شائع کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات اس زمانے میں بھی معیوب نہیں سمجھی جاتی تھی، چنانچہ تاریخ کے موضوع پر سنین الاسلام کے نام سے ایک کتاب مولانا آزاد سے لکھوائی اور اپنے نام سے شائع کرائی۔''[۳۷]

اس بیان میں جذباتیت کا عنصر زیادہ ہے اور اس میں لائٹنر پر سیدھا سیدھا الزام عائد کیا گیا ہے کہ وہ ماتحتوں سے اُردو میں کتابیں لکھوا کر اپنے نام سے شائع کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر پر یہ الزام صرف اس لیے لگایا گیا ہے کہ سنین الاسلام کو مولانا آزاد کی تصنیف ثابت کیا جائے، کیوں کہ آغا محمد اشرف نے اپنے الزام کے ثبوت میں سنین الاسلام کے علاوہ اُردو کی ایسی کسی اور کتاب کا نام نہیں لکھا جو لکھی تو کسی اور نے ہو لیکن شائع لائٹنر کے نام سے ہوئی ہو۔ ویسے ڈاکٹر لائٹنر کی تصانیف و تالیفات و مرتبات کی فہرست میں سنین الاسلام کے علاوہ کسی اور اُردو کتاب کا اندراج نہیں ہے۔''(۳۸)

خانوادۂ آزاد سے تیسرا بیان آغا سلمان باقر کا ہے۔ ان کے مطابق:

''......آزاد اور لائٹنر نے مل کر ایک کتاب سنین الاسلام لکھنی شروع کی مگر یہ کتاب ڈاکٹر لائٹنر نے آزاد سے چھین لی اور اپنے نام سے شائع کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کا مواد ڈاکٹر لائٹنر نے فراہم کیا تھا اور اسے لکھا آزاد نے تھا۔ یہ آزاد کی ایک گراں قدر تصنیف ہے جو آزاد کی ہوتے ہوئے بھی آزاد کی نہ ہو سکی۔ یہ تکرار بڑھتی گئی۔ آزاد اپنا حق ثابت کرتے رہے اور ڈاکٹر لائٹنر بگڑتے چلے گئے اور یہ تکرار، جو کاروباری تھی، ذاتی رنجش کی شکل اختیار کر گئی۔''(۳۹)

اس بیان کے یہ حصے تو درست ہیں کہ آزاد اور لائٹنر نے اشتراک سے سنین الاسلام لکھی اور یہ کہ مواد ڈاکٹر لائٹنر نے مہیا کیا اور اسے لکھا آزاد نے اور یہ بھی کہ دونوں کے درمیان ذاتی رنجش پیدا ہوگئی، لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ لائٹنر نے آزاد سے کتاب چھین کر اپنے نام سے شائع کر دی۔ یہ تو پہلے سے طے تھا کہ کتاب لائٹنر کی مرضی کے مطابق تیار ہوگی اور ظاہر ہے کہ اسی کے نام سے شائع ہوگی۔ یہ بھی درست نہیں کہ سنین الاسلام کے حوالے سے ڈاکٹر لائٹنر اور آزاد میں کبھی تکرار ہوئی ہو اور آزاد نے کتاب پر اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس دور کے آزاد کے خطوط پڑھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ نہ تو آزاد نے کبھی سنین الاسلام پر اپنا حق جتایا اور نہ کبھی ڈاکٹر لائٹنر سے جھگڑنے یا بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لائٹنر بہرحال حکومت کے ایک اعلا اور بااختیار افسر تھے۔ اُنھوں نے آزاد کی قدر کی، انھیں گورنمنٹ کالج میں ملازم رکھا۔ آزاد کے ڈاکٹر لائٹنر سے بڑے گہرے مراسم تھے اور پھر ایسے بااثر افسر سے بگاڑ پیدا کرنا آزاد کے لیے کئی مشکلات کا سبب ہو سکتا تھا۔ آزاد باشعور اور عقل مند تھے اور کوئی عقل مند شخص اپنے بااثر افسر سے جھگڑا کرنا یا عداوت مول لینا پسند نہیں کرتا۔ یہ بھی درست نہیں کہ آزاد اور ڈاکٹر لائٹنر کے درمیان رنجش کی وجہ سنین الاسلام تھی۔ دونوں کے درمیان رنجش تو کتاب کی اشاعت سے بھی پہلے پیدا ہو چکی تھی۔

دیگر محققین اور سوانح نگاروں کے بیانات بھی دیکھیے۔ ڈاکٹر محمد اسلم فرخی کے مطابق:

''بغور مطالعے اور دوسرے شواہد کی وجہ سے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ انداز بیان آزاد کا ہے لیکن کتاب کا مواد

ان کا مرتب کیا ہوا نہیں ہے۔ سنین الاسلام کا مواد نہایت محنت سے مرتب کیا گیا ہے اور اس میں جا بجا عالمی تاریخ کے متعلق ایسے پرکار و بلیغ اشارے ملتے ہیں جنھیں کسی صورت میں بھی آزاد سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ آزاد کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ جا بجا چھوٹے چھوٹے نوٹ لکھتے ہیں اور خود کلامی سے پڑھنے والے کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت ان کی ہر تصنیف میں نمایاں ہے لیکن سنین الاسلام اس سے محروم ہے۔ اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ سنین الاسلام میں تاریخ کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، وہ تمام و کمال معروضی ہے۔ آزاد کی دوسری کتابیں، مثلاً قصص ہند اور دربار اکبری اس تصور سے یک سر خالی ہیں۔ ان داخلی اسباب کی وجہ سے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ سنین الاسلام کا مواد لائٹنر نے مرتب کیا اور آزد نے اسے اپنے طرز میں لکھ کر زبان و بیان کی وہ شان پیدا کر دی کہ یہ مختصر تالیف بذات خود ایک گراں قدر تصنیف بن گئی۔''(۴۰)

اس کے علاوہ دو اور جگہوں پر بھی ڈاکٹر اسلم فرخی نے یہی بیان درج کیا ہے کہ سنین الاسلام کا مودا لائٹنر کا مرتب کردہ ہے اور تحریر کی خوب صورتی آزاد کی ہے۔ (۴۱)

ڈاکٹر اسلم فرخی نے جو نتیجہ نکالا ہے، سنین الاسلام کے سلسلے میں عام طور پر یہی نقطۂ نظر بیان کیا جاتا ہے لیکن قبل ازیں آزاد اور لائٹنر کے بیانات سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں، ان سے واضح ہے کہ مواد کی ترتیب اور تحریر آزاد کے قلم کی مرہون منت ہے۔ رہا اسلوب آزاد کے خواص اور ان کی سنینِ اسلام میں غیر موجودگی کا معاملہ تو اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں: اوّل یہ کہ آزاد مسودہ ضرور لکھتے تھے لیکن وہ لائٹنر کی منظوری کے بعد کتابت کے لیے جاتا۔ اس وجہ سے آزاد اتنے آزاد نہیں تھے کہ اپنی انشا پردازی اور اسلوب نگاری کے جوہروں کا کھل کر استعمال کر سکتے، پھر بھی سنین الاسلام کی نثر میں آزاد کے اسلوب کی ابتدائی جھلکیاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ سنین الاسلام ۱۸۷۱ء میں لکھی اور چھاپی گئی۔ اس وقت تک آزاد کی کوئی قابل ذکر تصنیف ابھی منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ قصص ہند ۱۸۷۳ء میں چھپی اور باقی معروف کتابیں اس کے ایک عرصے بعد، اس لیے ۱۸۷۱ء میں آزاد کا مخصوص اسلوب ابھی اتنا نہیں منجھا تھا کہ اس سنہ میں چھپنے والی سنین الاسلام کے اسلوب کا موازنہ ہم نو دس سال بعد شائع ہونے والی کتابوں: نیرنگ خیال، آب حیات وغیرہ سے کریں۔

ڈاکٹر محمد صادق کا خیال ہے کہ سنین الاسلام کا ''مواد ڈاکٹر لائٹنر نے فراہم کیا اور آزاد اسے ضبط تحریر میں لائے۔''(۴۲) مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کے مطابق بھی: ''سنین الاسلام کے پہلے حصے میں زبان و بیان کی تراش خراش میں مولانا سے مدد لی گئی تھی۔''(۴۳)

ڈاکٹر ملک حسن اختر لکھتے ہیں کہ: ''سنینِ اِسلام [کذا] کا پہلا حصہ..... ڈاکٹر لائٹنر کی ہی نہیں، بل کہ

دونوں کی مشترکہ تصنیف قرار دی جاسکتی ہے۔"[۴۴] جیفری ڈائمنڈ نے بھی اسلوب آزاد والی بات دہرا کر ایک اور نئی بات کہہ دی۔ان کی اصل انگریزی عبارت یہ ہے:

"It is probable that Azad served as a translator and Urdu stylist for a manuscript that Leitner had originally written in English."[۴۵]

جیفری ڈائمنڈ نے جو امکان ظاہر کیا ہے کہ لائٹنر نے کتاب انگریزی میں لکھی ہوگی اور آزاد نے اس کا ترجمہ اُردو میں کیا ہوگا،اس کی کوئی بنیاد نہیں اور نہ اس سلسلے میں ان کے پاس کوئی ثبوت ہے۔دل چسپ بات یہ ہے کہ جیفری ڈائمنڈ کو یہ خیال نہیں آیا کہ ان کے قیاس کے مطابق لائٹنر کا انگریزی مسودہ کیا ہوا؟اس کی موجودگی کہیں تو ظاہر ہونی چاہیے تھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود لائٹنر کے الفاظ میں سنین الاسلام ایک مفید کتاب تھی۔اگر لائٹنر نے اسے انگریزی میں ترتیب دیا ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے انگریزی مسودے پر مبنی کتاب شائع نہ کراتے؟اوپر درج طویل بحث سے جو نتائج سامنے آئے ہیں،ان کی روشنی میں ڈائمنڈ اور دیگر سوانح نگاروں کے تمام قیاس اور اندازے تصحیح طلب ہو گئے ہیں۔

جیفری ڈائمنڈ کے قیاس سے البتہ ایک امکان یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر سنین الاسلام کے سلسلے میں جو زبانی املا (dictation) کراتے تھے،وہ اُردو میں ہوتی تھی یا انگریزی زبان میں۔اس سلسلے میں کوئی واضح شواہد موجود نہیں،محض اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر لائٹنر کی کسی اُردو تحریر کا نمونہ نہیں ملتا لیکن یہ طے ہے کہ وہ اُردو جانتے تھے۔وہ آغاز ہی سے"انجمن مطالب مفیدۂ پنجاب" (بعدازاں"انجمن پنجاب") کے رکن[۴۶] اور بعد میں صدر مقرر ہوئے۔اس انجمن کی کارروائی اُردو میں ہوتی تھی۔دوسرے: آزاد سے ڈاکٹر لائٹنر کی قربت کی وجہ آزاد کی علمیت اور اَدبی صلاحیتیں تھیں اور لائٹنر اُن کی ان خوبیوں کے معترف تھے۔یہ ظاہر ہے کہ آزاد کی یہ صلاحیتیں اور خوبیاں اُردو کے حوالے سے ہیں۔اس طرح کے مزید شواہد پیش کیے جاسکتے ہیں (جن کی سردست ضرورت نہیں) کہ لائٹنر اُردو جانتے تھے۔ہاں! اتنی اچھی نہیں جانتے تھے کہ اچھی عبارت لکھ سکیں لیکن بول چال کی حد تک وہ اُردو سے یقیناً کام لیتے تھے۔

دوسری طرف آزاد کی انگریزی دانی بھی محتاج ثبوت ہے۔جس طرح لائٹنر کی کوئی مبسوط اُردو تحریر نہیں ملتی، اسی طرح آزاد کی بھی کوئی مبسوط انگریزی تحریر نہیں ملتی۔ڈاکٹر لائٹنر کے نام آزاد نے ایک خط کے آخر میں لکھا ہے کہ "یہ مختصری عرض داشت انگریزی میں لکھتا ہوں۔"[۴۷] لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا مناسب نہ ہوگا کہ آزاد انگریزی لکھنے اور سمجھنے میں مہارت رکھتے تھے،ورنہ اس خط کے علاوہ ان کی کسی اور انگریزی تحریر کا بھی معلوم ہوتا۔امکان یہی ہے کہ جس طرح ڈاکٹر لائٹنر اُردو سمجھتے اور بول لیتے تھے،اس سے کچھ کم سطح پر آزاد انگریزی میں اتنی شد بد ضرور رکھتے ہوں

گے کہ کسی نہ کسی طرح ایک مختصر خط انگریزی میں لکھ سکیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ انگریزی خط بھی اُنھوں نے کسی کی مدد سے لکھا ہو۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ آزاد کے لائٹنر کے نام تقریباً سبھی خطوط اُردو میں ہیں اور لائٹنر کے نوٹس وغیرہ ہمیشہ انگریزی زبان میں تحریر ہوتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آزاد انگریزی اور لائٹنر اُردو پڑھنا جانتے تھے لیکن شاید لکھنے پر قادر نہیں تھے۔

اس تناظر میں اگر غور کیا جائے تو درج ذیل دو امکانات پیدا ہوتے ہیں: اوّل تو یہ کہ لائٹنر انگریزی میں dictation دیتے ہوں اور یہ انگریزی زبانی نوٹس آزاد کے حوالے کر دیے جاتے ہوں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ لائٹنر زبانی املا اُردو ہی میں کراتے ہوں اور اس کی بنا پر آزاد مسودہ ترتیب دیتے ہوں۔ یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہے کہ دونوں میں سے کون سی صورت واقع ہوئی ہوگی۔ صرف ایک امکانی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ لائٹنر کو انگریزی میں dictation دینے کی ضرورت کیوں پیش آتی، جب کہ وہ انگریزی میں آسانی کے ساتھ مسودہ تحریر کر کے آزاد کے حوالے کر سکتے تھے۔ جب وہ کتاب کا دیباچہ انگریزی میں لکھ سکتے تھے تو ابتدائی مسودہ انگریزی میں لکھنے میں کیا قباحت تھی۔ اس سے امکان پیدا ہوتا ہے کہ لائٹنر زبانی املا اُردو میں دیتے ہوں، لیکن یہ نتیجہ بھی قیاس سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا، جب تک اس کے بارے میں کوئی واضح شواہد نہ مل جائیں۔

معترضین:

ڈاکٹر لائٹنر کے نام اپنے خط میں آزاد تحریر کرتے ہیں:

''کئی دن سے سنتا ہوں کہ سنین الاسلام میں کسی نے بہت غلطیاں نکالی ہیں اور دوسرے نے تصدیق کیں آج ایک نئی بات سنی کہ سنین الاسلام کی ترکیب ہی غلط ہے۔''(۴۸)

اس سے معلوم ہوا کہ سنین الاسلام کی اشاعت کے بعد اس پر اعتراضات کیے گئے تھے۔ آزاد نے دو معترضین کا ذکر کیا ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ سنین الاسلام کی تیاری کے دوران ہی آزاد اور لائٹنر کے تعلقات خراب ہو گئے تھے اور ایسا حاسدین آزاد کی ریشہ دوانیوں کے باعث ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ اعتراضات بھی ایسے ہی لوگوں کی طرف سے ہوئے ہوں گے جو آزاد اور لائٹنر کے دریان فاصلے بڑھانا چاہتے تھے۔

معترضین کی شخصیت مبہم ہے۔ کسی ذریعے سے بھی سنین الاسلام کے کسی معترض کی شخصیت واضح نہیں ہوتی۔ جن معاصر افراد پر معترضین میں شامل ہونے کا قیاس کیا جا سکتا ہے، ان میں سب سے پہلے مولوی کریم الدین کا نام آتا ہے۔ آزاد کو سنین الاسلام کے منصوبے سے نکالنے کے بعد کتاب کا دوسرا حصہ ۱۸۷۶ء میں سنین اسلام کے نام سے شائع ہوا تو اس کے سرورق پر ''بمدد مولوی کریم الدین'' کے الفاظ درج تھے۔ اس

سے قیاس ہوتا ہے کہ ایک معترض مولوی کریم الدین ہوں گے، اسی لیے آزاد کی جگہ لائٹنر نے انھیں اپنی مدد کے لیے مقرر کیا۔ سنینِ اِسلام، حصۂ اوّل، طبع ثانی میں ڈاکٹر لائٹنر نے اپنے انگریزی دیباچے میں کتاب کی تیاری کے لیے مولوی فیض الحسن اور مولوی غلام مصطفیٰ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ان دونوں کے نام بھی معترضین کی شخصیات میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ سنین الاسلام کی تیاری کے زمانے میں اخبار ''پنجابی'' کے مالک منشی محمد عظیم بھی آزاد کی مخالفت میں سرگرم تھے۔ آزاد نے لالہ دنی چند کے نام اپنے ۲۱ ستمبر ۱۸۷۴ء کے خط میں منشی سید محمد عظیم کے ساتھ مخاصمت کا ذکر کیا ہے۔[۵۵] منشی صاحب بھی معترضین کی فہرست میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔

جہاں تک مولوی کریم الدین کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ لائٹنر اور آزاد کے تعلقات ۱۸۷۱ء کے شروع میں خراب ہوئے اور اسی زمانے میں لائٹنر نے آزاد کو سنین الاسلام کی تالیف میں اشتراک سے علاحدہ کر دیا تھا، جب کہ مولوی کریم الدین کا نام ۱۸۷۶ء میں سامنے آتا ہے۔ اسی طرح مولوی فیض الحسن اور مولوی غلام مصطفیٰ کے نام بھی نو سال بعد سنینِ اِسلام، حصۂ اوّل کی طبع ثانی کے ذریعے منظرِ عام پر آتے ہیں، البتہ منشی سید محمد عظیم ۱۸۷۱ء یا اس کے قریبی زمانے سے آزاد کی مخالفت کے حوالے سے منظرِ عام پر آچکے تھے۔ باقی تینوں کے مقابلے میں منشی عظیم کی آزاد سے مخالفت بھی معلوم ہے، اس لیے بقیہ تینوں کے مقابلے میں منشی محمد عظیم کا معترضین سنین الاسلام میں شامل ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس سب کے باوجود معترضین سنین الاسلام کی شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

سنینِ اِسلام، حصۂ دوم کا قضیہ

جیسا کہ تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے کہ سنین الاسلام کا حصۂ دوم سنینِ اِسلام کے نام سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا اور اس کے سرِ ورق پر ''بمدد مولوی کریم الدین'' تحریر ہے۔ مقالہ ہٰذا کے شروع میں جو بحث کی گئی ہے، اس میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر اور آزاد کے منصوبے میں غالباً حصۂ اول و دوم کی تخصیص نہیں تھی۔ آزاد سے تعلقات کی خرابی اور انھیں اس منصوبے سے علاحدہ کرنے کے خیال کے بعد لائٹنر نے تیار مواد کو حصۂ اوّل کی شکل میں شائع کرنا بہتر سمجھا۔ اس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ حصۂ دوم اس کے پانچ سال بعد ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا۔ ظاہر ہے کچھ ایسے موانع رہے ہوں گے کہ لائٹنر کو تاخیر کے خطرے کے باعث حصۂ اوّل تک کا مواد فوراً شائع کرنا پڑا۔ یہ صرف ایک قیاس ہے۔ ممکن ہے کہ حقیقت یہ نہ ہو۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے تین جگہ یہ عندیہ دیا ہے کہ سنین الاسلام، حصۂ اوّل کی تکمیل کے بعد حصۂ دوم کی تالیف کا کام شروع ہوا۔[۴۹] عام حالات اور ظاہری شواہد کی بنا پر فطری طور پر یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے لیکن لائٹنر کی

طرف سے دوسری اور تیسری یاددہانی اور دوسری یاددہانی کے جواب میں آزاد کے خط سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ تالیف کا عمل مسلسل جاری تھا اور اس میں کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کی گئی تھی۔

ڈاکٹر صادق نے سنینِ اسلام، حصۂ دوم کے بارے میں جو دو بیانات دیے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کتاب کا اصل نسخہ ملاحظہ نہیں کیا۔ ان کے مطابق: ''تذکرۂ سنینِ اسلام، حصۂ اول...... ۱۸۷۴ء میں شائع ہوا۔ دوسرا حصۂ دو سال بعد شائع ہوا۔ ڈاکٹر لائٹنر کا بیان ہے کہ انھوں نے اسے مولوی کریم الدین...... کے تعاون سے لکھا۔''(۵۰) جس طرح سنین الاسلام حصۂ اول کا سنہ اشاعت درست نہیں، اسی طرح کتاب کا نام اور لائٹنر کے بیان کا اندراج بھی درست نہیں۔ لائٹنر نے اس سلسلے میں کوئی بیان نہیں دیا، بل کہ یہ اطلاع کتاب کے حصۂ دوم کے سرورق پر درج ہے۔

محمد اکرام چغتائی کا بیان ہے کہ سنین الاسلام کا حصۂ دوم وسوم ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئے۔(۵۱) یہ درست نہیں۔ اول تو حصۂ دوم کی اشاعت ۱۸۷۵ء نہیں ۱۸۷۶ء میں ہوئی اور دوسرے: یہ کتاب دو حصوں میں شائع ہوئی، اس کا تیسرا حصۂ نہ تو کبھی تھا اور نہ کبھی شائع ہوا۔

عام طور پر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ آزاد نے حصۂ دوم کی تیاری میں تاخیر کی جو لائٹنر کی طبیعت اور منصوبے کے خلاف تھی، اس لیے لائٹنر نے اس حصے کے مسودات آزاد سے واپس لے کر مولوی کریم الدین کے حوالے کر دیے۔ یہاں دو امر توجہ طلب ہیں۔ ایک یہ کہ آزاد کے خلاف معاندین نے ۱۸۷۱ء کے آغاز ہی سے ڈاکٹر لائٹنر کے کان بھرنے شروع کر دیے تھے۔ سنین الاسلام حصۂ اول کی اشاعت تک تو ان معاندین کی کوششوں سے آزاد اور لائٹنر کے تعلقات میں مخالفت کی حد تک تندی آ چکی تھی۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ لائٹنر اپنی تالیف کے لیے آزاد سے تعاون حاصل کرتے۔ آزاد سے سنین الاسلام کے مسودات واپس لینے کی ایک وجہ جہاں آزاد کی جانب سے سست روی اور تاخیر کا مظاہرہ ہے، وہیں لائٹنر کے ساتھ بگڑتے حالات ایک بڑی وجہ تھے۔ دوسری بات یہ کہ اگر تاخیر ہی اس کا سبب تھی تو حصۂ دوم کی اشاعت جلد ہونی چاہیے تھی، زیادہ سے زیادہ ۱۸۷۲ء میں لیکن اس کی اشاعت ہوئی پانچ سال بعد ۱۸۷۶ء میں۔ حصۂ اول و دوم کی اشاعت میں پانچ سال کے اس وقفے کے باعث سنین الاسلام کی تالیف میں آزاد کی سست روی کی وجہ کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔

سنین الاسلام کے قلمی مسودات

آزاد کے قلمی مسودات سے ترتیب دے کر آغا محمد طاہر نے غالباً ۱۹۲۷ء میں ایک مختصر سی کتاب کائنات عرب کے نام سے شائع کی۔(۵۲) اس کے دیباچے میں وہ رقم طراز ہیں:

''اس قسم کے چند مضامین کا مجموعہ ہے جو کائنات عرب کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ اصل دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولینا سنین اِسلام [کذا] کے ابتدا میں ایک مختصر مگر مکمل مقدمہ لگانا چاہتے تھے۔ اس مقدمہ کے لیے یہ نوٹ لکھے ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب کو پسند نہ آئے، اسی طرح ڈال دیے۔''(۵۳)

کائنات عرب میں شامل آزاد کی تحریر ان کے مقالات کے تیسرے مجموعے میں ''عرب اور زبانِ عرب'' کے عنوان سے بھی شامل ہے۔(۵۴) اس طویل مقالے کی عبارت مسلسل ہے، جب کہ سنین الاسلام کی عبارت مسلسل نہیں۔ اس سے آغا محمد طاہر کے اندازے کو تقویت ملتی ہے کہ آزاد اس تحریر کو سنین الاسلام کے مقدمے کے طور پر شامل کتاب کرنا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر لائٹنر کو پسند نہ آنے کی وجہ سے یہ تحریر کتاب میں شامل نہ ہو سکی۔

مقالات میں شامل ''عرب اور زبان عرب'' اور کائنات عرب کے متون میں بہت تفاوت ہے۔ اس کی وجہ آغا محمد طاہر کے اس بیان سے واضح ہوتی ہے:

''......اتفاقاً میرے مکرم و معظم مولینا مولوی سید محمد سبطین صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لدھیانہ تشریف لائے۔ ان سے رسالہ سے متعلق مشورہ ہوا۔ اُنھوں نے خاص محبت اور توجہ سے اس کو تمام و کمال دیکھا اور جہاں کہیں مناسب سمجھا، اصلاح فرمادی۔''(۵۵)

موازنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ ''جہاں کہیں مناسب سمجھا'' کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی، چنانچہ محمد سبطین صاحب نے آزاد کے مسودے میں وسیع پیمانے پر ترمیم و ''اصلاح'' دے دی جس کے باعث کائنات عرب اور آزاد کے مقالے کے متون میں جگہ جگہ اختلافات راہ پاگئے ہیں۔ موجودہ صورت میں کائنات عرب کو کسی طرح بھی آزاد کی تحریر نہیں کہا جاسکتا۔ آزاد کی تحریر مقالات میں درج مضمون کو ہی سمجھنا چاہیے۔ اس مضمون کا تعارف سب سے پہلے مولوی محمد شفیع نے کرایا تھا۔(۵۶)

اپنے اس مضمون میں (۱۹۶۳ء میں) مولوی محمد شفیع نے آزاد کے بعض مسودات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ایک مسودے کے بارے میں لکھا:

''مولانا آزاد کے کاغذات میں ایک مسودے کے ناتمام اوراق ہیں جسے سنین الاسلام کا مسودہ تصور کیا گیا ہے۔ اس کے بیش تر حصے میں ترتیب سنین سے جاہلی شعرا اور دوسری سے دسویں صدی ہجری تک کے علما و فضلا کے حالات اختصار سے بیان ہوئے ہیں...... زیر نظر مسودے میں علما کے حالات کے علاوہ چند اوراق پر خاندان سلجوقیہ و آل حمدان، اتابکوں کے خاندان، ملوک دیالیمہ یا آل بویہ، آل ایوب، سلاطین خوارزم شاہی کے حالات دیے ہیں۔ ان میں سے جو عنوان سنین الاسلام میں آئے ہیں، ان کا مواد ان اوراق کے

مواد سے فی الجملہ غیر مطابق ہے۔''(۵۷)

مقالات مولانا محمد حسین آزاد کی تینوں جلدوں میں ان موضوعات پر آزاد کی کوئی تحریر شامل نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ مسودہ اب بھی خانوادۂ آزاد کے پاس موجود ہے یا نہیں۔ مولوی شفیع کے علاوہ اس کا حوالہ اور بھی کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ مسودے کے یہ مضامین سنین اسلام، حصۂ دوم کے مباحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کتاب کے حصۂ دوم کے مواد کا ابتدائی مسودہ تیار کر رہے تھے اور اس کا کچھ حصہ تیار بھی کر لیا تھا۔

اسی مضمون میں مولوی محمد شفیع نے سنین الاسلام کے لیے کتابت کیے ہوئے دیباچۂ آزاد کا ذکر کیا ہے اور اس کا بچ جانے والا متن اپنے مضمون میں درج کر دیا ہے۔(۵۸) یہی دیباچہ مقالات کی دوسری جلد میں ''سبب تالیف سنین الاسلام'' کے نام سے شامل ہے۔(۵۹) ان دونوں متون میں بھی فرق ہے لیکن مختلف نوعیت کا۔ مولوی شفیع نے دیباچۂ آزاد کا جو بچ جانے والا حصہ درج کیا ہے، وہ محض چھ سطروں کا ہے، جب کہ مقالات میں یہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔ مولوی محمد شفیع کا مندرجہ متن مقالات کے متن میں پہلے صفحے کی آخری سے پہلے چوتھی سطر تک کا ہے۔ حیرت ہے کہ مولوی محمد شفیع کے ہاں پہلے صفحے کا متن مقالات میں شامل متن سے تین سطریں کم ہے؟

مقالات کے مرتب آغا محمد باقر کے مطابق اس کتابت شدہ دیباچے کے صرف دو صفحے باقی بچے تھے (پہلا اور آخری) جن کا متن مقالات میں نقل کر دیا گیا ہے۔ ان کے خیال میں:

> ''مولانا نے یہ عبارت سنین اسلام [کذا] کے لیے لکھی تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر نے پہلے اسے پسند فرمایا لیکن بعد میں، اور شاید مولانا سے ناراض ہونے کے بعد، اسے ناپسند کر دیا۔ بہر حال، یہ شائع نہیں ہوا۔''(۶۰)

آغا باقر کا خیال درست ہے۔ ظاہر ہے لائٹنر کو پسند آنے کے بعد ہی اسے کتابت کرایا گیا ہوگا۔ لگتا ہے آزاد سے ناچاقی کے باعث ڈاکٹر لائٹنر نے یہ دیباچہ کتاب میں شامل کرنا پسند نہیں کیا اور خود انگریزی دیباچہ لکھ کر شامل کتاب کیا۔

مقالات کی تیسری جلد میں تاریخ کے موضوع پر ''خاندان غزنویہ کی سلطنت'' (۳۴ صفحات)، ''امیر تیمور'' (۱۲ صفحات)، ''بابر بادشاہ کی داستان'' (۱۰ صفحات) اور ''جلال الدین اکبر کی داستان'' (۲۴ صفحات) نامی مضامین آزاد شامل ہیں۔ مرتب نے انھیں اندازاً ۱۸۷۱ء کی تحریریں بتایا ہے۔(۶۱) ان کا موضوع سنین الاسلام، حصۂ دوم کے مواد سے ہے۔ پیچھے ڈاکٹر لائٹنر کی طرف سے آزاد کو تیسری یاد دہانی کے نوٹس کی عبارت درج کی گئی ہے جس میں ہندوستان اور ایران میں مسلمانوں کی بادشاہت سے متعلق مواد کو آزاد کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ معلوم

ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا مضامین اسی مواد سے تعلق رکھتے ہیں اور ابتدائی مسودے کا متن محسوس ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر بعدازاں سنہ وار حالات وواقعات پر مبنی مسودہ تیار کیا جاتا۔

آزاد- اُردو کے صاحب طرز نثر نگار ہیں۔ افسوس! ان کی جادوئی نثر کا ایک نمونہ سنین الاسلام، حصۂ اوّل اب تک بے توجہی کا شکار رہا اور ماہرین اسے آزاد کی تحریروں میں شامل کرنے سے گریزاں رہے۔ اس کی تلافی اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ سنین الاسلام، حصۂ اوّل کا مطالعہ وتجزیہ بھی آزاد کی دیگر تحریروں کی سطح پر کیا جائے۔ یہ تاثر زیادہ درست نہیں کہ سنین الاسلام، حصۂ اوّل کے اسلوب میں آزاد کا مخصوص اور گہرا رنگ نہیں ملتا۔ یہ آزاد کی ابتدائی مطبوعہ کتاب ہے۔ اس وقت یقیناً اسلوب آزاد ابھی اتنا ترقی یافتہ نہیں ہوا تھا کہ ہم سنین الاسلام کے اسلوب کا موازنہ آب حیات، قصص ہند یا دیگر معروف تصانیف آزاد سے کریں جو سنین الاسلام کے کافی عرصے بعد لکھی گئیں۔ آزاد کی زندہ نثر کی ضیا پاشیاں سنین الاسلام کے ذریعے بھی اپنی روشنی اور چمک دکھا رہی ہیں، اگرچہ یہ روشنی چھن چھن کر آ رہی ہے۔

حواشی وتعلیقات

۱۔ عام طور پر مولانا آزاد کی وفات کی ہجری تاریخ ۹ محرم اور عیسوی تاریخ ۲۲ جنوری لکھی جاتی ہے۔ تقویم کی رو سے ہجری و عیسوی تاریخوں کا یہ تطابق درست نہیں۔ تقویم کے مطابق ۹ محرم کو جنوری کی ۲۱، اور ۱۰ محرم کو جنوری کی ۲۲ تاریخ تھی۔ [جوہر تقویم، ص۲۱۴]۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اسلم فرخی کا بیان ہے کہ ''بائیس جنوری ۱۹۱۰ء کو عاشورے کی شب میں آزاد فوت ہوئے [محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف، حصۂ اوّل، ص۳۸۴]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کی وفات کے وقت ۹ محرم کا دن ختم ہو چکا تھا اور عاشورے یعنی ۱۰ محرم کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ جنوری کی ۲۱ تاریخ تھی اور صبح یعنی روز عاشورہ کو ۲۲ جنوری ہونے والی تھی، لہٰذا ہجری مہینے محرم کی تو ۹ تاریخ باور کر لی گئی جب کہ رات گئے انتقال ہونے کے باعث جنوری کی ۲۱ کے بجائے آئندہ روز یعنی ۲۲ تاریخ ذہن میں رہ گئی۔ اس سلسلے میں مزید بحث کے لیے ملاحظہ کیجیے: ''مولانا محمد حسین آزاد اور ۱۸۵۷ء'' (مضمون): از راقم الحروف، مشمولہ: صحیفہ: کتاب ۱۸۵۷ء: مرتب: راقم الحروف؛ لاہور، مجلس ترقی ادب؛ فروری ۲۰۰۹ء؛ ص۱۵۹، حاشیہ ا۔

۲۔ مثال کے طور پر: ا۔ تاریخ ادب اُردو: از رام بابو سکسینہ، مترجم: مرزا محمد عسکری۔

ب۔ اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: از ڈاکٹر سلیم اختر۔

ج۔ اُردو ادب کی مختصر تاریخ: از ڈاکٹر انور سدید۔

د۔پنجاب میں اُردو ادب کا ارتقا ۱۸۴۹ء تا ۱۹۱۴ء: از ڈاکٹر ممتاز گوہر۔

ہ۔آب حیات: از مولانا محمد حسین آزاد، ترتیب و مقدمہ: (ڈاکٹر) ابرار عبدالسلام۔

و۔مولانا محمد حسین آزاد پر ڈاکٹر صادق کا مقالہ، در: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد چہارم، ص ۳۰۸ تا ۳۴۴۔

۳۔ سنین اسلام، جلد اول و دوم کے سرورق پر نام ''جی ڈبلیو لیٹنر'' لکھا ہے۔لائٹر کے رومن میں ہجے leitner ہیں جو انگریزی طریقے سے ''لیٹنر'' ہی پڑھا جا سکتا ہے۔Leitner کا نستعلیق تلفظ ''لائٹنر'' غالباً سب سے پہلے ڈاکٹر حمید اللہ نے گارساں دتاسی کے مقالات پر نظر ثانی کرتے ہوئے لکھا ہے [مقالات گارساں دتاسی، جلد اول، ص ۸۷]۔ڈاکٹر لائٹنر کے حالات کے لیے دیکھیے:

۱۔G. W. Leitner-Life and Works (مکمل حوالہ کتابیات میں)

۲۔مولانا آزاد، پروفیسر کی حیثیت سے: از آغا محمد اشرف، لاہور، مجلس یادگار آزاد۔

۴۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے:

الف۔تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج: از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار: لاہور اورینٹل کالج: ۱۹۶۲ء۔

ب۔صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب: از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار: لاہور، جامعہ پنجاب: ۱۹۸۲ء۔

۵۔ "Muhammadanism" کی اصطلاح کا اُردو مترادف، اختراعی اُردو اصطلاح۔

۶۔ سنین الاسلام کی تالیف کا یہ مقصد اور پس منظر کتاب میں شامل ڈاکٹر لائٹنر کے انگریزی مقدمے (ص ۱،۲) سے ماخوذ ہے۔

۷۔ سنین الاسلام، حصۂ اول کی پہلی اشاعت کا جو نسخہ پیش نظر ہے، اگرچہ اس میں اُردو اور انگریزی کے سرِاوراق موجود نہیں اور کتاب میں کسی اور جگہ بھی سنہ اشاعت درج نہیں لیکن اس کے کچھ کوائف سے اندازہ ہوا کہ یہ اشاعت اول ہی کا نسخہ ہے۔گارساں دتاسی نے ۱۸۷۱ء کی مطبوعہ کتابوں میں سنین الاسلام، حصۂ اول کی اشاعت کی خبر دیتے ہوئے اس کی ضخامت ۱۲۶ صفحات اور مسطر ۱۶ سطری لکھا ہے [مقالات گارساں دتاسی، جلد اول، ص ۸۷]۔ہمارے پیش نظر نسخے میں متن کے صفحات ۱۲۸ ہیں جب کہ مسطر کی تعداد اتنی ہی ہے (گارساں دتاسی کے ہاں صفحات کی تعداد ۱۲۶ درج ہونا غالباً کتابت کی غلطی ہے) اور یہ طے ہے کہ انیسویں صدی میں سنین الاسلام کا حصۂ اول صرف دو بار شائع ہوا: ایک ۱۸۷۱ء میں اور دوسری بار ۱۸۸۰ء میں۔۱۸۸۰ء کا جو نسخہ پیش نظر ہے، اس کے متن کی ضخامت ۹۸ صفحات ہے۔لہٰذا جس نسخے کے سرِاوراق موجود نہیں اور جس کے متن کی ضخامت ۱۲۸ صفحات اور مسطر ۱۶ سطری ہے، وہ سنین الاسلام کے حصۂ اول کی پہلی اشاعت کا نسخہ ہی ہو سکتا ہے۔

۸۔ سنینِ اِسلام، حصّۂ اوّل، انگریزی دیباچہ، ص۴۔

۹۔ مقالاتِ گارساں دتاسی، جلد اوّل، ص۸۷۔

۱۰۔ "G. W. Leitner and Muhammad Husain Azad...." ص۱۹۷، حاشیہ۲۔ ڈائمنڈ نے انگریزی میں کتاب کا نام "Sinin-i-Islam" لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف سے انگریزی عنوان نقل کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔

۱۱۔ G. W. Leitner-Life and Works، ص۶۔

۱۲۔ الف۔ مولانا محمد حسین آزاد، در: ''سببِ تالیف (سنین الاسلام)''، مشمولہ: مقالاتِ مولانا محمد حسین آزاد، جلد دوم، ص۲۹۸، ۳۰۰۔

ب۔ گارساں دتاسی، در: مقالات گارساں دتاسی، جلد اوّل، ص۸۷۔

ج۔ آغا محمد طاہر، در مقدمۂ مکتوباتِ آزاد، مشمولہ: محمد حسین آزاد، حیات اور تصانیف، جلد اوّل، ص۲۲۴۔

د۔ آغا محمد اشرف، در ایضاً، ص۲۲۳۔

ہ۔ مولوی محمد شفیع، در مضمون: ''شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد''، مشمولہ: مقالات مولوی محمد شفیع، جلد دوم، ص۱۱۶۔

و۔ ایضاً، در مضمون: ''مولانا آزاد کے بعض مسودے''، ماہ نامہ اَدبی دنیا، لاہور۔

ز۔ ڈاکٹر اسلم فرخی، در: محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف، جلد اوّل، ص۲۲۳ تا ۲۲۷۔

ح۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر، در مضمون: ''محمد حسین آزاد کی درسی کتابیں''، مشمولہ: تہذیب و تخلیق، ص۵۸، ۵۹۔

ط۔ آغا سلمان باقر، در محمد حسین آزاد: حیات، شخصیت، فن، ص۱۷۔

ی۔ سرِ ورق و ''تعارف''، در سنین الاسلام، طبع سوم، لاہور، انجمن حیات اسلام۔

ک۔ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، در حواشی مکاتیب آزاد، ص۶۶ تا ۶۹، ۷۲، ۷۶۔

۱۳۔ الف۔ مولانا محمد خلیل الرحمٰن، در مضمون ''حیات آزاد پر ایک اہم، نادر و معاصر ماخذ''، مشمولہ: مجلّہ راوی، لاہور، مولانا محمد حسین آزاد نمبر، ص۱۵۱۔

ب۔ آغا محمد طاہر، در دیباچۂ کائناتِ عرب، ص۶، ۷۔

ج۔ ڈاکٹر محمد صادق، در محمد حسین آزاد، احوال و آثار، ص۲۱۲، ۲۱۳ (تذکرۂ سنینِ اِسلام)۔

د۔ جیفری ایم ڈائمنڈ، در مضمون "G. W. Leitner and Muhammad Husain Azad:...."

ص ۱۹۷، حاشیہ ا۔

ہ۔ آغا محمد باقر، در تعارف ''سبب تالیف (سنین الاسلام)''، مشمولہ: مقالات مولانا محمد حسین آزاد، جلد دوم، ص ۲۹۸۔

و۔ ڈاکٹر اسلم فرخی، در مضمون: ''محمد حسین آزاد، گورنمنٹ کالج لاہور میں''، مشمولہ: مجلہ راوی، مولانا محمد حسین آزاد نمبر، ص ۲۱۱۔

ز۔ ایضاً، در مضمون: ''محمد حسین آزاد (فرمودات ''چغتائی'' کی روشنی میں)''، مجلہ بازیافت، لاہور، شمارۂ اول: جنوری ۲۰۰۲، ص ۳۴ تا ۴۰۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنی کتاب میں سنین الاسلام نام لکھا ہے (دیکھیے محولہ بالا)۔

ح۔ ڈاکٹر ممتاز گوہر، در پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا: ۱۹۴۷ء تا ۱۸۴۹ء، ص ۱۵۵۔

۱۴۔ ''حیات آزاد پر ایک اہم، نادر و معاصر ماخذ''، ص ۱۵۱۔

۱۵،۱۶۔ محمد حسین آزاد: احوال و آثار، ص ۲۱۲۔

۱۷۔ کائنات عرب، دیباچہ، ص ۶۔

۱۸۔ مقدمۂ مکتوبات آزاد، بحوالہ محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف، جلد اول، ص ۲۲۴۔

۱۹۔ سنین الاسلام، حصۂ اول، انگریزی دیباچہ، ص ا۔

۲۰۔ G. W. Leitner and Muhammad Husain Azad، ص ۱۹۸، حاشیہ ۲۔

۲۱۔ مکاتیب آزاد، ص ۶۶، ۶۷۔

۲۱۔ محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف، حصۂ اول، ص ۲۲۵، ۲۲۶۔

۲۳۔ مکاتیب آزاد، ص ۶۶، ۶۷۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۶۶۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۶۷۔

۲۶۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے قیاساً اس خط کا زمانۂ تحریر اگست ۱۸۷۱ء لکھا ہے۔ ان کے مطابق: ''تاریخ کا تعین اس خط کے جواب سے کیا گیا ہے۔'' انھوں نے لائٹز کا متعلقہ جواب بھی نقل کیا جو انگریزی میں ہے اور اس کا ترجمہ بھی درج کیا ہے، لیکن اس جواب خط پر کوئی تاریخ درج نہیں اور نہ خط کے تین سطری متن میں کوئی تاریخ مذکور ہے۔ محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف، ص ۶۶، ۶۷۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے واضح نہیں کیا کہ انھوں نے اس جوابی خط سے آزاد کے خط کی تاریخ اگست ۱۸۷۱ء کیسے متعین کی ہے۔

۲۷۔ ''مولانا آزاد کے بعض مسودے''، ص۱۵۳،۱۵۴۔

۲۸۔ مکاتیبِ آزاد، ص۶۷۔

۲۹۔ محمد حسین آزاد، حیات اور تصانیف، ص۲۲۶۔

۳۰۔ ایضاً، ص۲۲۵،۲۲۶۔

۳۱۔ سنین الاسلام، حصۂ اوّل، طبع اوّل، انگریزی دیباچہ، ص۳؛ نیز: سنینِ اسلام، حصۂ اوّل، طبع ثانی؛ انگریزی دیباچہ، ص۳۔

۳۲۔ ''مولانا آزاد کے بعض مسودے''، ص۱۵۴، ۱۵۵۔

۳۳۔ ''شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد''، ص۱۱۶۔

۳۴۔ ''حیاتِ آزاد پر ایک اہم، نادر و معاصر ماخذ''، ص۱۵۱۔

۳۵۔ کائناتِ عرب، دیباچہ، ص۶۔

۳۶۔ مکتوبات آزاد، ص۱۴۰، بحوالہ: محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف، حصۂ اوّل، ص۲۲۴۔

۳۷۔ ''مولانا آزاد بحیثیت ایک پروفیسر''، ص۸، بحوالہ محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف، حصۂ اوّل، ص۲۲۳،۲۲۴۔

۳۸۔ "G. W. Leitner-Life and Works"، ص۹ تا ۱۲۔

۳۹۔ محمد حسین آزاد: حیات، شخصیت، فن، ص۷۱،۷۲۔

۴۰۔ محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف، حصۂ اوّل، ص۲۲۴،۲۲۵۔

۴۱۔ ''محمد حسین آزاد، گورنمنٹ کالج لاہور میں''، ص۲۱۱؛ ''محمد حسین آزاد (فرمودات چغتائی کی روشنی میں)''، ص۳۷۔

۴۲۔ محمد حسین آزاد: احوال و آثار، ص۲۱۳۔

۴۳۔ مکاتیبِ آزاد، حاشیہ ص۶۷۔

۴۴۔ ''محمد حسین آزاد کی درسی کتابیں''، ص۵۹۔

۴۵۔ "G. W. Leitner and Muhammad Husain Azad;...."، ص۱۹۹۔

۴۶۔ محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف، حصۂ اوّل، ص۱۵۰۔

۴۷۔ مکاتیبِ آزاد، ص۷۷۔

۴۸۔ ایضاً، ص۹۱، ۹۲۔

۴۹۔ محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف، حصۂ اوّل، ص۲۲۵؛ ''محمد حسین آزاد، گورنمنٹ کالج لاہور میں''،

ص۲۱۱؛ ''محمد حسین آزاد (فرمودات چغتائی کی روشنی میں)''، ص۳۹۔

۵۰۔ محمد حسین آزاد: احوال و آثار، ص۲۱۲۔

۵۱۔ "G. W. Leitner-Life and Works" ص۱۱۔

۵۲۔ تقطیع: ۱۸×۱۲ س م، صفحات: ۴۰ (متن ص۹ تا ۳۹)۔ کتاب پر سنہ طبع و اشاعت درج نہیں۔ مرتب آغا محمد طاہر کے دیباچے کے آخر میں ۳ جون ۱۹۲۷ء کی تاریخ درج ہے۔ ممکن ہے کتاب شائع بھی اسی سال ہوئی ہو۔

۵۳۔ ایضاً، ص۶، ۷۔

۵۴۔ مقالات مولانا محمد حسین آزاد، جلد سوم، ص۳ تا ۳۶۔

۵۵۔ کائنات عرب، دیباچہ، ص۷۔

۵۶، ۵۷، ۵۸۔ ''مولانا آزاد کے بعض مسودے''، ص۱۵۴۔

۵۹۔ مقالات مولانا محمد حسین آزاد، جلد دوم، ص۲۹۸ تا ۳۰۰۔

۶۰۔ ایضاً، ص۲۹۸، مرتب کا نوٹ۔

۶۱۔ ایضاً، جلد دوم، ص۱۰۹ تا ۱۸۸۔

کتابیات

۱۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر:

۱۔ محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف، حصۂ اول، کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، اشاعتِ اول، ۱۹۶۵ء

۲۔ ''محمد حسین آزاد (فرمودات چغتائی کی روشنی میں)''، ششماہی بازیافت، لاہور، شمارہ ۳: جولائی ۲۰۰۳ء، ص ۲۷ تا ۶۴۔

۳۔ ''محمد حسین آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں''، مجلّہ راوی، لاہور: اکتوبر ۱۹۸۳ء، (مولانا محمد حسین آزاد نمبر)، ص ۲۰۷ تا ۲۱۶۔

۲۔ اکرام چغتائی، محمد: "G. W. Leitner--Life and Works"، ششماہی بازیافت، لاہور، شمارہ ۱: جنوری ۲۰۰۲ء، انگریزی حصہ، ص ۱ تا ۲۴۔

۳۔ آزاد، مولانا محمد حسین:

۱۔ کائناتِ عرب؛مرتب: آغا محمد طاہر؛لاہور، آزاد بک ڈپو؛اشاعت اوّل،س ن[۱۹۲۷ء]۔

۲۔مقالات مولانا محمد حسین آزاد ،جلددوم؛مرتب: آغا محمد باقر؛لاہور،مجلس ترقی اَدب؛اشاعت اوّل، جون۱۹۷۸ء۔

۳۔مقالات محمد حسین آزاد،جلدسوم؛مرتب وناشر ایضاً؛اشاعت اوّل،اپریل ۱۹۸۷ء۔

۴۔مکاتیب آزاد؛مرتب: سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی؛لاہور،مجلس ترقی اَدب؛اشاعت اوّل،نومبر ۱۹۶۶ء۔

۴۔ آغا محمد باقر:تعارف مقالات مولانا محمد حسین آزاد،جلددوم،سوم (دیکھیے بنیادی حوالہ)۔

۵۔ آغا محمد طاہر:دیباچہ کائنات عرب (دیکھیے بنیادی حوالہ)

۶۔ Jeffery M. Diamond "G. W. Leitner and Muhammad Husain Azad; Vernacular Education and Language Reform in the Punjab"; مشمولہ:محمد حسین آزاد (نئے دریافت شدہ ماخذ کی روشنی میں)؛تعارف وترتیب:محمد اکرام چغتائی؛لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز؛اشاعت اوّل،۲۰۰۴ء؛ص ۱۸۳تا۲۱۴۔

۷۔ حسن اختر،ڈاکٹر ملک:''محمد حسین آزاد کی درسی کتب''؛مشمولہ:تہذیب و تحقیق؛از ڈاکٹر ملک حسن اختر؛لاہور، یونیورسل بکس؛اشاعت اوّل،۱۹۸۵ء؛ص۱۵۱تا۱۱۸۔

۸۔ رفاقت علی شاہد:مولانا محمد حسین آزاد اور ۱۸۵۷ء؛ مشمولہ:صحیفہ: کتاب ۱۸۵۷ء ؛مرتب: رفاقت علی شاہد؛لاہور،مجلس ترقی اَدب؛اشاعت اوّل،۲۰۰۹ء،ص ۱۵۸۔

۹۔ سلمان باقر، آغا:محمد حسین آزاد: حیات ، شخصیت ، فن؛ لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز؛اشاعت اوّل،ستمبر۱۹۸۱ء۔

۱۰۔ شفیع،مولوی محمد:

۱۔''مولانا آزاد کے بعض مسودے''؛ماہ نامہ اَدبی دنیا،لاہور؛ص۱۵۳تا۱۵۷۔

۲۔''شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد''؛مشمولہ:مقالات مولوی محمد شفیع ،جلددوم؛مرتب:احمد ربانی؛ لاہور،مجلس ترقی اَدب؛اشاعت اوّل،نومبر۱۹۷۲ء؛ص۱۱۱تا۱۱۸۔

۱۱۔ صادق،ڈاکٹر محمد:محمد حسین آزاد، احوال و آثار؛لاہور مجلس ترقی اَدب،اشاعت اوّل،نومبر ۱۹۷۶ء۔

۱۲۔ ضیاءالدین لاہوری:جوہرِ تقویم؛لاہور ادارۂ ثقافت اسلامیہ؛اشاعت اوّل،۱۹۹۴ء۔

۱۳۔ گارساں دتاسی:مقالات گارساں دتاسی ،جلداوّل،(مترجم ندارد،نظر ثانی: ڈاکٹر حمید اللہ)؛کراچی،انجمن ترقی اُردو پاکستان؛اشاعت ثانی،۱۹۶۴ء۔

۱۴۔ لیٹنر، ڈاکٹر جی ڈبلیو (G. W. Leitner):

۱۔سنین الاسلام، حصۂ اوّل، اشاعت اوّل: لاہور، ۱۸۷۱ء۔

۲۔سنینِ اِسلام، حصۂ اوّل، اشاعت ثانی، لاہور، مطبع انجمن پنجاب؛ ۱۸۸۰ء۔

۳۔ایضاً: اشاعت ثالث: لاہور، انجمن حمایت اسلام، س ن۔

۴۔ سنینِ اِسلام، حصۂ دوم: اشاعت اوّل، لاہور، مطبع انڈین پبلک اوپنین: ۱۸۷۶ء۔

۱۵۔ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید: تعارف مکاتیب آزاد (دیکھیے بنیادی حوالہ)۔

۱۶۔ معین الرحمٰن، ڈاکٹر سید: ''حیات آزاد پر ایک اہم، نادر و معاصر'' ماخذ: مجلّہ راوی لاہور: اکتوبر ۱۹۸۳ء، (مولانا محمد حسین آزاد نمبر) ص ۱۳۴ تا ۱۶۰۔

۱۷۔ ممتاز گوہر، ڈاکٹر: پنجاب میں اُردو ادب کا ارتقا: ۱۹۴۹ء تا ۱۹۱۴ء، لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی: اشاعت اوّل، ۱۹۸۷ء۔

جدید اردو تنقید، محمد حسین آزاد اور نو آبادیاتی مضمرات

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی

اردو میں نئی ادبی تنقید دراصل الطاف حسین حالی کی مرتب کردہ اردو شعریات کی توسیع ہے۔ سو سال کے عرصے میں اس شعریات میں یوں تو مغربی تصور شعر کے ان گنت عناصر شامل ہو گئے ہیں مگر اس کی لسانی اور تہذیبی جڑیں مشرقی روایت میں ہمیشہ پیوست رہیں۔ خود الطاف حسین حالی نے ملٹن کے حوالے سے سادگی، اصلیت اور جوش پر مبنی جن ترجیحات کو اردو شعریات کا حصہ بنانے کی کوشش کی تھی وہ امتداد وقت کے ساتھ منہا ہوتی چلی گئیں۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں اردو تنقید پر پہلے رومانی اور بعد میں ترقی پسند رویے حاوی رہے ہوں یا نصف آخر میں اس کے ساتھ حقیقت پسندانہ اور پھر حقیقت پرستانہ عناصر شامل ہوئے ہوں، ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ اردو کے نظریات شعر میں تنوع پیدا ہوا اور تقریباً ہر طرح کے تصورات کے کارآمد عناصر اردو شعریات میں نہ صرف یہ کہ حل ہو گئے بلکہ اس کی جزوی توسیع کا حصہ بنتے رہے۔ اہم بات یہ ہے کہ مغرب سے اثر پذیری کے طویل تجربے کے باوجود اردو کی اپنی شعریات پر قائم رہنے یا اس کی بازیافت کی ضرورت ہر زمانے میں محسوس کی گئی۔ یہ وہی شعریات ہے جس کے وسیلے سے شعر و ادب کے تعینِ قدر میں اردو کے ان لسانی اور تہذیبی رشتوں پر اصرار بڑھا ہے جن کے اصل سرچشمے فارسی اور ہند اسلامی روایت کے علاوہ کہیں اور تلاش نہیں کیے جا سکتے۔ چنانچہ آج بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں مغرب کے نظریاتی تنوع سے استفادے اور اس سے متعلق بحث و تمحیص کے باوجود اردو کی جدید تنقید کا ارتقا اپنی مخصوص بنیادوں پر ہی استوار رہا۔

محمد حسین آزاد کو ہم اصطلاحی معنوں میں ایک باقاعدہ تنقید نگار کا نام دیں یا نہ دیں، مگر اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ انھوں نے اردو تنقید کے لیے بعض نظریاتی بنیادیں فراہم کیں اور اردو شاعری کی تاریخ رقم کرتے ہوئے اپنی بساط بھر شاعروں کی تنقیدی درجہ بندی کی کوشش بھی کی۔ اس طرح ان کی نظری تنقید کے نمونے بھی ہمارے سامنے موجود ہیں اور بکھری ہوئی صورت میں سہی مگر عملی تنقید کے مختلف عناصر کو بھی مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر سب سے

اہم سوال یہ ہے کہ ان کے اصولی مباحث اور اطلاقی تنقید میں ہمیں کوئی مناسبت یا ہم آہنگی بھی ملتی ہے یا نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کے نظریات اور عملی اطلاق میں پائی جانے والی شعریاتی مغائرت، ہمیں ان کے نظریاتی موقف کو کسی اور سیاق وسباق میں سمجھنے اور اس کے مضمرات کا سراغ لگانے پر مجبور کرتی رہی ہو اور ہم نے ہنوز اس پہلو کی طرف خاطر خواہ توجہ صرف ہی نہ کی ہو؟ جہاں تک ان کے تنقیدی تصورات کے مضمرات تک رسائی حاصل کرنے کا سوال ہے تو ان کے بارے میں قرار واقعی رائے اس وقت تک قائم نہیں کی جاسکتی جب تک ان کے نظریے اور اطلاق کی مغائرت کی حرکیات کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ تاہم اس سے پہلے ہمارے لیے ان کی نظری اور عملی تنقید کی نوعیت اور محرکات کو سمجھنا ضروری ہوگا۔

آزاد کی نظری تنقید کے نمونے نظم آزاد کے دیباچے، نظم اور کلام موزوں سے متعلق لکچر، بعض مقالات اور آب حیات کے دیباچے میں ملتے ہیں جب کہ آب حیات میں شعری محاسن ومعائب کی نشاندہی کو ان کی اطلاقی تنقید کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ہر چند کہ اس ضمن میں وہ جن اصولوں اور معیاروں کو روبہ عمل لاتے ہیں ان کی کوئی نشاندہی ان کی اصولی تحریروں میں نہیں ملتی۔ نظم اور کلام موزوں پر گفتگو کرتے ہوئے، انھوں نے شعر کی اثر انگیزی کا اصل محرک موزونیت کو قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں مشرقی تصور شعر میں رائج موزوں اور مقفّی ہونے کی شرائط پر وہ موثر ہونے کی شرط کا اضافہ کرتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ مشرق کے علوم متداولہ میں تسلیم شدہ انسان کی سب سے بڑی امتیازی صفت نطق، کو وہ غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> پس قوت انسانی بھی اس میں کامل سمجھنی چاہیے جس میں قوت گویائی کامل ہو۔ چونکہ نظم بہ نسبت نثر کے زیادہ زورِ طبیعت سے نکلتی ہے، یہی سبب ہے کہ موثر بھی زیادہ ہوتی ہے۔

اس طرح کا معاملہ شعر کی تعریف کا ہو یا لسانی اظہار کی سطح پر انسان کے ناطق ہونے کا، صاف پتہ چلتا ہے کہ مشرقی تصور انسان کے ساتھ مشرقی تصور کلام، آزاد کے ذہنی ارتقا کا محض حصہ نہیں بنا بلکہ ان کے خمیر میں شامل ہے۔ یہاں شاید اس بات کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ مغرب کے سماجی علوم میں انسان کو ایک سماجی جانور سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے جب کہ مشرق کے عقلی اور نقلی علوم میں انسان کی مابہ الامتیازی خصوصیت قوت نطق کو ہی قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اسی باعث اس کی تعریف حیوان ناطق کے لفظوں میں کی گئی ہے۔ اس کا جدید سیاق وسباق یہ بنتا ہے کہ کمال ابو دیب نے عبدالقاہر جرجانی کے تصور استعارہ پر گفتگو کرتے ہوئے جدید ساختیاتی مفکرین کے لسانی اظہار یا ڈسکورس کو مشرق میں تسلیم شدہ انسان کی امتیازی صفت 'قوت نطق' کی بازیافت کا نام دیا ہے۔ اس طرح آزاد کا انسان کی قوت گویائی کو شعری اظہار کی اساس قرار دینا ان کے تنقیدی نقطہ نظر کو اردو کی جدید تنقید کے مباحث کے لیے بڑا بامعنی بنا دیتا ہے۔ پھر یہ کہ وہ جب شاعری میں مصوری کے عناصر کی جستجو کرتے ہیں، تب بھی مشرقی شعریات کی پرانی

اصطلاح محاکات اور مغربی تصور شعر میں مقبول شعری طریق کار، امیجری یا پیکر تراشی کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

شاعر گویا ایک مصور ہے کہ معنی کی تصویر دل پر کھینچتا ہے اور بسا اوقات اپنی رنگینی فصاحت سے عکس نقش کو اصل سے بھی زیادہ زیبائش دیتا ہے۔ وہ اشیاء جن کی تصویر قلم مصور سے نہ کھنچے یہ زبان سے کھینچ دیتا ہے۔ چنانچہ ہزاروں صفحہ کاغذ بھیگ کر فنا ہو گئے مگر صدہا سال سے آج تک ان کی تصویریں ویسی کی ویسی ہی ہیں۔

محمد حسین آزاد کے بعض شعری تصورات جدید تنقیدی مباحث کے لیے ہر چند کہ خاصے معنی خیز معلوم ہوتے ہیں مگر ان کا اصل سرچشمہ وہی مشرقی نظریہ شعر ہے جس کا سلسلہ عربی اور فارسی کی شعریات کے تسلسل کے طور پر اردو شعریات تک پہنچتا ہے۔ یہ روایت اس طرح ان کے خمیر میں اس حد تک شامل ہے کہ جب تک بعض مصلحتوں کے زیر اثر وہ شعوری کوشش کر کے اپنے بنیادی سرچشموں سے صرف نظر کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے ان کی تنقید اپنے اصل مآخذ سے منحرف نہیں ہو پاتی۔ انھوں نے شعری زبان کی سحر آفرینی کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے اس میں زبان کے اجنبیا نے (Defamiliarize کرنے) کے جدید تصور شعر سے لے کر حقیقت کا التباس پیدا کرنے والے طرح طرح کے جدید طریقہ ہائے فن کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے شاعری کے وسیلے سے شعری زبان کی طلسم کاری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

اگر شاعر چاہے تو امورات عادیہ کو نیا کر دکھائے۔ پتھر کو گویا کر دے، درختان یا درِ گل کو رواں کر دکھائے، ماضی کو حال، حال کو استقبال کر دے، دور کو نزدیک کر دے۔ زمین کو آسمان، خاک کو طلا اور اندھیرے کو اجالا کر دے۔

آزاد کی ان نکتہ آفرینیوں کو اگر فارسی کی روایت میں تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو اس میں محمد عوفی کی لباب الالباب اور رشید الدین وطواط کے تصورات کی گونج ملتی ہے، جن کی بہترین تلخیص نظامی عروضی سمرقندی کے الفاظ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے:

شاعری صناعتے است کہ شاعر بداں صناعت، اتساق مقدمات موہومہ کند و التیام قیاسات منتجہ، بر آں وجہ کہ معنی خرد را بزرگ گرداند و معنی بزرگ را خرد۔ و نیکو را در خلوت زشت باز نماید و زشت را در صورت نیکو جلوہ کند۔ و بہ ایہام قوت غضبانی و شہوانی بر انگیزد، تا بداں ایہام طبایع را انقباضے و انبساط بود، و امور عظام را در عالم سبب شود (چہار مقالہ)

یہ محمد حسین آزاد کا وہ ذہنی اور فکری پس منظر ہے جس پر اکتفا کرنا وہ گوارا نہیں کرتے اور بعض ایسے تصورات سے بھی کسب فیض کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے کلاسیکی مغربی تنقید سے ان کی دلچسپی کا التباس پیدا ہوتا ہے۔ اس

لیے مناسب ہوگا کہ ان کے مغربی مآخذ پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے اور اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے کہ زیادہ صحیح معنوں میں شعریات کے مغربی سرچشموں سے قابل اعتبار حد تک واقفیت رکھتے ہیں یا محض سنی سنائی باتوں کو اپنے زور بیان کی بنیاد بنا لیتے ہیں۔ وہ شعر کی ماہیت کے بارے میں اپنی گفتگو کچھ انداز سے شروع کرتے ہیں:

فلاسفہ یونان کہتے ہیں کہ شعر خیالی باتیں ہیں جن کو واقعیت اور اصلیت سے تعلق نہیں۔ قدرتی موجودات یا اس کے واقعات کو دیکھ کر جو خیالات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے مطلب کے موقعوں پر موزوں کر دیتا ہے۔ اس خیال کے لیجے کی پابندی نہیں ہوتی ...... غرض (شعر میں) ایسی باتیں ہیں کہ نہایت لطف دیتی ہیں۔ انھیں حقیقت سے کوئی غرض نہیں ہے۔ باوجود اس کے صنعت گاہ عالم میں نظم ایک عجیب صفت الٰہی ہے۔ اسے دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ (آب حیات)

یہ الگ بات ہے کہ یہی ماورائی انداز کلام موزوں کے بارے میں اپنے لکچر میں اختیار کر چکے ہیں مگر اس کا حوالہ یونانی فلسفہ نہیں الہام اور القاء کی کیفیت ہے۔

فی الحقیقت شعر ایک پرتو روح القدس کا اور فیضان رحمت الٰہی کا ہے کہ اہل دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے۔

(نظم اور کلام موزوں)

یوں تو وہ اپنے اس لکچر میں شعر کے لیے گلزار فصاحت کا پھول، گل ہائے الفاظ کی خوشبو، روشنی عبارت کا پرتو، علم کا عطر، قوائے روحانی کا جوہر اور روح کے لیے آب حیات جیسی صفات کو بھی نئے انداز میں دہراتے ہیں، مگر اس قسم کی تمام تعریفات سے سوائے اس کے کچھ اور پتہ نہیں چلتا کہ وہ قدیم مغربی تصورات شعر کی یا تو غلط تعبیر کرتے ہیں یا ان پر کچھ اس طرح اپنے اسلوب کی پیوندکاری کرتے ہیں کہ ان کی طباعی پوری طرح کھل کر سامنے آسکے۔ تاہم یونانی مآخذ سے ان کے اکتساب فیض کو بھی بنیادی حوالوں کی مدد سے سمجھنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ ان تصورات کے ذکر میں وہ افلاطون اور ارسطو کا ذکر تو نہیں کرتے مگر کلاسیکی یونان کے حوالے کے سبب ہمارا ذہن بلاتوقف انھی اولیں نظریہ سازوں کی طرف جاتا ہے۔ ویسے آزاد کے بیانات کی تفصیل میں جائیے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے تصورات کی پوری عمارت افلاطون اور ارسطو سے ناکافی واقفیت کی بنیاد پر تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ افلاطون نے Republic میں شاعر کے منصب کے بارے میں ضمنی طور پر ہی سہی مگر دوررس نتائج کا حامل نظریہ عینیت پیش کیا تھا اور شاعر کو بحیثیت نقال عینیت سے دو درجے دور ہونے کا فیصلہ صادر کیا تھا، مگر اس کی دوسری تحریروں مثلاً Ion اور Phaedrus میں شعر کی ماہیت کے موضوع پر بعض بنیادی باتیں ملتی ہیں۔ اس کے خیالات کی جامع ترجمانی ان الفاظ میں ملتی ہے:

شاعر جو لکھتے ہیں وہ اپنے فن کے بل بوتے پر نہیں لکھتے بلکہ الفاظ کے زور پر لکھتے ہیں ..... اس لیے کہ ان پر

شاعری کی دیوی کا سایہ ہے، جیسے سائی بیلو دیوی کے پجاری رقص کرتے ہیں تو اپنے آپ میں نہیں رہتے۔ اس طرح لکھنے والے حالت جنون میں اپنے حسین نغمے لکھ سکتے ہیں...... یا یہ کہ شاعر نازک اور مقدس ہستی ہے، لیکن اس میں قوت ایجاد اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس پر الہام ہوتا ہے۔ اس کے حواس جاتے رہتے ہیں اور وہ ادراک سے دست بردار ہو جاتا ہے۔

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ افلاطون نے ان الفاظ میں شاعری کی تعریف نہیں کی ہے بلکہ اس پر طنزیہ تبصرہ کیا ہے۔ جب کہ بعض کا خیال ہے کہ ریپبلک لکھنے کے بعد ممکن ہے افلاطون کے نقطہ نظر میں تبدیلی واقع ہوئی ہو۔ یہاں معنویت محض اس بات کی ہے کہ آزاد کے زیر بحث تصورات میں یونانی فلسفہ سے استفادہ ملتا ہے یا نہیں؟ تو شاعروں پر دیوؤں کا سایہ ہونے یا الہام قرار دینے میں افلاطونی تصورات کی بازگشت کسی کو بھی سنائی دے سکتی ہے مگر جہاں وہ شاعری کے موثر ہونے، اس کے حقیقت میں اضافہ ہونے اور اس کی فصاحت سے لطف پیدا ہونے کی باتیں کرتے ہیں وہاں ارسطو کے اس خیال سے استفادہ ملتا ہے، جس میں شاعرانہ نقل کو جمالیاتی عمل بتایا گیا ہے اور تخیل اور استعارے کی مدد سے حظ و انبساط پیدا کرنے یا فطرت میں موجود خلا کو پر کرنے کا نقطہ نظر ملتا ہے۔ اس طرح تصورات خواہ افلاطون کے ہوں یا ارسطو کے، آزاد نے ان کی ترجمانی کرتے ہوئے ان کے غیر مربوط عناصر کو تحلیل کرنے کی کوشش بالکل نہیں کی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ شعر کی ماہیت کے بارے میں ان کے تصورات بعض نمایاں تضادات میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ہاں یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ آزاد اپنے عہد کے مغرب میں غیر معمولی طور پر مقبول رومانی شعری رجحان کے ترجمان بن کر رہ گئے ہیں اور ان کا رومانی طرز بیان ان کے تاثراتی انداز فکر میں مزید ماورائیت بلکہ الجھاؤ پیدا کر دیتا ہے۔

آزاد نے مشرقی اور مغربی تصورات شعر سے جو غیر مربوط اثرات قبول کیے ہیں ان میں ایک اہم پہلو شعری لسانیات کا بھی ہے۔ جس کے تحت وہ آب حیات میں سنسکرت اور فارسی کے رائج اسالیب اظہار کا موازنہ کرتے ہوئے فارسی میں رائج طرز بیان کو استعارہ سازی یا بالواسطہ انداز کلام کا نام دیتے ہیں اور اس کے مقابلے میں بھاشا کے راست بیانیہ کو زیادہ قابل قبول قرار دیتے ہیں۔ دونوں زبانوں کے اسالیب کا موازنہ انھیں اس نتیجے تک پہنچاتا ہے:

دونوں کے رنگ ڈھنگ میں کیا فرق ہے؟ بھاشا کا فصیح، استعارے کی طرف بھول کر بھی قدم نہیں رکھتا۔ جو جو لطف آنکھوں سے دیکھتا ہے اور جن جن خوش آوازیوں کو سنتا ہے یا جن جن خوشبوؤں کو سونگھتا ہے، انھیں کو اپنی میٹھی زبان میں بے تکلف بے مبالغہ صاف کہہ دیتا ہے۔ (آب حیات)

حیرت کی بات یہ ہے کہ بھاشا کے اسلوب سے آزاد کی رغبت اور اس کے مقابلے میں فارسی کی اسلوبیاتی

روایت کو کم تر گردانے کا رویہ، بالآخر فارسی کے زیر اثر اردو میں رائج اسالیب کی تحقیر پر منتج ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ صرف بھاشا کی دل پذیری پر توقف نہیں کرتے بلکہ اس کی مماثلت انگریزی زبان کے بیانیہ اور تسلسل اظہار میں ڈھونڈھ لیتے ہیں اور یہ تک کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ:

بیشک مبالغے کا زور یا تشبیہ اور استعارے کا نمک، زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے۔ لیکن نمک اتنا ہی چاہیے کہ جتنا نمک۔ نہ کہ تمام کھانا نمک۔ اس لیے تشبیہ اور استعارے ہمارے مطلب میں ایسے ہونے چاہئیں جیسے معرکہ یا دریا یا باغ کی تصویر پر آئینہ، کہ اس کی کیفیت کو زیادہ روشن کردے، نہ اتنے آئینے کہ تصویر کا اصل ہی دکھائی نہ دے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں۔ لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیوں کہ اب رنگ، زمانہ کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھ کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے، ہار، طرّے ہاتھ میں لیے حاضر ہیں۔ اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے۔ (نظم اور کلام موزوں)

اس پس منظر میں اگر آزاد کے مختلف، متنوع اور متضاد تصورات کے بین السطور پر توجہ صرف کی جائے تو ان کے ترجیحات کو نشان زد کرنا زیادہ مشکل نہیں رہ جاتا۔ پھر بھی اس ضمن میں حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے زیادہ مناسب یہی ہے آزاد کے نظری موقف کے ساتھ ان کی اطلاقی تنقید کو بھی سامنے رکھا جائے۔ ان کی اطلاقی تنقید کے نمونوں کے طور پر ذوق، مومن اور غالب کی شاعری کے بارے میں آزاد کے تنقیدی فیصلوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔ کلام ذوق میں انھیں جو محاسن نظر آتے ہیں وہ کچھ اور اس طرح ہیں:

عام جوہر ان کے کلام کا تازگی، مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے۔

ان صفات کے ساتھ ذوق کی غزلوں میں چست بندشیں، برجستہ ترکیبیں، معانی کی بلندی اور الفاظ کی شکو ہیں، بہت اہم ہیں۔ جب کہ غالب کے بارے میں ان کی رائے میں طنز کا لہجہ صاف محسوس کیا جاسکتا ہے:

جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اس سے ہزار درجہ عالم میں کلام بلند ہے بلکہ اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجہ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے معنی آفرینی اور نازک خیالی کو غالب کا شیوۂ خاص بتایا ہے۔ ذوق اور غالب کے علاوہ مومن خاں مومن آب حیات کے دوسرے ایڈیشن میں ان خوش نصیب شاعروں میں شامل ہوجاتے ہیں جن پر آزاد کی رائے کو تذکروں کی رائج کردہ تعمیم کے بجائے تنقیدی تخصیص کا نام دیا جاسکتا ہے۔

غزلوں میں ان کے خیالات نازک اور مضامین عالی ہیں، اور تشبیہ اور استعارے کے زور نے اور بھی اعلیٰ

درجے پر پہنچادیا ہے۔ معاملات میں ان کا انداز جرات سے ملتا جلتا ہے۔ وہ اکثر اشعار میں ایک شے کو کسی صفت خاص کے لحاظ سے ذات شما کی طرف نسب کرتے ہیں، اور اس ہیر پھیر سے عجیب لطف بلکہ معانی پنہانی پیدا کرتے ہیں مثلاً

محو مجھ سا دم نظارۂ جاناں ہو گا
آئینہ آئینہ دیکھے گا تو حیراں ہو گا

آب حیات کے تنقیدی فیصلوں کی روشنی میں آزاد کی عملی تنقید بعض تجزیوں اور موازنوں کی بنیاد پر اردو تنقید کی آگے کی منزلوں کا سراغ دیتی ہے۔ وہ خود کو تذکروں کی محض چند گنی چنی اصطلاحوں میں اسیر نہیں رکھتے اور یہ کوئی کم اہم بات نہیں کہ ایک شاعر کو دوسرے سے الگ کرنے کی خاطر اس انفرادی پہچان کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ اس طرح تمام حد بندیوں کے باوجود وہ تذکروں کی نام نہاد تنقیدی رایوں پر اضافے کا انداز اپناتے ہیں۔ اور اپنے زمانی سیاق وسباق میں الطاف حسین حالی کے مربوط اور منضبط تنقیدی تصورات کی تمہید ضرور بن جاتے ہیں۔ ان تمام صفات کے باوجود دانستہ اغماض اس وقت مقام حیرت بن جاتا ہے جب ہماری نظر اس پہلو پر پڑتی ہے کہ ان کی عملی تنقید کو بڑی مشکل سے اطلاقی تنقید کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ جن اصولوں کا اطلاق ہمیں آب حیات میں ملتا ہے وہ صرف آزاد کے تحت الشعور میں نظر آتے ہیں، ورنہ ان کی نظری تنقید تو منصوبہ بند طریقے سے نوآبادیاتی نظریہ سازی میں اسیر ہے۔ یہ محمد حسین آزاد کی نظری اور اطلاقی تنقید کی مغائرت اور ناقدانہ شخصیت کے تضادات کا ایسا پختہ ثبوت ہے جس کا تجزیہ کر کے ان کی شخصیت پر پڑنے والے مرئی اور غیر مرئی دباؤ کا اندازہ لگانا بہت مشکل نہیں رہ جاتا۔

سوال یہ ہے کہ مشرقی شعریات کے زیر اثر پروردہ آزاد کا ادبی مزاج اور فارسی اور عربی میں رائج شعری تدبیروں کا استعمال، اگر ان کے نظریہ شعر اور تصور لسان سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا تو اس کے اصل محرکات کیا ہیں؟ یا وہ اس ضمن کس حد تک نوآبادیاتی مقاصد کو آگے بڑھانے میں معاون نظر آتے ہیں۔

محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کی انگریزوں کے ہاتھوں معتوبیت اور پھر شہادت یا خود آزاد کی افتاد طبع پر اقتدار وقت کی ہیبت اور نتیجے کے طور پر اپنی مخصوص امیج کے باعث، ان کا نوآبادیاتی طریق کار کا آلہ کار بن جانا یوں بھی غیر متوقع نہیں معلوم ہوتا۔ اس ضمن میں یہ تاریخی حقیقت بھی غور طلب ہے کہ ہندوستان میں انگریزی زبان کے نفاذ اور ذریعہ تعلیم بنانے کی لارڈ میکالے کی پالیسی کے برخلاف انجمن کے صدر لائٹنر، دیسی زبانوں کے ذریعہ مغربی تصورات کی ترویج کے طرف دار ہیں۔ جس کو ڈاکٹر محمد صادق نے ''مقامی زبانوں میں ایسا ادب پیدا کرنے کا نام دیا ہے جس میں مغرب کی روح سمائی ہوئی ہو۔'' لائٹنر کے اس موقف کو نوآبادیاتی منصوبہ سازوں کی پشت پناہی حاصل

ہے۔ اس لیے کہ اس طریق کار سے ہندوستانیوں کا مانوس ہونا بھی عین متوقع ہے اور ان کا غیر شعوری طور پر مغربی تہذیب کی برتری کا معترف ہونا بھی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ کرنل ہالرائڈ کے عملی اقدامات، لائٹنر کے نقطہ نظر کو آگے بڑھاتے ہیں اور دونوں مل کر محمد حسین آزاد کے تسلیم شدہ علمی اور ادبی وقار اور اعتبار کو اپنے مقاصد کی تکمیل کا وسیلہ بنانے اور صورت حال کا استحصال کرنے میں پوری طرح کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ چنانچہ نوآبادیاتی ایجنڈے کے مطابق مغرب کی تہذیبی برتری کو تسلیم کرانے کا جو منصوبہ زیر عمل تھا اس کا پہلا مرحلہ اردو والوں کو ان کے اپنے ادب، اپنی تہذیب اور اپنے ماضی قریب کی ثقافت سے برگشتہ کرنا اور اپنے ادب و کلچر کی بے وقعتی کا احساس دلانا تھا۔ خود کرنل ہالرائڈ نے انجمن کے پہلے مناظرے میں جو باتیں کہیں ان کی ہنرمندانہ تکرار محمد حسین آزاد کی ادبی نظریہ سازی میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان کے الفاظ یہ تھے:

> یہ جلسہ اس لیے منعقد کیا گیا ہے تاکہ نظم اردو جو چند عوارض کے باعث تنزلی اور بدحالی میں پڑی ہوئی، اس کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے جائیں۔ (آزاد، محمد صادق)

چنانچہ محمد حسین آزاد کے وسیلے سے ان نوآبادیاتی منصوبہ کاروں کے نقطہ نظر کو منطقی اور مدلل اسلوب مل جاتا ہے اور ان کے لکچر اور بعض دوسری تحریروں میں لیفٹیننٹ گورنر ڈونلڈ، لائٹنر اور ہالرائڈ جیسے سربراہوں کے خیالات کی ترجمانی زیادہ قابل قبول انداز میں ہونے لگتی ہے۔ جس کا اندازہ ان بعض عبارتوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جن میں آزاد نے اپنی روایت کی تحقیر اور انگریزی شعر و ادب کی افادیت اور معنویت کو نمایاں کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے:

> عربی فارسی میں اس ترقی و اصلاح کے راستے سالہا سال سے مسدود ہو گئے ہیں (آب حیات)

یا یہ کہ:

> فارسی کے اثر کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو باتیں بدیہی ہیں اور محسوسات میں عیاں ہیں، ہماری تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ در پیچ خیالوں میں آ کر وہ بھی عام تصور میں جا پڑتی ہیں کیوں کہ خیالات کے ادا کرنے میں ہم اول اشیائے بے جان کو جاندار بلکہ انسان فرض کرتے ہیں۔ بعد میں ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں جو اکثر ملک عرب یا فارس یا ترکستان کے ساتھ مذہبی خصوصیات رکھتے ہیں۔

واضح رہے کہ یہ نیرنگ خیال کے وہی محمد حسین آزاد ہیں جن کو تمثیلی مضامین کا بنیاد گزار کہا جاتا ہے۔ بہر کیف اردو اور فارسی کے رائج اسالیب کے نقائص کی نشاندہی کے بعد ان نقائص کے مداوا سے متعلق ان کا لکچر بنیادی اہمیت رکھتا ہے مثلاً:

> انگریزی زبان ترقی و اصلاح کا طلسمات ہے۔

یا یہ کہ:

میں انگریزی میں دیکھتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب و مضامین کو نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں اور حق یہ ہے کہ کلام میں جان ڈالتے ہیں اور مضمون کی جان پر احسان کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں کیا۔ سن کر ترسیں، اپنے تئیں دیکھ کر شرمائیں۔ کاش ہم جو ٹوٹی پھوٹی نثر لکھتے ہیں، اتنی ہی قدرت نظم پر ہو جاوے، جن کے اعلیٰ درجے کے نمونے انگریزی میں موجود ہیں۔

مگر وہ اپنی عملی تنقید میں اس نوع کے کسی نوآبادیاتی نظریے کو عدم مناسبت کے باعث استعمال نہیں کر پاتے اور اپنی نظری اور عملی تنقید کو دولخت بنا لیتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کے نظریہ اور عمل کے مابین ایک خلا پیدا ہوتا ہے جو بالآخر اس مغربی یا نو استعماری نقطہ نظر سے پُر ہوتا ہے جو نہ ان کا مزاج ہے نہ ترتیب اور نہ افتادِ طبع۔ چنانچہ آزاد کی تنقید جدید اردو تنقید کے لیے جزوی طور پر بامعنی ہونے کے باوجود کسی فکری انضباط کے بجائے سیاسی محرکات کا نمائندہ بن جاتی ہے۔

مقالاتِ آزاد - ایک مطالعہ

ڈاکٹر عبدالحق

مولانا آزاد جیسی پر اسرار شخصیت میرے مشاہدے میں نہیں ہے۔ گفتگو کے ساتھ صوب وثبوت بھی فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ ادب کی کہکشانی کیفیات پیش نگاہ ہوں تو آزاد کی افتاد اور انفرادیت کے استعجاب کا اعتراف آسان ہوگا۔ ہم ان کے وجود ونمود سے متاثر یا مرعوب ہی نہیں ہیں اکثر زیر وزبر بھی ہوتے رہتے ہیں۔ تخلیق کے اطراف و آہنگ کے مختلف روپ دیکھے ہوں تو ان سے رجوع کیجیے۔ انشا واسالیب سے قطع نظر ان کی نگارشات خانۂ حیرت محسوس ہوتی ہیں۔ جہاں عقل وخرد دونوں دم بخود ہیں۔ شعری مضامین نو کے ادراک کا ارادہ ہو تو کلیات نظم سے سرشاری حاصل کیجیے۔ عہد ماضی کے ایوان وامصار سے آگہی کے لیے آئین اکبری کہ عہد تیمور نہیں سینۂ تاریخ میں آئینہ حق نما ہے۔

اردو وفارسی کے لسان وادب کی بازآفرینی اور سخن شناسی کے لیے ان کے دامن دل کشا میں لطف افروزی کے ان گنت اسباب اکٹھا [اکٹھے] ہیں۔ جہاں حسن اظہار کی بے پروائی بھی الہام بن جاتی ہے۔ ابلاغ کے ہر دم متغیر نظریات کو بالائے طاق رکھیے۔ اسالیب کی ابدی حقیقتوں کے عرفان کے لیے نیرنگ خیال کی سحر آفرینی کسی جام جمشید سے کم نہیں۔ الہیاتی فکر وفلسفہ سے تشنگی اور تشکیک کو دور کرنے کے لیے مزید تجسس کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سب سے صرف نظر کر کے عمومی مطالعے یا مطالبے کے لیے مقالات سے مراجعت کیجیے۔ جس میں ان کی فکر وتحریر کے کئی امکانی زاویوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ یہاں ادب وانشا کے ساتھ کھوئے ہوؤں کی جستجو، الہیاتی فکر، تعلیم وتجارت، سیر وسائنس غرض کبھی کچھ موجود ہیں۔ مگر اصلاحی فکر سب پر غالب ہے۔ مقالات کا مجموعہ ان کی مجوزہ یا منضبط تصنیف نہیں ہے۔ یہ وقتی اور فرمائشی مضامین ہیں جو زیادہ تر انجمن پنجاب کی مختلف نشستوں میں پڑھے گئے اور بیشتر شائع شدہ ہیں۔ کچھ غیر مطبوعہ بھی ہیں۔ ان سب کو ان کے پوتے آغا محمد باقر نے مولانا کی وفات کے بعد مرتب کیا۔ سرسید اور شبلی کے مقالات بھی پس از مرگ جمع واشاعت سے آراستہ ہوئے۔ غالباً اسی پیروی میں انھیں بھی مقالات کا نام دیا گیا۔

محدود اصطلاحی معنوں میں انھیں مقالات کہنا مشکل ہے۔ بیش از بیش ہلکے پھلکے مختصر مضامین ہیں۔ موضوعات بھی عمومی نوعیت کے ہیں۔ دو چار مقالات کے ذیل میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ جن میں سنجیدہ موضوعات، دقیق مسائل اور علمی انداز پیش کش نمایاں ہے۔ یادِ رفتگاں پر تعزیتی اظہار کے ساتھ تعلیم و تدریس اور حصول علم پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ ان کی مدد سے آزاد کی اصلاحی فکر و تدبیر کی شعوری سعی پر سیر حاصل گفتگو کی جاسکتی ہے۔ جو ان کی شخصیت کے نہاں خانۂ وجود کا ان مول حصہ ہے۔ ان مضامین کو مختلف ذیلی عنوانات کے تحت بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ جیسے ادب و تاریخ، تہذیب و تمدن، مذہب و معاش، تعلیم و تدریس، اشخاص و آثار، سائنس و سیاست، فکر و نظر وغیرہ۔ ان سب میں اکثر بہت واضح اور کہیں کہیں بین السطور اصلاحی رجحان دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ معاصر فکر کا غالب رویہ بھی تھا۔ سرسید و شبلی و حالی سبھی شریک خیال تھے۔ ان میں کہیں کہیں بعد میں لکھی جانے والی تصانیف کے ابتدائی نقش و نگار بھی نمایاں ہیں۔ قومی فلاح و بہبود کے ساز و سامان کے ساتھ مولانا آزاد انگریزی استبداد اور نظام کے اعتراف میں صدق و صفا کے پیکر نظر آتے ہیں۔ اسے خوشامد یا مداحی سے تعبیر کریں یا اپنے تقاضائے وقت کی مجبوری پر محمول کریں جس سے پورا معاشرہ دوچار تھا۔ آشوب کے قلزمِ خوں سے گزرتے رہنا آزاد کا مقدر بن چکا تھا۔ اس سراسیمگی میں صرف انگلیاں ہی فگار نہیں ہوتیں بلکہ نالۂ نے اور صریر خامہ، سرِ دار نہ سہی صفحہ کاغذ پر مصلوب ہوتے ہیں۔ مقالات کا مطالعہ آزاد کی شخصیت اور ان کے گوشہ دل میں چھپے اضطراب کی تفہیم کے لیے سب سے موثر وسیلہ ہے اور لوح جبیں پر ان کے قلم کی لکھی ہوئی ان کی سرنوشت ہے۔

نبیرۂ آزاد کا خیال ہے کہ یہ مضامین قصص ہند حصہ سوئم کے لیے لکھے گئے تھے۔ جو شاید بڑے ڈائریکٹر تعلیم کی ناپسندیدگی کے باعث اس میں شامل نہ ہو سکے۔ ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب کے قیام کے ساتھ ہی جلسوں میں مضامین کے پیش کیے جانے کا سلسلہ شروع ہوا اور اشاعت بھی ہوتی رہی۔ سنہ مذکور میں انھوں نے صرف پانچ مضامین پڑھے۔ ۱۸۶۶ء میں وہ کسی جلسے میں شریک نہ ہو سکے۔ کیوں کہ وہ بیرونی سفر پر تھے۔ واپسی پر ۱۸۶۷ء میں انجمن کی محفلوں میں ان کا پر جوش استقبال کیا گیا۔ مارچ تا دسمبر ۳۲، یعنی سب سے زیادہ مضامین قلم بند کیے گئے۔ ۱۸۶۸ء کے کل پندرہ مضامین شامل مقالات ہیں۔ ۱۸۶۹ء سے ۱۸۸۷ء کے درمیان ۱۸ سال میں کل پندرہ مقالات لکھے گئے۔ چار غیر مطبوعہ مضامین ایسے ہیں جن کے سن و سال کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ پہلی جلد کے ۷۳ مشمولات کے استحضار اور تجزیے کے لیے ناچیز ہر مقدرت سے محروم ہے۔ آپ کے تحمل و تشویق کو گراں گوش کرنا بھی بار خاطر ہے۔ افسانہ آزاد جہاں آشوب ہے اور جاں فزائے ناز بھی۔ یہ بادہ و زہر کا بڑا دل نشین مرکب ہے۔ مقالات میں ان کی سرشاری اور پر سوز طبیعت کا بے حجاب اظہار ملتا ہے۔ وہ نئے نظام اقدار کا استقبال کرتے ہیں۔ مگر قومی جمود اور زوال سے وحشت زدہ بھی ہیں۔ طرز فکر میں تبدیلی کا اضطراب انھیں ہر شعبہ زندگی میں اصلاح کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ شعرو

ادب میں انقلاب آفریں تبدیلی انھیں کی سرنوشت ہے۔ پہلے مقالے (۱۱فروری ۱۸۶۵ء) کا عنوان ہے ''تدبیر رفع افلاس وحصول فارغ ابہائی اہل ہند'' جو معاش وتجارت سے متعلق ہے۔ اختتامی عبارت کی انقلابی فکر ملاحظہ ہو:

دامن ہمت مردانہ کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔ سچ ہے:

دامن ہمت مدہ از دست خویش
ہمت مرداں مدد از کبریا

تیسرا مضمون بھی ''اہل ہند کو اپنے سود و بہبود میں آپ ہمت کرنی لازم ہے'' کے عنوان سے ہے۔ اس کا بھی صرف ایک جملہ پیش نگاہ رکھیں:

اے اہل وطن تم خود کمر سعی کو چست باندھو اور ہمت مردانہ کو ہاتھ سے نہ دو:

اہل ہمت را نباشد تکیہ بر بازوئے کس
خیمۂ افلاک بے چوب و طناب استادہ است

ہم آزاد کے ادبی مطالعے پر ہی مطمئن اور مسرور ہیں اور وہ زمین سخن سے بہت پرے چرخ نیلی فام تک ہمیں پرواز کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ معاش ومعیشت، صنعت وتجارت، بازار و برآمدات سے متعلق ان کے طرز خیال کی ایک سودمند شاہ راہ ہے جو مال ومنافع کی اسرار کشائی کرتی ہے۔ معاشرتی بہبود کے لیے وہ دور ونزدیک کی عالمی منڈیوں پر نظر رکھنے کی تاکید کرتے ہیں۔ وہ اسلاف کے بیرون ملک کے تجارتی حوصلوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں اور اپنی خانہ نشینی پر ماتم کے ساتھ مغربی اقوام کی تجارت سے تخت وتاج تک رسائی کی مثال بھی پیش کرتے ہیں:

اجناس خام ہماری یورپ کو جاتی ہیں اور اشیائے گراں بہا ہو کر وہاں سے آتی ہیں۔

علامہ اقبال نے بھی غیرت دلائی تھی:

تختۂ دکان شریک تخت و تاج
از تجارت نفع از شاہی خراج
قالی از ابریشم تو ساختند
باز او را پیش تو انداختند

''ترقی تجارت وتائید ہندوستان'' کے عنوان سے پندرہ صفحے کا یہ مضمون نکتہ سرایان تجارت کا دستور ہے۔ 'محصول کتب اور سود مروجہ' بھی اس خیال کی توسیعی صورتیں ہیں۔ تجارت کی اساس ضرورت اور فراہمی پر ہے۔ ان کی بنیاد افزائش اور آبادی پر قائم ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی سے معاشی بحران کا سب سے تشویش ناک منظر نگاہوں کے سامنے ہے۔ کتاب کا دوسرا مضمون آپ کے شہر نگاراں کی کریہہ اور کرب ناک تصویر پیش کرتا ہے۔ 'برائے توسیع شہر

لاہور کا پہلا جملہ سنیے:

تدابیر صحت میں گنجانیِ شہر و بداسلوبیِ مکانات اول قدم پر سدراہ ہے۔

جائے تنگ است و مرداں بسیار

ربنا وقنا عذاب النار

آپ نے بھی ماسٹر پلان اور اربن آرٹ کے شعبے قائم کیے ہوں گے۔ مولانا آزاد نے پوری تفصیل پیش کی ہے۔ گوجروں کے مویشی خانے، اناج منڈی، گھی منڈی، شالی کوب، گدھے والے رنگریز، ٹھٹھیرے، گنجان مکانوں کو مسمار کیے جانے کی تجاویز ہیں۔ منظور شدہ نقشے کے مطابق مکانوں کی تعمیر پر زور ہے۔ ساتھ ہی نئی بستیوں کے باشندوں کے لیے اشیائے ضروری پر محصول دس برس کے لیے معاف کیے جانے کی سفارش بھی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل کا یہ ماسٹر پلان آزاد کی بصیرت کا ادنیٰ اشارہ ہے۔

ان کارآمد تجاویز کے ساتھ اقتدار اور افسران کی خوشنودی کو ملزوم قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی ایما کے بغیر یہ کام انجام نہیں پا سکتا۔ بیش از بیش مضامین میں انگریزوں کی تعریف اور خوشامد کے الفاظ ناگوار گزرتے ہیں۔

مقالات میں کتابوں پر تبصرے بھی ہیں جو تبصرہ کی تاریخ کی اولیات میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ واقدی سے منسوب ترجمے کو غلط بتایا ہے۔ فرہنگ آصفیہ جلد چہارم اور موعظہ حسنہ پر تاثرات محفوظ کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں ذخیرۂ بال گوبند، کتاب عجائب و غرائب، عجائب خانہ لاہور، کتب خانہ انجمن، کتاب اپدیشک بنجک وغیرہ پر ان کی خیال افروز تحریریں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ سید احمد کی اس کاوش کو آزاد نے لبیک کہا ہے:

اس کتاب کے باب میں یہ کہنا ایشیائی تعریفوں کا معمولی فقرہ نہیں کہ اس سے زیادہ جامع کتاب اب تک زبان اردو میں نہیں لکھی گئی...... وضع تحریر اور طرز ترتیب میں جو خوبیاں اہل یورپ نے نکالی ہیں اور اب تک ہماری کتابیں ان سے محروم ہیں۔ صاحب کمال مصنف نے انھیں بھی نہیں چھوڑا۔

اس تبصرہ میں آزاد کے مجوزہ منصوبے کا بھی ذکر ہے کہ وہ بھی ایک جامع لغت لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ہمت کی عدم رفاقت اور سامان ضرورت کی قلت نے مہلت نہ دی۔ دوسرے معاصر ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب موعظہ حسنہ کی اشاعت کو جواں سال نسل کی تربیت کے لیے ایک ناگزیر صحیفہ قرار دیا ہے۔ ان کے برعکس کتاب اپدیشک بنجک پر سات جملوں کا تبصرہ ہے۔ جس میں آزاد کے اخلاقی اقدار کی ارتفاعیت عیاں ہے:

عبارت اس کی عاشقانہ اور ایسی رنگین ہے کہ جس کا پڑھنا بھی عورتوں اور لڑکوں کے سامنے مناسب معلوم نہیں ہوتا ہے۔ پس انجمن کی رائے میں ایسی کتاب کو لڑکوں کے لیے بھی تدریس میں داخل نہ کرنا چاہیے چہ جائے

دختران و مستورات۔

مقالات میں ایک معقول حصہ مختلف النوع اشخاص کے تعارف پر مشتمل ہے۔ جسے خاکہ نگاری کے ابتدائی خدو خال کہہ لیجیے یا شخصیتوں کی شبیہہ سازی پر آزاد کے انہماک کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ ان میں علما، ادبا، سربراہ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ جیسے اخلاق جلالی کے مصنف ملا جلال الدین دوانی، بوعلی سینا، عبدالرحیم خان خاناں، راجہ بیربر، سکندر بیگم والی بھوپال، سردار ہری سنگھ، شاہ ہدایت وغیرہ۔ ان کی دل چسپ اور ترقی یافتہ صورتیں آب حیات کے ادبی حوالوں میں ملتی ہیں۔

ان مضامین کے فکر انگیز زاویوں پر توجہ کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر متنوع ادبی موضوعات میں غور و فکر کے بڑے سامان موجود ہیں۔ اردو ادب کا بابا آدم جنھیں ''موجد اردو شاعری'' کہا گیا ہے۔ مولانا آزاد نے ولی شناسی کا آغاز کیا ہے:

اس کا کلام نہایت حیرت انگیز ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ تمام ہندوستانی شاعروں کا ہادی اور رہ نما ہے۔

''شاہ حاتم استاد مرزا رفیع سودا'' ادبی انتقاد کا ایک اہم مضمون ہے۔ یہاں بھی حاتم شناسی کی اولیت قائم ہے۔ شاہ ظہور الدین حاتم کے بارے میں معلومات کا گراں مایہ ذخیرہ اس مضمون کا حاصل ہے۔ دیوان زادہ کے مقدمے کو نقل کر کے مولانا آزاد نے انتقادی اجتہادی فکر کو روشنی بخشی ہے۔ آب حیات میں یہ مضمون تقریباً ہو بہو نقل کر لیا گیا ہے۔ ہاں یہ بات باعث حیرت ہے کہ مذکورہ مضمونؑ کے تیس اشعار آب حیات میں نہیں ملتے۔ وہاں دوسرے اشعار موجود ہیں۔ شاہ ہدایت اللہ خاں ہدایت کے تذکرے کے بعد ''غم نامہ غالب'' ہے۔ جوان کے انتقال پر لکھا گیا ہے۔ تخلیق کاروں کے ساتھ زبان و ادب سے متعلق دوسرے موضوعات بھی اسی سے نسبت رکھتے ہیں۔ جن میں لسانی و تہذیبی اشتراک و اختلاف کے ساتھ زبان کے گوناگوں کرداروں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ جیسے زبان اردو، نظم و کلام موزوں، قواعد اردو، انشائے فارسی و اردو، نظم میں انقلاب عربی قدیم و جدید، ترجمہ اصطلاحات، ترجمہ کتب علمی، ریاضی وغیرہ مضامین میں مولانا آزاد کی وسعت فکر اور علمی اکتشاف دردل کو کشادگی بخشتا ہے۔ ان میں ان کے طلوع فکر فردا کے ساتھ ان کی دل نشیں تحریر کی بھرپور بشارت بھی خشت و خمیر کا خاکہ مقالات میں موجود ہے۔ بعض مضامین تو ان کتابوں میں شیر و شکر کی طرح ہم آمیز ہو گئے ہیں۔ اور کچھ مصادر کی طرح محفوظ و مربوط ہیں۔

ایک دوسرے زاویہ نظر کی طرف آپ کا التفات چاہتا ہوں۔ جدید شاعری کے قندیل برداروں کی قیادت مولانا آزاد نے کی۔ ان کی تحریریں نظر میں نہ بھی ہوں، سالار کی اس انقلابی فکر کا اعتراف ہی کافی ہے۔ معروف مشاعرے اور بالرائڈ کے حوالے سے پہلے ۱۸۶۸ء میں ایک مضمون پڑھا گیا۔ ''در باب نظم اور کلام موزوں'' جو مجموعہ نظم آزاد میں شامل بھی ہے۔ تخلیق میں تبدیلی آزاد کے سوز دروں کا ایک اضطراب تھا۔ اختتامی عبارت کی پیش بنی

اور دردمندی دیکھیے:

پس اس انجمن کے تقرر اور آپ صاحبوں کی برکتِ اجتماع سے یہ بھی امید ہے کہ جہاں اور محاسن وقبائح کی ترویج واصلاح پر نظر ہوگی فن شعر کی اس قباحت پر بھی نظر رہے گی۔ گو آج نہیں مگر امید قوی ہے کہ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرۂ نیک حاصل ہو کہ یہ فن شریف مدت دراز سے خرابی میں پڑا ہے اور روز بروز تباہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

آزاد نے خشت اول ہی نہیں رکھی بلکہ نظم کی فلک نشیں عمارت کو اہتمام و آرائش کا پیراہن بھی بخشا۔ اس مضمون کا سلسلہ ۸ مئی ۱۸۷۴ء کو ''نیچر کی شاعری'' کے افتتاحی اجلاس میں ''نظم میں انقلاب'' کے عنوان سے پیش کیا گیا۔ جو شہرت پروین اور دین سخن کا آئین آزاد تسلیم کیا گیا:

میرے اہل وطن آؤ آؤ۔ برائے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو۔ اٹھو۔ اٹھو۔ وطن اور اہل وطن کی قدیمی ناموری کو بربادی سے بچاؤ۔ تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرانے میں کوشش کرو...... حق پوچھو تو ہماری انشا کے ستارۂ اقبال کی مبارک ساعت ہے۔ اس موقع پر ہماری تھوڑی کوشش بھی بہت سا اثر کرے گی۔

''رات کی حالت'' پر ایک نظم بھی پڑھی۔ جس کا آخری شعر ابدی حقیقتوں کو آشکار کرتا ہے۔

کوئی گھڑی تو ہوش و خرد سے بھی کام لے
وقت سحر قریب ہے اللہ کا نام لے

موجودہ معنوں میں مقالات کے کئی اہم سلسلے ہیں جیسے مسائل فلسفہ کا طریق تحقیق، فلسفہ طبعی، اصول فلسفہ طبعی، قوت تجاذب، حرکت و سکون، ان میں علمی مسائل کی نوعیت، تحقیق و تدقیق، منطقی استدلال، تبحر و تعدیل، فکر آزاد کے علمی جذب و جنون کی وافر مثالیں پیش کرتے ہیں۔ متکلمین، اشراقین اور مشائین کے مباحث کے ساتھ صحف سماوی کے تکوینی اور تشریعی تصورات پر تفکر و تصلف کی نظر ہماری حیرتوں میں اضافے کا موجب بنتی ہے۔

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت والی الاسماء کیف رفعت والی الجبال کیف نصبت، والی الارض کیف سطحت

مقالات میں آخری کتاب کا یہ پہلا حوالہ آزاد کی دانش و بینش کا مظہر ہے۔ کرۂ ارض اور عالم افلاک کے درمیان مظاہر کی ہیئت پر نکتہ رسی سے ان کے فکری اسالیب اور انہماک کا ادراک ہوتا ہے۔ یہاں آزاد کی شخصیت مروجہ یا متعین محسوسات سے مختلف ہے۔ کشش زمین سے متعلق مندرجات میں ناپ، نقشے اور جدول بھی ان کے اکتسابی فکر کے آئینہ دار ہیں۔

دیگر اہم موضوعات سے قطع نظر ان کے ایک اور پہلو کا ذکر بے محل نہ ہوگا جس پر اردو کا پہلا رپورتاژ سمجھ کر توجہ دی جائے۔ یہ سفر ایران کی مسافت اور مقامات کے احوال کی داستان دل کشا ہے جو اس مجموعہ میں ۲۴ صفحے کا سب سے طویل اور دلچسپ حصہ ہے۔ یہ ان کی رہ نوردی اور جنون شوق کی سب سے دلآویز تحریر بھی ہے۔ حیرت ہے کہ آزاد مرزا رضا خاں افشار سے ملاقات کے ضمن ان کی حمایت کرتے ہوئے فارسی سے عربی الفاظ کے اخراج کی تائید بھی کرتے ہیں۔ سفرنامہ کے آخری حصے میں ایک واقعہ کا ذکر بڑی بے تکلفی سے کیا گیا ہے۔ جو احوال واقعی پر مبنی نہ سہی مگر اندیشہ ہائے افلاکی کی طرف اشارہ ضرور ہے۔ وہ ایرانیوں کے بار بار کے سوالات سے عاجز تھے۔ قندھار میں بھی یہ واقعہ پیش آیا کہ تم کہاں سے آئے ہو اور کہاں جاؤ گے؟

ایک ایرانی آزاد کے بازو پکڑ کر کہنے لگا:

"میرانی، ما می توانیم ترا بگیریم و پیش امیر صاحب بریم۔ تو جاسوس فرنگ ہستی۔"

کسی اور نے کہا "ایں چہ بلا است"؟

آزاد کے لاشعور میں درون خامہ کے یہ ہنگامے ان کی شورش جنوں کی کسی حکایت خوں چکاں سے کم نہیں ہیں۔ آزاد کے یہ حرف راز تھے جن کی بازبینی کے لیے نفس جبرئیل درکار ہے۔

تخلیقِ شعر کے نظری مباحث اور محمد حسین آزاد

ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری

انیسویں صدی کے نصفِ دوّم میں یکے بعد دیگرے ایسی تین نابغہ شخصیات کا ظہور ہوا جنھوں نے شعرو ادب کے دوسرے شعبوں کے علاوہ شعری تنقید کو بھی لائقِ اعتنا سمجھا اور اس کی طرف نظری و عملی، دونوں زاویوں سے توجہ دی۔ ہماری مراد شمس العلما محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالؔی اور علامہ شبلی نعمانی سے ہے جنھیں بعدازاں مہدی افادی نے بجاطور پر اردو نثر کے ارکانِ خمسہ میں شمار کیا۔ ان میں سب سے زیادہ پذیرائی حالؔی کے حصے میں آئی اور بطور نقاد ان کی فضیلت کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا۔ مقدمۂ شعر و شاعری اور یادگارِ غالب جیسی منضبط اور مستقل تصانیف آج بھی اردو کی نظری و عملی تنقید کا معتبر حوالہ سمجھی جاتی ہیں۔ نقاد کی حیثیت سے حالؔی کے بعد شبلی کی اہمیت کا اعتراف بھی ہر عہد کے نقادوں نے کیا اور شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر کو اہم کتبِ تنقید کے طور پر سراہا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ آزاد کو نقاد کی حیثیت سے آج تک وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق تھے، حالانکہ حالؔی اور شبلی پر زمانی تقدم حاصل ہے اور وہ نظری و عملی، دونوں حوالوں سے اردو تنقید میں اُن کے پیش رو ہیں اور اگر تذکروں کے زیادہ تر رسمی یا زیادہ سے زیادہ تاثراتی بیانات کو ایک طرف رکھ دیا جائے تو آزاد کو ڈاکٹر محمد اسلم فرخی کے الفاظ میں اردو کا ''اوّلین نقاد'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ (۱) اس زاویۂ نگاہ سے دیکھیں تو بلاشبہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی آزاد نے ''سب سے پہلے اردو میں تنقید کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا۔'' (۲) ظاہر ہے کہ یہاں تنقید سے مراد وہ تنقید ہے جس کے شواہد ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پیشتر عنقا تھے۔ اس وقت تک اردو میں عربی و فارسی سے مستعار معانی، بیان، بدیع اور عروض کی اصطلاحوں کو بروئے کار لانے اور شعرا کے تذکروں میں ان کی مدد سے رسمی اور تاثراتی بیانات قلمبند کرنے کے سوا تنقید کا کوئی اور تصور موجود نہیں تھا۔ آزاد اس تصور میں تبدیلی لانے والے پہلے شخص ہیں۔ بلکہ اس تناظر میں تو ڈاکٹر وزیر آغا نے قدرے مبالغہ آمیز انداز اختیار کرتے ہوئے انھیں ''اوریجنل نقاد'' (۳) بھی کہہ دیا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

...جدید اردو تنقید کے آغاز کا سہرا حالی نہیں بلکہ محمد حسین آزاد کے سر ہے جن کے ہاں نہ صرف پہلی بار اردو تنقید کے باب میں مغرب سے متاثر ہونے کے شواہد ملتے ہیں بلکہ جنھوں نے تنقید کے میدان میں اجتہادی سوچ کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ علاوہ ازیں محمد حسین آزاد قدیم اور جدید کا سنگم بھی ہیں۔ یعنی ایک ایسا نقطہ جہاں قدیم اندازِ نقد و نظر جدید فکری رویے سے پنجہ آزما ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ (۴)

لیکن حیرت ہے کہ جدید اردو تنقید کے نقیب اور اردو کے پہلے اوریجنل نقاد کی تنقیدی بصیرت کو زیادہ تر نظر انداز ہی کیا گیا ہے۔ لے دے کے مذکورہ بالا نقادوں جیسے دو چار نقاد ہی ہوں گے جنھوں نے اردو تنقید میں آزاد کو ان کا جائز مقام دلانے کی سعی کی ہوگی۔ اس اغماض کا ایک سبب تو یہ ہے کہ آزاد نے حالی اور شبلی کی طرح اپنی نظری تنقید کو بالخصوص اور عملی تنقید کو بھی ایک حد تک کسی منضبط اور مستقل تصنیف میں پیش نہیں کیا بلکہ ان کے تنقیدی تصورات اور ان کی اطلاقی صورتیں نسبتاً منتشر حالت میں ہیں جس کے باعث ان کا مجموعی تاثر آسانی سے قائم نہیں ہو پاتا۔ دوسرا سبب آزاد کی انشا پردازی ہے جو ان کی طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ وہ اپنی عمومی روش پر چلتے ہوئے تنقیدی نثر کو بھی شاعرانہ وسائلِ اظہار سے مزین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ دلچسپ تجسیمی اسلوب کبھی کبھی افکار و خیالات کی ترسیل میں حائل ہو جاتا ہے۔ خوبصورت الفاظ کے گورکھ دھندے بعض اوقات تنقیدی تصورات کو اپنے دبیز پردوں میں چھپا دیتے ہیں۔ اس امر کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے بجا طور پر لکھا ہے:

...انھوں نے اپنی تنقید کو ادبی تخلیق بنانے کی کوشش میں اپنے اصولوں کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ مگر ان خوشنما تحریروں کے اندر تنقیدی اصول موجود ہیں۔ (۵)

آئندہ صفحات میں ہم تخلیقِ شعر کے حوالے سے آزاد کے انھی تنقیدی اصولوں کو دیکھنے کی سعی کریں گے۔ لیکن اس سے پیشتر اس بات کا اعادہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وجہ خواہ کچھ ہو، بعض سخت گیر نقادوں کو آزاد کے ہاں تنقیدی اصول سرے سے دکھائی ہی نہیں دیتے۔ ان میں کلیم الدین احمد پیش پیش ہیں۔ ان کا فتویٰ ہے:

آزاد میں نقد کا مادہ مطلق نہ تھا۔ نظر مشرقی حدود میں پابند تھی۔ وہ لکیر کے فقیر تھے۔ باریک بینی اور آزادیِ خیال سے مبرا۔ انگریزی لالٹینوں کی روشنی ان کے دماغ تک نہیں پہنچی تھی۔ ان کی رائے اکثر گول ہوتی تھی۔ (۶)

ظاہر ہے کہ اس سویپنگ اسٹیٹمنٹ (Sweeping Statement) سے اتفاق کرنا ہوشمندی کے خلاف ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید عبداللہ اس رائے کی تکذیب و تردید کرتے ہوئے بجا طور پر رقمطراز ہیں:

حسبِ معمول ان کی یہ رائے بھی بہت سخت ہے، بلاشبہ آزاد کا طریقِ تنقید مذاقِ جدید کے مطابق نہیں لیکن ان کی شعرفہمی اور ذوقِ سخن سے انکار بہت بڑی ناانصافی ہے۔ (۷)

دراصل آزاد کی تنقید کو اُن کے دور کے تناظر میں رکھ کر دیکھنے سے ہی، ان کی تنقیدی صلاحیتوں کی صحیح قدر و قیمت متعین کی جا سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے اکثر معاصرین کی طرح ان کی ذہنی تنظیم اور ذوقی تربیت میں عربی و فارسی کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والی مشرقی روایتوں کا کردار ہی بنیادی حیثیت کا حامل رہا ہے اور اس معاملے میں کسی قسم کی معذرت خواہی کی بھی ضرورت نہیں، تاہم مغربی تنقید سے زیادہ استفادہ نہ کر سکنے کے باوجود انھوں نے مغرب سے بھی اثر ضرور قبول کیا۔ دلّی کالج کی فضا ہو یا کرنل ہالرائیڈ اور میجر فُلر کے ایما پر شروع ہونے والی نیچرل شاعری کی تحریک، ماسٹر پیارے لال آشوب کی صحبتیں ہوں یا علیگڑھ سے نمو پانے والا پیرویِ مغربی کا رجحان، آزاد کے مغرب سے اثر پذیری کے امکانات بہرحال موجود تھے۔ یہ درست ہے کہ مشرقی اندازِ نظر رکھنے کے باعث ان کا تنقیدی مزاج عام مغربی مزاج کی طرح عقلی یا سائنٹفک نہیں بلکہ بہت حد تک تاثراتی اور مابعدالطبیعیاتی ہے تاہم انھوں نے اپنے عہد سے کسی قدر آگے بڑھ کر اپنے تنقیدی خیالات میں مشرق و مغرب کا امتزاج پیدا کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ آزاد کے عہد کو دیکھتے ہوئے یہ بات بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں محسوس ہوتی۔

آزاد کی تنقید کا نقطۂ آغاز ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' کے زیرِ عنوان انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم پر ۱۵۔ اگست ۱۸۶۷ء کو دیا گیا وہ مشہور لیکچر ہے جس میں انھوں نے شعر اور تخلیقِ شعر سے متعلق کئی نظری مباحث پر اظہارِ خیال کیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس لیکچر کو ''اردو میں سب سے پہلا تنقیدی کارنامہ'' قرار دیا ہے۔ (۸) نظری تنقید کے حوالے سے آزاد کی دوسری اہم تحریر بھی انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں دیا گیا لیکچر ہی ہے جو مئی ۱۸۷۴ء کی یادگار ہے۔ اس میں لسانی اور تہذیبی مباحث بھی شامل ہیں لیکن زیادہ تر توجہ اس بات پر مرکوز رہی ہے کہ عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو شاعری کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا جائے۔ مذکورہ لیکچروں کے علاوہ سخن دانِ فارس، مقدمۂ دیوانِ ذوق اور دیباچۂ آبِ حیات میں بھی ایسے منتشر اشارے مل جاتے ہیں جو آزاد کے تنقیدی نظریات کا پتا دیتے ہیں۔ یہ اشارے انجمن پنجاب والے لیکچروں ہی کا اعادہ معلوم ہوتے ہیں۔

شعر کی ماہیت کے بارے میں آزاد کے تنقیدی تصورات کا پہلا اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ عروضیوں کی طرح محض وزن اور قافیے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان دونوں عناصر کے علاوہ تاثیر کو بھی لازم گردانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

> کتابوں میں اکثر شعر کے معنی کلامِ موزوں و مقفّٰی لکھے ہیں لیکن درحقیقت چاہیے کہ وہ کلام مؤثر بھی ہو۔ ایسا کہ مضمون اس کا سننے والے کے دل پر اثر کرے۔ اگر کوئی کلام منظوم تو ہو لیکن اثر سے خالی ہو تو وہ ایک ایسا کھانا ہے کہ جس میں کوئی مزا نہیں۔ نہ کھٹا نہ میٹھا۔ جیسا کہ شعر کسی استاد کا ہے:
>
> دندانِ تو جملہ در دہانند
>
> چشمانِ تو زیرِ ابروانند (۹)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد نظم اور شاعری میں فرق روا رکھنے کے قائل ہیں۔ اگرچہ اس ضمن میں انھوں نے کولرج جیسے مغربی نقادوں یا اپنے ہی عہد کے اردو نقاد حالی کی طرح زیادہ صراحت سے کام نہیں لیا تاہم احسن فاروقی کی طرح یہ مفروضہ قائم کرنا بھی درست نہیں کہ ''شعر اور نظم کے فرق سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔'' (۱۰) حقیقت تو یہ ہے کہ آزاد نے اپنے اس بیان میں شعر کے صوری پہلو کے ساتھ ساتھ داخلی وصف کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے جو اسے نظم سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ داخلی وصف 'تاثیر' ہے جو شاعر، شعر اور قاری/سامع کی مضبوط مثلث بنانے کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ یہاں یہ وضاحت بہرحال ضروری ہے کہ آزاد اہلِ مغرب کی طرح شعر کا ایسا تصور پیش نہیں کرتے جس میں موزونیت کی نفی کی گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ ایک عجمی لے کے عادی نقاد کے لیے وزن سے عاری شعر کا تصور پیش کرنا آسان نہ ہوتا۔

آزاد کے نزدیک شعر گوئی کا ملکہ ایک غیر اختیاری فضیلت ہے۔ وہ موزونیِ طبع کو جوہرِ خداداد تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ تخلیقِ شعر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> جب انسان کے دل میں قوتِ گویائی اور جوششِ مضمون مجتمع ہوتے ہیں تو طبیعت سے خود بخود کلام موزوں پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر ایسی قوت اور ایسی قوت کا جوش و خروش زیادہ ہوگا اسی قدر کلام پُر تاثیر ہوگا۔ (۱۱)

یہاں قوتِ گویائی سے مراد تخلیقِ شعر کی وہ وہبی صلاحیت ہے جس کے باعث ایک شاعر اپنا مافی الضمیر بیان کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ جوششِ مضمون بھی ایک داخلی وصف ہے جو شدید جذبات کے شدید اظہار کے لائق بناتا ہے۔ جس کی طرف ورڈز ورتھ کے تصورِ شعر میں بھی واضح اشارہ ملتا ہے۔ اہم تر نکتہ یہ ہے کہ یہاں آزاد نے بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی ''ایک اور بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ موزونیت درحقیقت مضمون اور معنویت کی تابع ہوتی ہے۔'' (۱۲)

نزولِ شعر کے بارے میں آزاد قدیم یونانی مفکرین، مثلاً افلاطون کے ہم آواز ہیں اور اسے الہام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا بیان ہے:

> شاعر کو ایک نسبتِ خاص عالمِ بالا سے ہے کہ بے وساطت اور بے اسبابِ ظاہری کے، ادھر سے اپنا سلسلہ جاری کرتا ہے۔ فی الحقیقت شعر ایک پرتو روح القدس کا اور فیضانِ رحمتِ الٰہی کا ہے کہ اہلِ دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے۔ (۱۳)

یونانیوں کے علاوہ خود ہمارے ہاں بھی شاعری کو کشف و الہام سمجھا جاتا رہا ہے۔ شعرا کو 'تلامیذ الرحمٰن' اور شاعری کو 'جزویست از پیغمبری' قرار دینا اسی وجدانی اور مابعد الطبیعیاتی تصورِ شعر کی غمازی کرتا ہے۔ 'غیب سے مضامین کا خیال میں آنا' اور 'صریرِ خامہ کا نوائے سروش' قرار پانا بھی یہی ہے۔ مذکورہ مقام پر آزاد کے ہاں مشرق و مغرب کی

اسی فکری مماثلت کا سراغ ملتا ہے۔لیکن ایک آدھ مقام پر آزاد نے بغیر تصدیق کیے یا تفہیم میں غلطی لگنے کے باعث یونانی مفکرین کے منہ میں ایسی بات بھی ڈال دی ہے جو انھوں نے نہیں کہی۔ مثلاً آبِ حیات میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

فلاسفۂ یونان کہتے ہیں شعر خیالی باتیں ہیں جن کو واقعیت اور اصلیت سے کوئی تعلق نہیں۔ (۱۴)

آزاد کے اس بیان کو اکثر ناقدین، خصوصاً ڈاکٹر احسن فاروقی نے رد کیا ہے۔

نزولِ شعر کے حوالے سے آزاد کے تنقیدی تصورات میں ایسے موسم، مقامات اور اوقات بھی مذکور ہیں جو قوتِ گویائی اور جوششِ مضمون کے فطری خصائص کو مہمیز لگاتے ہیں یا عرفِ عام میں طبع میں روانی پیدا کر دیتے ہیں۔ موسموں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

جوشِ مضامین اور شگفتگیِ طبع کے لیے بعض موسم خاص ہیں۔ چنانچہ فصلِ بہار اور موسمِ برسات میں طبائعِ موزوں زیادہ تر شگفتہ ہوتے ہیں بلکہ ناموزوں اور مردہ دلوں کی طبیعت میں بھی ایک حرکتِ مذبوحی پیدا ہوتی ہے۔ (۱۵)

اسی طرح اوقات اور مقامات کے ضمن میں رقمطراز ہیں:

شاعری کے لیے اوقات اور مقامات خاص ہیں۔ اوّل خلوت کہ جہاں ذہن اور طبیعت نہ بٹے۔ خواہ گھر میں گوشۂ عافیت ہو، خواہ باغ و صحرا، خواہ کنارِ دریا... اکثر وقتِ شب جب خلقِ خدا اپنے کاموں سے تھک کر سو جاتی ہے تب شاعر اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے.... جوں جوں رات ڈھلتی جاتی ہے، خیال زیادہ تر بلند ہوتا جاتا ہے۔ خصوصاً پچھلی رات، قریبِ صبح کہ عالم چپ چاپ اور خاطر مطمئن، طبیعت صاف اور ہوا لطیف ہوتی ہے۔ دل شگفتہ ہوتا ہے اور مضمون کی کاوش سے دل کو ایک لذت حاصل ہوتی ہے۔ (۱۶)

اگرچہ شاعری ایک ایسا پراسرار تخلیقی عمل ہے جو کبھی بھی اور کہیں بھی ظہور پذیر ہو سکتا ہے تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بالعموم ہر تخلیقی عمل کی طرح یہ بھی ایک خاص نوع کے اجتناب یا علیحدگی (Isolation) کا تقاضا کرتی ہے۔ وقت اور مقام کے حوالے سے آزاد نے ایسی ہی خلوت گزینی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس ضمن میں آزاد کے مذکورہ خیالات اپنے اندر اتنی عمومیت رکھتے ہیں کہ کسی اور قابلِ ذکر نقاد نے انھیں اپنے نظری مباحث میں جگہ نہیں دی۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، قدیم فلاسفۂ یونان کی طرح آزاد بھی شاعری کو الہام سے تعبیر کرتے ہیں جس کی تائید ہماری روایتی فکر سے بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ جنون کو بھی شاعری کے لیے لازم گردانتے ہیں۔ ان کا بیان ہے:

جنون بھی ایک طرح لازمۂ شاعری ہے.... شاعر کو لازم ہے کہ سب طرف سے مطمئن اور خیالات سے منقطع ہو کر اسی کام میں متوجہ اور غرق ہو جائے اور یہ بات سوائے مجنون کے یا عاشق کے کہ برادرِ مجازی اس کا ہے،

ہر ایک شخص سے نہیں ہو سکتی۔ مجنون کو اپنے جنون اور عاشق کو اپنے معشوق کے سوا دوسرے سے کچھ غرض نہیں... (۱۷)

ظاہر ہے کہ یہاں جنون سے مراد پاگل پن نہیں بلکہ یہ ارتکاز، محویت اور یکسوئی (Concentration) سے عبارت ایک ایسا رویہ ہے جو پوری زندگی کو محیط ہے۔ تخلیقِ شعر ایسے ہی جنون کی متقاضی ہے۔

آزاد اپنے تنقیدی تصورات میں شاعر اور غیر شاعر اور اسی طرح ادبی مذاق کے حامل اور اس سے محروم افراد کے مزاجوں میں پائے جانے والے فرق اور طبعی مغائرت کو بھی زیرِ بحث لائے ہیں اور یوں انھوں نے شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ شاعرانہ مزاج کو 'نعمتِ الٰہی' اور غیر شاعرانہ مزاج کو 'غضبِ الٰہی' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس فرق کو واضح کرنے کے لیے وہ مزید لکھتے ہیں:

....بعضے ایسے ہیں کہ ان کے سامنے اگر طلسماتِ معنی کے دریا کو شیشے میں بند کر کے رکھ دو تو پھر بھی انھیں خبر نہ ہو۔ سبب اس کا کدورتِ دل ہے کہ نورِ معنی اس میں اثر نہیں کر سکتا.... جو لوگ لطفِ طبیعت اور صفائے دل سے محروم ہیں وہ کیفیتِ شعر، فصاحتِ کلام سے محروم ہیں..... (۱۸)

اس پر ہمیں غالب کا ایک شعر یاد آتا ہے۔ آپ بھی سنیے:

حسن فروغِ شمعِ سخن، دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

بہر حال آزاد شاعرانہ اور غیر شاعرانہ مزاج کا فرق بیان کرنے کے ساتھ ساتھ شاعر کی ان وہبی اور فطری صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرتے ہیں جو اسے عام لوگوں سے ممیز کرتی ہیں۔ ان صلاحیتوں کی مناسبت ہی سے شعری تاثیر کم و بیش ہوتی ہے۔ اس ضمن میں آزاد رقمطراز ہیں:

شاعر کو چاہیے کہ طبیعت اس کی زیادہ تر قابل اور مؤثر ہو... اس کی اپنی ہی طبیعت کا اثر ہوتا ہے کہ جو مضمون فرحت یا غم، رزم یا بزم کا باندھتا ہے، جتنی اس کی طبیعت اس سے متاثر ہوتی ہے، اتنا ہی اثر سننے والوں کے دل پر ہوتا ہے۔ (۱۹)

یہ وصف خارجی کے بجائے داخلی اور اکتسابی کے بجائے وہبی ہے تاہم اس کی تربیت ہو سکتی ہے۔ بعض خارجی اور اکتسابی عناصر اس کی تربیت کا سامان فراہم کر سکتے ہیں۔ ان کا تعلق زبان و بیان، طرز و اسلوب اور فصاحت و بلاغت سے ہے۔ شاعر کی تربیت میں ان عناصر کا بڑا دخل ہے۔ اگر اس حوالے سے شاعر کی تربیت میں کمی رہ جائے تو اس کا فن بھی خام ہی رہ جاتا ہے۔ اسی لیے تو آزاد کہتے ہیں:

بعضے شاعر مضمون خوب نکالتے ہیں مگر زبان صاف نہیں۔ بعضے ایسے ہیں کہ زبان ان کی صاف ہے مگر مضامین

عالی نہیں۔ (۲۰)

گویا مخصوص مزاج کے علاوہ شاعر کی ذوقی اور فنی تربیت بھی ضروری ہے۔ جہاں تک ایک باصلاحیت اور تربیت یافتہ شاعر کا تعلق ہے، اسے ایک عجیب اور بیحد پُر تاثیر قدرتِ کلام حاصل ہوتی ہے۔ یہاں آزاد نے مشرق و مغرب کے متعدد نقادوں کی طرح شاعر اور مصوّر کی مماثلت بیان کرنے کے باوصف اوّل الذکر کو ثانی الذکر پر فوقیت دی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک تو شاعر کا دائرہ مصوّر کے دائرے سے وسیع تر ہے کیونکہ وہ ظاہری خدوخال ہی کی نہیں، داخلی جذبات واحساسات اور مجرد کیفیات کی تصویر کشی بھی کر دیتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی بنائی ہوئی لفظی تصویر میں اصل سے بھی زیادہ دلکشی و رعنائی پیدا کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک شاعر ایک

> ایسا مصوّر ہے کہ معنی کی تصویر صفحۂ دل پر کھینچتا ہے۔ اور بسا اوقات اپنی رنگینیِ فصاحت سے عکسِ نقش کو اصل سے بھی زیادہ زیبائش دیتا ہے۔ وہ اشیا جن کی تصویر مصوّر سے نہ کھنچے یہ زبان سے کھینچ دیتا ہے۔ (۲۱)

مشرق میں جمالیاتِ شعر کا یہ تصوّر وسائلِ بلاغت کی صورت میں عہدِ قدیم ہی سے پایا جاتا ہے۔ عرب و عجم سے اس کی بیسیوں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ محاکات سے لے کر تمثیلات (Imagery) تک لفظی مصوّری ہی کے متنوع ارتقائی تصوّرات ہیں۔ شبلی نعمانی نے شاعری کے جن دو لوازم کا تذکرہ کیا ہے، ان میں تخیّل کے علاوہ محاکات ہی کو جگہ دی ہے۔ (۲۲) مغرب میں تو شاعری میں متنوع ابعاد سے عبارت لفظی مصوّری کا وسیع تر تصوّر بیسویں صدی میں تمثال کاری (Imagism) کی تحریک کی صورت اختیار کر گیا جس کے اثرات بشمول اردو شاعری، دنیا بھر کی شاعری پر مرتسم ہوئے۔ (۲۳)

قدرتِ کلام کے حوالے سے آزاد نے شاعر کو قدرت کی ودیعت کردہ اس صلاحیت کا بھی ذکر کیا ہے جس کی بدولت وہ ہر مقام و منزل سے گزرنے اور کیف و کم میں جذب ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ آزاد کے الفاظ میں شاعر

> پانی میں مچھلی اور آگ میں سمندر ہو جاتا ہے۔ ہوا میں طائر بلکہ آسمان پر فرشتے کی طرح نکل جاتا ہے۔ جہاں کے مضامین چاہتا ہے بے تکلف لیتا ہے اور بہ تصرّفِ مالکانہ اپنے کام میں لاتا ہے۔ زہے سعادت اس کی جسے ایسے ملکِ معنی کی سلطنت نصیب ہوئی۔ (۲۴)

بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعر کی یہ صلاحیت اپنی ذات سے بالاتر ہونے کی صلاحیت ہے۔ اسی صلاحیت کے باعث شاعر مشاہدے کو بھی شعری تجربہ بنا دیتا ہے۔ گویا 'پرندے پر نظم لکھتے ہوئے پرندہ بن جاتا ہے'۔ کولرج کے نظامِ تنقید میں بھی متخیلہ (Imagination) کی ترکیبی قوت کے حوالے سے شاعری کی ایسی ہی صلاحیت زیرِ بحث آئی ہے۔ (۲۵)

کا تعلق شعور و آگہی کے ساتھ ضرور جوڑتی چلی آئی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے آزاد کے پیش روؤں میں گلستانِ سخن کے مؤلف مرزا قادر بخش صابر کا حوالہ دیا ہے جنھوں نے دانستن/ جاننے کو شعر کے لوازم میں شمار کیا ہے۔ (۲۶) غالباً اسی مفہوم میں:

Poetry is the essence of all knowledge.

کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ آزاد بھی اسی خیال کے حامل ہیں۔ چنانچہ الفاظ کا جادو جگاتے ہوئے لکھتے ہیں:

شعر گلزارِ فصاحت کا پھول ہے۔ گل ہائے الفاظ کی خوشبو ہے، روشنئ عبارت کا پرتو ہے، علم کا عطر ہے، قوائے روحانی کا جوہر ہے۔ تاثیر معنوی کا ست ہے۔ (۲۷)

یہاں آزاد نے اس بحث میں پڑے بغیر کہ الفاظ کو فوقیت حاصل ہے یا معانی کو، دونوں کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے شاعری کو شعور و آگہی کے آئینے میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ خدا، انسان اور کائنات کی لازوال مثلث میں شامل کونسی ایسی بات اور کونسا ایسا پہلو ہوگا جو شاعری کا موضوع نہ بنتا ہو۔ یہ حیات و کائنات کے مسائل کو سمجھنے اور گتھیوں کو سلجھانے میں معاونت کرتی ہے اور انسان کی باطنی دنیا اور اس کے گرد و پیش کی دنیا کے بارے میں شعور و آگہی عطا کرنے کا وسیلہ ثابت ہوتی ہے۔ گویا عالم اکبر (Macrocosm) اور عالم اصغر (Microcosm) دونوں اس کے دائرے میں شامل ہیں۔ آزاد نے اسی نقطۂ نظر کی توسیع میں شاعری کے منصب و عمل اور مقصد و وظیفہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے مختلف کیفیتوں کی مناسبت سے روح کی بالیدگی اور ارتقاع کی طرف اشارہ کیا ہے۔ رقمطراز ہیں:

... جس طرح پھولوں کے رنگ و بو سے دماغ جسمانی تر و تازہ ہوتا ہے، شعر سے روح تر و تازہ ہوتی ہے.... جس طرح پھول کہ کبھی چمن میں، کبھی ہار میں، کبھی عطر کھینچ کر، کبھی عرق میں جا کر، کبھی دور سے، کبھی پاس سے، مختلف کیفیتیں معلوم ہوتی ہیں اسی طرح مضامین شعری مختلف حالتوں اور مختلف عبارتوں میں رنگارنگ کی کیفیتیں عیاں کرتے ہیں۔ .... عالم معنی میں روح کے لیے غذا درکار ہے۔ چونکہ اشعار و مضامین لطیف سے روح قوت کمال اور طاقت بلند پروازی پاتی ہے، یہی اس کی غذا ہے۔ (۲۸)

شعر کے منصب و عمل اور مقصد و وظیفہ کے حوالے سے آزاد کا نقطۂ نظر زیادہ تر تاثیری ہے۔ اس ضمن میں وہ مزید لکھتے ہیں:

(شعر) روح کے لیے آب حیات ہے، گرد غم کو دل سے دھوتا ہے۔ طبیعت کو بہلاتا ہے۔ خیال کو عروج دیتا ہے۔ دل کو استغنا، بے نیازی اور ذہن کو قوت پرواز دیتا ہے... وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت، سفر در وطن اور سیر در چمن کے یہی معنی ہیں... دل میں سوز و گداز اور طبیعت میں ایسی مقبولیت اثر کی پیدا کرتا

ہے کہ بات بات میں ایک لطف اور کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ (۲۹)

اس اقتباس میں آزاد نے وحدت میں کثرت/ سفر در وطن اور کثرت میں وحدت/ سیر در چمن کی تصوفانہ اصطلاحیں استعمال کر کے اوّل الذکر کے ذریعے تجزیاتی عمل اور ثانی الذکر کے وسیلے سے ترکیبی عمل کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ شعر دونوں حوالوں سے اپنا وظیفہ انجام دیتا ہے۔ اور یہ سب کچھ شعری تاثیر کی سطح پر رونما ہوتا ہے۔

فن شعر گوئی کو گمراہی سے تعبیر کرنے اور اسے مخربِ اخلاق قرار دینے کا سلسلہ عہدِ قدیم ہی سے جاری ہے۔ اس کے پیچھے مذہب و اخلاق کے محدود اور یک رخے تصورات کی کارگزاری کا دخل رہا ہے۔ لیکن دوسری طرف اخلاقی حوالے سے شاعری کا جواز پیش کرنے والوں کی بھی کمی نہیں رہی۔ چنانچہ مغرب میں اگر افلاطون سے لے کر گاسن تک، بہت سے معترضین نے شاعری کو، اخلاقی اعتراضات کا نشانہ بنایا تو ارسطو سے لے کر فلپ سڈنی تک بہت سے مفکرین نے ان اعتراضات کے جواب دیتے ہوئے شاعری کا اخلاقی جواز فراہم کرنے کی کوششیں بھی کیں۔ اردو تنقید میں پہلے پہل آزاد نے بھی شاعری کو گمراہی سے تعبیر کرنے کے تصور کو یوں رد کیا کہ کوئی صنعت اپنی ذات میں معیوب نہیں ہوتی بلکہ اس کا غلط استعمال اسے معیوب بنا دیتا ہے۔ چنانچہ رقمطراز ہیں:

> اکثر اشخاص علی العموم فن شعر گوئی کو گمراہی خیال کرتے ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے لیکن جو لوگ سرِ معنی اور اصلِ سخن کو پہنچے ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر صناع خبثِ طبیعت سے صنعت کو بری طرح کام میں لائے تو اصل صنعت پر الزام نہیں آ سکتا۔ (۳۰)

جہاں تک آزاد کی ذاتی ترجیح کا تعلق ہے، وہ شاعری کی افادیت کے روحانی غذا کے طور پر قائل دکھائی دیتے ہیں اور گذشتہ صفحات میں اس امر کی وضاحت کی جا چکی ہے، تاہم وہ شاعری کی مادی افادیت کو بھی ایک حد تک تسلیم کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

> ...بعض طبائع شعر سے تنفر پائی جاتی ہیں اور دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں اور اگر فائدے سے یہی مراد ہے کہ اس سے چار پیسے ہاتھ آ جائیں تو شعر بالکل کارِ بے فائدہ ہے.... باوجود اس کے بھی جو لوگ طبعِ موزوں رکھتے ہیں، اگر زورِ طبیعت کو علوم و تواریخ و قصص میں صرف کریں تو فائدہ و کسب دنیاوی بھی خاطر خواہ دیوے۔ (۳۱)

جیسا کہ ہم ابتدا میں بھی اس امر کی طرف اشارہ کر چکے ہیں، آزاد کی نظری تنقید میں لسانی و تہذیبی بحثیں اور ان کے علاوہ اردو کی روایتی شاعری میں موجود عیوب کی نشاندہی اور عصری تقاضوں کے پیشِ نظر انھیں دور کرنے کی تجاویز کا بیان بھی شامل ہیں۔ یہ بحثیں زیادہ تر مئی ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں دیے گئے لیکچر کا حصہ ہیں جن کا اعادہ بعد کی تحریروں میں بھی ہوتا رہا۔ مذکورہ لیکچر میں آزاد نے رام بابو سکسینہ کے الفاظ میں:

اردو شاعری کے عیوب، تکرار مضامین، غلو و مبالغہ، فضول تشبیہات و استعارات، اس کا تصنع اور خلافِ فطرت رنگ... سب بہ وضاحت بیان کر دیے اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اردو شاعری کی بقا منظور ہے تو ہم کو چاہیے کہ عشق و عاشقی کے پرانے ڈھکوسلے ترک کریں اور عروسِ شاعری کو تیرہ و تار حجروں سے نکال کر زمانۂ موجودہ کی روشنی میں لائیں۔ شاعروں سے کہا گیا کہ پرانے مضامین ترک کرو۔ سادگیِ اظہار، اصلیت اور درد و اثر بھاشا سے اور صاف بیانی، فائدہ رسانی اور وسعت نظری مغربی شاعری سے سیکھو۔ (۳۲)

چونکہ یہ سب بحثیں تخلیق شعر سے براہِ راست نہیں بلکہ بالواسطہ طور پر منسلک ہیں، اس لیے ہم ان کا مفصل تجزیاتی مطالعہ کرنے کے بجائے، دو بنیادی نکات کا جائزہ لینے پر اکتفا کریں گے۔

پہلا نکتہ فارسی کے اثرات سے متعلق ہے۔ آزاد سمجھتے ہیں کہ جہاں فارسی کے اثر و نفوذ سے اردو میں بلند پروازی اور نزاکت و لطافت جیسے فنی محاسن پیدا ہوئے وہاں اس میں بعض معائب بھی در آئے۔ مثلاً بھاشا سے دوری نے اسے حسی ادراک پر مبنی 'اصلیت' اور 'سادگی' سے دور کر دیا اور اس میں مقامی رنگ کی کمی واقع ہوگئی۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے الفاظ میں آزاد کے نزدیک:

فارسی کی اندھی تقلید نے اسے ان سوتوں سے دور کر دیا جو خاص اسی ملک کی پیداوار تھے۔ اور جو اردو کو ایسی قوت نمو بخش سکتے تھے جن سے اس کی صلاحیتیں دو چند ہو جاتیں۔ (۳۳)

آزاد سمجھتے ہیں کہ فارسی سے آنے والی نازک خیالی اور باریک بینی نے استعاروں اور تشبیہوں کی رنگینی اور مناسبت لفظی کے ذوق و شوق میں خیال سے خیال پیدا کرنا شروع کیا اور اصلی مطالب کے ادا کرنے میں بے پروائی کے سبب اظہارِ اصلیت اور کلام کا اثر غائب ہو گیا۔ فارسی سے استعارے اور تشبیہ کا رنگ اس شدت سے آیا کہ ہماری قوت بیان کو سخت نقصان پہنچا اور خیالی باتوں کی وجہ سے زبان توہمات کا سوانگ بن گئی۔ چنانچہ اردو شاعری میں اصل مطالب اس طرح دکھائی دیتے ہیں جیسے اندھیرے میں جگنو۔ وہ اس مسئلے کا حل بھاشا کے اسلوب شعر کی طرف متوجہ ہونے میں ڈھونڈتے ہیں۔ اگرچہ اس ضمن میں آزاد سے اختلاف کی خاصی گنجائش موجود ہے تاہم ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں:

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اردو زبان کے زمینی رشتوں کے علمبردار تھے۔ (۳۴)

آزاد نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں اس امر کا اظہار بھی کیا ہے کہ فارسی کے بلند خیالات اور مبالغہ مضامین کے ساتھ اردو کی طبیعت میں وہ حالات، ملکی رسمیں اور تاریخی اشارے بھی آ گئے ہیں جو فارس اور ترکستان سے مخصوص تھے۔ اور یہ چیز اصلیت سے دوری کی ایک اور صورت ہے۔ اس ضمن میں آزاد نے چند مثالیں دیتے ہوئے لکھا ہے:

...خاص و عام پپیہے اور کوئل کی آواز اور چنبا چنبیلی کی خوشبو بھول گئے۔ ہزاروں بلبل اور نسرین و سنبل جو کبھی دیکھی بھی نہ تھیں، ان کی تعریفیں کرنے لگے۔ رستم و اسفند یار کی بہادری، کوہ الوند اور بے ستون کی بلندی، جیحوں سیحوں کی روانی نے یہ طوفان اٹھایا کہ ارجن کی بہادری، ہمالہ کی ہری بھری پہاڑیاں، برف بھری چوٹیاں اور گنگا جمنا کی روانی کو روک دیا۔ (۳۵)

اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری سے مقامی رنگ کی کمی کی جو شکایت اکثر و بیشتر کی جاتی ہے، اس کا سبب یہی ہے جو آزاد نے بتایا ہے۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر وزیر آغا نے انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

یوں انھوں نے اردو کا اس کے ثقافتی پس منظر سے ایک گہرا رشتہ دریافت کرلیا۔ (۳۶)

'ایک لیکچر' میں آزاد نے دوسرا اہم نکتہ فصاحت و بلاغت کے نئے طرز اور جدید اسالیب اظہار سیکھنے کے لیے یورپی زبانوں، خصوصاً انگریزی سے استفادہ کرنے کے حوالے سے اٹھایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

...اب رنگ زمانے کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے، ہار طرّے ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں۔ اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحبِ ہمّت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے.... نئے انداز کے خلعت اور زیور جو آج کے مناسبِ حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔ (۳۷)

آزاد نے جس اہم بات کی طرف اشارہ کیا، ہوسکتا ہے کہ ہماری انانیت اسے بآسانی قبول نہ کرپائے تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جدید اردو شاعری نے یورپی زبانوں، خصوصاً انگریزی زبان کے ادب سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اور یوں آزاد کا بیان ان کی پیش بینی کا مظہر ثابت ہوا ہے۔

مجموعی طور پر آزاد کی تنقید کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض نقائص کے باوجود وہ لائقِ اعتنا ہے اور اردو میں نظری تنقید کا آغاز صحیح معنوں میں انھی کے ہاتھوں ہوا۔ آج جب اردو تنقید سوا ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں عہد بہ عہد مختلف ارتقائی مراحل طے کرکے ایک اونچے سنگھاسن پر براجمان ہو چکی ہے، آزاد ہی نہیں، شبلی اور حتیٰ کہ حالی کی تنقید میں بھی کئی کمزوریاں دکھائی دینے لگی ہیں اور بعض مقامات پر تو سطحیت کا احساس بھی ہونے لگا ہے لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے بلندی سے نیچے دیکھتے ہوئے بڑی چیزیں بھی چھوٹی نظر آیا کرتی ہیں۔ اصل حقیقت کا ادراک تو قریب جانے پر ہی ہوسکتا ہے۔ آزاد کے تنقیدی تصورات اور خصوصاً تخلیقِ شعر سے متعلق ان کے بیان کردہ نظری مباحث کو بھی ان کے عہد میں رکھ کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ایسا کرنے سے ان کی حیثیت روشن تر ہو جائے گی۔

حوالہ جات وحواشی

(۱) ڈاکٹر محمد اسلم فرخی۔محمد حسین آزاد۔جلد دوم۔کراچی:انجمن ترقی اردو،۱۹۶۵ء۔ص ۲۶۷
(۲) ڈاکٹر عبادت بریلوی۔تنقید اور اصولِ تنقید۔لاہور:ادارہ ادب وتنقید،۱۹۸۴ء۔ص ۱۲۳
(۳) ڈاکٹر وزیر آغا۔تنقید اور جدید اردو تنقید۔کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۸۹ء۔ص ۱۵۸
(۴) ایضاً۔ص ۱۴۰
(۵) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ۔اشاراتِ تنقید۔لاہور:سنگ میل پلی کیشنز،۲۰۰۰ء۔ص ۱۴۹
(۶) کلیم الدین احمد۔اردو تنقید پر ایک نظر۔عشرت پبلشنگ ہاؤس،سنہ ندارد۔ص ۵۵
(۷) اشارات تنقید۔ص ۱۴۹
(۸) تنقید اور اصولِ تنقید۔ص ۱۲۵
(۹) محمد حسین آزاد۔''نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات''مشمولہ،نظم آزاد۔لاہور:شیخ مبارک علی،بار دہم، ۱۹۴۷ء۔ص ۱۰
(۱۰) ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔اردو میں تنقید۔لاہور:عشرت پبلشنگ ہاؤس،۱۹۶۷ء۔ص ۲۱
(۱۱) ''نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات''مشمولہ،نظم آزاد۔ص ۱۰-۱۱
(۱۲) ڈاکٹر عبادت بریلوی۔تنقید اور اصولِ تنقید۔لاہور:ادارہ ادب وتنقید،۱۹۸۴ء۔ص ۱۳۱
(۱۳) ''نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات''مشمولہ،نظم آزاد۔ص ۱۳
(۱۴) محمد حسین آزاد۔آبِ حیات۔ملتان:شعبۂ اردو،بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی،۲۰۰۶ء۔ص ۴۲
(۱۵) ''نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات''مشمولہ،نظم آزاد۔ص ۱۶
(۱۶) ایضاً ۔ ص ۱۶
(۱۷) ایضاً ۔ ص ۱۵
(۱۸) ایضاً ۔ ص ۱۷-۱۸
(۱۹) ایضاً ۔ ص ۱۷
(۲۰) ایضاً ۔ ص ۱۶
(۲۱) ایضاً ۔ ص ۱۱

حوالہ جات وحواشی

(۱) ڈاکٹر محمد اسلم فرخی۔محمد حسین آزاد۔جلد دوم۔کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۵ء، ص ۲۶۷
(۲) ڈاکٹر عبادت بریلوی۔تنقید اور اصولِ تنقید۔لاہور: ادارہ ادب وتنقید، ۱۹۸۴ء، ص ۱۲۳
(۳) ڈاکٹر وزیر آغا۔تنقید اور جدید اردو تنقید۔کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۹ء، ص ۱۵۸
(۴) ایضاً۔ص ۱۴۰
(۵) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ۔اشاراتِ تنقید۔لاہور: سنگِ میل پلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۹
(۶) کلیم الدین احمد۔اردو تنقید پر ایک نظر۔عشرت پبلشنگ ہاؤس، سن ندارد۔ص ۵۵
(۷) اشاراتِ تنقید۔ص ۱۴۹
(۸) تنقید اور اصولِ تنقید۔ص ۱۲۵
(۹) محمد حسین آزاد۔"نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات" مشمولہ، نظم آزاد۔لاہور: شیخ مبارک علی، بار دہم، ۱۹۴۷ء۔ص ۱۰
(۱۰) ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔اردو میں تنقید۔لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۷ء۔ص ۲۱
(۱۱) "نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات" مشمولہ، نظم آزاد۔ص ۱۰-۱۱
(۱۲) ڈاکٹر عبادت بریلوی۔تنقید اور اصولِ تنقید۔لاہور: ادارہ ادب وتنقید، ۱۹۸۴ء۔ص ۱۳۱
(۱۳) "نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات" مشمولہ، نظم آزاد۔ص ۱۳
(۱۴) محمد حسین آزاد۔آبِ حیات۔ملتان: شعبۂ اردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء۔ص ۴۲
(۱۵) "نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات" مشمولہ، نظم آزاد۔ص ۱۶
(۱۶) ایضاً ۔ ص ۱۶
(۱۷) ایضاً ۔ ص ۱۵
(۱۸) ایضاً ۔ ص ۱۷-۱۸
(۱۹) ایضاً ۔ ص ۱۷
(۲۰) ایضاً ۔ ص ۱۶
(۲۱) ایضاً ۔ ص ۱۱

(۲۲) علامہ شبلی نعمانی۔شعر العجم۔جلد چہارم۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،سنہ ندارد۔ص ۶-۷

(۲۳) دیکھیے: تسنیم رحمٰن۔تمثال کاری کی تحریک اور جدید اردو نظم۔غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اردو) مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور،۲۰۰۸ء

(۲۴) ''نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات'' مشمولہ،نظم آزاد۔ص ۱۳-۱۴

(۲۵) ڈاکٹر سجاد باقر رضوی۔مغرب کے تنقیدی اصول۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۴ء۔ص ۲۲۵-۲۲۷

(۲۶) ڈاکٹر عبادت بریلوی۔اردو تنقید کا ارتقا۔علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس،۲۰۰۲ء۔ص ۱۱۵

(۲۷) ''نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات'' مشمولہ،نظم آزاد۔ص ۱۴

(۲۸) ایضاً ۔ ص ۱۲-۱۳

(۲۹) ایضاً ۔ ص ۱۴

(۳۰) ایضاً ۔ ص ۱۸-۱۹

(۳۱) ایضاً ۔ ص ۱۸

(۳۲) رام بابو سکسینہ۔تاریخ ادب اردو (مترجمہ مرزا محمد عسکری) لاہور: بک ٹاک،۲۰۰۷ء۔ص ۴۴۴

(۳۳) ڈاکٹر سجاد باقر رضوی۔تہذیب و تخلیق۔لاہور: مکتبۂ ادب جدید،۱۹۶۶ء۔ص ۲۱۷

(۳۴) ڈاکٹر وزیر آغا۔تنقید اور جدید اردو تنقید۔کراچی: انجمن ترقی اردو،۱۹۸۹ء۔ص ۱۵۵

(۳۵) ''ایک لیکچر''۔مشمولہ،نظم آزاد۔ص ۲۳

(۳۶) ڈاکٹر وزیر آغا۔تنقید اور جدید اردو تنقید۔ ص ۱۵۳-۱۵۴

(۳۷) ''ایک لیکچر''۔مشمولہ،نظم آزاد۔ص ۲۴-۲۵

حالی اور شبلی کی محمد حسین آزاد سے اثر پذیری

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

۱۸۸۰ء میں محمد حسین آزاد کی معروف ترین کتاب آب حیات کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا، جو اردو ادب کی پہلی جدید طرز کی تاریخ ہے۔ اپنی اشاعت کے روز اول سے لے کر آج تک یہ کتاب زبانِ اردو کی تاریخ، واقعات، لطائف وظرائف، زبان واسلوب اور شعرائے اردو کے ماحول وشخصیت کے انمٹ مرقعات کے اعتبار سے انتہائی موثر کتاب ہے۔ اس پر بلا مبالغہ پچاسیوں تنقیدیں لکھی گئی ہیں مگر اس کی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود، ادبی تھیوری کے اعتبار سے اگر کوئی کتاب مقبولیت میں اس کے قریب ہے تو وہ مقدمہ شعر وشاعری ہے۔ آب حیات جدید ادبی تحقیق وتنقید کا نقش اول ہے اور آزاد کا ایسا کارنامہ ہے کہ صرف یہی ایک کتاب اردو ادب کی تاریخ میں اسے زندہ رکھنے کو کافی ہے۔ اس کے بعد لکھی جانے والی ادبی تحقیق وتنقید کی تمام کتب اس سے فیض یاب ہوتی رہی ہیں۔ حتیٰ کہ حالی اور شبلی کی تنقید پر بھی اس کے گہرے اثرات پڑے ہیں اور یہی اس مقالے کا موضوع ہے۔

ذیل میں ہم پہلے اردو زبان اور شاعری کے بارے میں آزاد کے خیالات پیش کریں گے اور پھر بالترتیب مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی کے شعری تصورات اور بعض اوقات لفظیات تک میں آزاد کے اثرات کا سراغ لگائیں گے۔

آب حیات میں آزاد کا عمومی نظریہ یہ ہے کہ شاعری گرد وپیش کی دنیا سے اپنے تعلق کے اعتبار سے نمو پذیر ہوتی ہے، ترقی کرتی ہے اور پھر عروج پاتی ہے یا مرجھا جاتی ہے۔ قدما جو سوجھ بوجھ میں سادہ، حقیقی زندگی کے قریب اور پیچیدہ خیالی سے دور ہوتے ہیں ایسی شاعری تخلیق کرتے ہیں جو دلوں کو کھینچ لیتی ہے اور متاخرین، تاوقتیکہ وہ نئے طریقے اختیار کر کے ادل بدل نہ کریں، حسن وعشق کے مضامین میں اگلوں کے چبائے ہوئے نوالے چباتے ہیں۔ زوال پذیر قومیں زوال آمادہ شاعری پیدا کرتی ہیں۔ جو شاعری جتنی زیادہ آرائش وزیبائش کی حامل ہوتی ہے اور خیالی رنگوں کے طوطے مینا اڑاتی ہے وہ اتنی ہی غیر حقیقی اور مصنوعی ہوتی ہے۔ ایسی شاعری کی قسمت میں مرجھا جانا ہوتا ہے۔

اردو شاعری کو اگر اس انجام سے بچنا ہے تو اسے انگریزی کے نقش قدم پہ چلنا ہوگا۔ اس باب میں آزاد کو سب سے زیادہ گلہ اردو کے تشبیہ و استعارہ اور مبالغہ کے پیچ در پیچ سلسلوں سے ہے، جو اس نے سنسکرت اور بھاشا کی سادگی کے بجائے فارسی سے لیے ہیں:

اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اگا مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا ہے۔ البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گزر چکا تھا اور ان کے معتقد باقی تھے۔ وہ استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے۔ اس واسطے گویا اردو بھاشا میں استعارہ و تشبیہ کا رنگ بھی آیا...(آب حیات، ص ۴۷)[1]

آزاد کے خیال میں فارسی اور اردو کے مقابلے میں بھاشا کا امتیاز اور اس کی برتری یہ ہے کہ

بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے اس کی کیفیت ہمیں ان خط و خال سے سمجھاتی ہے جو خاص اسی شے کے دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی مگر سننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا ہے، وہ سننے سے آجاتا ہے۔ برخلاف شعرائے فارس کے کہ یہ جس شے کا ذکر کرتے ہیں صاف اسی کی برائی بھلائی نہیں دکھا دیتے، بلکہ اس کے مشابہ ایک اور شے، جسے ہم نے اپنی جگہ اچھا یا برا سمجھا ہوا ہے، اس کے لوازمات کو شے اول پر لگا کر ان کا بیان کرتے ہیں۔ مثلاً پھول کہ نزاکت، رنگ اور خوشبو میں معشوق سے مشابہ ہے، جب گرمی کی شدت میں معشوق کے حسن کا انداز دکھانا ہو تو کہیں گے کہ مارے گرمی کے پھول کے رخساروں سے شبنم کا پسینہ ٹپکنے لگا۔ (آب حیات، ص ۴۷-۴۸)

یہیں سے پھر تشبیہ و استعارے کی پیچ داریوں کا گلہ شروع ہوتا ہے:

غرضکہ اب ہماری انشا پردازی ایک پرانی یادداشت ان تشبیہوں اور استعاروں کی ہے کہ صدہا سال سے ہمارے بزرگوں کی دستمال ہو کر ہم تک میراث پہنچی ہے۔ ہمارے متاخرین کو نئی آفرین لینے کی آرزو ہوئی تو بڑا کمال یہ ہے کہ کبھی صفت بعد صفت، کبھی استعارہ در استعارہ سے اسے اور تنگ و تاریک کیا۔ جس سے ہوا تو یہ ہوا کہ بہت غور کے بعد فقط ایک وہمی نزاکت اور فرضی لطافت پیدا ہوگئی۔ (آب حیات، ص ۵۱)

آزاد بتاتے ہیں کہ بھاشا استعارے کی طرف بھول کر نہیں جاتی جو کچھ آنکھوں سے دیکھتی، کانوں سے سنتی اور ناک سے سونگھتی ہے اسی کو اپنی میٹھی زبان سے بے مبالغہ کہہ دیتی ہے مگر افسوس کہ ہمارے بزرگوں نے:

ایک قدرتی پھول کو جو اپنی خوشبو سے مہکتا اور رنگ سے لہکتا تھا، مفت ہاتھ سے پھینک دیا۔ وہ کیا ہے؟ کلام کا اثر اور اظہار اصلیت۔ ہمارے نازک خیال اور باریک بین لوگ استعاروں اور تشبیہوں کی رنگینی اور مناسبت لفظی کے ذوق شوق میں خیال سے خیال پیدا کرنے لگے اور اصلی مطالب کے ادا کرنے میں بے پروا ہو گئے

۔انجام اس کا یہ ہوا کہ زبان کا ڈھنگ بدل گیا اور نوبت یہ ہوئی کہ اگر کوشش کریں تو فارسی کی طرح پنجرقعہ اور مینا بازار یا فسانہ عجائب لکھ سکتے ہیں لیکن ایک ملکی معاملہ یا تاریخی انقلاب اس طرح نہیں بیان کر سکتے۔ (آب حیات، ص۵۴)

بھاشا کے بعد وہ انگریزی کی متوجہ کر کے اس کی خوبیاں گنواتے ہیں جو ان کے خیال میں بھاشا کے زیادہ نزدیک ہیں: ''انگریزی تحریر کے عام اصول یہ ہیں کہ جس شے کا حال یا دل کا خیال لکھیے، تو اسے اس طرح ادا کیجیے کہ خود وہ حالت گزرنے سے یا اس کا مشاہدہ کرنے سے جو خوشی یا غم یا غصہ یا رحم یا خوف یا جوش دل پر طاری ہوتا ہے، یہ بیان وہی عالم اور وہی سماں دل پر چھا دیوے۔'' (آب حیات، ص۵۴) مگر اس کے برعکس ہمارے طرز بیان میں خرابی اور اس کی نااہلی یہ ہے کہ اس میں:

دلی اثر یا اظہار واقعیت ڈھونڈو تو ذرا نہیں۔ چند مضمون ہیں کہ ہماری زبانوں پر بہت رواں ہیں مگر حقیقت میں ہم ان میں بھی ناکام ہیں۔.... انگریزی میں بہت خیالات اور مضامین ایسے ہیں کہ ہماری زبان نہیں ادا کر سکتی۔یعنی جو لطف ان کا انگریزی زبان میں ہے وہ اردو میں پورا ادا نہیں ہو سکتا، جو کہ حقیقت میں زبان کی ناطاقتی کا نتیجہ ہے اور یہ اہل زبان کے لئے نہایت شرم کا مقام ہے۔ (آب حیات، ص۵۶-۵۵)

آزاد اردو کی اس کمزوری اور نااہلی کا سبب اہل مشرق، یہاں کی ناشائستہ اقوام اور ان کے عام تعلیمی و ملکی حالات کو قرار دیتے ہیں۔ یہ بات ان پر یورپ کے ملکوں اور وہاں کی مہذب اقوام کی ذاتی و علمی لیاقتوں کو دیکھ کر عیاں ہوئی تھی۔ (آب حیات، ص۵۶) اس لیے وہ یورپی ملکوں کے سیاسی سماجی حالات، عامۃ الناس کی ان میں شراکت اور ان کے زورِ تحریر و تقریر اور استدلال کی قوت کا ہندوستان سے موازنہ کرتے ہیں، اور بھاشا اور انگریزی کے مقابلے میں اردو کی اس ''ناطاقتی و قابلِ شرم'' مقام کے بیان کے بعد 'نظمِ اردو کی تاریخ' کے باب میں اپنے پڑھنے والوں کو اردو شاعری کے مضامین و مطالب کی اس ''قابلِ افسوس'' صورتِ حال کا احساس دلاتے ہیں۔ (آب حیات، ص۷۱)

سوال ہے کہ اردو شاعری نیم جاں مردہ کیوں ہو گئی تھی؟ اس کا سبب آزاد کے نزدیک حسن و عشق کے مضمون اور تشبیہ و استعارے کے ذخیرے ہیں:

اردو والوں نے بھی آسان کام سمجھ کر اور عوام پسندی کو فرض ٹھہرا کر حسن و عشق وغیرہ کے مضامین کو لیا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ کیا بہت خوب کیا، لیکن وہ مضمون اس قدر مستعمل ہو گئے کہ سنتے سنتے کان تھک گئے ہیں... گویا کھائے ہوئے بلکہ اوروں کے چبائے ہوئے نوالے ہیں، انھی کو چباتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں... لیکن تابہ کے؟ حور ہو یا پری گلے کا ہار ہو جائے تو اجیرن ہو جاتی ہے۔ حسن و عشق سے کہاں تک جی نہ

گھبرائے اور اب تو وہ بھی سو برس کی بڑھیا ہوگئی۔ ...ان خیالات کے ادا کرنے کے لیے ہمارے بزرگ الفاظ ومعنی اور استعاروں اور تشبیہوں کے ذخیرے تیار کر گئے ہیں اور وہ اس قدر رواں ہوگئے ہیں کہ ہر شخص تھوڑے فکر سے کچھ نہ کچھ کر لیتا ہے۔...لیکن کم بخت حسن وعشق کے مضمون، اس کے خط وخال اور بہار وگلزار کے الفاظ ان کی زبان ودہان میں رچے ہوئے ہیں۔ (آب حیات، ص۷۳)

ان خرابیوں کے پیش نظر

اردو نظم مضامین عاشقانہ ہی کہہ سکتی ہے۔ اسے ہر ایک مضمون کے ادا کرنے کی طاقت اور لیاقت بالکل نہیں اور یہ ایک بڑا داغ ہے جو ہماری قومی زبان کے دامن پر لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اسے کون دھوئے اور کیوں کر دھوئے۔ ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے جو کشورِ علم میں مشرقی اور مغربی دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض ہوگئے ہیں۔ ان کی ہمت آبیاری کرے گی۔ دونوں کناروں سے پانی لائے گی اور اس داغ کو دھوئے گی بلکہ قوم کے دامن کو موتیوں سے بھر دے گی۔

(آب حیات، ص۷۴)

اردو شاعری کے تشخیص مرض اور تجویز علاج کے ان ابتدائی کلمات کے بعد آب حیات کا پہلا دور شروع ہوتا ہے۔ آزاد بتاتے ہیں کہ اردو شاعری کی ابتدا کرنے والے بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں؛ ان کی آنکھیں جو کچھ دیکھتی اور دل جو کچھ محسوس کرتے ہیں وہی ان کی زبان پر آتا ہے۔ ''اینچ پینچ کے خیال، دور دور کی تشبیہیں نازک استعارے نہیں بولتے''۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ''شاعری جب تک عالم طفولیت میں ہوتی ہے، تب تک بے تکلف، عام فہم اور اکثر حسب حال ہوتی ہے۔'' اور اسی لیے قدیم محاورات، سبک اور مبتذل مضامین کے باوجود ان کے کلام کی سادگی و بے تکلفی دل کو بھلی لگتی ہے۔ (آب حیات، ص۷۶) مگر اس سے پہلے وہ ایہام اور ذو معنی الفاظ (جو بے تکلفی اور سادگی کے بجائے پیچیدگی اور مضمون پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ لہٰذا آزاد کو ناپسند ہیں) کے استعمال پر پہلے دور کے سرخیل ولی دکنی کے ہم عصروں کا شکوہ بھی کرتے ہیں کہ ولی نے تو ''اپنے کلام میں ایہام اور الفاظِ ذو معنین سے اتنا کام نہیں لیا، خدا جانے ان کے قریب العہد بزرگوں کو پھر اس قدر شوق اس کا کیونکر ہوا شاید دوسروں کا انداز جو ہندوستان کی زبان کا سبزہ خودرو تھا، اس نے اپنا رنگ دیا'' ہو۔ (آب حیات، ص،۷۵) یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایہام اور ذو معنی الفاظ کو اگر پہلے دور کے بزرگوں میں بھی مستعمل مانا جا رہا ہے تو پھر وہ سادگی و بے تکلفی کیا ہوئی جو آزاد کے نزدیک پہلے دور کا خاصہ ہے؟ اس سے قبل سنسکرت اور برج بھاشا میں بھی، جو ان کے خیال میں سادگی اور تاثیر میں فارسی اور اردو سے بڑھی ہوئی تھی، آزاد ایہام اور ذو معنی الفاظ کو بھاشا کی امتیازی خصوصیت بتا چکے ہیں! (آب حیات، ص،۷۰)

پہلے ہی دور میں اُنھوں نے ولی دکنی کے باب میں شعر کی افادیت اور مقصدیت کی طرف بھی اشارے کیے ہیں:

اگر چہ اس اعتبار سے نہایت خوشی کا موقع ہے کہ عمدہ جوہر انسانیت پسندیدہ لباس پہن کر ہماری زبان میں آیا مگر اس کوتاہی کا افسوس ہے کہ کوئی ملکی فائدہ اس سے نہ ہوا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی علمی یا آئینی رستے سے نہیں آیا بلکہ فقیرانہ شوق یا تفریح کی ہوا سے اڑ کر آ گیا تھا۔ کاش شاہنامہ کے ڈھنگ سے آتا کہ محمد شاہی عیاشی اور عیش پرستی کا خون بہاتا اور اہل ملک کو پھر تیموری اور بابری میدانوں میں لا ڈالتا یا تہذیب و شائستگی سے اکبری عہد کو پھر زندہ کر دیتا۔ (آب حیات، ص ۸۱)

اس کے بعد دوسرے دور کا آغاز کرتے ہوئے آزاد بتاتے ہیں کہ اس دور کے اہل کمال ''جو کچھ دل میں ہوتا ہے جوں کا توں بیان کر دیتے ہیں، خیالی رنگوں کے طوطے مینا نہیں بناتے''۔ بے تکلف بولی اور سیدھی سادھی باتوں سے جو کچھ دل میں آتا ہے'' بے ساختہ کہہ دیں گے کہ سامنے تصویر کھڑی کر دیں گے'' اور سننے والے'' کلیجے پکڑ کر رہ جائیں گے۔ اس کا سبب کیا؟ وہی بے ساختہ پن، جس کے سادہ پن پر ہزار بانکپن قربان ہوتے ہیں''۔ (آب حیات، ص ۹۸) خاتمے پر اس دور والوں (شاہ حاتم، سعادت یار رنگین، اشرف علی خان فغاں وغیرہ) کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ان کے ہاں'' نہ استعاروں کے پیچ نہ تشبیہوں کی رنگا رنگی'' ہے۔ زبان اور خیالات ایسے سیدھے اور صاف کہ'' آج تک جو سنتا ہے سر دھنتا ہے، ان کا کلام قال نہ تھا حال تھا۔ یہی سبب ہے کہ جس شعر کو دیکھو تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسی کو آج اہل فرنگ ڈھونڈتے ہیں'' کہ'' ہر شے کی اصلی حالت دکھانی چاہیے مگر حالت کون دکھائے کہ اپنی حالت بگڑی ہوئی ہے''۔ (آب حیات، ص ۱۱۳)

آزاد لکھتے ہیں کہ تیسرے دور میں'' ان صاحب کمالوں کی آمد آمد ہے جن کے پا انداز میں فصاحت آنکھیں بچھاتی ہے اور بلاغت قدموں میں لوٹی جاتی ہے،'' مگر جلد ہی فصاحت و بلاغت کو ان سے مایوسی ہونے لگتی ہے، کیونکہ سادگی و بے تکلفی کا'' نولکھا ہار سابقہ دور کے بزرگوں کے گلے میں'' پڑ چکا تھا۔ ان صاحب کمالوں نے جب'' اپنے بزرگوں کے چمن بندی کی سیر کی'' تو'' فصاحت کے پھول'' کو'' قدرتی بہار میں حسن خداداد کا جوبن'' دکھاتے ہوئے پایا۔'' انھیں بھی ناموری کا تمغہ لینا تھا، اس لیے بڑوں سے بڑھ کر قدم مارنے چاہے'' مگر گرد و پیش کی زمینوں میں عمارتیں کھڑی ہو چکی تھیں، جگہ کی سخت قلت واقع ہو چکی تھی۔ انھوں نے'' جب سامنے کچھ نہ پایا تو ناچار اپنی عمارتوں کو اونچا اٹھایا''، مگر اگلوں کے سے بلندی کے مضمون جب ہاتھ نہ آئے تو'' اپنی صنعتوں میں کچھ کچھ تکلف'' کر کے وہ ناچار اپنی عمارتوں کو اونچا اٹھانے لگے۔ اس پر انھوں نے قدر دانوں سے داد ہی نہ پائی بلکہ پرستش کروائی۔ یاد رہے کہ طبقہ سوم کے ناموروں میں مرزا جانِ جاناں مظہر، سودا، میر درد، اور میر تقی میر جیسے استادانِ فن شامل ہیں، مگر آزاد کو اس''

بات کا افسوس ہے کہ (ان لوگوں نے) اس ترقی میں طبیعت کی بلند پردازی سے اوپر کی طرف رخ کیا۔ کاش آگے قدم بڑھاتے تاکہ حسن وعشق کے محدود صحن سے نکل کر جاتے اور میدانوں میں گھوڑے دوڑاتے کہ نہ ان کی وسعت کی انتہا ہے نہ عجائب ولطائف کا شمار ہے۔'' (آب حیات، ص ۱۵-۱۱۴)

چوتھے اور پانچویں دور کے شعرا کے بارے میں بھی آزاد کی رائے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے یا تو تمسخر اور پھکڑ پن سے کام لیا یا خیال بندی اور نازک خیالی کو استعمال میں لائے۔

وہ لکھتے ہیں کہ ان بزرگوں کی نازک خیالی میں کچھ کلام نہیں۔ لیکن انھوں نے اگلوں ہی کے مضامین میں اپنے گل بوٹے ٹانکے، مگر کچھ اضافہ نہ کر پائے؛ چونکہ پہلے بزرگ گردوپیش کے باغوں کا پتا پتا کام میں لا چکے تھے۔ اب نئے پھول کہاں سے آتے؟ لہٰذا خیال بندی اور نازک خیالی والوں نے ''لاچار اسی طرح اپنی استادی کا ڈنکا بجایا اور ہمعصروں میں تاج افتخار پایا''۔ آزاد کے خیال میں یہ ''آخری دور کی مصیبت'' دنیا کی ہر زبان کے کے ساتھ ہے:

> انگریزی اگرچہ میں نہیں جانتا مگر اتنا جانتا ہوں کہ اس کے متاخرین بھی اس دور سے نالاں ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ زبان جب تک عالم طفولیت میں رہتی ہے، تبھی تک شیر وشربت کے پیالے لنڈھاتی ہے۔ جب پختہ سال ہوتی ہے تو خوشبو عرق اس میں ملاتی ہے؛ تکلف کے عطر ڈھونڈ کر لاتی ہے۔ پھر سادگی اور شیریں ادائی تو خاک میں مل جاتی ہے۔ ہاں دواؤں کے پیالے ہوتے ہیں۔ جس کا جی چاہے پیا کرے۔
>
> (آب حیات، ص ۳۰۱)

جیسا کہ ان بیانات سے ظاہر ہے آزاد سب سے پہلے تو اردو کے مقابلے میں بھاشا کی سادگی اور دل میں اتر جانے کی بات کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں فارسی کے زیر اثر اردو کی پیچیدگی کا بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں قدرتی بہاؤ، تاثیر اور اظہار واقعیت کی شدید کمی ہے۔ بھاشا کی وہی خوبیاں، جس سے اردو محروم ہے، اگلے اقتباسات میں آزاد نے کم وبیش انگریزی کے ساتھ منسوب کی ہیں: جو کیفیت رحال دل پر گزرے اسے ادا کرنا، جس سے وہی کیفیات (جوش رخوف) دل پر طاری ہو جائیں وغیرہ وغیرہ۔ یہاں بقول شمس الرحمٰن فاروقی آزاد کے پیش نظر تبدیلی کا یہ ایجنڈا ہے:

اول: جدیدیت رمغربیت کے واضح مطالبات کی خاموش ہم کاری؛ ''انگریزی تحریر کے عام اصول'' اور ''شائستہ قوموں کی انشا'' میں وہی خوبیاں تلاشنا جو بھاشا میں تو ہیں مگر اردو جن سے خالی ہے۔

دوم: اردو کی پیچیدگی، استعارہ در استعارہ اور وہمی وفرضی لطافت سے بوجھل اسلوب کی جگہ سادگی، تاثیر، واقعیت اور جوش بھرے انشا کا فروغ۔ (۲)

تبدیلی یا ترقی کے نام پر آزاد اکثر وبیشتر صرف لسانی تغیرات کے نمونے دیتے ہیں اور لسانی تغیر میں بھی

ان کے نزدیک ناپسندیدگی کا امر یہ ہے کہ قدما کے ہاں الفاظ کا ایسا برتاؤ ہے جو بعد کے دور میں مروج نہیں رہا، جو متروکات میں داخل ہو چکا ہے۔ ان امور میں آزاد کا تصور یہ ہے کہ پرانے اور قدیم طرز کے متروک الفاظ سے بری شاعری پیدا ہوتی ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انشاء و شاعری میں اگر ملکی و معاصر مسائل زیر بحث آئیں اور تہذیب و شائستگی کو زندہ کریں، بالفاظ دیگر اگر اس کی کوئی افادیت ہو، تب ہی زبان متروک ہونے سے بچ سکتی ہے۔ ورنہ متروکیت اس کا بھی مقدر بنے گی۔

آب حیات کا اگلا اہم اصول یہ ہے کہ زبان جب تک اپنے عالم طفولیت میں رہتی ہے، شیر و شکر کے پیالے لنڈھاتی ہے اور جوں جوں آگے بڑھتی ہے اس میں لکھے گئے ادب و شاعری اصلیت، سادگی، شیرینی، تاثیر اور جوش سے خالی ہو کر خاک میں مل جاتے ہیں، کیوں کہ اس میں تشبیہ و استعارے اور مبالغے کی لائی ہوئی پیچیدگی در آتی ہے اور شاعری مردہ ہونے لگتی ہے۔

اردو شاعری کے زوال کے بارے میں اس رائے کو آزاد کی اپنی رائے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ آزاد کے انگریز آقاؤں کا بھی ہماری تہذیب اور ادب کے بارے میں یہی خیال تھا۔ ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے مشاعروں کے آغاز پر کرنل ہالرائیڈ کی تقریر کے یہ جملے ملاحظہ ہوں:

یہ جلسہ اس لیے منعقد کیا گیا ہے کہ نظم اردو جو چند عوارض کے باعث تنزل اور بدحالی میں پڑی ہوئی ہے اس کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے جائیں، اس واسطے جملہ رؤسا اور اہل علم لوگوں سے جو شعر و سخن اور تصانیف سے لطف اٹھاتے ہیں، درخواست کی جاتی ہے جہاں تک ہو سکے اس طرف توجہ کریں۔ (۳)

اس امر سے قطع نظر کہ آقا (اور وہ بھی ۱۸۷۵ء کا فاتح انگریز، جس کی فتوحات کے اثر سے ہم آج بھی نہیں نکل سکے) کی درخواست میں التجا کتنی ہوتی ہے اور حکم کتنا، اور پبلک انسٹرکشن ڈیپارٹمنٹ کے ایک ملازم کے لیے جو اپنے ذہن پر سوار ماضی کے کابوس سے ہر قیمت پر چھٹکارہ چاہتا تھا، آقا کی درخواست رحکم سے سرتابی کس حد تک ممکن تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ آزاد کرنل ہالرائیڈ کے زیر اثر آنے کے بعد پہلے والے آزاد نہ رہے تھے اور اس بات کے پوری طرح قائل ہو چکے تھے کہ ہندوستان کی پرانی عاشقانہ شاعری ختم ہو چکی ہے، یا اسے ختم ہو جانا چاہیے!!!

خاتمہ کتاب میں آزاد نہایت دکھے دل کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ: ''ہندوستان کی پرانی ہمدم یعنی عاشقانہ شاعری ہو چکی، اور اس کی ترقی کا چشمہ بند ہوا''۔ ان جلسوں کے صدر نشینوں سے خطاب کر کے کہتے ہیں کہ تمھاری تصنیفیں، تالیفیں، حکائتیں اور روائتیں جب تک موجود ہیں تم آپ موجود ہو اور تمھارے فخر کی دستاروں کے پھول بھی موجود ہیں، ان تک کبھی خزاں کا ہاتھ نہ پہنچے گا: ''مگر اے با اقبالی گداؤ... تمھاری نیک نیتی اچھے وقت تمھیں لائی، مگر افسوس کہ تمھاری شاعری نے بہت کم عمر پائی''۔ کیونکہ جیسا جوہر تم نے پایا اب نہ وہ جوہر باقی ہے اور نہ اس کے

قدر دان۔ لہٰذا اب اس شاخ کو کوئی ہرا نہ رکھ سکے گا۔ "ہاں تمھاری لکیروں کے فقیر تمھارے ہی ہجر و وصل اور خط و خال کے مضمون لیں گے اور انھی لفظوں کو الٹیں پلٹیں گے اور تمھارے چبائے ہوئے نوالوں کو منہ میں پھراتے رہیں گے۔"

(آب حیات، ۸۶۔۴۸۵)

یہاں تک تو یوں لگتا ہے کہ آزاد واقعی اگلے صاحب کمالوں کے کمالات کے معترف ہیں اور ان کی گوہر تراشیوں کی داد دے رہے ہیں اور آخر میں انھیں سلامیاں بھی پیش کر رہے ہیں؛ مگر ان کا لہجہ اور چشم و ابرو کے اشارے کسی اور آرزو کی غمازی کر رہے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں کہ آزاد کی حالت ایک ایسے امیر زادے وارث کی ہے جو اپنے باپ کی محبت بھی دل میں رکھتا ہے مگر اس کے مرجانے کا بھی بڑی بے صبری سے خواہاں ہے۔ (۴)

آزاد نہ صرف "چبائے ہوئے نوالے چبانے والے" ناخلف ورثا کے شاکی ہیں بلکہ ایسی میراث چھوڑنے والے اسلاف سے بھی زیادہ خوش نہیں۔ لہٰذا وہ اسے حسن و عشق کے چکر سے نکال کر اس سے کچھ "مفید کام" لینے کا منصوبہ اپنے ذہن میں رکھتے ہیں، کیونکہ چچوڑی ہوئی ہڈیاں چوسنے والوں سے تو یہ ممکن نہ تھا۔ خاتمہ کتاب کے آخری پیروں میں ان کے تیور کچھ یوں ہیں: "اردو شاعری نے اگرچہ بہت شان دار محل تعمیر کیے مگر اس کی زیادہ تر عمارتوں میں حسن و عشق کا مسالہ لگا ہوا ہے، آئندہ نسلیں اس سے بہت کچھ حاصل کریں گی؛ مگر وہاں جو پتھر محض گلکاری اور خوش نمائی کے لیے لگائے گئے تھے انھیں ہم نکال کر "شکریہ کے ساتھ آنکھوں سے لگائیں گے"، مگر ان سے "کسی ایسی محراب کو زینت دیں گے جو اپنی مضبوطی سے ملکی ایوان کو استحکام دے۔" اس شاعری میں لفظوں کی تراش خراش، پسندیدہ ترکیبیں استعارے اور تشبیہیں "اگرچہ عاشقانہ مضامین میں ہیں، پھر بھی ہم (انھیں) سلیقہ اور امتیاز سے کام میں لائیں گے تو علوم و فنون اور تاریخ وغیرہ عام مطالب میں ہمارے ادائے مقاصد اور انداز بیان کے لیے عمدہ معاون اور کارآمد ہوں گے۔" (آب حیات، ص ۴۸۷)

یہاں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ آب حیات میں ادوار کی اس تقسیم سے آزاد کا مقصود "اردو زبان کی عہد بہ عہد ترقی اور اصلاحوں کا حال" دکھانا تھا مگر بالآخر ثابت یہ کیا کہ وہ زبان اور شاعری جو اپنے ابتدائی عرصے میں سادگی، واقعیت، تاثیر اور جوش وغیرہ میں بے مثال تھی آخر آخر تشبیہ و استعارہ، مبالغہ اور مجرد خیالات و فرضی لطافت سے آلودہ ہو کر شیر و شربت کے شیریں جاموں کے بجائے دواؤں کے پیالوں میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔...تو یہ ہے زبان اردو کا آب حیات!!!! ان تمام تضادات کے باوجود بقول احسن فاروقی: "مگر لطف یہ ہے کہ یہ ادوار اس قدر زیادہ مقبول ہوئے کہ جو بھی اردو شاعری کی تاریخ لکھتا ہے ان ہی کو اٹل مان کر لکھتا ہے"۔ (۵)

☆

آزاد کے ان خیالات کے بعد ہم مقدمہ شعر و شاعری میں بیان کردہ الطاف حسین حالی کے شعری تصورات کا ایک جائزہ پیش کرتے ہیں۔ حالی کا مقدمہ شعر و شاعری، جس کے سرورق پر ''جس رخ زمانہ پھرے اوسی رخ پھر جاؤ'' کا جملہ ان کے ذہنی رجحانات کی پوری عکاسی کر رہا تھا، پہلی مرتبہ ۱۸۹۳ء میں چھپا، لیکن وہ اس پر کام ۱۸۸۲ء سے کر رہے تھے۔ یاد رہے کہ آب حیات کا پہلا اڈیشن ۱۸۸۰ء میں آیا تھا اور ۱۸۸۱ء میں حالی نے اس پر ایک خیر مقدمی ریویو لکھا تھا، جس سے اندازہ ہوتا ہے حالی اس سے شدید متاثر ہوئے تھے۔

بہت سی ضمنی باتوں کو چھوڑ کر مقدمے کے بارے میں بنیادی بات یہ ہے کہ اس میں حالی، وقت کے ساتھ شاعری کو تبدیل کرنا اور اسے معاشرے کی اصلاح کا کام لینا چاہتے ہیں۔ وہ آزاد کی اس رائے سے پوری طرح متفق ہیں کہ شاعری کا آغاز سادگی سے ہوتا ہے، پھر اس میں مصنوعی پن آتا ہے اور آخر میں یہ زوال پذیر یا مردہ ہو جاتی ہے۔ زوال سے بچنے کے لیے معاشرے کے ساتھ اس کا تبدیل ہونا ضروری ہے۔ وہ اس طرح ممکن ہے کہ یہ معاشرے کے لیے ''مفید'' بنتی رہے۔

حالی شاعری کے آغاز، عروج اور زوال کے بارے میں آزاد کے خیالات کے پوری طرح ہمنوا ہیں۔ فرق صرف اس امر میں ہے کہ آزاد نے جہاں صرف ڈیڑھ سو سال کے عرصے پر محیط پانچ ادوار کو اپنا موضوع بنا کر اردو شاعری کے آغاز و انجام، ترقی و انحطاط کا تاریخی سفر بیان کیا ہے، وہاں حالی نے مسلمانوں کی شاعری کے عروج و زوال کے زمانی سفر کا آغاز عربی شاعری سے کیا ہے۔ حالی اپنی بات کا آغاز شاعری کی بالذات قدر کے بجائے اس کی معاشرتی جواز جوئی سے کرتے ہیں:

شعر کی ''تاثیر'' اور ''جادو''، یعنی شعر کی افادیت جو حالی کے نزدیک اس کی بالذات خوبی سے نہیں بلکہ بالغیر قدر--- معاشرہ، قوم، اخلاق--- سے متعین ہوتی ہے، کے ڈانڈے بھی حالی کے دیگر بہت سے اصولوں کی طرح آزاد ہی سے جا ملتے ہیں، گو وہاں یہ بہت ہلکے سروں میں ہیں۔ حالی یورپ کے ایک مورخ کے حوالے سے بتاتے ہیں عربوں اور مسلمانوں میں شاعروں کی تعداد تمام جہان کی قوموں سے زیادہ ہے۔ (مقدمہ، ص ۱۱۵)(۶) اس کثرت کے اسباب دو ہیں: ایک مدح و ستائش پر ممدوح کی طرف سے صلہ و انعام کی لالچ اور دوسرے سامعین کی طرف سے جا و بے جا تحسین و آفرین کی خواہش۔ ''صدر اسلام کی شاعری میں ... تمام سچے جوش اور ولولے موجود تھے... پارسا بیویاں شوہروں کے اور شوہر بیویوں کے فراق میں درد انگیز شعر انشا کرتے تھے۔ چراگاہوں، چشموں اور وادیوں کی، گذشتہ صحبتوں اور جمگھٹوں کی ہو بہو تصویر کھینچتے تھے۔'' (مقدمہ، ص ۱۱۹) اس لیے عربوں کی شاعری میں بے انتہا جوش پایا جاتا تھا کیونکہ اس کا ''مدار واقعات اور دل کے سچے حالات و واردات پر تھا۔'' (مقدمہ، ص ۱۶۱)

لیکن رفتہ رفتہ درباروں سے تعلق کی وجہ سے نیچرل جذبات کا خاتمہ ہو گیا۔ اب شعرا کے پاس صرف دو

میدان رہ گئے تھے: مدحیہ مضامین، جن سے ممدوحین کو خوش کیا جائے اور عشقیہ مضامین جن سے جذبات کو اشتعالک ہوتی تھی۔ پھر ایک مدت کے بعد ان دونوں مضامین میں بھی جب ''چچوڑی ہوئی ہڈیوں'' کی طرح کچھ مزہ باقی نہ رہ گیا (مقدمہ، ص ۱۲۰) تو تشبیہ واستعارے اور جھوٹ ومبالغہ پر تکیہ ہوگیا۔ حالی فارسی شاعری میں بھی زوال کا یہی سلسلہ دیکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہاں جن لوگوں نے شروع میں غزل لکھی ہوگی انھوں نے عشق ومحبت کے جذبات سادہ و نیچرل انداز میں بیان کیے ہوں گے۔ بعد کے لوگوں نے انھی باتوں کو مجاز اور استعارے کے رنگ میں بیان کیا مگر متاخرین کو ان استعاروں سے بہتر اور کوئی استعارہ ہاتھ نہ آیا تو وہ ان کے مجازی معنی کے بجائے ان سے حقیقی شمشیر و سناں مراد لینے لگے اور جو خواص ایک اصلی تلوار میں ہو سکتے تھے، انھیں محبوب کے غمزوں اور نظروں میں ثابت کرنے لگے۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں ''متاخرین نے ہر مضمون کو جو قدما نیچرل طور پر باندہ گئے تھے۔ نیچر کی سرحد سے ایک دوسرے عالم میں پہنچادیا''۔ (مقدمہ، ص ۱۹۱) شاعری کے آغاز وانجام کے بارے میں سابقہ سطور میں آمدہ آزاد کے بیانات پیش نظر رہیں تو نظر آتا ہے کہ حالی کے نزدیک بھی شاعری کا آغاز سادگی سے ہوتا ہے اور تصنع وبناوٹ پر ختم ہوتا ہے۔ (۷)

آزاد اور حالی کی نظر میں شاعری کی تاریخ ادوار کا ایک سلسلہ ہے جس میں شاعری نیچرل انداز میں شروع ہوتی ہے، وقت کے ساتھ ساتھ اس کا ''نیچرل پن'' داغ دار ہوتا جاتا ہے اور پھر زوال یا موت اسکا مقدر ہوتا ہے۔

اردو شاعری کی ترقی کا منصوبہ دیتے ہوئے حالی لکھتے ہیں کہ جن ذریعوں سے ایشیا کی شاعری ترقی پاتی تھی ''وہ اردو کی شاعری کے لیے فی زمانہ مفقود ہیں'' اور آئندہ ان کے مہیا ہونے کا امکان بھی نہیں، لہٰذا ''اردو شاعری کی ترقی کا خیال پکانا گویا زمانہ ناسازگار سے مقابلہ کرنا ہے''، خصوصاً ایسے میں جبکہ ''اردو شاعری سے نہایت اعلیٰ اور اشرف زبانوں کی شاعری بھی معرض زوال میں ہو، سائنس اس کی جڑیں کاٹ رہا ہو اور سویلیزیشن اس کا طلسم توڑ رہی ہو''۔ اسی لیے ترقی واصلاح کے اس منصوبے کے باوجود انھیں شاعری کے نیم مردہ جسم میں جان پڑ جانے کا کوئی یقین نہیں۔ بس 'مذبوح اور مدقوق کے دم واپسیں' کی امید کا معاملہ ہے: ''جو کچھ ہم لکھنا چاہتے ہیں اس سے یہ جتانا مقصود نہیں ہے کہ کچھ ہوگا بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ کاش ایسا ہوتا!'' (مقدمہ، ص ۱۲۹)

اردو شاعری کے مستقبل سے مایوسی کی یہ لہر، جیسا کہ سابقہ صفحات سے ظاہر ہے آب حیات کے آخر میں بھی نظر آتی ہے، مگر اتنی شدید نہیں۔ حالی تو اردو زبان کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر پاتے ہیں۔ آب حیات پر اپنے تبصرے (۱۸۸۱ء) میں انھوں نے لکھا تھا: ''معلوم ہوتا ہے اردو شاعری کی رفتار سرے ہی سے ایسی بے اصولی تھی کہ وہ جس قدر آگے بڑھتی تھی اسی قدر منزل مقصود سے دور ہوتی جاتی تھی... اردو شاعری کا آغاز اور سلطنت مغلیہ کا زوال ایک ہی وقت میں ہوتا ہے'' کہ اس کا بیج ایک بانجھ زمین میں بویا گیا تھا۔ ''شاعری کی اصل ترقی کا مدار ملک کی

عام شائستگی اور تعلیم پر ہے۔ کیونکہ شعرا کو جس قدر شائستہ اور نکتہ فہم مخاطب میسر آتے ہیں اسی قدر ان کے خیالات بھی شائستہ اور معقول ہوتے جاتے ہیں''۔ اسی بنا پر زمانے کو''گریٹ ریفارمر'' کہا گیا ہے۔''دوسری چیز جو شاعری کو شگفتہ اور بارور کرتی ہے وہ قومی سلطنت ہے۔ جس ملک میں یہ دونوں صورتیں نہیں ہوتیں تو شاعری کی اصل ترقی ناممکن ہے مگر شخصی سلطنت سے بھی اس کو بہت کچھ مدد پہنچتی ہے... چنانچہ اکبری دور کی شاعری اس کی مصداق ہے مگر افسوس کہ اردو شاعری نے اس وقت جنم لیا جبکہ اس کا کوئی مربی اور سرپرست نظر نہ آتا تھا''۔ (۸) ہم یہاں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس پس منظر میں حالی کا یہ کہنا''زمانہ باآواز بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہوگی یا عمارت خود نہ ہوگی''، اردو شاعری کے مستقبل سے ان کی کلی مایوسی کے اعلان کے سوا اور کچھ نہیں۔ (مقدمہ، ص ۲۰۸) آب حیات پر حالی کے تبصرے سے ظاہر ہے کہ وہ بھی آزاد کی طرح اردو شاعری کی''بے اصولی رفتار'' کو ہندوستان کے سیاسی و سماجی احوال سے وابستہ سمجھتے ہیں۔

حالی کے نظام شعریات میں اچھے شاعر کی تین شرائط: تخیل، مطالعۂ فطرت اور تفحص الفاظ اور اچھی شاعری کی تین خصوصیات: سادگی، اصلیت اور جوش الگ الگ نہیں بلکہ ایک ہی فارمولے کا حصہ ہیں اور ان خصائص کی حامل شاعری نیچرل ہوتی ہے اور وہ ماضی و حال کی شاعری کو اسی پیمانے پر پرکھتے ہیں۔ نیچرل شاعری کا تصور حالی کا ایجاد کردہ تو نہیں مگر وہ اس کے سب سے اہم اور بڑے وکیل ضرور ہیں۔ شاعری کے آغاز، ترقی و زوال کے بارے میں حالی نے قدما، دور وسطی اور متاخرین کے تین ادوار گنائے ہیں جن میں نیچرل شاعری بتدریج ان نیچرل ہوتی جاتی ہے۔

شاعری سے نیچر کے مطالعے کا تقاضا اور اردو شاعری کے اس سے محرومی کا احساس سب سے پہلے سرسید احمد خان کو ہوا تھا اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انگریزوں کے توجہ دلانے پر ہوا تھا۔ کرنل ہالرائڈ کو اردو شاعری میں جو کمزوریاں نظر آئیں تھیں وہ بعد میں آزاد اور حالی کے بھی ورد زبان ہوتی چلی گئیں۔ ہالرائیڈ کے بعد آزاد نے اردو شاعری کی اس محرومی کا ذکر شروع کر دیا تھا۔ آزاد کے ہاں''نیچر'' کا لفظ خواہ کم استعمال ہوا ہو مگر اصلیت و واقعیت کی کمی کا وہ بھی ذکر کرتے ہیں۔ کیا یہ محض اتفاق ہے؟

سرسید، آزاد اور حالی کی طرح اگرچہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء) بھی انیسویں صدی کے مخصوص حالات کی پیداوار تھے، مگر ان حالات نے ان کی شخصیت کو ان کی طرح متاثر نہیں کیا جس طرح آزاد اور حالی وغیرہ کو کیا تھا۔ وہ سرسید اور علی گڑھ تحریک سے پوری طرح متفق نہ تھے، بلکہ بڑی حد تک ان کا فکری کام سرسید کی متجددانہ کاوشوں کے آگے بند باندھنے کے انداز کا ہے مگر وہ خود اس متجددانہ لہر سے بالکل غیر متاثر بھی نہ رہے تھے۔ سرسید اور علی گڑھ نے ان پر اثرات ضرور ڈالے تھے۔ بقول آل احمد سرور''شبلی مغرب تک سرسید کے واسطے سے پہنچے۔ سرسید کے کتب

خانے، ان کی صحبت، علی گڑھ کی علمی صحبتوں اور آرنلڈ کی رفاقت نے شبلی کو ایک نیا ذہن اور ایک نیا مزاج دیا۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان کی سخت حنفیت سرسید کے اثر سے اعتزال اور عقلیت میں تبدیل ہوگئی'۔ (۹) ان جدید خیالات کا اثر ان کے مذہبی خیالات کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی تصورات پر بھی نظر آتا ہے۔ شبلی کے ادبی نظریات بالکل غیر محسوس طور پر انھی خطوط پر ڈھلے جو آزاد اور حالی، یا یوں کہیے کہ حالات کا دھارا متعین کر رہا تھا۔ مذہبی معاملات میں بھی شبلی محض زاہد خشک نہ تھے۔ مولانا کہلانے کے باوجود ان کے اندر عقلیت پسندی اور جمالیاتی ذوق کا ہمیشہ غلبہ رہا۔

شاعری و تنقید کے بارے میں شبلی کے خیالات موازنہ انیس و دبیر اور سب سے بڑھ کر شعر العجم میں ملتے ہیں۔ (فارسی شاعری کی تمدنی تاریخ پر مشتمل یہ پانچ جلدیں ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۸ء کے دوران بتدریج شائع ہوئیں) اس کے علاوہ کچھ بکھرے ہوئے خیالات ان کے وقتاً فوقتاً لکھے گئے مقالات، مقالات شبلی اور سوانح مولانا روم میں بھی مل جاتے ہیں۔ شبلی نے اگر ایک طرف آزاد اور حالی کے تنقیدی تصورات سے اثرات قبول کیے ہیں تو دوسری طرف اپنے پیش رووں کے مقابلے میں بدرجہا بلند علمی مقام اور ذوقی و وقوفی قوت کے بل پر بعض خاص طرح کے مسائل و معاملات کو انھی کی طرح اردو تنقید میں ایک حاکمانہ استواری کے ساتھ معیاری و قواعدی حیثیت بھی دے دی ہے۔

خالص ادبی اور تنقیدی حیثیت سے شعر العجم شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ مباحث کی وسعت، گہرائی اور دقیقہ سنجی میں ان تمام کمزوریوں کے باوجود جو بعد کے محققین نے گنوائی ہیں، شعر العجم آج بھی بے مثال ہے۔ یہ شعرائے عجم کا ایک تذکرہ ہے مگر جس طرح آب حیات قدیم طرز کے تذکروں سے ایک مختلف شے ہے اس طرح شعر العجم میں بھی ایران کی تہذیب، تمدن، معاشرت، اور معتقدات کا بیان، اس سے جنم لینے والے شعری مزاج اور ہندوستان کی سرزمین میں آکر فارسی شاعری کے رنگ و بو میں آنے والے تبدیلیوں کے تذکرے کا انداز قدیم تذکرہ نگاری سے بہت کچھ مختلف ہوگیا ہے۔ آب حیات (۱۸۸۰ء) نے جو معیارات اور طریقہ ہائے کار متعین کیے اس کا اثر مقدمہ شعر و شاعری اور ان دونوں کے اثرات شعر العجم پر نظر آتے ہیں۔ شعر العجم کی اشاعت کا آغاز ۱۹۰۸ء میں ہوا، لیکن شبلی کے ذہن میں اس کا منصوبہ بہت پہلے سے تھا۔ اس کا کچھ حال انھوں نے جلد اول کے دیباچے میں ہی لکھا ہے۔ (۱۰) مولانا حبیب الرحمن شروانی کے نام ۱۸۹۹ء کے ایک خط میں شبلی لکھتے ہیں کہ ''اگر آپ کو مرغوب ہو تو فارسی شاعری کی تاریخ اور عہد بہ عہد خصوصیتیں اور ترقیاں، ان تمام مضامین میں آپ کو اسسٹنٹی کا کام دے سکتا ہوں''۔ پھر چند روز بعد اس منصوبے کا خاکہ یوں بیان کیا تھا: ۱۔ اس کے ادوار کی تقسیم، (مجمع الفصحا میں چار دور قرار دیے گئے ہیں)؛ ۲۔ ہر دور کے خصوصیاتِ شاعری اور متروکات الفاظ و محاورات؛ ۳۔ بڑے بڑے شعراء کے کلام پر ریویو؛ ۴۔ شاعری سے ملکی، اخلاقی، معاشرتی اثر کیا پیدا ہوئے۔ (۱۱) یہ

دونوں اقتباسات شعر العجم کے خاکے پر آب حیات اور انیسویں صدی کی مغربی شعریات کے اثرات کو واضح کرتے ہیں۔

مکاتیب شبلی کے اس اقتباس کو درج ذیل نکات کی روشنی میں دیکھیں تو اس منصوبے پر آب حیات کے اثرات کا اندازہ ہو سکتا ہے: ا۔ آب حیات کا ذیلی عنوان بھی ''مشاہیر شعرائے اردو کے سوانح اور زبان مذکور کی عہد بہ عہد ترقیوں اور اصلاحوں کا بیان'' ہے؛ ۲۔ شاعری کو ادوار میں تقسیم کرنے کی روایت جو اپنی نہاد میں مشرقی نہیں بلکہ انیسویں صدی کے انگریزی اثرات کے تحت اردو میں آئی اور جسے آب حیات کے ذریعے فروغ عام حاصل ہوا، وہ بھی شبلی کے پیش نظر ہے؛ ۳۔ یہ کہ شعر و ادب کا سیاسی سماجی حالات سے متاثر ہونا اور ان کا ملکی اخلاقی اور معاشرتی اثر پیدا کرنے کا تصور بھی مشرقی شعریات کا تصور نہیں ہے۔ اردو میں اس تصور کا فروغ، جیسا کہ آزاد و حالی والے مباحث سے ظاہر ہے، آب حیات (۱۸۸۰ء) اور مقدمہ شعر و شاعری (۱۸۹۳ء) کے ذریعے ہوا۔ آب حیات میں مختلف ادوار کو ایک دوسرے سے متمیز کرنے اور ہر دور کی خصوصیات متعین کرنے میں زیادہ زور متروکات الفاظ و محاورات کی فہرستیں بنانے میں صرف کیا گیا ہے۔ گو شبلی کے ہاں متروکات کی فہرستیں بنانے پر زیادہ زور نہیں لیکن بطور ایک اصول کے وہ بھی اسے ادواری خصوصیات کا ایک پیمانہ ضرور سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ دوسرے اقتباس سے ظاہر ہے کہ ابتداً شبلی بھی ہدایت قلی خان کے مجمع الفصحا کی طرح فارسی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کرنا چاہتے تھے مگر بعد میں پروگرام میں کچھ تبدیلی آئی اور اسے ''قدماء، متوسطین، اور متاخرین کے تین دور'' (شعر العجم، ج ا،ص ۳) میں تقسیم کر دیا۔ یاد رہے کہ اس طرح کے تین ادوار کا ذکر آزاد اور حالی بھی کثرت سے کرتے ہیں۔ شبلی نے ہر دور کے لیے شعر العجم کی ایک جداگانہ جلد وقف کی ہے۔ اس طرح پہلی تین جلدیں مذکورہ تین ادوار پر محیط ہیں۔ جبکہ چوتھی جلد (جسے پہلی جلد کے آخر کی ''چند ضروری باتیں'' کے مطابق آخری جلد بھی ہونا تھا، مگر جو پھیل کر دو حصوں میں چلی گئی) اس سارے سلسلے کی جان ہے۔ کیونکہ اس میں شاعری کی حقیقت اور ماہیت پر بحث ہے اور یہ نظری تنقید کا شاہکار ہے۔

شبلی کے نزدیک ''شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے: محاکات اور تخیل۔ ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا''۔ باقی اوصاف یعنی وزن ''سلاست، صفائی، حسن بندش وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزائے اصلی نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں''۔ (ج ۴،ص ۸) اس وغیرہ وغیرہ میں خیال بندی، سادہ و شیریں الفاظ اور طرز ادا کی جدت وغیرہ بھی شامل سمجھیے۔ انہوں نے محاکات اور تخیل پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے، جو حالی (یا شبلی کے حال، یعنی یورپ کے) اثرات سے محفوظ نہیں۔ اگرچہ انھوں نے کہیں بھی حالی کا ذکر نہیں کیا مگر اس میں مقدمہ کے بعض تصورات کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس خیال کو رد کرتے ہوئے کہ شعر کا جوہر اصلی محاکات یعنی مصوری

ہے، محاکات کے مقابلے میں شبلی تخیل کی برتری جتلاتے ہیں۔ محاکات کے معنی وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ''کسی چیز یا حالت کا اس طرح ادا کرنا کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے''۔ تصویر اور محاکات کا فرق وہ یہ بتاتے ہیں کہ تصویر اگر چہ مادی اشیاء کے علاوہ حالات یا جذبات کی بھی کھینچی جاسکتی ہے مگر ''تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دے سکتی'' کیونکہ بہت سے ایسے حالات و واقعات ہوتے ہیں جو تصویر کی دسترس میں نہیں آسکتے۔ عام مصوری کی خوبی یہ ہے کہ تصویر تمام تر جزیات میں اصل کے مطابق ہو، تب ہی اس سے اصل کا اثر پیدا ہوگا۔ اس کے برعکس محاکات میں شاعر صرف ان اجزاء کو لیتا ہے جن سے کسی خاص طرح کے جذبات ابھارنا مقصود ہوں۔ گویا شاعر کم سے کم اجزاء کے بیان سے زیادہ سے زیادہ تاثر پیدا کرسکتا ہے۔ تصویر اگر اصل کے مطابق ہوگی تو مصور کا فن کامل کہلائے گا، لیکن شاعر کو یہ مشکل درپیش رہتی ہے کہ وہ نہ تو اصل کی پوری تصویر کھینچ سکتا ہے کہ اس مطابقت سے احساسات برانگیختہ نہیں ہوں گے، اور نہ اصل سے دور ہوسکتا ہے کہ اس وجہ سے اس پر صحیح تصویر نہ کھینچنے پر اعتراض ہوگا۔ اس موقع پر اس کو تخیل سے کام لینا پڑتا ہے۔ (ج ۴، ص ۱۱-۱۰)

شبلی کے ہاں تخیل کی بحث سے پہلے چند امور دیکھتے چلیے۔ حالی نے شاعری کی قلمرو کو مصوری، بت تراشی اور ناٹک وغیرہ سے وسیع بتایا تھا اور شبلی بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ اس بحث کے فوراً بعد حالی نے بھی تخیل کی بحث چھیڑی اور مطالعہ کائنات و تفحص الفاظ کا مسئلہ اٹھایا تھا اور شبلی بھی آگے یہی کر رہے ہیں۔ انھوں نے اگرچہ تخیل کی بحث حالی کی نسبت تفصیل سے لکھی ہے، مگر نتیجہ کچھ مختلف نہیں ہے۔ حالی کے اثرات بولتے نظر آتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ حالی کے ہاں اختصار اور سلاست زیادہ ہے۔ شبلی نے تخیل کی بحث سے پہلے تکمیل محاکات کی کچھ ضروریات بتائی ہیں، جو یہ ہیں: محاکات کا مقصد اور کمال یہ ہے کہ کسی شے یا کیفیت کا بیان کا ملاً اس کے حسب حال ہو، اس طرح کہ وہ شے ''خود مجسم ہو کر سامنے آجائے''۔

شبلی شاعری کے اس تصور سے قدرے اختلاف رکھتے ہیں جس کے مطابق یہ محاکات یعنی نقل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعری ایسی محاکات ہے جس میں تخیل کی کارفرمائی کی وجہ سے نقل کے بجائے 'ایک نئی طرح کی تخلیق' کا شائبہ ہو؛ کیونکہ ان کے خیال میں انسان محض نقال نہیں بلکہ خلاق ہے۔ وہ شاعری میں محاکات کے مقابلے میں تخیل کی فوقیت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک تخیل روح، اور محاکات جسم کے مانند ہیں: ''اگرچہ محاکات اور تخیل دونوں شعر کے عنصر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل تخیل کا نام ہے۔ محاکات میں جو جان آتی ہے وہ تخیل ہی سے آتی ہے ۔ ورنہ خالی محاکات نقالی سے زیادہ نہیں''۔ محاکات دیکھی سنی شے کو بعینہٖ ادا کردینے کا نام ہے۔ ''لیکن ان چیزوں میں ایک خاص طرح کی ترتیب پیدا کرنا، تناسب اور توافق کو کام میں لانا، ان پر آب و رنگ چڑھانا، قوت تخیل کا کام ہے۔'' (ج ۴، ص ۳۰) لیکن وہ کہتے ہیں کہ شاعرانہ تخیل کا طریقہ علت و معلوم کے عام طریقے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس

میں چیزیں ایک ایسے سلسلے سے مربوط نظر آتیں ہیں جس میں غرض و غایت، اسباب و محرکات اور نتائج وغیرہ عام منطقی سلسلے سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ (ج ۴، ص ۳۹۔۳۴)

آزاد کے اسلوب نثر میں قاری کو جس تشبیہی اور استعاراتی طرز بیان سے سابقہ پڑتا ہے اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہے کہ آزاد کے ہاں عملاً تخیل کا استعمال وافر طور پر ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی نظری تنقید میں تخیل کی بے راہ روی کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اور حالی کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ شبلی نے بھی تخیل کی اہمیت پر زور دینے کے باوجود ''تخیل کے لیے مواد اور تخیل کی بے اعتدالی'' کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس کا مفاد بھی آزاد اور حالی کی طرح یہ ہے:

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ تخیل کے لیے معلومات و مشاہدات کی ضرورت نہیں، یا ہے تو بہت کم ... چنانچہ ان شعرا نے جنہوں نے واقعات یا مشاہدات کو ہاتھ تک نہیں لگایا خیالات کا گوناگوں عالم پیدا کر دیا۔ جلال اسیر، زلالی، شوکت بخاری، بیدل، ناصر علی وغیرہ نے صرف گل و بلبل سے دیوان طیار کر دیے اور شاعری کو چمنستان خیال بنا دیا۔ (ج ۴، ص ۴۷)

وہ بتاتے ہیں کہ شاعری میں اکثر ناممکنات یا غیر موجود چیزوں سے کام لیتے ہیں جنھیں تخیل ایک عالم میں جمع کر دیتا ہے۔ ''شعراء کی اس سے زیادہ کوئی بدقسمتی نہیں کہ تخیل کا بے جا استعمال کیا جائے''۔ (ج ۴، ص ۵۰۔۴۷)

شبلی کا کہنا ہے کہ تخیل کی بے اعتدالی کے مواقع مبالغے، تناسب لفظی یا ایہام، تشبیہ و استعارے اور حسن تعلیل کے استعمال میں آتے ہیں؛ لیکن اس نے سب سے زیادہ گمراہی مبالغے میں پھیلائی ہے۔ (مبالغے کے باب میں بھی حالی سے شبلی کے موازنے کی ضرورت ہے) ان کا کہنا ہے کہ عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے کہ

مبالغے کے لیے اصلیت اور واقعیت کی ضرورت نہیں، اس بنا پر قوت تخیل جی کھول کر بلند پروازی دکھاتی ہے اور کج روی اور بے راہ روی کی اس کو پروا نہیں ہوتی ... شاعر کو چونکہ ایک محال پر قناعت نہیں اس لیے وہ محالات کی تہ پر تہ قائم کرنا چاہتا ہے لیکن یہ تخیل کی سخت بے اعتدالی ہے۔ (ج ۴، ص ۵۲۔۵۱)

اس طرح وہ مبالغے، لفظی تناسب یا ایہام پر مبنی شاعری کو تخیل کی بے کاری اور بے اثری سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھر اسی منطق پر تشبیہ اور استعارے کے بارے میں انھی پیش رووں کی بولی بولتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: ''استعارے اور تشبیہیں جب تک لطیف، قریب الماخذ اور اصلیت سے ملتے جلتے ہوتے ہیں شاعری میں حسن پیدا کر دیتے ہیں''، لیکن تخیل کی بے اعتدالی ''دور از کار اور فرضی استعارات اور تشبیہیں پیدا کرتی ہے اور پھر اس پر اور بنیادیں قائم کرتی جاتی ہے۔'' بیدل کا شعر ہے:

تبسم کہ بہ خون بہار تیغ کشید
کہ خندہ برلب گل نیم بسمل افتادہ است

(کس کے قاتل تبسم نے خون بہار کے ارادے سے تلوار سونتی ہے کہ اس کی ہنسی کا وار پھول کے نیم بسمل لب پر پڑا) اس پر شبلی کہتے ہیں ''اس تخیل میں جو بے اعتدالی ہے استعارات کی وجہ سے ہے۔ بہار کا خون، تبسم کی تلوار، خندہ گل کا بسمل ہونا، دوراز کار استعارات ہیں۔'' (ج ۴، ص ۵۴) تشبیہات کے باب میں انھوں نے تخیل کی بے اعتدالی یہ بتائی ہے کہ جب کسی چیز کو کسی چیز سے تشبیہ دیتے ہیں تو:

پھر اس شے کے جس قدر اوصاف اور لوازم ہیں اس میں ثابت کرتے ہیں... مثلاً کمر کو بال سے تشبیہ دیتے ہیں ،اب اس کے بعد بال کے جتنے اوصاف ہیں کمر میں ثابت کرتے ہیں... یا مثلاً ابرو کو تلوار باندھا تو تلوار کے تمام لوازم آب وتاب، دم خم، جوہر ناب، ڈاب، قبضہ، میان سب کچھ اس کے لئے ثابت کرتے جاتے ہیں۔ (ج ۴، ص ۵۵)

اسی طرح پانچویں جلد میں صنف غزل کے جو معائب شبلی نے گنوائے ہیں وہ حالی کی صدائے بازگشت ہی ہے؛ لیکن کہیں کہیں یہ عین حالی کی آواز بلکہ الفاظ نظر آنے لگتے ہیں:

لیکن ایرانی شعراء نے ان میں اس قدر مبالغہ کیا کہ ان اوصاف کو حقیقی قرار دے کر ان کے تمام لوازمات اور جزیات بیان کیے۔ مثلاً معشوق کو بے التفاتی کی بنا پر بے رحم کہا، پھر بے رحم کو قاتل کا خطاب دیا، پھر قتل کے تمام حقیقی سامان مہیا کر دیے، گویا معشوق واقعی ایک قاتل ہے۔ ہاتھ میں تلوار ہے، عاشق کو قتل کے لیے طلب کرتا ہے، اس کی آنکھوں پر جلاد کی طرح پٹی باندھتا ہے، پھر ذبح کرتا ہے، عاشق کے خون کی چھینٹیں اڑتی ہیں اور اس کے دامن پر پڑتی ہیں۔ (ج ۵، ص ۷۹۔۷۸)

حسن تعلیل میں بھی شبلی نے تخیل کی اسی بے اعتدالی کے نمونے گنوائے ہیں۔ ان سب امور کا موازنہ حالی کے مقدمے کی اس بحث سے کیجیے جس میں انھوں نے ان نیچرل شاعری کا مذاق اڑایا ہے۔ (مقدمہ شعر و شاعری ،۸۸-۱۸۷) کیا آزاد اور حالی سے شروع ہونے والے غزل سے ایسے ہی ٹھٹھے مذاق کا یہ انداز شبلی سے ہوتا ہوا بعد کی تنقید میں سکہ رائج الوقت نہیں بنا؟

شبلی محاکات پر تخیل کی برتری کے قائل ہیں جو حالی کی عمومی سکیم سے ذرا مختلف ہے؛ مگر شبلی کا تصور تخیل اور اس سے متعلقہ مباحث حالی ہی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اصولی بات یہ ہے کہ شبلی کے اس نکتے کا مفاد کہ تخیل کو واقعیت کا پابند ہونا چاہیے آزاد اور حالی ہی کو ملے گا جو تخیل پر اصلیت و واقعیت اور مشاہدہ کائنات کے پہرے بٹھانے کا مشورہ دے گئے تھے۔ یوں لگتا ہے تخیل کا باقی بیان شبلی نے اسی مشورے پر عمل کر کے لکھا ہے۔

ایران میں شاعری کی ابتدا والے باب میں ''شاعری کی تدریجی رفتار'' کا انداز یہ بتایا گیا ہے ''شعر اگرچہ غیر مادی چیز ہے لیکن مادیات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔'' (ج ۴، ص ۱۱۷) شبلی کا خیال ہے کہ معاشرت و تمدن میں سادگی سے پیچیدگی کے سفر کا اثر شعر پر بھی پڑتا ہے۔ پھر مبالغوں، تشبیہوں اور استعاروں میں در آنے والی باریکیوں، نزاکتوں، رنگینیوں، خیال آفرینیوں، طلسم کاریوں اور، اور... یعنی جملہ مجموعہ ہائے خرابی کی ایک لمبی فرد جرم ہے جو ''سادگی سے پیچیدگی'' کے فلسفے کے تحت شعرائے متاخرین کے سر لگائی گئی ہے۔ (ج ۴، ص ۱۱۸) کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سب بواسطہ مقدمہ شعر و شاعری، آب حیات سے نہیں آ رہا! شاعری کے عروج و زوال کو شبلی بھی تمدنی و سیاسی حالات کے تابع دیکھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اردو میں بھی یہی حالت تھی:

ولی دکنی نے اردو شاعری کی بنیاد ڈالی۔ وہ ناصر علی اور بیدل کا معاصر تھا، جو مضمون بندی اور خیال آفرینی میں بال کی کھال نکالتے تھے۔ ولی ان لوگوں سے راہ و رسم رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ فارسی شاعری کا ماہر تھا۔ تاہم اردو میں شاعری شروع کی تو اس کا یہ انداز ہے:

جسے عشق کا زخم کاری لگے ہے
تو پھر زندگی اس کو بھاری لگے ہے

سادگی کا یہ وصف قدما کے اخیر دور تک قائم رہا، لیکن مدارج میں فرق آتا گیا۔ کیونکہ جس قدر زمانہ گزرتا جاتا تھا سادگی کے بجائے زور اور تکلف آتا جاتا تھا۔ (ج ۴، ص ۱۱۹)

گویا قدماء کے ہاں تشبیہ و استعارات سے لے کر مدحیہ و عشقیہ مضامین تک ہر شے میں ابتدا سادگی ہوتی ہے جو بعد میں نہیں رہتی۔ ان تمام تصورات کا ماخذ آب حیات میں تلاش کرنا ناممکن نہیں!

جدید نظری تنقید کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ شاعری کے سماجی وظیفے کا ہے۔ شبلی عموماً جمالیاتی نقاد کہلاتے ہیں، شاعری میں تخیل کی غیر معمولی اہمیت کے قائل ہیں، اسے تنہانشینی اور مطالعہ نفس کا نتیجہ بھی قرار دیتے ہیں اور خطابت و شاعری میں امتیاز کی خاطر شاعر کو سامع یا قاری سے بے نیاز بھی بتاتے ہیں مگر اس کے باوجود نئے تنقیدی نظریات اور آزاد و حالی کے اثرات کے تحت شاعری کے اخلاقی و سماجی وظیفے سے بھی صرف نظر نہیں کرتے ہیں: ''شعر ایک قوت ہے جس سے بڑے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ اس کا استعمال صحیح طور سے کیا جائے۔'' (ج ۴، ص ۱۰۱) کہتے ہیں کہ شاعری خواہ کسی قسم کی بھی ہو --- اخلاقی، فلسفیانہ یا عشقیہ --- اس سے مفید کام لیے جاسکتے ہیں لیکن حالی ہی کے رنگ میں ان کا مؤقف ہے کہ اکثر شعرائے ایران نے شاعری کا صحیح استعمال نہیں کیا اور مدح و مبالغہ اور کذب و افترا کا طومار جمع کیا۔ (ج ۴، ص ۱۰۵؛ جلد چہارم کے صفحات ۹۸ تا ۱۰۹ شبلی نے شاعری کے اثرات کے تحت شاعری کے اس وظیفے پر تفصیلاً اظہار خیال کیا ہے۔)

شبلی کے شعری تصورات کے اس جائزے سے سردست توجہ اس امر کی طرف طرف دلانا مقصود ہے کہ تخیل کی ماہیت، اس کی بے راہ روی، اصلیت، مبالغہ، مطالعہ فطرت، تشبیہ و استعارہ کی پیچیدگی، شاعری کے عروج و زوال یا تدریجی ارتقاء میں سادگی سے آغاز اور پیچیدگی پر اختتام، تجریدی و خیالی مضمون آفرینی اور پھر شاعری کے اخلاقی و سماجی کردار کے بارے میں شبلی کے یہ سب تصورات پوری طرح اپنے نامور پیش رووں سے اثر پذیر ہیں، یا نرم الفاظ میں یوں کہیے کہ اس معاملے میں ان سب کے مآخذ ایک ہیں۔

آزاد، حالی اور شبلی، اردو کی جدید ادبی تنقید میں اپنی اپنی تین عہد آفرین کتب کے ساتھ معیاری اور قواعدی (Normative) اصول کار بن گئے ہیں۔ آب حیات نے جو ادواری طریقہ کار اختیار کیا، شاعری کے عروج و زوال کے جو اصول دیے اور غیر دہلوی شعرا۔۔ مثلاً گجراتی، دکنی، پنجابی۔۔ عورتوں اور ہندووں کو مشاہیر شعرائے اردو کو خارج کر کے اس نے جو فہرست استناد بنائی، وہ بعد کے مورخین ادب کے لیے معیاری نمونہ بن گئی۔ مقدمہ شعر و شاعری نے اصناف سخن اور مضامین شاعری کے لیے جو معیارات قائم کیے وہی بعد میں سند ٹھہرے۔ اسی طرح برصغیر ہندوستان میں فارسی شاعری نے جو منفرد اسلوب اختیار کیا، جسے سبک ہندی کا نام دیا جاتا ہے شعر العجم میں اس کے بارے میں جو ناپسندیدگی اور کم نگری کا رویہ اختیار کیا گیا ہے، وہی بعد کی تاریخ میں اس کا معیاری درجہ قرار پایا۔ گو اس میں شبلی تنہا نہیں مگر اردو کی حد تک انھی کے اثرات زیادہ ہوئے ہیں۔

اردو کے کلاسیکی شعری تصورات کی تشکیل میں سبک ہندی کے شعری تصورات کا کردار بہت بنیادی اور تشکیلی رہا ہے اس لیے شبلی کے باب میں اس کا ذکر شاید غیر متعلق نہ ہو۔ سبک ہندی فارسی شاعری کی وہ طرز ہے جو ہندستان کے فارسی گو شعرا کی ایجاد ہے۔ اس شاعری کی وہ انفرادی خصوصیات جو اسے ایرانی شاعری سے ممتاز کرتی ہیں یہ ہیں: لطیف اور نادر خیالات؛ نئے، نازک اور بیگانہ مضامین کی تلاش، جس میں جزیات کی بھی اہمیت بھی رہتی ہے؛ کلام کو سادگی اور وضاحت سے قصداً اور فنکارانہ کمال کے ساتھ خالی رکھنا، جسے اختصار و اعجاز کہنا چاہیے؛ تشبیہ و استعارات کی تہ داری اور رعایت لفظی؛ ایہام اور ابہام سے ایسی شیفتگی کہ مفہوم گم ہوتا محسوس ہو۔

شبلی اس طرز کے مخصوص انداز کو خیالات، زبان اور مضامین کی نزاکت اور پیچیدگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سلسلے کا موجد فغانی شیرازی کو کہا جاتا ہے مگر اسے ترقی دینے والوں میں عرفی، نظیری، ظہوری، جلال اسیر، شوکت بخاری، طالب آملی، کلیم کاشانی، ناصر علی اور بیدل وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر شعراء کا ذکر شبلی نے پسندیدگی کے ساتھ نہیں کیا۔ ان کے بارے میں ان کی رائے کا اندازہ ان بیانات سے لگایا جا سکتا ہے: ''کلیم کے بعد شاعری شاعری نہیں رہی بلکہ چیستان گوئی بن گئی''۔ (ج ۱، ص ۴) ''اس طرز خاص کا نمایاں کرنے والا جلال اسیر ہے... شوکت بخاری، قاسم دیوانہ وغیرہ نے اس کو زیادہ ترقی دی... بیدل اور ناصر علی وغیرہ اسی گرداب کے تیراک

ہیں۔" (ج ۳، ص ۲۲) "استعارات کی جدت ونزاکت متاخرین کا عام انداز ہے، لیکن اس خاص وصف میں طالب آملی سب سے ممتاز ہے"۔ (ج ۳، ص ۲۶) "ان شعراء نے جنھوں نے واقعات یا مشاہدات کو ہاتھ تک نہیں لگایا، خیالات کا گوناگوں عالم پیدا کر دیا۔ جلال اسیر، زلالی، شوکت بخاری، بیدل، ناصرعلی وغیرہ نے صرف گل وبلبل سے دیوان طیار کر دیے اور شاعری کو چمنستان خیال بنا دیا" (ج ۴، ص ۴۷) یاد رہے کہ شبلی یہاں تخیل کی بے اعتدالیوں کی بحث کر رہے ہیں۔ وہ تخیل میں واقعیت کے جس قدر قائل تھے اس کے پیش نظر "چمنستان خیال" کوئی پسندیدہ صفت نہیں ہوسکتی۔ ولی دکنی کی سادگی اور بے تکلفی کے ذکر میں کہتے ہیں کہ ولی "ناصرعلی اور بیدل کا معاصر تھا، جو مضمون بندی اور خیال آفرینی میں بال کی کھال نکالتے تھے"۔ (ج ۴، ص ۱۱۹)

ان بیانات کی روشنی میں یہ نتیجہ آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شبلی سبک ہندی کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتے تھے۔ یاد رہے کہ ان امور پر محمد حسین آزاد کی بھی بالکل یہی رائے تھی، جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا یہ بیان تو جیسے شعر العجم کے لیے ہی تھا:

> اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زبان میں اگا مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا۔ البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصرعلی کا زمانہ قریب گزر چکا تھا... وہ استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے اس واسطے گویا اردو بھاشا میں استعارہ اور تشبیہ کا رنگ بھی آیا... (آب حیات، ص ۴۷)

بیدل، ناصرعلی اور غالب سبک ہندی کے نمائندہ شاعر ہیں۔ تینوں ہی آزاد اور شبلی کے ناپسندیدہ بھی ہیں۔ شبلی نے نہ صرف ان شعراء پر بلکہ سبک ہندی کے امتیازی خدوخال پر بھی پسندیدگی سے نہیں لکھا اور سبک ہندی کے جن جن شعراء کے لیے ناپسندیدگی کا رویہ اختیار کیا یا جنھیں شعر العجم میں بالکل شامل نہ کیا، خصوصاً ہندو فارسی گو شعراء کو، وہ ہمارے مطالعات کی فہرست استناد سے یا خارج ہو کر رہ گئے یا کم از کم بے اعتبار ضرور ہو گئے۔ اور اثبات ہوا "نیچرل شاعری" کو! اس لحاظ سے آب حیات اور شعر العجم اپنے منفی اثرات کے اعتبار سے بھی یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔

حواشی

۱۔ آزاد، محمد حسین، آب حیات، لاہور، تاج بک ڈپو، س ن۔ اس کے بعد آب حیات کے اقتباسات کے حوالے متن کے اندر ہی آئیں گے، اقتباسات کی صحت کا موازنہ آب حیات لکھنو، اتر پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۸۲ء والے ایڈیشن سے کر کے لکھا گیا ہے۔

۲۔ شمس الرحمن فاروقی، مقدمہ آب حیات انگریزی ترجمہ از فرانسیسی پریچیٹ "Constructing a Literary

"History, a Canon, and a Theory of Poetry: Ab-e Hayat (1880)، ص۸۵
Scientist, issues 269-71, Oct-Dec 1995, page 85. -- The Social Scientist
-- Digital South Asia Library
[http://dsal.uchicago.edu/books/socialscien...er.html?objectid =
HN681.S597_269-71_075.g

۳۔ بحوالہ فرخی، ڈاکٹر اسلم، محمد حسین آزاد۔ حیات اور تصانیف، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۵ء، ج۱،ص۲۳۶؛

۴۔ فاروقی، مقدمہ آب حیات، انگریزی ترجمہ Social Scientist, issues 269-71, Oct-Dec 1995, page 90

۵۔ ڈاکٹر احسن فاروقی، در آب حیات کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ، (مرتبہ، سید سجاد) نئی مطبوعات، لاہور، ۱۹۶۶ء،ص۵۸

۶۔ حالی، الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ، ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۵۳ء۔ آیندہ مقدمے کے حوالے متن کے اندر ہی آئیں گے۔

۷۔ نیز ملاحظہ ہو آزاد، محمد حسین، نیرنگ خیال، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء،ص۵۷۔۵۶

۸۔ حالی، الطاف حسین، کلیات نثر حالی (دوجلد)، مرتبہ شیخ محمد استعمال پانی پتی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء، ۱۹۶۸ء، ج۲،ص۱۹۲

۹۔ سرور، آل احمد، تنقید کیا ہے، اور دوسرے مضامین، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۶۴ء،ص۷۷ و بعد

۱۰۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، لاہور، انجمن حمایت اسلام، س ن، ج۱،ص۳۔۲؛ آیندہ اس کتاب کے حوالے، جلد (ج) اور صفحہ (ص) نمبر کے ساتھ، متن کے اندر ہی آئیں گے۔

۱۱۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول،ص۱۱۶ اور ۱۱۸ کے یہ دونوں اقتباسات یادگار شبلی از شیخ محمد اکرام،ص۳۶۶؛ اور شبلی ایک دبستان از ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی،ص۱۴۰ سے منقول ہیں۔ دونوں میں ایک آدھ لفظ کا فرق ہے۔

جدید اردو نظم کے فروغ میں آزاد کی خدمات

ڈاکٹر ضیاء الحسن

''مولانا محمد حسین آزاد صاحب طرز انشا پرداز تھے''، ''آزاد انگریزوں کے جاسوس تھے'' یا یہ کہ ''جدید نظم کے اصل بانی تو کرنل ہالرائیڈ یا ڈاکٹر لائٹنر تھے، آزاد نے تو ان کی امنگوں کو پروان چڑھایا''۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے تصورات ابتدا ہی سے آزاد کی شخصیت کے ساتھ منسلک ہو گئے تھے۔ جو تنقید یا تحقیق آج بھی یہی راگ الاپتی ہے، وہ ہمارے لیے بے معنی اور یبوست زدہ ہے۔ اگر آج بھی تنقید مذکورہ بالا تصورات سے باہر نہیں نکلتی تو چاہے وہ کتنی جدید کیوں نہ ہو چکی ہو اور تحقیق کی موشگافیوں میں کتنے ہی نئے ذرائع اور وسائل کا اضافہ کیوں نہ ہو چکا ہو، ہمارے لیے فضول اور لایعنی ہیں۔ اگر آزاد وہی تھے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے تو ان پر کافی سے زیادہ بات ہو چکی ہے اور اب ان پر مزید تحقیق و تنقید پر وقت ضائع کرنے کے بجائے نئے ادبی معاملات پر سوچنا چاہیے اور اگر وہ ان تصورات سے زیادہ مقام کے مستحق تھے تو اب سو سال بعد تو انھیں یہ مقام مل جانا چاہیے۔

آزاد کی محض یہ اہمیت نہیں ہے کہ انھوں نے برطانوی حکومت کے ایما پر ایک تعلیمی غرض سے قائم ہونے والے ادارے کو پروان چڑھایا اور نہ یہ کہ انھوں نے چند موضوعاتی مشاعرے منعقد کروائے۔ اگر ان کا ادبی کردار محض اتنا ہو تو ان کے ساتھ ہونے والا اردو نقادوں اور محققین کا سلوک کچھ زیادہ قابل اعتراض نہیں ٹھہرتا کیوں کہ اتنا معمولی کام کسی بڑے ادبی مرتبے پر منتج نہیں ہوتا، ان کے ساتھ اگر ان کے دیگر ادبی اثاثے، ان کی انشا پردازی یا آب حیات وسخن دان فارس کی نیم تاریخی، نیم تنقیدی کاوشوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان کا ذکر تاریخ ادب میں رہ جائے گا۔

اگر چہ آزاد کی انشا پردازی لازوال تخلیقی لطف سے معمور ہے لیکن محض انشا پردازی سے لازوال ادبی زندگی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ یہ ضرور ہے کہ اردو کے اسالیب نثر میں ان کی حیثیت مستحکم رہے گی اور تعلیمی اداروں کے نصاب میں بھی انھیں شامل کیا جاتا رہے گا لیکن ان کے اسلوب سے لطف کشید کرنے والے قارئین کا حلقہ محدود ہی رہے گا۔

اگرچہ آزاد پر ۲۰۱۰ میں بھی انھی حوالوں سے گفتگو ہو رہی ہے لیکن آزاد کے پاس کچھ اور بھی ہے، جس کا شعوری اظہار ابھی تک پورے دلائل کے ساتھ نہیں ہو سکا لیکن جو ہماری ادبی روایت کے اجتماعی شعور کا حصہ ہے اور جس کی وجہ سے آزاد پر وقتاً فوقتاً بات ہوتی رہتی ہے۔

آزاد کا یہ ''کچھ اور'' کردار نسبتاً پیچیدہ ہے اور اسی وجہ سے زیادہ واضح نہیں ہو سکا۔ جدید اردو ادب کی بنیاد رکھنے والوں میں انھیں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جدید اردو ادب کی بنیاد رکھنے والے اتنے زیادہ ادارے اور اتنے زیادہ لوگ ہیں کہ ان میں آزاد کی مرکزی حیثیت کا تعین پیچیدہ بھی ہے اور متنازعہ بھی لیکن اپنی تمام پیچیدگی اور تنازع کے باوجود ہم لاشعوری طور پر اسے محسوس کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی حیثیت اپنے دیگر ہم عصروں سے زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ آج ہم انھیں آزاد صدی تقریبات کے موقع پر یاد کرنے بیٹھے ہیں بلکہ وقتاً فوقتاً اس ضمن میں کام ہوتا رہا ہے، کبھی یہ کام اعتراف کی حیثیت کا حامل ہے تو کبھی اس میں استرداد کی لے بھی شامل رہی ہے لیکن ہم آزاد کو نظرانداز کرنے کی ہمت پیدا نہیں کر سکے۔ جدید ادب کی تعمیر میں فورٹ ولیم کالج، دلی کالج، غالب اور سرسید تحریک کی خدمات بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ بلاشبہ سرسید احمد خان کی ذہانت اور ان تھک کاوشوں نے اس عہد کو تعمیر کیا جسے جدید اردو ادب کا پہلا عہد کہنا چاہیے۔ خود آزاد کی کاوشوں کے پیچھے سرسید کی رہ نمائی اور تحسین نے اہم کردار ادا کیا ہے اس دور میں قومی ضروریات کے پیش نظر نثر کو خوب ترقی حاصل ہوئی۔ شاعری کے حوالے سے تنہا اکبرالہ آبادی نظر آتے ہیں جنھیں ہم پہلا جدید شاعر کہہ سکتے ہیں کیوں کہ انھوں نے جس طنزیہ مزاحیہ اسلوب کو اختیار کیا، اس نے شاعری کی زبان بدلنے میں اہم کردار ادا کیا لیکن مجموعی شعری فضا روایتی عناصر پر مشتمل تھی۔ کلاسیکی نظامِ علامات گھس پٹ چکا تھا اور اپنی معنویت کھو چکا تھا۔ ایسے میں سرسید اور ان کے ساتھیوں نے نئے ادب کی تحریک آغاز کی۔ ادھر پنجاب میں گورنر کے حکم پر کرنل ہالرائیڈ اور ڈاکٹر لائٹنر نے انجمن اشاعتِ مطالب مفیدہ پنجاب کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا جس کا کام نئے تعلیمی نصاب کی تیاری تھی۔ سیکرٹری گورنمنٹ آف پنجاب نے اس ضمن میں ناظم سررشتہ تعلیم پنجاب کو لکھا:

> ''آپ اس بات پر غور کریں کہ ہمارے دیہاتی اور ضلعی مدارس میں ایک منتخبات اردو نظم، جس میں اخلاق، نصیحت اور ہر ایک کیفیت کی تصویر کھینچی گئی ہو، کیا پڑھائی میں داخل ہو سکتی ہے؟ کیا اس قسم کا انتخاب سودا، میر تقی، ذوق یا غالب کی تصانیف سے مرتب ہو سکے گا۔ اگر شعرائے مذکورہ بالا کے دیوانوں یا مثنوی ہائے موجودہ سے ایسا انتخاب نہ ہو سکے، تو حسب الہدایت دریافت کیا جاتا ہے کہ شعرائے زمانہ حال سے خاص مدارس کے استعمال کے لیے ایک ایسی نظم کی تصنیف کا کام سرانجام ہو سکتا ہے یا نہیں۔''(۱)

انجمن پنجاب کے متعدد مقاصد تھے لیکن ایک اہم مقصد ایک نئے نصاب کی تیاری تھا۔ انجمن پنجاب کو

جدید نظم کی تحریک بنانا برطانوی حکومت کے مقاصد میں شامل نہیں تھا، البتہ ایک ایسا انتخاب وہ سکولوں کے نصاب میں ضرور شامل کرنا چاہتے تھے جس میں اخلاق، نصیحت اور ہر کیفیت کی تصویر کشی کی گئی ہو۔ اخلاق، نصیحت اور ہر کیفیت کی تصویر کشی سے ان کی مراد وہ مخصوص اخلاق، نصیحت اور کیفیات تھیں جو برطانوی اقتدار کی برکتوں اور ناگزیریت کے ضمن میں ذہن تیار کر سکیں اور نئی سرمایہ دار اخلاقیات تیار کر سکیں۔ ۱۸۵۷ء کے تجربے نے انھیں بتا دیا تھا کہ محض طاقت سے زیادہ دیر تک انسانی ذہن کو قابو میں نہیں رکھا جا سکتا، چاہے وہ ہندوستانیوں جیسا حکومت واقتدار کی پرستش کرنے والا ذہن ہی کیوں نہ ہو۔ اس قوم میں تقدیر پرستی کے عناصر ازل ہی سے موجود تھے، اب وہ کچھ اور باتیں بھی ان کی نفسیات میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ قطعاً نہیں چاہتے تھے کہ اعلیٰ درجے کی شاعری ان کی تربیت میں شامل ہو کیوں کہ اعلیٰ درجے کی ہر شاعری کا موضوع اور تاثیر غیر انسانی رویوں کے خلاف مزاحمت پیدا کرتے ہیں۔ انھیں ایک خاص قسم کی سطحی سرمایہ دار اخلاقیات کو رائج کرنا تھا۔ اس خط میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر گذشتہ شاعری سے اس طرح کچھ نمونے مل جائیں تو انھیں شامل نصاب کر لیا جائے، بہ صورت دیگر نئے شاعروں سے یہ کام کروایا جائے۔ مولانا آزاد نے اس خط کی دوسری رائے/حکم کو ترجیح دی۔ انھوں نے انجمن کے پلیٹ فارم سے اس نئی شاعری کی داغ بیل ڈالی جو ان کے خیال میں اس وقت ہماری قومی زندگی کی ضرورت تھی لیکن انھوں نے یہ کام نہایت ذہانت سے کیا اور بظاہر انگریزی حکومت کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کیا۔ یہ تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف تھا اور اس کی نزاکت کو سمجھنے کے لیے ظاہری حقائق کو پیش نظر رکھنے سے زیادہ ان حقائق کی تہ تک پہنچنا ضروری ہے۔ آزاد کا انگریزی حکومت سے تعلق سادہ نہیں تھا کہ انھوں نے انجمن پنجاب بنوائی اور وہ ان کے مقاصد کی تکمیل میں لگ گئے یا انھوں نے آزاد کو وسط ایشیا میں جاسوسی کے لیے بھیجا اور یہ جاسوسی کر آئے۔ کوئی سادہ مزاج ہی ایسے سمجھ سکتا ہے۔ ان کا انگریزوں سے تعلق خوف اور نفرت کا تھا۔ خوف کے باعث وہ ہر اس حکم کی بجا آوری کرتے تھے جو برطانوی حکومت کی طرف سے صادر ہوتا تھا اور نفرت کے باعث وہ اس کا منشا تبدیل کر دیتے تھے۔ آزاد کے نقاد اور محقق یہ تو بتاتے ہیں کہ انھوں نے انگریزوں کے حکم کے مطابق انجمن پنجاب کی سرگرمیاں جاری کیں لیکن وہ سرگرمیاں کیا تھیں اور انگریزوں کو ان سے کیا فائدہ پہنچا، یہ نہیں بتاتے۔ اسی طرح ان کے محققین یہ تو بتاتے ہیں کہ وہ جاسوسی کی غرض سے بھیجے گئے اور کہاں کہاں بھیجے گئے لیکن یہ نہیں بتاتے کہ وہ کیا جاسوسی کر کے آئے اور ان سے انگریزوں کو کیا فوائد حاصل ہوئے۔ اب انجمن پنجاب ہی کو لیجیے ''اے گلشن فصاحت کے باغبانو!'' والا اقتباس تو ہمارے اکثر نقادوں نے جدید نظم کی ترویج کے ضمن میں نقل کیا ہے لیکن پورے خطبے کے غایت پر کبھی بات نہیں کی۔ بظاہر یہ خطبہ انگریزوں کے مقاصد کی تکمیل کے لیے لکھا گیا اور خطبے میں ایک مختصر اقتباس اس بارے میں بھی ہے لیکن اس کا موضوع اردو زبان و شاعری کی تجدید نو ہے۔ آزاد نے اس خطبے میں یہ نہیں کہا کہ اردو شاعری شاعری نہیں ہے بلکہ اردو ہی نہیں بھاشا اور سنسکرت کی شاعری کے بارے

میں بھی وہ رطب اللسان ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو شاعری موجودہ عہد کو اس کی حسرتوں، آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ بیان کرنے سے قاصر ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ پرانے اسالیب ترک کر کے بھاشا اور انگریزی کے اسالیب سے نئے اسالیب وضع کیے جائیں۔ آزاد پہلے ہندوستانی نقاد ہیں جنھوں نے مقامی اور مغربی زبانوں کے ادب سے بہ یک وقت سیکھنے کا مشورہ دیا۔ وہ اس خطبے میں بھی سرسید اور ان کے ساتھیوں کی طرح مرعوب یا احساس کمتری کا شکار نظر نہیں آتے بلکہ انھوں نے انگریزی کے پہلو میں بھاشا کو کھڑا کر کے دونوں سے اکتساب کا مشورہ دیا ہے:

''ہمیں چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بہ موجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں، سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں کیوں کہ اب رنگ زمانے کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گل دستے، ہار، طرّے ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے۔''(۲)

اس اقتباس میں انھوں نے انگریزی زبان کے ادب سے استفادے کا مشورہ نہیں دیا بلکہ فارسی اور بھاشا کو بھی اسی قدر اہمیت دی ہے اور انگریزی کے بجائے یورپی زبانوں کے ادب سے اکتساب فیض کی بات کی ہے جن میں انگریزی ادب کے مدمقابل ولندیزی و فرانسیسی ادب سے ربط استوار کرنے کی بات بھی شامل ہے۔ یہ طرز استدلال صاف بتاتا ہے کہ وہ برصغیر کے لوگوں کو انگریزوں سے مرعوب اور متاثر نہیں کرنا چاہتے تھے اور ان کا ذکر انھوں نے یورپی زبانوں کے ادب کے ضمن میں بغیر نام لیے کیا ہے۔ جہاں ممکن ہوتا ہے انگریزوں سے ان کی نفرت غیر محسوس طریقے سے اپنا اظہار کرتی ہے اور انگریزوں کے خوف سے وہ ان کی مساعی کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ انگریزی صندوقوں کا ذکر بھی کرتے ہیں لیکن جہاں استفادے کا مشورہ دیتے ہیں، صیغہ تعمیم اختیار کرتے ہیں۔ اس خطبے میں کئی مقامات پر انھوں نے یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس خطبے کے بعد انھوں نے اس جلسے میں اپنی ''مثنوی موسوم بہ شب قدر'' پیش کی۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے کہیں بھی احساس نہیں ہوتا کہ یہ سرمایہ دارانہ اخلاقیات کی ترویج و اشاعت کے لیے لکھی گئی ہے۔ آزاد کے مسائل سرسید اور ان کے ساتھیوں سے مختلف تھے۔ سرسید کے ساتھیوں میں بھی سرسید جتنی سرمایہ داری کی توقیر نہیں تھی لیکن آزاد تو مشرقی اخلاقیات یا جاگیردارانہ اخلاقیات کو پسند کرتے تھے۔ اس مثنوی میں بھی رات کی تعریف و توصیف کرنے کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ کس کس طبقے کے لوگ رات کو کیا سرگرمیاں اختیار کرتے ہیں۔ طبقہ امرا کی عیش پرستی کے پس منظر میں جو لعنت پوشیدہ ہے یا دولت پرستوں کی ہوس میں جو بے اطمینانی اور بے سکونی ہے، چور چاہے مال و دولت کا ہو یا تصورات اور تخلیقی جوہر کا ہو، اس کے کام میں جو بے برکتی ہے، آزاد

نے اسے موثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔غریبوں کے مصائب اور مسائل کا بیان نہایت دردمندی سے کیا ہے اور اہل علم وادب کی مساعی کو تحسین کی نظر سے دیکھا ہے

اور ان کے زیر سایہ پڑا اک غریب ہے — دن بھر اٹھاتا بوجھ وہ آفت نصیب ہے
تھا صبح دم کا نکلا ہوا گھر سے کام کو — وہ حق حلال کر کے جو آیا ہے شام کو
اب اپنے نان خشک کو پانی میں چور کر — کھایا ہے اور مست پڑا ہے تنور پر
سر پر قیامت آئے تو اس کو خبر نہیں — سونا تو آنکھ میں ہے مگر پاس زر نہیں (۳)

اس اقتباس میں آزاد کا معاشی اور طبقاتی شعور بہت نمایاں ہے۔اردو میں یہ شعور بالکل نیا تجربہ تھا۔قبل ازیں شہرآشوبوں اور نظیر اکبرآبادی کی نظموں میں بھی اس شعور کی عکاسی ہوئی ہے لیکن وہاں جاگیرداری ذہنیت نمایاں ہے جو اپنی حالت پر راضی بہ رضا رہنے کی تربیت کرتی ہے۔اس طرح کی نظموں میں معاشی ابتری کی تصویریں تو مل جاتی ہیں لیکن ان کی معاشرتی حیثیت کا تعین اس طرح نہیں ملتا جس طرح آزاد کی نظموں میں ملتا ہے۔یہ نقطہ نظر فی الاصل سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے شعور سے پیدا ہوا ہے جس کی بالکل ابتدائی صورتیں آزاد کے زمانے میں نظر آنے لگی تھیں۔آزاد نے سرمایہ داری نظام کا نقطہ نظر اختیار کرنے کے بجائے اپنے تہذیبی نقطہ نظر کو فوقیت دی ہے جس میں انسانی عظمت کا تعین مادی وسائل اور دولت کی بنیاد پر نہیں کیا جاتا بلکہ انسانی شرف کی بنیاد علم اور انسانی ہم دردی پر قائم ہے۔یوں آزاد کی یہ نظمیں بہ ظاہر روایتی ہونے کے باوجود اپنے موضوعات اور ان کی پیش کش میں جدید ہیں۔

آزاد کے اس کردار کو ان کے عہد میں نہیں سمجھا گیا۔چوں کہ یہ کام ایک سرکاری ادارے کے پلیٹ فارم سے کیا جارہا تھا، اس لیے ان کے دور میں ان کی یہ ساری کاوشیں مشکوک رہیں۔اس زمانے کے اخبارات میں اس کے خلاف متواتر لکھا گیا۔ان شعروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں ان کی ان مساعی جمیلہ کو انگریز دشمنی کے پس منظر میں دیکھا گیا، بالکل ویسے ہی جیسے آج امریکی امداد یا تعاون سے کوئی کار خیر آغاز کرے تو اس پر بھی سی آئی اے کے ایجنٹ ہونے کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔یہاں اس بات کا تجزیہ ضروری ہو جاتا ہے کہ تمام کام جو بظاہر ایک جیسے نظر آرہے ہوں، ہمیشہ ایک جیسے نہیں ہوتے اور اس فرق کا فیصلہ ان کے نتائج اور اثرات کی روشنی میں کیا جانا چاہیے۔آسان بات تو یہ ہے کہ ہم آزاد کو انگریزوں کے ہر حکم کی تعمیل کرنے والا ایک ملازم سمجھ کر ان کے ہر کام کو انگریز پرستی شمار کریں لیکن ایک ایسے آدمی کے بارے میں ایسا کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انگریز اس کے انتہائی عزیز والد کے قاتل تھے اور آزاد اور اس کے اہل خاندان کی دربدری کا موجب تھے، اس لیے آزاد کے دل میں انگریزوں کے لیے ناپسندیدگی اور نفرت کا ہونا لازمی اور فطری عمل ہے۔ایسے شخص پر انگریزوں کے مقاصد پورے کرنے کا الزام بھی عاید کرنا شقی القلبی ہے اور واقعاتی طور پر غلط ہے۔

شاید پروفیسر صاحب (آزاد) نے اس مقام پر بہ مقتضائے وقت، رعایت خاطر حکام پر نظر کی ہوگی، نہیں تو بیان مطالب کے واسطے یہاں ایسے قواعد کلیہ منضبط ہیں جن سے واقعی سرگذشت اور علمی مطالب اور اخلاقی مضامین صاف وسلیس و بامزہ اور رنگین اور دقیق اور متین، سب طرح کے نظم ہوئے اور ہو سکتے ہیں۔ (۴)

اس اقتباس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ آزاد اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھے کہ ہماری شاعری میں کیا کچھ بیان ہوا ہے اور ہو سکتا ہے۔ جدید شاعری کے ضمن میں آزاد کی ۱۸۶۷ کی تقریر اور ۱۸۷۴ کا خطبہ، دونوں میں اردو شاعری کے بارے میں جس تحسین کا اظہار ہوا ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے مذکورہ بالا رائے صرف تعصب پر مبنی ہی ہوسکتی ہے۔ آزاد نے جدید شاعری کے ضمن میں جن خیالات کا اظہار انیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی میں کیا تھا، وہ شاید قبل از وقت تھے کہ ایسے ہی خیالات کا اظہار تقریباً نصف صدی بعد عظمت اللہ خاں اور ان کے بعد کے لوگوں نے بھی کیا اور جدید شاعری کے ارتقا میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو آزاد پہلے ہندوستانی نقاد ہیں جنھوں نے وقت کے تقاضوں کو بھی سمجھا اور اردو شاعری کے مستقبل کے بارے میں دانش مندانہ تجاویز پیش کیں۔ آزاد کی ان مساعی سے لاہور میں جن ادبی سرگرمیوں کا آغاز ۱۸۶۵ سے ہوا، اس نے لاہور کو علی گڑھ کے بعد جدید اردو شاعری ہی کا نہیں بلکہ اردو ادب کا مرکز بنا دیا۔ بیسویں اور اب اکیسویں صدی میں بھی لاہور اردو ادب کا سب سے بڑا اور فعال مرکز ہے۔ اس مرکز سے منسلک ہوتے ہوئے اقبال، راشد اور جیلانی کامران جیسے بڑے شاعر پیدا ہوئے۔ منٹو، بیدی، غلام عباس، انتظار حسین اور ذکاء اللہ جیسے افسانہ نگار، عبداللہ حسین، مستنصر حسین تارڑ اور مرزا اطہر بیگ جیسے ناول نگار پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ریاض احمد، جیلانی کامران، مظفر علی سید، سجاد باقر رضوی اور سراج منیر جیسے نقاد پیدا ہوئے۔ اگر آزاد سیکریٹری گورنمنٹ پنجاب کے حکم کے مطابق شعرائے مذکور میر، سودا، ذوق اور غالب جیسے شاعروں کی شاعری میں سے نصابی ضرورتوں کے مطابق شاعری کا ایک انتخاب مرتب کر دیتے تو شاید اردو ادب کو ایک نیا اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال مرکز میسر نہ آ سکتا یا کم از کم اس کی مذکورہ بالا صورت نہ بن سکتی۔ آزاد اردو شاعری کی ضرورتوں سے بھی آگاہ تھے اور اپنی قومی صورت حالات کو بھی جانتے تھے، اس لیے انھوں نے آسان کام کرنے کے بجائے مشکل گوارا کر کے اردو کا ادبی منظر نامہ تبدیل کرنے کے لیے کاوش کی۔ وہ یہ کام پہلے سے ہی کرنا چاہتے تھے لیکن جب انھیں سرکاری وسائل نعمتِ غیر مترقبہ کے طور پر میسر آئے، تو انھوں نے اس سے بھرپور کام لیا۔ اس ضمن میں حالی لکھتے ہیں:

لاہور ہی میں کرنل ہالرائیڈ، ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا یعنی ۱۸۷۴ میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نیا تھا۔ (۵)

انجمن پنجاب کے بعد انجمن حمایت اسلام، انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقہ ارباب ذوق جیسی تنظیموں نے لاہور کی ادبی فضا کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا لیکن انجمن پنجاب کے بنیادی کردار کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اس فضا کی تشکیل میں ۱۸۵۷ء کے بعد کے ہندوستان کی انتشاری صورت حال اور لاہور کی پرسکون فضا نے بھی ادیبوں کے اس مرکز پر جمع ہونے کی راہ ہموار کی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد دلی کی معاشرتی اور سیاسی زندگی اجڑ کر رہ گئی۔ لکھنؤ جو علم وادب کا گہوارہ تھا، آہستہ آہستہ ویران ہوتا گیا۔ چنانچہ شعر وادب سے دلچسپی رکھنے والوں نے مختلف علاقوں کی طرف ہجرت شروع کر دی۔ کچھ حیدر آباد (دکن) پہنچے اور کچھ نے پنجاب کا رخ کیا۔ پنجاب میں قدرے امن تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ پنجاب پر انگریزوں کا مکمل قبضہ تھا۔ یہاں انگریزوں کو سکھوں کا تعاون حاصل تھا...... جو لوگ ہجرت کر کے لاہور آئے، ان میں ایک نام محمد حسین آزاد کا بھی ہے۔ ان کے علاوہ دہلی کے مشاہیر ماسٹر پیارے لال آشوب، پنڈت من پھول، منشی درگا پرشاد نادر، مرزا اشرف بیگ خاں اشرف، مولوی اسد جان دلی، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی کریم الدین، مولوی سید احمد اور مرزا ارشد گورگانی کے نام شامل ہیں۔ (۶)

یہ ایسے ہی ہے جیسے دلی کی بربادی کے بعد دلی کے شاعر لکھنو جمع ہوئے اور لکھنو کی ادبی مرکزیت قائم ہوئی۔ لاہور کے ادبی مرکز کی تشکیل میں ۱۸۵۷ء کے بعد مختلف ادبی انجمنوں اور بڑی ادبی شخصیات نے تسلسل سے خدمات انجام دیں۔ آزاد کے بعد اقبال اور اقبال کے بعد ترقی پسندوں اور حلقہ ارباب ذوق والوں کی مسلسل کوششوں سے جو ادبی مرکز قائم ہوا، وہ آج بھی دنیا بھر میں اردو ادب کا سب سے بڑا مرکز ہے لیکن ہمیں اس مرکز کے قیام میں آزاد کی بنیادی کاوشوں کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔

جدید اردو نظم کے فروغ کے لیے مذکورہ بالا عملی کاوشوں یعنی انجمن پنجاب کے جلسوں کا انعقاد، ان جلسوں میں ان کی تقریروں اور خطبوں اور جدید نظم کے مشاعروں کے انعقاد کے ساتھ انہوں نے اپنے ہم عصروں کو جدید نظم کے نمونے بھی پیش کیے۔ ''نظم آزاد'' میں شامل ان کی نظمیں آج ہمارے لیے قدیم شاعری کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں لیکن ان کے دور کی غزل بنیاد فضا میں یہ نظمیں بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئیں۔ ان کے دور میں شاعری کی یہ ہیئت، اسلوب اور موضوع اس قدر نئے تھے کہ ان کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور مختلف اخبارات ورسائل میں ان کے خلاف شدید غصے کا اظہار کیا گیا اور انہیں ہر طرح سے مطعون کیا گیا۔

اردو میں موضوعاتی نظموں کی روایت آزاد اور ان کے ہم عصروں نے آغاز نہیں کی بلکہ یہ روایت قلی قطب شاہ سے ہوتی ہوئی نظیر اکبر آبادی تک پہنچی اور نظیر سے آزاد اور ان کے ہم عصروں تک پہنچی۔ ان مشاعروں میں پڑھی جانے والی نظموں میں مناظر فطرت کے ساتھ ملی اور قومی شعور کی حامل نظمیں بھی لکھی گئیں خصوصاً حب وطن، امن اور

انصاف جیسے موضوعات پر لکھی جانے والی نظموں میں یہ شعور واضح نظر آتا ہے۔اسی طرح اخلاقی اقدار، معاشرتی رویے اور معاشی صورت حال کی عکاسی بھی ان نظموں میں کئی مقامات پر دیکھنے کو مل جاتی ہے۔بعض ناقدین کے نزدیک تو اس طرح کے موضوعات کی وجہ ہی سے برطانوی افسروں نے ان مشاعروں کا سلسلہ منقطع کیا۔اس ضمن میں ڈاکٹر ممتاز گوہراپنی کتاب پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا میں لکھتے ہیں:

انجمن کے مشاعروں نے یہ احساس دلایا کہ شاعری میں غزل کافی نہیں، [اس] نئے اصناف کی طرف توجہ دلائی، مغربی اثرات کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اسے تحریک کی شکل عطا کی۔اس میں مبالغہ! انفعالیت، حزن و یاس اور قنوطیت کے بجائے حقیقت، زندگی اور جولانی، رجائیت اور مسرت کو پیش کیا جانے لگا اور لوگوں کو یہ احساس پیدا ہو گیا کہ شاعری اب محض تفنن طبع کے لیے نہیں بلکہ اسے عظیم مقصد کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔"(۷)

آزاد کے اثر سے جدید اردو نظم میں آنے والی ان موضوعاتی تبدیلیوں سے زیادہ اہم آزاد کا ہیئتی شعور ہے۔اس ہیئتی شعور نے اردو میں معریٰ، آزاد اور نثری نظم کی راہ ہموار کی اور اردو میں نظم کا نیا تصور متعارف کرایا۔آزاد سے قبل نظم سے مراد وہ فن پارہ تھا جو کسی مخصوص بحر اور قافیے میں ہو۔نظم کے لیے مخصوص پابند ہیئتیں مروج تھیں جن سے باہر نکلنے کا شاعر سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ وہ معمولی ہیئتی تنوع جو آزاد اور ان کے اثر سے ان کے ہم عصر شاعروں کے ہاں نظر آتا ہے، ان کے زمانے میں اس پر بھی بہت لے دے ہوئی۔ابھی اردو میں مغربی شعری ہیئتوں کا تعارف نہیں ہوا تھا، اس لیے آزاد کے ذہن میں مخصوص پابند ہیئتوں کا تصور ہی تھا جن میں مثنوی، مسدس اور مخمس زیادہ نمایاں تھیں۔آزاد نے جدید نظم کے لیے مثنوی کی ہیئت کو مناسب خیال کیا۔اسی لیے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں بیشتر اسی ہیئت کو اختیار کیا گیا۔اردو میں مثنوی زیادہ تر عشقیہ قصوں کے لیے مخصوص سمجھی جاتی تھی۔آزاد نے اسے مخصوص موضوعاتی دائرے سے نکال کر فطرت نگاری اور قومی و ملی شعور کے اظہار کی راہ دکھائی۔آزاد سے قبل موضوعاتی نظم کا ترقی یافتہ شعور ہمیں نظیر اکبر آبادی کی نظموں سے ملتا ہے لیکن نظیر کا نظم کا تصور بھی کلاسیکی زیادہ ہے۔اگرچہ ہیئتی اعتبار سے آزاد نے بھی زیادہ تر کلاسیکی ہیئت کو ہی اختیار کیا لیکن اس نظم کی جو کلی ساخت انھوں نے قائم کی، وہ نظیر سے قدرے مختلف ہے۔نظیر کسی ایک موضوع کو مختلف مناظر اور مختلف بندوں میں تقسیم کرتے ہیں اور اس ضمن میں کسی شعوری تناسب کو پیش نظر نہیں رکھتے لیکن آزاد کی نظموں میں بندوں کی تقسیم کا عمل زیادہ شعوری ہے۔انھوں نے مثنوی کی ہیئت کو اختیار کیا اور مثنوی کو مخمس یا مسدس کی نسبت بندوں میں تقسیم کرنا ایک جدت بھی تھی اور نظم کے تصور میں اضافہ بھی تھا۔مسدس یا مخمس میں بند ہیئتی طور پر خود بخود مرتب ہو جاتے ہیں لیکن ان میں یہ موضوعاتی تناسب قائم کرنا ممکن نہیں ہوتا کیوں کہ شاعر کو ایک ایک بات کو کئی بندوں میں بھی بیان کرنا پڑ جاتا ہے۔مثنوی کی ہیئت میں یہ سہولت

حاصل ہے کہ شاعر موضوع کے اعتبار سے بند میں اشعار کی تعداد کم یا زیادہ کرسکتا ہے اور آزاد نے اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بندوں کی تقسیم موضوع کی مناسبت سے اختیار کی۔ اگر چہ روایتی مثنوی میں بھی شاعر مختلف مناظر اور موضوعات اور قصے کے اجزا کو مختلف عنوانات کے تحت متعدد حصوں میں تقسیم کیا کرتے تھے لیکن ان کی حیثیت نظم کے بند کے بجائے قصے کے مختلف اجزا کی ہوتی تھی۔ آزاد کی مثنوی شب قدر کو سرسری نظر سے دیکھا جائے تو یہ مثنوی کی ہیئت ہی محسوس نہیں ہوتی بلکہ یہ لگتا ہے کہ شاعر نے کوئی نئی ہیئت وضع کی ہے کیونکہ پوری مثنوی چھوٹے بڑے متعدد بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلا بند پانچ، دوسرا چھے، تیسرا تین، چوتھا پانچ، چھٹا آٹھ، ساتواں چار، آٹھواں تین، نواں تین، دسواں چار، گیارہواں تین، بارہواں تین، تیرہواں چار، پندرہواں سات، سولہواں چار، سترہواں تین، اٹھارہواں پانچ، انیسواں چار، بیسواں پانچ، اکیسواں تین، بائیسواں چار، تئیسواں تین، چوبیسواں چار، پچیسواں پانچ، چھبیسواں چار، ستائیسواں پانچ اور آخری بند تین شعروں پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں بندوں میں اشعار کی تعداد کے تعین میں اتنا تنوع نہیں ہے جو ان کی بعد کی کچھ دیگر نظموں میں ملتا ہے مثلاً صبح امید کا پہلا بند انچاس، دوسرا بند دو، تیسرا بند تئیس، چوتھا بند پندرہ، پانچواں بند دس، چھٹا بند تیرہ، ساتواں بند پانچ، آٹھواں بند سترہ، نواں بند پانچ اور آخری بند گیارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کی اس طرح کی نظموں میں حب وطن، داد انصاف، وداع انصاف، گنج قناعت، ابر کرم، زمستاں، مصور تہذیب، شرافت حقیقی، سلام علیک اور جسے چاہو سمجھ لو، کے نام شامل ہیں۔ ان نظموں میں بندوں کی تقسیم میں جدت پیدا کرنے کے ساتھ آزاد نے ان کی بحروں میں بھی تنوع پیدا کیا۔ عام طور پر مثنوی کے لیے چند بحریں مخصوص سمجھی جاتی تھیں لیکن آزاد نے اس تصور کو ختم کیا اور موضوع کی مناسبت سے بحریں بھی اختیار کیں۔ یوں انھوں نے آہنگ کو خارجی عنصر کے بجائے داخلی عنصر بنا دیا اور اس کا تعلق شاعر کے فکری آہنگ سے جوڑ دیا۔ ہیئت و آہنگ کے ساتھ آزاد نے اردو شاعری کے غزلیہ و عشقیہ اسلوب کو بھی ترک کیا اور اپنے موضوع کی مناسبت سے نیا شعری اسلوب وضع کیا۔ متعدد مقامات پر ان کے شعری اسلوب پر ان کے نثری اسلوب کے بہت واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ تمثال کاری، پیکر تراشی کے جن نمونوں نے ان کی نثر میں جادوئی تاثیر دی ہے، اس کی جھلکیاں ان کے شعری اسلوب میں بھی وقتاً فوقتاً ملتی رہتی ہیں۔ سید امتیاز علی تاج نے ان کے شاعری پر اپنے مضمون میں جو قند مکرر کے طور پر مجلہ راوی آزاد نمبر(۹) میں شامل کیا گیا۔ ان کے اسلوب کی خامیوں پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود اس اسلوب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اپنے موضوع سے ہم آہنگ ہے۔ آزاد کے مذکورہ بالا ہیئتی شعور کے اثرات انجمن پنجاب کے مشاعروں میں شامل ہونے والے شاعروں ہی پر نہیں پڑے بلکہ اس کی گونج دور دور تک سنائی دی اور دیگر ادبی مراکز میں نئی شاعری کا شعور پیدا ہوا۔ یقیناً ان شاعروں پر مغربی ادب کے اثرات بھی مرتب ہوئے ہوں گے لیکن جدید نظم کے پہلے مجتہد محمد حسین آزاد کے اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس دور میں بعض شعرا ایسے بھی تھے جو لاہور کے ادبی مرکز سے دور ہونے کے باوجود انگریزی ادب اور تعلیم سے متاثر ہوئے۔ نادر کاکوروی، سرور جہاں آبادی، شرر لکھنوی، نظم طباطبائی، بے نظیر شاہ، اوج، شوق قدوائی، علم دار حسین واسطی، سید کبیر احمد، علی سجاد، عظمت اللہ خاں وغیرہ نے بہت سی طبع زاد نظمیں لکھیں اور بعض نے انگریزی نظموں کے ترجمے کیے۔ (۹)

آزاد کے اس ہیئتی شعور کے اثرات مولانا حالی پر بھی مرتب ہوئے۔ انھوں نے خود بھی اس ہیئت میں نظمیں کہیں لیکن اس کا زیادہ فائدہ انھوں نے مقدمہ شعر و شاعری میں اٹھایا۔ انھوں نے مثنوی کے ذیل میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے دلائل سے ثابت کیا کہ اس دور میں مثنوی موزوں ترین ہیئت شعر ہے۔ جس میں زیادہ سے زیادہ فطری انداز میں نئے عہد کو اس کے مسائل و معاملات کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان دلائل میں سب سے اہم دلیل قافیہ کا کم سے کم ہونا ہے۔ انھوں نے مروج پابند ہیئتوں میں سے مثنوی کو اس لیے پسند کیا کیوں کہ اس میں شاعر زیادہ آزادی سے اور فطری انداز میں اظہار پر قادر ہو سکتا ہے۔ حالی پر آزاد کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حنیف کیفی لکھتے ہیں:

جس شاعری کی ابتدا حالی نے آزاد کے زیر اثر کی تھی، اسے بعد کے شعرا نے آگے بڑھایا اور نئی نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ دیکھا جائے تو حالی کے بعد کے شعرا کی نسل حالی ہی کی اولاد معنوی ہے اور اس کا تکملہ اقبال کی شکل میں نظر آتا ہے۔ جنھوں نے خود اپنی جگہ ایک پورے عہد کے شعرا کو متاثر کیا۔ (۱۰)

آزاد کے شعور ہیئت کا سب سے زیادہ فائدہ اقبال کو ہوا کیوں کہ انھوں نے اپنی شاعری میں پابند ہیئتوں کو برتا ہے۔ ان ہیئتوں میں بھی انھوں نے غزل اور مثنوی کی ہیئت کو سب سے زیادہ استعمال کیا ہے۔ آزاد کی طرح انھوں نے بھی مثنوی کی ہیئت کو موضوع کی مناسبت سے مختلف بندوں میں تقسیم کیا۔ اگر چہ اقبال کے زمانے میں ہیئتی تجربات خصوصاً نظم معریٰ کے تجربات نے پورے شعری منظر نامے کو متاثر کیا اور آزاد نظم کے تجربات بھی ان کی زندگی کے آخری سات آٹھ سالوں میں آغاز ہو گئے تھے لیکن اقبال نے اپنی فکر کے اظہار کے لیے پابند ہیئتوں سے بہترین کام لیا۔

ہیئت کے ضمن میں آزاد کی سب سے اہم نظم ''جغرافیہ طبعی کی پہیلی'' ہے۔ اگر چہ ان کی نظم ''نو طرز مرصع'' بھی مثنوی کی ہیئت میں تبدیلی کر کے لکھی گئی ہے لیکن اسے زیادہ سے زیادہ پابند ہیئت کا تجربہ کہا جا سکتا ہے لیکن جغرافیہ طبعی کی پہیلی کو تو اردو کی پہلی معرا نظم ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اگر چہ ڈاکٹر حنیف کیفی نے اس نظم کو ہیئت کا غیر سنجیدہ تجربہ قرار دیا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ ابتدائی تجربات بعض اوقات زیادہ گہرے نہیں ہوتے لیکن دور رس نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ نظم چھے بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند میں شعروں کی تعداد مختلف ہے۔ پہلا بند چھے، دوسرا پانچ،

تیسرا انیس، چوتھا سات، پانچواں سات اور چھٹا بند پانچ شعروں پر مشتمل ہے۔ بہت چھوٹی بحر کی اس نظم کے بیشتر شعر غیر مقفی ہیں

ہنگامۂ ہستی کو — گر غور سے تم دیکھو
ہر خشک و ترِ عالم — صنعت کے تلاطم میں
جو خاک کا ذرہ ہے — یا پانی کا قطرہ ہے
حکمت کا مرقع ہے — جس پر قلم قدرت
انداز سے ہے جاری — اور کرتا ہے گل کاری
اک رنگ کہ آتا ہے — سو رنگ دکھاتا ہے [۱۱]

اس بند میں تیسرا، پانچواں اور چھٹا شعر ہم قافیہ ہے۔ دوسرے بند میں آخری شعر ہم قافیہ ہے۔ تیسرے اور سب سے طویل بند میں چھٹا، ساتواں اور سولہواں شعر ہم قافیہ ہے۔ ہم قافیہ اشعار بھی کسی خاص ترتیب سے نہیں لائے گئے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ نظم کی روانی میں قافیہ غیر شعوری طور پر خود بخود آ گیا ہے۔ نظم معریٰ کی پہلی کاوش طور پر یہ نظم اہمیت کی حامل ہے اور جدید اردو نظم میں سمت نما کا کام دے رہی ہے۔ آزاد کی اس نظم نے اردو نظم میں آئندہ آنے والی تبدیلیوں کا در وا کیا۔

آزاد جس درجے کے شاعر تھے، ان سے زیادہ شعری مقام کے حامل شعرا بھی آج ہمارے لیے اتنے برمحل نہیں ہیں جتنے آزاد ہیں کیوں کہ انھوں نے کسی بنی بنائی روایت میں اعلیٰ درجے کے شعر کہنے کے بجائے اردو کی جدید شعری روایت کی تشکیل کا کام آغاز کیا اور ان معنوں میں وہ روایت ساز شاعر تھے۔ جدید نظم کی روایت پر کام کرنے والے ہر نقاد کو لامحالہ انھیں سے آغاز کرنا پڑتا ہے۔ یوں وہ اعلیٰ درجے کی شاعری نہ کرنے کے باوجود کئی اعلیٰ درجے کے شاعروں سے زیادہ اہم ہیں اور ان کی یہ اولیت و اہمیت ہمیشہ قائم رہے گی۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر محمد صادق، آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین، مجلس ترقی ادب، لاہور
۲۔ محمد حسین آزاد، نظم آزاد، مرتبہ آغا محمد باقر، شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور ۱۹۴۷ء، ص ۲۴-۲۵
۳۔ ایضاً، ص ۳۵-۳۶
۴۔ ڈاکٹر محمد صادق، آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین، مجلس ترقی ادب لاہور
۵۔ الطاف حسین حالی، کلیات نثر حالی، مجلس ترقی ادب لاہور

۶۔ ڈاکٹر عارف ثاقب، انجمن پنجاب کے مشاعرے، الوقار، ۱۹۹۵ء، ص ۱۹-۲۰

۷۔ ڈاکٹر ممتاز گوہر، پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا، مغربی پاکستان اردو اکادمی، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۴۴

۸۔ مجلہ راوی، محمد حسین آزاد نمبر، سالنامہ ۱۹۸۳ء، ص ۶۱

۹۔ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، دیگر شعرا مضمون مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، جلد نہم، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۷۲

۱۰۔ ڈاکٹر حنیف کیفی، اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی، ۱۹۸۲ء، ص ۵۰

۱۱۔ محمد حسین آزاد، نظم آزاد، ص

شعرِ آزاد کی فنّی جہات

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین

مولانا محمد حسین آزاد کی شاعری کو ان کی نثر کے مقابلے میں کم موضوعِ تنقید بنایا گیا۔ اگر ان کی شاعری کو اہمیت دی بھی گئی تو ناقدینِ آزاد کی غالب توجہ مثنویات و منظومات کی جانب زیادہ رہی۔ خود آزاد نے قدرے عاجزانہ مگر بے حد شاعرانہ رنگ میں اس حوالے سے لکھا ہے:

میں نثر کے میدان میں بھی سوار نہیں، پیادہ ہوں اور نظم میں خاک افتادہ، مگر سادہ لوحی دیکھو، ہر میدان میں دوڑنے پر آمادہ ہوں۔ (۱)

یہ درست ہے کہ کلامِ آزاد کی شعری قدر و قیمت اُن کی نثر خصوصاً تمثیلی و تخئیلی طرز پر لکھے گئے مضامین و موضوعات کے سامنے کچھ زیادہ نہیں ہے، لیکن اُن کی شاعری کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا ـــــ خاص طور پر غزلیاتِ آزاد کے فنی و شعری مطالعے کی روشنی میں آزاد کے نثری اسلوب کی تفہیم ضروری ہے۔ ان غزلوں میں ان کے شعری مزاج کی وہ تمام تر جھلکیاں موجود ہیں جن کی نمود زیادہ جامعیت و اکملیت کے ساتھ اُن کی نثری نگارشات میں ہوئی ہے ـــــ آزاد کے اسلوبِ منثور میں تین بنیادی حیثیات نے زیادہ اعتبار و وقار حاصل کیا جن میں سرِفہرست انشا پردازی کا وصف ہے جس کے پیشِ نظر انھیں مہدی افادی نے 'اول و آخر انشا پرداز' بھی کہا جب کہ دوسرے امتیازی اوصاف میں تمثیل نگاری اور مرقع کشی شامل ہیں جن کی وساطت سے مولانا نے اثر انگیز، جذبہ آمیز اور تخیل خیز نثر کے نمونے تخلیق کیے۔ آزاد کی غزلیہ شاعری میں فنی و شعری اعتبار سے ایسے محاسن موجود ہیں جو اکثر و بیش تر روایتی و اکتسابی ہونے کے باوصف نثرِ آزاد کی متذکرہ تینوں صورتوں یعنی انشا پردازی، تمثیل نگاری اور مرقع کشی کی صورت گری میں بھرپور طور پر دخیل ہیں۔ چناں چہ ان کے نثری مقام کی پہچان اور دریافت میں ان وسائل شعری کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

آزاد ایک بے مثل انشا پرداز تھے۔ زبان و بیان پر ان کی بھرپور گرفت تھی۔ انھوں نے جس طرح اپنی نثر

میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے ہیں اور روز مرہ و محاورات، رعایات و تناسبات اور لفظیات و مرکبات کے موثر استعمال پر جس قدر ان کی نظر ہے، اس میں کلام نہیں۔ آزاد 'رعایت لفظی کا بادشاہ' کہلائے (۲) اور ان کی زبان کی شستگی و شائستگی معیارِ نثر ٹھہری۔ ایجاز و بلاغت، رمزیت وایمائیت اور علوم معانی و بیان اور بدیع کی پیش کش میں وہ ممتاز نظر آتے ہیں ___ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو انشا پردازی کے یہ تمام پہلو بنیادی طور پر شعری خصائص ہیں جن کی نمود مولانا نے زیادہ اثر انگیزی کے ساتھ نظم کے بجائے نثر میں کی ہے۔ آزاد کی شاعری بہت اعلیٰ درجے کی نہ سہی لیکن ان کے اختیار کردہ وسائل شعری نے انھیں وقار ضرور بخشا ہے۔

غزلِ آزاد کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ آزاد کی شعری لفظیات میں نیا پن نہیں ہے۔ وہ جابجا روایتی ذخیرۂ الفاظ سے استفادہ کرتے ہیں جو اکثر اوقات گراں گزرتا ہے۔ بعض مقامات پر تو وہ ایک ہی غزل میں لفظی تکرار سے بے جا کام لیتے ہیں اور یہ صورت اس وقت مزید معیوب لگتی ہے جب پڑھنے والا ان لفظوں میں کوئی خاص کشش، لطافت یا شعریت محسوس نہیں کرتا۔ ایسے الفاظ ارتباطِ فکر و معنی سے قاصر نظر آتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر کو محض پہلے انتخاب میں پسند آگئے اور اس نے مزید غور و خوض کرنے کے بجائے ایک ہی غزل میں ان کی بھرمار کر دی ہے ___ تاہم ترکیباتِ آزاد کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آزاد نے ترکیب سازی میں روایتی و کلاسکی صورتیں بھی ترتیب دی ہیں اور بعض نادر اور اچھوتی ترکیبیں بنائی ہیں۔ یہ اضافی و عطفی بھی ہیں اور امتزاجی اشکال میں ڈھل کر لطفِ مزید پیدا کرتی ہیں۔ طویل ترکیبوں کی صورت میں بعض اوقات پورے مصرعے میں ڈھل کر ترکیبی حسن متاثر کرتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں ان کے بھونڈے استعمال سے لطافتِ بیان مجروح ہوتی ہے ___ فنی نوعیتوں کے اعتبار سے یہ ترکیبیں زیادہ تلمیحی و تنزیہی، تشبیہاتی و استعاراتی، تمثیلی و تمثالی اور طنزیہ و تعریضی مزاج کی حامل ہیں۔ اس سلسلے میں نگاہِ باز پسیں، گردونِ بدنہاد، زلفِ چلیپا، توسنِ جنوں، شہرۂ حسن و گمنامیِ عشق، کوے سلامت روی، کوچۂ زلفِ دوتا، کجلۂ کشورِ حسن، روشِ اشکِ ندامت، یمنِ قدوم، دستِ ساقیِ مہوش، سنگِ حادثۂ محتسب، مصرعۂ قامت، ریشِ شعاع، نخلِ آہ، کتابِ طولِ امل، فیضِ بہار و ریزشِ ابرِ بہار، خسروِ گردوں نشاں، تبسمِ زیرِ لبی، آبگینۂ شرع، زلفِ شب رنگ، کیسۂ غنچہ، رہِ یاس، آشیاں گیر، چشمِ فسوں گر، چرخِ نیلی فام، رنگِ روُ سیاہی، کمندِ آہ، طرۂ مشکیں، پاسنگِ حُب و کیں، درہ التاج، رشکِ چشمۂ آبِ بقا، آہِ شعلہ بار، کعبۂ ابرو، دیوارِ قہقہا، طفلِ سرشک، کشتیِ گردوں، حجابِ اکبر، دل داریِ یگانہ و بیگانہ، شرم سارِ قُم، پارۂ مصحفِ دل ___ جیسی متعدد اثر انگیز ترکیبوں نے آزاد کی ترکیب سازی کو پُرکشش بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ذوق سے فیضان اندوزی کے باعث غزلیاتِ آزاد میں محاورات کا کثرت سے استعمال ملتا ہے۔ صرف غزلوں ہی میں کم و بیش دو سو (۲۰۰) محاورات موزوں ملتے ہیں جن میں معروف اور غیر معروف دونوں طرح کے

محاورے شامل ہیں۔ یہ درست ہے کہ بیش تر یہ محاورات روانی و بے ساختگی سے پیوند شعر ہوئے ہیں لیکن جہاں کہیں وہ ایک ہی شعر میں دو دو تین تین محاورے لے آتے ہیں، وہاں لطافتِ بیان متاثر ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر شعوری کاوش کا اشتباہ ہوتا ہے اور معنی کی دل پذیری پر حرف آتا ہے، لیکن چوں کہ محاورات کو سمونے کا تناسب زیادہ ہے، اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ اکثر محاورات بے ساختگی سے استعمال ہوئے ہیں، جیسا کہ ذیل کے اشعار (۴) سے ظاہر ہے:

یہ دستِ آرزو نہ ہوئے اُس گلے کا ہار
حسرت ہے ہاتھ ہم یوں ہی ملتے چلے گئے
(ص ۱۱۱)

تمھارے در پہ جو بیٹھے ہیں پاؤں پھیلائے
کبھی وہ ہاتھ اُٹھا کر دُعا نہیں کرتے
(ص ۱۰۶)

سمجھتے جس کو تھے ہم یارِ مہرباں اپنا
غضب ہے آج وہی ہے وبالِ جاں اپنا
(ص ۵۵)

غرض کے بندے ہیں، کرتے ہیں ہم سلام بہت
تمھیں تو کام نہیں ہیں، ہمیں تو کام بہت
(ص ۶۷)

آزاد کو تشبیہات و استعارات برتنے کا بہت لپکا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ اُن کی نثر میں استعارے کو خصوصیت کے ساتھ اہمیت حاصل ہے۔ جس بے مثل انداز سے انھوں نے اپنی نثر میں استعارہ در استعارہ کا استعمال کرتے ہوئے دل کش کردار تشکیل دیے ہیں یا پھر استعاراتی بیان سے اپنی تحریروں میں تمثیلی و تجسیمی رنگ ابھارا ہے اس سے ان کی اس شعری خوبی سے دل چسپی ظاہر ہوتی ہے۔ پھر جہاں آزاد کی نثر سرتاسر استعاراتی نثر ہے وہاں ان کی تشبیہوں کا عالم بھی سب جانتے ہیں۔ انھوں نے مرکب تشبیہوں سے اپنی نثر کو عجیب و غریب تخیلاتی اُپج دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ شعری وسائل ہیں اور آزاد کے شعری مزاج کے باعث ہی نثر میں اس قدر پُر اثر اظہار ممکن ہو سکا۔ آزاد کی غزلوں میں تشبیہات و استعارات کی طرف توجہ بہت زیادہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں زیادہ تر روایت سے اخذ و استفادے کا رجحان ملتا ہے، چند شعر اس مزاجِ شعری کی توضیح میں درج کیے جاتے ہیں:

چھوڑے ہے جیتے جی کوئی اُس زلف کا خیال
بے ڈھب ہے دل کے پیچھے یہ کالی بلا لگی
(ص ۱۱۴)

اشکوں نے برسات لگائی
آنکھیں ہیں یا جھرنا ہیں
(ص ۱۰۴)

ہزاروں قافلے حسرت کے دشتِ غربت میں
ہمارے خانۂ دل میں مقام کرتے ہیں
(ص ۹۷)

اُس سرو قد کے عارضِ گل گوں کو دیکھنا
کیا گل کھلا ہے شاخِ صنوبر کی نوک میں
(ص ۹۲)

دکھا کے سبزۂ جنت کے باغِ سبز آزاد
غزالِ نفسِ رمیدہ کو رام کرتے ہیں
(ص ۹۷)

فلک پر گیا اُڑ کے شعلہ زمیں کا
یہ نالہ تھا کس کے دلِ آتشیں کا
(ص ۳۲)

آزاد کا اصل میدان محسّناتِ شعر سے کلام کو ارفعیت بخشنا ہے۔ صنائع بدائع لفظی و معنوی تو ان کے نثری اسلوب میں بھی نو بہ نو صورتیں اختیار کرتے ہیں لیکن شاعری میں کچھ اور ہی عالم ہے۔ اس سلسلے میں صنعتِ تجنیس، صنعت طباق، صنعتِ مراعاۃ النظیر، صنعتِ حسنِ تعلیل، صنعتِ لف ونشر، صنعتِ ایہام، صنعتِ تصلیف اور صنعتِ تلمیح ان کے ہاں خصوصیت کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ان صنعتوں کا استعمال انھوں نے بڑے تواتر اور بے ساختگی کے ساتھ کیا ہے۔ انھیں اس سلسلے میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے اور زیادہ تر تصنع کے بجائے روانی اور ساختگی کے بجائے بے ساختگی کا حصول ہوا ہے۔ دیگر صنائع لفظی و معنوی میں صنعتِ تکریر یا تکرار، صنعتِ ترجمۃ اللفظ، صنعتِ ملمّع، صنعتِ تضمین، صنعتِ سوال و جواب، صنعتِ استفہام، صنعتِ جمع اور صنعتِ سیاقۃ الاعداد شامل ہیں جب کہ

ملحقاتِ سرقہ کی ذیل میں ان کے ہاں 'اقتباس' اور 'ارسال المثل' کی طرف توجہ ملتی ہے۔ آزاد کے شعری موضوعات روایتی واکتسابی ہونے کے باوجود ان صنعتوں کی وساطت سے چمک اٹھتے ہیں۔ مزید برآں لفظی وترکیبی محاسن نے کلام کی دل کشی بڑھا دی ہے، یہاں اولاً جزوی طور پر مستعمل صنائع بدائع کا رنگ ملاحظہ کیجیے:

صنعتِ ترجمۃ اللفظ:

صبا سے غنچۂ خاطر کھلے گا کیا ساقی
گرہ تو دل کی کھلے جب کھلے سرِ مینا
(ص ۶۱)

صنعتِ سیاقۃ الاعداد:

کیا غضب ہیں تری اے تُرکِ جفا کار آنکھیں
دو ہی کر دیتی ہیں ہو جاتی ہیں جب چار آنکھیں
(ص ۸۷)

صنعتِ ملمع/تلمیع:

قرار بر کفِ آزادگاں نہ گیرد مال
جو ایک پائے تو کیا اور اڑے ہزار تو کیا
(ص ۴۷)

صنعتِ تکرار/تکریر:

شبِ وصال عجب شے ہو جس میں شکوہ ہو
نہ ہم کو یاد رہا ہے، نہ اُس کو یاد رہا
(ص ۳۶)

صنعتِ مقابلہ:

کہاں تم کہ گل ہو نسیم و صبا کے
کہاں ہم کہ بیٹھے ہوا دیکھتے ہیں
(ص ۷۷)

صنعتِ عکس (مقلوب مستوی)

اِدھر حُسن و عشق آئے ہیں کر کے وعدے

ہمارا تمھارا، تمھارا ہمارا
(ص۳۸)

صنعتِ سوال وجواب:

عدو کی بات نہ ہو یہ کبھی نہیں ہوتا
جو ہم نے چاہا تو بولے یہی نہیں ہوتا
(ص۴۰)

صنعتِ استفہام:

وہ کون ہے کہ ہم کو نہ جس نے بُرا کہا
پوچھو تو خامشی سے بھلا ہم نے کیا کہا
(ص۴۲)

صنعتِ جمع:

زلفِ شب رنگ کا سایہ وہ بلا ہے جس پر
نہ چلے سحر، نہ منتر، نہ فتیلا تعویذ
(ص۶۹)

تضمینِ مترجم (بہ صورتِ تأبید):

جہان و کارِ جہاں کس نے ہیں تمام کیے
اُٹھو یہاں سے کہ اب ہو گئی ہے شام بہت
(ص۶۸)

جیسا کہ ذکر ہوا کہ صنعتِ تجنیس، صنعتِ طباق، صنعت مراعاۃ النظیر، صنعتِ حسنِ تعلیل، صنعتِ مبالغہ، صنعتِ ایہام، صنعتِ لف ونشر اور صنعتِ تصلیف آزاد کے کلام میں کثرت سے برتی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں تجنیس و طباق اور ان کی متعلقہ صورتیں تو کم وبیش ہر دوسرے شعر میں ہیں۔ تجنیسات میں ناقص وزائد اور خطی وصوتی اور طباق میں ایجابی وسلبی ہر دو میں وہ اس قدر دل چسپی دکھاتے ہیں کہ لفظیات و کیفیات کی جتنی فطری متضاد صورتیں ہو سکتی ہیں، ان کے ہاں مستعمل ہیں بل کہ اس حوالے سے بہت سے مقامات پر جمع آوری احساس ہونے لگتا ہے۔ البتہ ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں فطری روانی برقرار رہی ہے، جیسے اولاً تجنیسی انداز دیکھیں:

ہمارے دل کی تو دل دار تک ہے دل داری

جو وہ نہ دل کو سنبھالے تو دل کہاں اپنا
(ص۵۵)

بلا سے دشمنِ جانی مرا سارا جہاں ہوتا
کسی صورت سے اے جانِ جہاں تو جانِ جاں ہوتا
(ص۵۷)

عالم خیالِ دل کا ہے باہر مثال سے
پوچھیں گے حال جا کے کسی اہلِ حال سے
(ص۱۰۹)

نہ کی بات اور ہو گئے سب سے وعدے
یہ اک ناز ہے اُس بُتِ نازنیں کا
(ص۳۳)

ثانیاً طباقِ ایجابی وسلبی کے حوالے سے شعر دیکھیے:

پاس تم ہو اگر نہیں تو نہ ہو
اے بتو! کیا نہیں خدا میرا
(ص۵۶)

نہ وہ ناز سے یاں ہیں آنے کے قابل
نہ ہم ضعف سے واں ہیں جانے کے قابل
(ص۷۰)

یاد رہے کہ آزاد صنعتِ مراعاۃ النظیر کو کلاسیکی مزاج کے عین مطابق طباق و تضاد کے ساتھ بہت مہارت کے ساتھ کھپاتے ہیں اور اکثر و بیش تر روایتی اشعار کی طرح ان کے کلام میں دونوں صنائع ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ ان کے پسندیدہ تلازمات میں گریہ وزاری، حسن و عشق اور بہار و گلستان کے متعلقات شامل ہیں اور ایسے تناسبات و رعایات کو برتتے ہوئے ان کا رنگِ سخن کچھ اس طرح ہے:

میں وہ سینہ سپر ہوں مُنہ نہ موڑوں تیرِ باراں سے
تری ترکش میں صید افگن بھلا پیکان کتنے ہیں
(ص۸۶)

آنکھ کی خوش نظری ہے کہ ہو تو نورِ نظر
جب نظر ہی نہیں ان میں تو ہیں بیکار آنکھیں
(ص۸۹)

کون سا گل نہیں گلشن میں کہ اے بادِ صبا
آج سنتے نہیں ہم مرغِ گلستان کی تان
(ص۹۸)

چمنِ بزم سے آنکھوں نے لیا رنگِ سرور
سُرمہ کیا دیتا یہ اے نرگسِ شہلا تھا مجھے
(ص۱۰۵)

تمھاری زلف کو تھے باندھتے پریشاں ہم
سو دامن آج لیے تار تار بیٹھے ہیں
(ص۹۵)

آزاد کی غزلوں میں حُسنِ تعلیل کا رنگ ڈھنگ وہی ہے جو ماقبل کی شعری روایت میں ملتا ہے تاہم بعض مقامات پر انھوں نے اپنی فطری تخئیلی صلاحیت سے اس میں نئے رنگ شامل کرنے کی کاوش کی ہے۔ یہاں وہ تمثیلی انداز میں اپنے نقطۂ نظر میں دلالتِ شعری کا اظہار کرتے ہیں:

خرامِ ناز سے ٹھکرا کے تو نے اے بُتِ کافر
دماغ عرش پہ پہنچا دیا غبارِ زمیں کا
(ص۳۰)

یقیں ہے، بحر بھی اس غم میں ہوگا خاک پہ غلطاں
کہ اس کی یاد میں دل ٹوٹتا ہے دُرِ ثمیں کا
(ص۳۰)

صنم ہے گردشِ عالم نگاہِ مہر سے تیری
اگر تو مہرباں ہوتا تو عالم مہرباں ہوتا
(ص۵۸)

خدا جانے کیا تم نے سُرمے میں ڈالا

کہ آنکھوں میں کالی گھٹا دیکھتے ہیں

(ص ۷۵)

آزاد کی مبالغہ آمیزی اور تخیلاتی طبیعت کا موثر اظہار صنعتِ مبالغہ کی صورت میں ہوا ہے۔ یہ صنعت انھیں بے حد مرغوب ہے اور انھوں نے اس کے تینوں درجات یعنی تبلیغ، اغراق اور غلو سے حسن وعشق کے معاملات، وعظ ونصیحت کے امور اور حیات ومسائلِ حیات کا پُر تاثیر بیان کیا ہے۔ آزاد کا انائی لب ولہجہ اور پُر شکوہ اسلوب اس صنعت میں جاذبیت پیدا کر دیتا ہے، مثلاً:

میں اختر ہوں پر آفتابِ فلک ہوں
کہ دل خاکِ در ہے کسی مہ جبیں کا

(ص ۴۳)

معجزۂ حُسن سے ساقی کے عجب کیا ہے اگر
شاخِ موجِ مئے لعلیں ہو ہری شیشے میں

(ص ۹۱)

جہاں تک ان کے ایہامی اشعار کا تعلق ہے، ان میں ایک مقبول رنگ تو وہی ہے جس کے تحت انھوں نے اپنے تخلص کی رعایت سے وہم واشتباہ کی صورت پیدا کی ہے جب کہ دوسرا انداز بھی قدرے روایتی واکتسابی ہے جس کی رو سے وہ کسی ایہامی لفظ پر مطالب شعر کی بنیاد اُستوار کرتے نظر آتے ہیں، مثلاً لکھتے ہیں:

نہ سمجھو وادیِ وحشت میں تم ہمیں آزاد
ہم اپنے جوشِ جنوں سے ہجومِ عام میں ہیں

(ص ۷۹)

آج تک کہتا تھا عالم جسے مجموعۂ دل
یہ تو سی پارہ بھی اوراقِ پریشاں نکلا

(ص ۵۴)

نظر بھر کے دیکھا نہ دل کو کسی نے
یونہی رہ گیا آہ! سودا ہمارا

(ص ۳۸)

صنعت لف ونشر کے سلسلے میں آزاد نے مرتب صورت کی طرف زیادہ توجہ کی ہے۔ وہ ایک شعر میں بھی اس

محسنۂ شعری کو برتتے ہیں اور مسلسل اشعار میں بھی اس کا استعمال ملتا ہے۔ انھوں نے اس کے ذریعے تضاد و تقابل کی فضائیں ترتیب دینے میں خاصی معاونت لی ہے اور کہنا چاہیے کہ یہ شعرِ آزاد کا ایک محبوب حربہ ہے، چند شعر دیکھیے:

سچ ہے اک جا پہ بہم کیوں کہ رہیں دو بیمار
مرا بیمار ہے دل اُن کی ہیں بیمار آنکھیں
(ص ۸۹)

حرم میں شیخ ہیں اور مست دورِ جام میں ہیں
وہ اپنے کام میں ہیں اور یہ اپنے کام میں ہیں
(ص ۷۸)

نہ نکلا قول فیصل اختلافِ رند و زاہد میں
کہ جو سمجھا وہ در پردہ، وہ اُس نے برملا دیکھا
(ص ۶۰)

آزاد کے انانیت پسند مزاج کی جھلکیاں صنعتِ تصلیف کی شکل میں نمود کرتی ہیں اور وہ اسے مقطعوں میں اپنانے کے علاوہ دوسرے شعروں میں بھی اپناتے ہیں۔ دیکھیے ذیل کے اشعار میں اپنے شعری رتبے اور ذات کو کس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں:

دم بخود رہ گئے مرغانِ چمن گلشن میں
لیکن آزاد اُدھر ہو کے غزل خواں نکلا
(ص ۵۴)

آزاد بزمِ دہر میں کہتے ہیں جس کو شعر
بلبل نے ہے چمن میں اُسے زمزما کہا
(ص ۴۳)

غزل تو پڑھتا ہوں میں لب ہوئے ہیں آپ کے بند
بہا قلم سے کہیں میرے انگبیں تو نہیں
(ص ۸۴)

آئے یوں گلشنِ بزمِ شعرا میں آزاد

صبح دم جیسے کہ گل زار میں آتی بلبل

(ص۷۳)

خدا کے واسطے آزاد روکو نالۂ دل کو

کہ کوئی آن میں کون و مکاں ہے لامکاں ہوتا

(ص۵۸)

صنائع بدائع کے ضمن میں آزاد صنعتِ تلمیح کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور زیادہ تر ان کے ہاں بے ساختگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے شعر پارے طنزیہ پیرایے میں مرقوم ہیں اور وہ بڑے جان دار اُسلوب میں مسلمات کو جھٹلاتے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں سدرہ و جبریل امین، موسیٰ و فرعون اور سامری، یوسف و مسیح، منصور حلاج ـــــ فریدون و فغفور، جمشید و سکندر، مجنون و لیلیٰ اور فرہاد و قیس کی تلمیحیں فرداً فرداً موجود ہیں جب کہ امتزاجی تلمیحوں کی جانب ان کی توجہ نہیں ہے۔ 'جبریل امیں' کی تلمیح تنزیہی رجحان کی حامل ہے اور اسے حُسنِ محبوب میں اضافے کے لیے مستعار لیا گیا ہے۔ 'سنگِ موسیٰ' جفائے محبوب سے منسلک ہے جب کہ عیسیٰ کی مسیحائی اور شفایابی سے انھوں نے یہ پہلو ابھارا ہے کہ عاشق بسترِ مرگ سے کبھی اچھا ہو کر نہیں اٹھتا، یہاں تک کہ مسیحا نادم ہو کر بالیں سے اٹھ جاتا ہے۔ چناں چہ 'مسیحا دم' کی استعاراتی ترکیب محبوب کے واسطے آئی ہے کہ عشاق اس کے کوچے میں جانا درد کی دوا جانتے ہیں۔ اسی طرح 'سامریِ عصر' کی تلمیحی ترکیب فرعون کی نخوت و نکبت کا استعارہ ہے جو محبوب کے لیے مستعار ہے۔ 'عمرِ نوح'، 'حُسنِ یوسف' اور 'بازارِ مصر'، حُسنِ محبوب کی فزوں تری کے اظہار کے لیے آئے ہیں، اس ضمن میں اشعار دیکھیے:

صنم جو روے کتابی کا تیری وصف ہو انشا

سبق ہو مکتبِ سدرہ میں جبریلِ امیں کا

(ص۳۱)

مریضِ عشق مرض کی دوا نہیں کرتے

مسیح کی بھی کبھی التجا نہیں کرتے

(ص۱۰۶)

تمھاری جنبشِ لب کر گئی مسیحائی

ہزار شکر کہ ہم شرم سارِ قم نہ ہوئے

(ص۱۱۷)

نہیں کرتے جو مسیحائی ہماری نہ کرو

پر تم اپنی تو خبر لو کہ ہیں بیمار آنکھیں

(ص۸۸)

اللہ رے چرخِ پیر کہ اک اک قدم پہ سو

فرعون اُٹھتے ہیں تری نخوت کی چال سے

(ص۱۰۹)

دیکھتا آئینۂ دل میں جو یُوسف یہ جمال

محوِ حیرت ترا اے حُور شمائل ہوتا

(ص۵۲)

آمد آمد ہے یہ کس یوسفِ مصری کی آج

سرِ بازار بچھائے ہیں خریدار آنکھیں

(ص۸۷)

خالص ادبی روایات پر مبنی تلمیحوں کے ضمن میں آزاد نے لیلیٰ و مجنوں، فرہاد و شیریں اور سکندر و آبِ حیات کا اطلاق حُسنِ محبوب اور وصلِ محبوب کے موضوعات پر کرتے ہوئے اس طرح کے روایتی شعر رقم کیے ہیں:

کیا تماشا تھا کہ صحرائے جنوں میں مجنوں

پردۂ چشم ترا پردۂ محمل ہوتا

(ص۵۲)

ہم تو قیس و کوہکن کے بھی تماشے دیں بُھلا

لیلیٰ و شیریں سا کوئی دیکھنے والا تو ہو

(ص۹۹)

لعلِ تر دیکھ کے آئینے میں ہو گرمِ سخن

ہووے تا چشمۂ صد آبِ بقا آئینہ

(ص۱۰۱)

منصور حلاج کی تلمیح مسلمہ حقائق کو جھٹلانے کے کلاسیکی زاویے کی پیش کش کرتی ہے جب کہ تاریخ غیر مسلم کی ذیل میں 'فرِ فریدوں'، 'شوکتِ فغفور'، 'آئینۂ سکندری' اور 'جامِ جم' وغیرہ کو واعظانہ و ناصحانہ رنگ میں زیرِ تلمیح لایا گیا ہے، جیسے:

نہ کریں مر کے بھی ہم رازِ محبت افشا
تھا وہ منصور ہی کم ظرف جو چلا اُٹھا
(ص۴۹)

سُبک سروں سے یہ کہتی ہے فرِ افریدوں
شرف یہ نوکِ کُلاہِ ذری نہیں ہوتا
(ص۴۱)

نگارِ مُلکِ فنا پر بھی ہے نظر فغفور؟
نگارخانۂ ہستی ہے، مُلکِ چیں تو نہیں
(ص۸۳)

شکلِ اسکندر نہیں آتی کسی صورت نظر
دیدۂ حیرت ہے آنکھ آئینۂ فولاد کی
(ص۱۲۴)

جام تھا بہرِ جم آئینہ پئے اسکندر
پر دیا تجھ کو بھی خالق نے ہے کیا آئینہ
(ص۱۰۰)

شعرِ آزاد کی اُن شعری وفنی جہات میں جن کی وساطت سے مولانا آزاد کے نثری اُسلوب کے دوسرے نمایاں زاویے نے تقویت حاصل کی ہے، شعری تمثیلوں، مکالماتی رنگ وآہنگ، متنوع لب ولہجے، اقوال وامثال کے اظہاراور علامتی پیرایۂ بیان کواہم گردانا جاسکتا ہے۔غزلیاتِ آزاد میں نیرنگِ خیال کے سے تمثیلی نقوش موجود ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ان میں رفعتِ خیال اورادائی بیان قدرے فروتر ہے۔آزاد کی جادوکارانشاپردازی بڑی حد تک تجسیمی وتمثیلی عناصر کی رہینِ منت ہے۔ان کلیدی پہلوؤں کوانھوں نے اپنی غزلیہ شاعری میں نبھانے کی کوشش کی ہے۔خصوصاً یہاں ان کی توجہ مجرد کی تجسیم کی طرف ہے۔وہ اعضا کی مصوری بھرپور تجسیمی حسن کے ساتھ کرتے ہیں اور بعض مقامات پراس حوالے سے متحرک پیکرتشکیل ہو پائے ہیں۔آزاد کی غزلوں میں تمثیل نگاری کاایک اہم پہلووہ ہے جس کے تحت انھوں نے چرند وپرند کاذی شعورافراد پر قیاس کرتے ہوئے اپنے کلام کی دل پذیری کوفزوں تر کردیا ہے۔مجرد کی تجسیم پرمبنی اشعار میں حکمت ودانش کے جواہر ریزے تمام تر شاعرانہ استدلال کے ساتھ موزوں ہوئے ہیں۔یہ محض پیکرِ شعری نہیں بلکہ ان سے کلاسیکی شاعری کے روایتی واکتسابی رنگِ سخن کی تمام تر معنویت مترشح ہے۔

آزاد فطرت کے مناظر پر مبنی تجسیمات تشکیل دیتے ہیں اور اس سلسلے میں صبا و ہوا، خار و گلشن، نسرین و نرگس، شبنم و شگوفے اور گل و بلبل کے تناسبات قائم کرتے ہوئے ان مظاہر قدرت نے مجسم وجود کی حیثیت اختیار کرلی ہے جو فی نفسہٖ پُرتحرک بھی ہے ـــــ یاد رہے کہ ان تجسیمی شعر پاروں میں انھوں نے تشبیہ و استعارہ، روزمرہ و محاورہ، تجنیس و تضاد اور مراعاۃ النظیر و حُسنِ تعلیل کی شمولیت سے خاطر خواہ رنگ آمیزی بھی کی ہے۔ مثلاً غزلیاتِ آزاد سے چند شعر ملاحظہ ہوں جو متذکرہ پہلوؤں کی توضیح کرتے ہیں:

اس پہ مرتا ہوں کہ جوہر سے تری تیغ کی آب
مار کر آنکھ سُوئے آبِ بقا ہنستی ہے
(ص ۱۲۱)

وحشی تمھاری جنبشِ مژگاں کے دھیان میں
دیوارِ قہقہا تک اُچھلتے چلے گئے
(ص ۱۱۱)

جو اُفتاد آتی ہے کہتی ہے ہنس کر
کہ مضموں ہوں مَیں اُن کی چینِ جبیں کا
(ص ۳۴)

گھورے ہے ایک ایک کو آنکھیں نکال کر
نرگس کو بھی چمن میں یہ آ کر ہوا لگی
(ص ۱۱۴)

رہِ یاس پر بیٹھے گُل ہائے گلشن
تری راہ بادِ صبا دیکھتے ہیں
(ص ۷۶)

شبنم کے موتی صبح پہ روئے بہ گوشِ گُل
میرا بھی حال تھا کبھی بادِ صبا کہا
(ص ۴۳)

ناخنِ خار آ کے خود عقدہ ترا کر دے گا وا

پہلے پائے شوق میں پیدا کوئی چھالا تو ہو

(ص۹۹)

کیا صبا پھونک گئی کان میں اے بلبلِ راز
ہے شگوفے سے جو ہنستا گلِ خنداں نکلا

(ص۵۳)

ہم تو خیالِ یار کے گھر ہجر میں رہے
اپنی کہو کہ حضرتِ دل تم کدھر رہے

(ص۱۲۸)

آزاد کی شعری تمثیلوں نے اقوال و امثال کی شمولیت سے تلقینی رنگ اختیار کیا ہے۔ یہ بھی غالباً ذوق سے اثر پذیری کا نتیجہ ہے کہ وہ بڑے سادہ اُسلوب میں نکتہ وری کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس مثالیہ عنصر کی شمولیت سے ان کے ہاں پہلوداری کا وصف اُبھرا ہے اور ایسے اشعار ان کی نفسیاتی ژرف بینی پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ یہاں آزاد انسانی فطرت کے نباض اور خاصے زمانہ شناس دکھائی دیتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ نفسِ انسانی کے ساتھ ساتھ حیاتِ انسانی کے اُتار چڑھاؤ پر ان کی خاصی نظر ہے ___ اور یہ امر ثابت ہے کہ تمثیلی اُسلوب ایسے حِکمیہ پہلوؤں سے تقویت پکڑتا ہے، مثلاً آزاد لکھتے ہیں:

نگیں میں دیکھیں ذرا رنگِ رُوسیاہی کو
نشاں اُڑاتے جو شہرت کے ننگ و نام میں ہیں

(ص۷۹)

قدم قدم پہ نظر چاہیے چلے ہو کہاں
لگائے بیٹھا کوئی دیکھنا کمیں تو نہیں

(ص۸۰)

یہ کیسے دل ہیں کہ خوفِ خدا ذرا بھی نہیں
جو دیکھو چشمِ مروّت تو آشنا بھی نہیں

(ص۸۴)

یاد رہے کہ آزاد کے تمثیلی اُسلوب کی تشکیل میں ان کے بعض شعری لہجے بھی دخیل ہیں ___ شوخیہ وطنزیہ لہجہ ہو کہ استفہامیہ و استعجابیہ، انکاری ہو کہ اثباتی، مفکرانہ ہو یا شاعرانہ، خبریہ ہو کہ نظریہ، تحیرآمیز ہو یا تصلیفی وفخریہ ___ یا

پُرواسوخت نما اور کٹیلا ــــ کوئی لحن اگر شعرِ آزاد میں حاوی ہے تو وہ بلند بانگ اور پُرشکوہ آہنگ ہے، جسے ہم انقلابی لہجے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ آزاد کا شعری مقام کم رتبہ سہی لیکن ان کے ہاں ایسے نعرۂ مستانہ کی شمولیت سے بڑا شکوہ پیدا ہوا ہے، جیسے:

قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں جام دے ساقی
کہ تیرے سر پہ مرا خوں ہے یا سرِ مینا
(ص ۶۱)

سُناؤں داستانِ عشق سب قلقل کے پردے میں
صراحی کے دہن پر کاٹ کر رکھ دو زباں میری
(ص ۱۳۰)

اپنے ہاتھوں سے نکالوں گا میں اے یار آنکھیں
اب نظر بھر کے جو دیکھیں تو گنہ گار آنکھیں
(ص ۸۷)

خصوصاً یہ شکوہ وطنطنہ جب آزاد کی زود حسی سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو وہ بڑے کاٹ دار اور تیکھے اُسلوب میں انسانی کیفیات و واردات اور طرز ہائے خیال و زیست کا خاکہ اُڑانے لگتے ہیں جن پر کبھی کبھی تضحیک کا گمان گزرتا ہے ــــ البتہ یہ ایسا طنز ہے جو برائے استہزا نہیں بلکہ برائے اصلاح ہے۔ آزاد کے اشعارِ ریش خند کے متعدد رنگ ہیں جن میں سرِفہرست معاملاتِ عشق پر شوخی ولطافت سے چوٹ کرنا ہے، مثلاً:

نہ اُس زُلف کو چھیڑو اے حضرتِ دل
کہ یہ جُرم ہے مار کھانے کے قابل
(ص ۱۷)

دل اُن کا غیر کی باتوں میں ایسا شاد رہا
جو کچھ کہ ہم نے کہا تھا، وہ کچھ نہ یاد رہا
(ص ۳۵)

پکاریں جائیں شہیدانِ خاص دیکھیں کہاں
ابھی تو تُرکِ نظر پھرتے قتلِ عام میں ہیں
(ص ۷۸)

اسی طرح وہ زاہد و شیخ سے متعلق موضوعات کے بیان میں کلاسیکی انداز میں طنز و تعریض سے کام لیتے ہیں۔ خصوصاً اہلِ طریقت کی ان پر افضلیت کو ظاہر کرتے ہوئے ان کے ہاں معنی کی تہ داری ملتی ہے، لکھتے ہیں:

وہاں تو شیشۂ مے توڑا، یاں دلِ رنداں
کوئی یہ پوچھے کہ زاہد کو کیا ثواب ہوا
(ص ۶۳)

زاہد کا جو تھا وعظ وہ تھا پیٹ کے لیے
اک مسئلہ نہ تھا کہ جو بہرِ خدا کہا
(ص ۴۲)

کبھی کبھار اہلِ دل کی حرماں نصیبی اور اہلِ دُنیا کی بخت آوری دیکھ کر ان کا دل بھر آتا ہے اور وہ طنزاً پکار اٹھتے ہیں:

جو تھے محفلوں سے اُٹھانے کے قابل
ہوئے ہیں وہ سر پر بٹھانے کے قابل
(ص ۷۰)

جو منہ دھو دھو وضو کرتے تھے سب سینے سیہ نکلے
سیہ رُویوں کا سینہ شکلِ آئینہ صفا دیکھا
(ص ۶۰)

انھوں نے کسی قدر شوخ اور واسوخت نما لہجے کے تال میل سے نہ صرف کلام کی دل کشی بڑھائی ہے بلکہ ایسے اشعار یہ غزل کے اُس مخصوص مزاج کے آئینہ دار ہیں جس کے تحت شوخی کو مکرِ شاعرانہ کے ساتھ ملانے کی روایت ملتی ہے۔ انداز دیکھیے:

جو دل میں چور تھا آخر پکڑ لیا کہ نہیں
جہاں تھے رات کو تم، ہم بھی تھے بھلا کہ نہیں
(ص ۸۵)

تم خوب، غیر خوب، بُرے ہیں اگر تو ہم
تم کو ہماری بات بھلی کب بھلا لگی
(ص ۱۱۴)

آپ کی میری سرِ بزم لڑائی ہو گی
جا کے غیروں میں لڑایا نہ کرو یار آنکھیں
(ص۸۹)

آزاد استعجاب وفخر، تحیر وتخاطب اور اخبار واغراق کے لحن میں بھی مطالبِ غزل کو معنویت سے ہم کنار کرتے ہیں اور رنگ کچھ یوں ہے:

کسی کا حلقۂ انگشتری جو خالی ہے
فلک پہ مہر اسی کا کہیں نگیں تو نہیں
(ص۸۲)

فلک کی فتنہ گری کیا ہے، سیکڑوں ایسے
خرامِ یار سے اُٹھ کر غبار بیٹھے ہیں
(ص۹۵)

نگاہِ ساقیِ سرمست سے اُڑیں گے جام
شراب شیشہ و مینا میں گر نہیں تو نہیں
(ص۸۳)

دل پر مرے لگا کے سنانِ نگہ وہ شوخ
کہتا ہے، اے لو پھینکی کدھر، کس کے جا لگی
(ص۱۱۳)

فصّادِ سوزِ عشق سے میرے ہے کیا عجب
پڑ جائے آبلہ ترے نشتر کی نوک میں
(ص۹۲)

جہاں غزلِ آزاد کے تعریضی ابیات نے علامتی حیثیت اختیار کی ہے، وہاں قدرے آفاقیت پیدا ہوئی ہے اور ایسے اشعار کا اطلاق زوال زدہ عہد کے سماجی اداروں کے بعض نمائندگان پر بخوبی ہو جاتا ہے تاہم موضوعاتی سطح پر ایسے اشعار کا رنگ روایتی واکتسابی ہی سمجھنا چاہیے، مثلاً:

اِدھر بھی چشمِ عنایات ہو ذرا ساقی

کہ مست دیر سے اُمیدوار بیٹھے ہیں
(ص ۹۴)

ساقیا ظلم ہے یہ فصلِ بہار اور اُس میں
شیشہ ہو طاق پہ اور مَے ہو بھری شیشہ میں
(ص ۹۰)

مولانا آزاد کی مرقع نگاری و پیکر تراشی اُن کے اُسلوب کا وہ تیسرا نمائندہ رجحان ہے، جس کے عقب میں شعرِ آزاد کے فنی ابعاد اثر انگیزی پیدا کر گئے ہیں۔ آزاد کی نثری تحریروں کا مصورانہ پہلو قابلِ مطالعہ ہے اور اکثر مقامات پر انشا پردازی کرتے ہوئے ان کی قلم کاری دیدنی ہوا کرتی ہے لیکن آزاد کی غزلوں میں تمثالی و محاکاتی حسن نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں خال خال ایسے شعر ملتے ہیں جن میں بے مثال تخیل کی وساطت سے تصویر کاری و مرقع نگاری کے جوہر دکھائے گئے ہیں۔ سوائے چند متفرق اشعار ایک آدھ مسلسل غزل کے جسے ان کے ایک بہاریہ قصیدے کے حصۂ نسیب کے ابیات قیاس کیا جاتا ہے ___ اور جنھیں پڑھ کر ذہن میں ذوق کی بہاریہ تشابیب تازہ ہو جاتی ہیں، مثلاً چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

گردوں شفق سے سُرخ، زمیں گُل سے لالہ گوں
گویا کہ ہو گیا ع زمیں آسماں نیا
دامانِ کوہسار میں لوٹے ہے آب جو
ہے بہر تیغِ موج یہ سنگ فساں نیا
گردوں پہ کہکشاں ہے عجب چاندنی کی بیل
اک اک ستارہ جس میں گُلِ بے خزاں نیا
"　"　"　"　"　"
رُخ سے جو ہے اُلٹ دیا دامانِ ابر تر
نکلا نکھر کے رنگ رُخِ آسماں نیا
ریشِ شعاعِ مہ پہ کرے شام کو خضاب
بنتا ہے چرخِ پیر بھی ہر شب جواں نیا
(ص ٦٦)

تمثال طرازی کی متفرق صورتوں میں چند متحرک تصویریں دیکھیے جو آزاد کے اُس مخصوص محاکاتی رنگ کی

عکاس ہیں جس کی نمود بھرپور طور پر نثر میں ہوئی اور جس کے تحت تمثیل و تشخیص کے اجزا کا ارتباط و انسلاک تمثالی اُسلوبِ نگارش کے ساتھ ہوتا ہے:

یہ دل اُڑ رہے ہیں کہ کبکِ دری ہیں
وہ نکلا ہوا چاند ہے چودھویں کا
(ص ۳۴)

صبا ہے جو سبزے پہ لہرا کے جاتی
تو دل ٹوٹتا ہے گا کیا کیا ہمارا
(ص ۳۹)

کھلا ہے ابر برس کر، نکھر لو تم بھی ذرا
چمک کے آج ہے نکلا مہِ تمام بہت
(ص ۶۸)

نظر اُٹھا کے نہیں دیکھتا وہ صید افگن
دلوں کو ہاتھ پہ رکھے شکار بیٹھے ہیں
(ص ۹۵)

حقیقت یہ ہے کہ محمد حسین آزاد کے کلام کی یہ متنوع فنی جہتیں اُن کے اُسلوبِ نثر میں کہیں زیادہ قوت و شوکت کے ساتھ موجود ہیں۔ آزاد کی بے مثل اور کم عدیل نثر میں دل کش لفظیات و تراکیب کا چناؤ اور روزمرہ و محاورات کا رچاؤ ___ کفایت لفظی، لفظی اُلٹ پھیر، مناسباتِ لفظی ___ تجسیم و تمثال کی دل پذیری، مرقع کشی اور حسیاتی رنگ آمیزی ___ تخیل و شعریت اور ایجاز و بلاغت ___ تشبیہات و استعارات اور اشارات و کنایات کی پُرکشش صورت گری ___ محسناتِ لفظیہ و معنویہ کی دل پذیر تشکیل اور نو بہ نو لہجوں کی بُنت کاری ___ شاعرانہ نوک جھوک، طنز و مزاح کی چاشنی، اقوال و امثال کا بیان اور علائم و رموز کے پردے میں جدت و معنویت کا حصول ___ کیا کیا ہے جو بھرپور سحر کاری کے ساتھ موجود نہیں ___ اور ظاہر ہے کہ نثرِ آزاد کی یہ تمام تر فنی جہتیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے شاعری سے متعلق ہیں ___ ڈاکٹر محمد صادق نے آزاد کی شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''آزاد کی زندگی میں شاعری ایک سانحے کی سی حیثیت رکھتی ہے اور اُن کا ادبی مقام متعین کرنے کے لیے اُن کی نثر ہی کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے ___ '' (۴) اس رائے میں اضافہ کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزاد کا ادبی مقام متعین کرنے کے لیے بے شک اُن کی نثر کو سامنے رکھنا ضروری ہے لیکن اس حقیقت سے گریز بھی ممکن نہیں کہ آزاد کی شاعرانہ و تخیلاتی نثر

کے مقام کا تعین کرتے ہوئے ان کے شعری مزاج اور اُن کی شاعری (بالخصوص غزلیات) کی شعری وفنی جہات کو پیشِ نظر رکھنے سے اُن کے حیرت زا تخلیقی وتخئیلی اُسلوبِ نثر کی تفہیم زیادہ موثر طور پر ہوسکتی ہے۔

حواشی

(۱) ملاحظہ کیجیے آزاد کا لکچر: ''نظم میں انقلاب'' (۱۸۷۴ء) مشمولہ مقالاتِ محمد حسین آزاد (مرتبہ) آغا محمد باقر۔ ص ۴۵۳۔

(۲) محمد منور، مرزا: ''مولانا محمد حسین آزاد ــــ ایک صاحبِ طرز انشاپرداز'' (مضمون) مشمولہ محمد حسین آزاد (مرتبہ) ساحل احمد، الہ آباد: لٹریری بک سنٹر ۱۹۸۵ء، ص ۸۰۔

(۳) دیکھیے: کلیاتِ نظمِ آزاد (مرتبہ) ڈاکٹر محمد ہارون قادر، لاہور: الوقار پبلی کیشنز: ۲۰۱۰ء ــــ یہاں طوالت سے گریز کرتے آزاد کے غزلیہ اشعار کے صفحات نمبر مضمون کے متن میں درج کر دیئے گئے ہیں۔

(۴) محمد صادق، ڈاکٹر: محمد حسین آزاد ــــ احوال و آثار، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اول ۱۹۷۶ء، ص ۱۲۲۔

دربار اکبری اور تاریخ نویسی کے تقاضے

ڈاکٹر قاضی افضال حسین

مسلم تاریخ نویسی کی روایت میں آبادیوں، طبقات اور شہروں کی تاریخ کے مقابلے میں افراد کی سوانح کو رفتہ رفتہ جو اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوئی اس کا ایک سبب تو مصنفین کی دینی فکر اور دوسرا سبب معاشرہ میں خود فرد کی اہمیت اور مرکزیت کا تصور تھا۔ اس کے نتیجہ میں سیرت نبویؐ سے لے کر مغازی اور پھر اس کے بعد علماء، صوفیا اور راویوں کی سوانحات کا وہ دفتر ہے، جو دنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی حکومتوں کے قیام کے ساتھ مرتب ہوتا رہا۔

سوانحات کے اس ذخیرے میں ایک طرف درباری وقائع نویس، سوانح نگار/مورخ ہیں، جن کا پہلا مقصد تو بادشاہ وقت کی تحسین کے ذریعہ عوام میں اس کا اعتبار قائم کرنا تھا اور ایک ضمنی مقصد دربار میں خود اپنے مادی فوائد کو مزید یقینی بنانا تھا، اس لیے ان تاریخوں میں واقعات کا انتخاب مصلحت وقت کا پابند تھا۔ دوسری طرف وہ سوانح نگار/مورخ ہیں جنھوں نے حدیث کے راویوں، مشائخ اور علماء کی سیرت و کوائف کو موضوع بنایا۔ ان کے نزدیک 'اسناد' کی اہمیت سرکاری سوانح نگاروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ انھیں سوانح نگاروں نے فن اسماء الرجال کو اس کی انتہا تک ترقی دی۔

دوسرے تمام بیانیوں کی طرح تاریخ نویسی کے مقاصد میں اختلاف کے سبب تاریخی بیانیہ کی شرائط اور امتیازات بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی مثالیں ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر کے عہد انتشار میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ جدوجہد آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں نے خود کو مجتمع کرنے اور اس نئے انتظام میں اپنے لیے جگہ بنانے کی غرض سے جو وسائل اختیار کیے ان میں سے ایک ماضی کی بازیافت بھی ہے، جو اس تہذیبی و معاشرتی بحران کے زمانے میں، تاریخ نویسی کے احیاء اور مقبولیت کا سبب ہوا۔ شبلی، آزاد اور ذکاءاللہ کے تاریخی بیانیوں کا بنیادی محرک احساس شکست کی اس جانکاہ صورت سے نکلنے کی آرزو تھی۔

لیکن شکست اور انتشار کی ایک ہی تہذیبی صورت حال میں شبلی اور آزاد کی سوانحی تاریخ نویسی کے محرکات

یکساں نہیں ہیں۔ شبلی اپنے لیے سیدنا عمر فاروق اور خلیفہ مامون الرشید کا انتخاب کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک ان ہیروز کی سیرت، حیات اور حسن انتظام وہ مثالی شکل ہے جس کی اس نئی صورت حال میں بازآفرینی کے ذریعہ اپنے تحفظ اور بقا کی کوئی صورت نکالی جا سکتی ہے۔ جبکہ آزاد کے نزدیک ہندوستان میں اکبر کی ذات اور اس کا عہد برصغیر میں نئی زندگی کی تعمیر کے لیے مثالی نمونہ ہیں۔ یہ دونوں مصنف اپنے عہد کے تقاضوں کو ایک دوسرے سے مختلف طرح دیکھتے ہیں۔ چنانچہ شبلی کے مقابلے میں اپنی تحریروں کا مقصد بیان کرتے ہوئے محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

کاش وہ دن جو میری عمر کی فصل بہار تھے، طبیعت جوان تھی، جوش ٹپکتے تھے، مضامین برستے تھے اور رنگ اڑتے تھے، ان تصنیفات میں خرچ ہوتے، جن سے میرے وطن کی اصلاح ہوتی، گورنمنٹ کے مقاصد پورے ہوتے، تمھاری نظر سے گزرتے، تم خوش ہوتے اور میرا دل خوش ہوتا......

(انسٹی ٹیوٹ گزٹ، یکم فروری ۱۸۸۱ء)

یہ آزاد کی تحریروں کا عمومی مقصد ہے جس میں وطن کی 'اصلاح' گورنمنٹ کے مقاصد کی پابند ہے۔ خاص دربار اکبری کی تحریر کا مقصد اس کتاب کے بالکل شروع میں بیان کر دیا گیا ہے:

وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا، پھر بھی اپنی نیک نامی کے کتابے ایسے قلم سے لکھ گیا کہ دن رات کی آمد و رفت اور فلک کی گردشیں انھیں گھس گھس کر مٹاتی ہیں مگر وہ جتنا گھستے ہیں اتنا ہی چمکتے آتے ہیں۔ اگر جانشیں بھی اس رستے پر چلتے تو ہندوستان کے رنگارنگ فرقوں کو دریائے محبت پر ایک گھاٹ پانی پلا دیتے بلکہ وہی آئین ملک ملک کے لیے آئین ہوتے۔

(دربار اکبری، ص ۱۵)

مقصد کے اس اختلاف کے سبب دربار اکبری میں اختیار کیا گیا موقف اور اس کے اثر سے منتخب کیے گئے واقعات اور ان کا بیان اپنے عہد کے دوسرے مورخین سے مختلف ہے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال اکبر کی مذہبی فکر کے متعلق اختیار کیا گیا، آزاد کا موقف ہے۔ لیکن اس پر گفتگو قدرے رک کر ہوگی۔

تاریخ نویس کی حیثیت سے محمد حسین آزاد کا سب سے نمایاں امتیاز، بنیادی ماخذوں کی جستجو اور ان سے استفادہ ہے۔ آزاد کے خطوط دربار اکبری کی تالیف کے سلسلے میں ان کی مساعی کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ کہیں مواد کی فراہمی کے سلسلے میں اپنی کوششوں کا ذکر ہے۔ کہیں کسی کتاب، فرمان، تصویر یا کسی دوسری تحریر کا تقاضا ہے اور کہیں مواد کے حاصل ہونے کے بعد اپنی خوشی کا اظہار۔ دربار اکبری کے نئے ہندوستان ایڈیشن (ادارۂ اشاعت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء)[۱] کے دیباچہ نگار پروفیسر محمد انصار اللہ نے اس کتاب کے ۳۸ مآخذ کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ مآخذ ہیں، جن کا ذکر کتاب یا مصنف کے نام سے اصل بیانیہ میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ بعض ماخذوں کے متعلق صرف یہ لکھا ہے کہ ایک کتاب دیکھنا، یا ایک رومی زبان کے ترجمے میں لکھا ہے،

وغیرہ۔ ظاہر ہے آزاد نے دربار اکبری مرتب کرتے ہوئے اپنے موضوع کے متعلق ہر اس ماخذ سے استفادہ کیا ہے، جن تک ان کی رسائی ممکن ہوئی۔

دربار اکبری میں ملا عبدالقادر بدایونی کے ترجمے میں ان کی تاریخ نویسی کے متعلق جو باتیں لکھی ہیں اس سے خود آزاد کے نزدیک تاریخ نویسی کا اہم شرائط کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں ایک شرط دیانت اور جرات ہے۔ لکھتے ہیں:

> ۹۷۹ھ میں بدایونی اپنا ایک ماجرا بیان کرتے ہیں جس سے تاریخ نویسی کی روح شاداب ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ نگار کو کیونکر واقعیت نگار ہونا چاہئے۔ (ص ۴۳۲)

دوسری شرط، موضوع سے گہری واقفیت اور تیسری شرط معروضیت ہے:

> ان کی تاریخ اپنے مضمون اور مقصود کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ الماری کے سر پر تاج کی جگہ رکھی جائے۔ سلطنت کے عمومی انقلاب اور جنگی مہمات سے ہر شخص آگاہ ہوسکتا ہے، لیکن صاحب سلطنت اور ارکان سلطنت میں سے ہر ایک کے اطوار و اسرار اور نہاں و آشکار سے جو وہ آگاہ تھے، دوسرا نہ ہوگا...... اکبری خلعت و دربار میں ہمیشہ پاس جگہ حاصل کرتے تھے اور ان کے معلومات اور حسن صحبت کے لطائف سے امرائے دربار اپنی دوستانہ صحبتوں کو گلزار کرتے تھے۔ علماء، فقرا اور مشائخ تو ان کے اپنے ہی تھے۔ لطف یہ ہے کہ انھیں میں رہتے تھے مگر خود ان کی قباحتوں میں آلودہ نہ ہوتے تھے۔ دور کے دیکھنے والوں میں تھے اس لیے انھیں حسن و قبح خوب نظر آتا تھا۔ اونچی جگہ پر کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس لیے ہر جگہ کی خبر اور ہر خبر کی تہ معلوم ہوتی تھی۔ (ص ۴۲۰)

اس براہ راست واقفیت اور موضوع سے ممکن حد تک قریب تر ہونے کے باوجود معروضیت کے بعد تاریخ نویسی کی آخری صفت خوبِ اظہار ہے۔ بدایونی کی تحسین میں لکھتے ہیں:

> دراصل بات تو یہ ہے کہ طرز تحریر کا بھی ایک ڈھب ہے۔ یہ خوبی ان کے قلم میں خداداد تھی۔ ان کی تاریخ میں یہ کوتاہی ضرور ہے کہ مہمات اور فتوحات کی تفصیل نہیں اور واقعات کو بھی مسلسل طور پر بیان نہیں کیا۔ لیکن اس خوبی کی تعریف کس قلم سے لکھوں کہ اکبری عہد کی ایک تصویر ہے، جذبات اور اندرونی اسرار ہیں کہ اور تاریخ نویسوں نے مصلحتاً یا بے خبری سے قلم انداز کر دیے۔ ان کی بدولت ہم نے سارے عہد اکبری کا تماشا دیکھا...... (دربار اکبری، ص ۴۲۰)

تاریخ نگاری میں واقعات کے تسلسل اور جزئیات نگاری کی تحسین کے ساتھ فن تاریخ نویسی کا خاکہ مکمل ہوا۔

محمد حسین آزاد کو بدایونی کے بیان میں مہمات اور فتوحات کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہ کمی دربار اکبری میں نہ ہونی چاہیے تھی اور نہ ہے بلکہ اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ آزاد اردو کے سب سے بڑے واقعہ نگار ہیں۔ جنگ کا نقشہ ہو یا بزم کا بیان، آزاد اس کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ قاری یہ تفصیلات صرف سنتا ہی نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ اسے خود آزاد مورخ کی ایک بڑی صفت تصور کرتے ہیں کہ وہ صورت حال اس طرح بیان کرے گویا وہ اپنے قاری کو 'دکھا' رہا ہے۔ (۲) جنگوں کا تو ذکر ہی کیا کہ اس میں تحرک، حملہ، دفاع، معرکہ وغیرہ کی تصویر کھینچنی محمد حسین آزاد جیسے واقعہ نویس کے لیے بالکل ان کے شوق کی چیز تھی۔ وہ سادہ بزم کی تصویر بھی ایسے کھینچتے ہیں، گویا قاری کو منظر دکھا رہے ہیں:

...... بارگاہ جلال آراستہ، تخت مرصع زرین و سیمیں چبوترے پر جلوہ گر۔ تاج اقبال میں ہما کا پر۔ چتر جواہر نگار سر پر۔ زربفت کا شامیانہ، موتیوں کے جھالر، سونے روپے کے استادوں پر تنا۔ ابریشم قالینوں کا فرش۔ در و دیوار پر شالہائے کشمیری مخمل ہائے رومی، اطلس ہائے چینی لہراتے۔ امراء دست بستہ دو طرفہ حاضر۔ چوبدار، خاص بردار اہتمام کرتے پھرتے ہیں۔ ان کے زرق برق لباس، سونے روپے کے نیزوں اور عصاؤں پر باناتی اور سقر لاتی غلاف۔ طلسمات کی تپلیاں تھیں، خدمت کرتی پھرتی تھیں ......

بارگاہ کے دونوں طرف شہزادوں اور امیروں کے خیمے، باہر دونوں طرف سواروں اور پیادوں کی قطار۔ بادشاہ دو منزلی راوٹی (جھروکے) میں آ بیٹھتے۔ اس کا زردوزی خیمہ۔ سایہ اقبال کا شامیانہ۔ شہزادے، امراء سلاطین آتے۔ انھیں خلعت اور انعام ملتے۔ منصب بڑھتے۔ روپے اشرفیاں، سونے چاندی کے پھول اولوں کی طرح برستے۔ یکا یک حکم ہوتا کہ ہاں نور برسے۔ فراشوں اور خواصوں نے منوں بادلہ اور مقیش کتر کر جھولیوں بھر لیا ہے اور صندلیوں پر چڑھ کر اڑا رہے ہیں۔ نقار خانے میں نوبت جھڑ رہی ہے۔ ہندوستانی، عربی، ایرانی، تورانی فرنگی باجے بجتے ہیں۔ (ص ۱۴۳)

اس حصے کا عنوان بھی آزاد نے 'سواری کی سیر' رکھا ہے کہ بیان کرنے والا اس منظر کا گویا آنکھوں دیکھا حال سنا رہا ہے۔ دوسرے پیراگراف کے صیغہ حاضر میں چھوٹے چھوٹے جملے اس منظر کے تحرک کو بالکل روشن کر دیتے ہیں۔ واقعہ نگاری کی اس صلاحیت میں محمد حسین آزاد کا کوئی ثانی نہیں۔

شبلی نے واقعہ نگاری کے متعلق نہایت نکتے کی بات کہی ہے:

درحقیقت، تاریخ اور انشاء پردازی کی حدیں بالکل جدا ہیں۔ ان دونوں میں جو فرق ہے وہ نقشے اور تصویر کے فرق سے مشابہ ہے۔ نقشہ کھینچنے والے کا یہ کام ہے کہ کسی حصۂ زمین کا نقشہ کھینچے تو نہایت دیدہ ریزی کے ساتھ اس کی ہیئت، شکل، سمت، جہت، اطراف، اضلاع، ایک ایک چیز کا احاطہ کرے بہ خلاف اس کے مصور

صرف ان خصوصیتوں کو لے گا یا ان کو زیادہ نمایاں صورت میں دکھائے گا جن میں کوئی خاص عجوبگی ہوگی اور جن سے انسان کی قوت منفعل پر اثر پڑتا ہے۔ (الفاروق، ص۱۹)

واقعہ نگاری میں آزاد کا رحجان جنگ کا نقشہ کھینچنے کی طرف نہیں اس کی تصویر کشی کی طرف ہے تا کہ پڑھنے والے کی قوت متخیلہ متاثر ہو۔ دراصل آزاد مشرق میں مورخوں کے اس سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں، جو بیان کو واقعہ پر فوقیت دیتا ہے۔ ابوالفضل کی نثر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ انشاء پردازی کا خدا ہے۔ اپنی لطف خیالات سے جیسی مخلوق چاہتا ہے الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ جس عالم میں لکھتا ہے، نیا ڈھنگ ہے اور جتنا لکھتا جاتا ہے، عبارت کا زور بڑھتا اور چڑھتا چلا جاتا ہے۔ (ص۴۹۳)

درباری مورخوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ لوگ اس کے وفا پرست نمک خوار تھے اور ایشیائی انشا پردازی اس پر گرم مصالح ......

(ص۳)

عبدالرحیم خان خاناں کے ترجمے میں ایک جگہ واقعہ کی تاریخیت، بیان کے حسن میں گم ہوتی معلوم ہوئی تو لکھتے ہیں:

استغفر اللہ کدھر تھا اور کدھر آن پڑا۔ مگر باتوں کا مصالحہ بغیر تاریخی حالات کا بھی مزہ نہیں آتا۔

(ص۵۹۶)

آزاد کی واقعہ نگاری میں، انشاء پردازی کا 'مصالحہ' ان کے بیانیہ کو پرتاثیر بناتا ہے، لیکن اس سے خود تاریخ نویسی کی بعض بنیادی شرائط پر اثر پڑتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے بیان میں نفس واقعہ تو صحیح ہوتا ہے مگر اس کی تفصیل وہ اپنے تخیل سے مرتب کرتے ہیں۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری اکبری عہد کے صاحب مرتبہ لوگوں میں تھے۔ دربار اکبری میں ان کے متعلق بیشتر تفصیلات مآثر الامراء از نواب شمس الدولہ شاہ نواز خاں سے لی گئی ہیں۔ مخدوم الملک کی موت کے بعد ان کی تدفین اور اس کے بعد ان کے اموال کے ضبط کیے جانے کا ذکر کرتے ہوئے شاہ نواز خاں لکھتے ہیں:

گویند بادشاہ عرش آشیانی مسموم کردند۔ مردم بہ طریق اخفا در جالندھر آوردہ و مدفون ساختند۔ قاضی علی بضبط اموالش مامور گشت۔ خزائن و دفائن بسیار در لاہور برآمد۔ از آن جملہ چندین صندوق خشت طلاء از گورخانہ او ظاہر شد (کہ بہ بہانۂ اموات دفن کردہ بود)۔ (مآثر الامراء، جلد سوئم ص۲۵۶)

اب یہی بیان محمد حسین آزاد سے سنیے:

ان کے املاک اور مکانات لاہور میں تھے اور گھر میں بڑی بڑی قبریں تھیں۔ جن کے لمبے لمبے طول وعرض بزرگان مرحوم کی مقدار بزرگی ظاہر کرتے تھے۔ اس پر سبز غلاف پڑے رہتے تھے اور دن ہی سے چراغ جل جاتے تھے، ہر وقت تازے پھول پڑے رہتے تھے۔ یہاں پھول پتے لگانے والوں نے پتے لگائے اور کہا کہ حضور یہ مزار دکھاوے کے بہانے ہیں۔ حقیقت میں دفینے اور خزانے ہیں کہ خلق خدا کے گلے کاٹ کر جمع کیے ہیں۔ (ملا صاحب) فرماتے ہیں قاضی علی فتح پور سے لاہور آیا اور اتنے خزینے اور دفینے نکلے کہ وہم کی کنجی بھی ان قفلوں کو نہ کھول سکے۔ ان کے گورخانے میں سے چند صندوق نکلے کہ ان میں سونے کی اینٹیں چنی ہوئی تھیں ... (ص ۳۱۸)

واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ انصاری نے خزانے زمین میں دفن کروا کے ان کی شکل قبروں جیسی بنوادی تھی جو قاضی علی نے برآمد کیں۔ اب رہا قبروں کی لمبائی سے بزرگی کا معیار مقرر کرنا، قبروں پر سبز چادر اور ان پر تازہ پھول، قبروں پر دن سے ہی چراغاں اور یہ ساری دولت خلق خدا کے گلے کاٹ کے جمع کی گئی وغیرہ تو یہی وہ تصویر کشی ہے، جو واقعہ پر بیان کی فوقیت کا اشارہ ہے جو سادہ بیان کے مقابلے میں قوت متخیلہ کو متاثر کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آزاد کی واقعہ نگاری پر مورخ سے زیادہ انشا پرداز حاوی ہے۔

لیکن تاریخ نویسی کے اعتبار سے دربار اکبری کا سب سے کمزور پہلو اسباب وعلل کا دیانت دارانہ تجزیہ اور بیان ہے اور محمد حسین آزاد اسے خود بھی محسوس کرتے ہیں کہ اکبر کے بیان میں روایت یا درایت کے بجائے تحسین اور مبالغے کا جز بڑھ گیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

لوگ کہیں گے کہ آزاد نے دربار اکبری لکھنے کا وعدہ کیا تھا اور شاہنامہ لکھنے لگا۔ (ص ۳۵)

واقعہ یہ ہے کہ یہی ہوا۔ اکبر کی تعریف اور طرفداری میں اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ بادشاہ کے غیر عقلی بلکہ بیجا فیصلوں کو جائز اور مناسب ثابت کرنے کے لیے، اس کے حق میں کمزور دلائل پیش کرنے کے علاوہ مخالفین کی نامناسب تنقیص وعیب جوئی سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال اکبر کا روایتی اسلام کی طرف رویہ ہے۔ آزاد اکبر کی اسلام سے برگشتگی/ انحراف کا جواز قائم کرنے کے لیے معاصر علماء کی جاہ طلبی، ہوس دنیا اور بداعمالیوں کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں اور بار بار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اکبر کے زمانے میں علماء اتنے گمراہ اور بداعمال نہ ہوتے تو اکبر اسلام سے اتنا بدظن نہ ہوتا۔ کتاب میں جگہ جگہ علماء کی ہوس دنیا کا ذکر کرنے کے علاوہ آزاد نے ''علماء اور مشائخ کی بداقبالی کے اصل اسباب'' کا الگ باب قائم کیا ہے اور اس میں تقریباً تین صفحہ تک مسلسل علماء کی بداعمالیوں کا ذکر اتنے مبالغے سے کیا ہے کہ نہ صرف حیرت ہوتی ہے بلکہ بحیثیت مورخ ان کی دیانت (جس کی وہ بدایونی کے سلسلے میں تعریف کرتے ہیں) معرض بحث میں آ جاتی ہے۔

اگر بالفرض علماء کے متعلق محمد حسین آزاد کے ساری باتیں بلکہ الزامات صحیح ہیں تب بھی اکبر اور عہد اکبر کے مورخین نے جو تفصیلات یکجا کردی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو آزاد کو ان ماخذوں کی خبر نہ تھی (اور یہ قرین قیاس نہیں) یا انھیں آزاد نے دیدہ و دانستہ نظر انداز کیا۔ اس کی ایک مثال عہد اکبری میں نقطوی فرقے کا فروغ ہے۔ اس فرقے کے متعلق تفصیلی مضمون پروفیسر نذیر احمد مرحوم نے لکھا تھا۔ اس تفصیلی مضمون کی بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں، ان سے نقطویوں کے متعلق ضروری معلومات فراہم ہوتی ہیں:

> نقطوی تحریک کا بانی محمود پسیخانی گیلانی تھا۔ پسیخان گیلان میں ایک گاؤں ہے جو فومن جانے والی سڑک کے کنارے دشت سے سات کلومیٹر مغرب میں واقع ہے...... محمود نے مدتوں فضل اللہ استرآبادی بانیِ دین حروفی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا لیکن بعد میں دونوں میں اختلاف ہوگیا اور فضل اللہ نے اس کو اپنے یہاں سے نکال دیا...... اس نے یہیں سنہ ۸۰۰ھ میں اس نئے مذہب کا اعلان کیا...... محمود نے فضل کی طرح مہدی موعود کا دعویٰ کیا۔ وہ کہتا تھا کہ دین اسلام اور دورِ عرب ختم ہوگیا۔ اب اس کا لایا ہوا دین حق اور اس کی بتائی ہوئی راہ سیدھی ہے۔ یہ دورِ عجم ہے اور اس کی مدت آٹھ ہزار سال ہوگی اور اس مدت میں آٹھ مبین ہوں گے، جن میں پہلا وہ خود ہے...... ان کا کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ المرکب المبین'' ہے۔ اور مرکب مبین سے مراد انسان ہے...... یہ ''انسان کامل'' کی پرستش کرتے اور اس کو ''مرکب مبین'' کہتے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ''مرکب مبین'' ہی خدا ہے۔ (۳)

شاہ طہماسپ کے زمانے میں جب اس فرقے پر سختی شروع ہوئی تو نقطوی ایران چھوڑ کر دوسرے محفوظ ممالک کی طرف نکل گئے۔ ان میں ایک شریف آملی بھی تھا۔ اس کے متعلق ایک معاصر تاریخ نویس اسکندر منشی کا بیان ہے:

> شریف آملی جو جامع فضائل تھا اس فرقے کے اکابر سے تعلق رکھتا تھا وہ اپنے زمانے کی سخت گیریوں سے تنگ آکر ہندوستان چلا آیا تھا حضرت بادشاہ اکبر اس کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور اس کے ساتھ پیر جیسا سلوک کرتے تھے۔ (۴)

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی کی فراہم کردہ اطلاع (۵) کے مطابق اکبر سے شریف آملی کی ملاقات مالوہ کے دیپال پور میں ۷۷-۱۵۷۶ء میں ہوئی۔ یہاں اکبر نے اسے رات کی تنہائی میں طلب کیا اس کی باتیں غور سے سنیں اور اس سے متاثر ہوا۔

شریف آملی کے علاوہ اکبر کے دربار میں دو اور نقطوی تسبیحی کاشی اور وقوع نیشاپوری کو بھی ابوالفضل سے قربت حاصل ہوگئی۔ اس میں تسبیحی ایک قادر الکلام شاعر تھا، جسے ایک قصیدہ کے ذریعہ اکبر کے دربار میں رسائی حاصل

ہوئی۔

شاہ عباس اصفہان آیا تو وہاں کے اہم ترین نقطوی سردار میر سید احمد کاشی کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا۔ اس کے کاغذات میں بہت سے نقطویوں کے خطوط ملے۔ ان میں ایک خط ابوالفضل کا بھی تھا۔ یہ واقعہ تاریخ نویس اسکندر منشی سے سنیے:

ہندوستان سے آنے والوں سے معلوم ہوا کہ ابوالفضل پسر شیخ مبارک بھی جو ہندوستان کے فضلاء میں ہے اور دربار اکبری میں بہت زیادہ تقرب حاصل کر چکا ہے، اسی مذہب کا پیرو ہے۔ اس نے اکبر بادشاہ کو وسیع المشرب بنا کر جادۂ شریعت سے منحرف کر دیا ہے۔ اس کا یہ خط جو میر احمد کاشی کے نام لکھا گیا تھا اور جو میر مذکور کے کاغذات میں دستیاب ہوا، ابوالفضل کے نقطوی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ (۶)

چونکہ اس نقطوی عقیدے کے مطابق اسلام کا عرصۂ حیات ختم ہو چکا ہے اور اب ایک نئے ''مرکب مبین'' یعنی انسان کامل کے ظہور کا وقت ہے، ابوالفضل جیسے مقرب اور ذہین لوگوں نے اکبر کو باور کرایا کہ اس مرکب مبین، کی صفات آپ میں ظہور کر رہی ہیں۔ ظاہر ہے ایک بے پڑھے لکھے مگر صاحب اقتدار اور حوصلہ مند بادشاہ کے لیے خود کو اس مرتبہ پر دیکھنا اچھا لگا ہوگا غالباً اکبر کو ذہن میں رکھ کر ہی نقطویوں نے تمام مذاہب کے یکساں احترام کا تصور بھی عام کیا بلکہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ نیا انسان کامل پڑھا لکھا بھی نہیں ہوگا کہ ''مرکب مبین'' کے منتہا کو دنیاوی تعلیم کی ضرورت بھی نہیں۔

اکبر کے نئے 'اوتار' سے خود بادشاہ کے مقرب اور وفادار امراء بہت منغض ہوئے۔ پروفیسر اقتدار صدیقی نے مرزا عزیز کوکا خان کا ایک خط نقل کیا ہے جس میں انھوں نے اس رجحان کے خلاف انتہائی سخت الفاظ میں تنقید کی ہے۔

نقطویوں اور اس کے مبلغ شریف آملی کا ذکر، اکبر کے بیشتر معاصر مورخین نے کیا ہے بلکہ اس کا تفصیلی ذکر آزاد کے بنیادی ماخذ عبدالقادر بدایونی نے بھی کیا ہے۔ لیکن اکبر کے مذہبی افکار کے متعلق تفصیلی گفتگو میں آزاد نے اس کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ انھوں نے بدایونی کو بہت غور سے پڑھا ہے۔ اس لیے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ شریف آملی سے واقف نہیں۔ البتہ اس چشم پوشی سے آزاد کی طرفداری بالکل سطح پر نمایاں ہوگئی ہے۔

مزید یہ کہ اسباب دریافت کرنے کے بجائے آزاد اپنے قیاس سے نئے نئے اسباب تلاش کرتے ہیں۔ دراصل واقعہ اور اس کے بیان (تاریخ) کے درمیان زمانہ اور زبان دونوں حائل ہیں۔ زمانے کا یہ فاصلہ تاریخ نویسی کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہوا تاریخ نگار اپنے عہد کی مذہبی، فکری اور معاشرتی / سیاسی صورت حال کا پابند بلکہ زائیدہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ خود کو واقعہ کے زمانے میں رکھ کر اس کا تجزیہ کا اہل ہوتا ہی نہیں اس لیے اس سے یہ توقع

کرنی بھی نہیں چاہیے۔ لیکن اگر مورخ غیر جانب دار ہے اور اس کی نیت معروضیت کے تحفظ کی ہے تو وہ اسباب وعلل کی تحقیق اور تجزیہ ممکن حد تک احتیاط کے ساتھ کر سکتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے یہ نہیں کیا بلکہ کہیں کہیں تو آزاد کہتا ہے یا صرف ''آزاد'' لکھ کر تاریخ میں وہ بیانات شامل کر دیے ہیں جن سے ان کی طرف داری یا مخالفت ظاہر ہے۔ اصل سبب سے شاید ان کا کوئی تعلق ہی نہیں۔

صرف ایک مثال: ملا عبدالقادر بدایونی کا حوالہ دربار اکبری کے ہر باب میں ہے مگر اکثر جگہ ملا صاحب کے موقف اور ان کی فکر پر طنز کیا گیا ہے۔ ملا بدایونی ایک دین دار صاف گو اور جرات مند شخص تھا۔ یہ بات آزاد بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس کی تحریر میں تلخی کا سبب یہ ہے کہ اسے وہ دنیوی جاہ و مرتبہ حاصل نہ ہوا جو اس کے دوسرے معاصرین مثلاً ابوالفضل کو حاصل تھا۔ ملا بدایونی کی تلخی کا سبب آزاد سے سنیے:

> اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے ملائی کے دائرے سے باہر قدم نکالنا نہ چاہا اور اس کو دنیا کا فخر اور دین کی دولت سمجھا۔ انھیں کبھی تو بے علم یا کم لیاقت لوگ مراتبِ عالی پر نظر آئے اور یہ ناگوار گزرا۔ اکثر چھوٹے تھے کہ آنکھوں کے سامنے بڑے ہوئے، کبھی باہر سے آئے اور مختلف خدمات کی سنہری مسندوں پر بیٹھ کر صاحب جاہ وجلال ہو گئے اور یہ ملاّ کے ملاّ ہی رہے۔ ایسے لوگوں کو ان کی فضیلت علمی ضرور خاطر میں نہ لاتی ہوگی بلکہ چاہتی ہوگی کہ میرا ادب پیش نگاہ رکھیں، ادھر دولت اور حکومت کو اتنا دماغ کہاں؟ (ص ۴۱۹)

گویا بدایونی کی تلخی کا سبب یہ ہے کہ انھیں وہ دنیاوی مراتب اور مادی فوائد نہیں ملے جو دوسروں کو ملے۔ حالانکہ خود دربار اکبری میں ملا بدایونی کے وہ بیانات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا صاحب کو اس جاہ و مرتبت کی خواہش بھی نہیں تھی۔ بدایونی کے ایک بیان کی تلخیص کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

> اسی سال میں بیستی کا منصب دیا، کچھ خرچ بھی عنایت کیا اور پہلی ہی دفعہ میں فرمایا کہ بیستی کے منصب کے بہ موجب گھوڑے داغ کے لیے حاضر کرو۔ لکھتے ہیں کہ شیخ ابوالفضل بھی اسی عرصہ میں پہنچے تھے اور ہم دونوں کی وہی مثال ہے جو شیخ شبلی نے اپنے اور جنید کے لیے کہی تھی: میں اور یہ دو جلی ٹکیاں ہیں کہ ایک تنور میں سے نکلی ہیں۔ ابوالفضل نے جھٹ قبول کر کے کام شروع کر دیا اور اس عرق ریزی سے خدمت بجا لایا کہ آخر دو ہزاری منصب اور وزارت کے درجے کو پہنچ گیا۔ میں ناتجربہ کار اپنے عمل کو بھی نہ سنبھال سکا...... مجھے ان دنوں یہی خیال تھا کہ قناعت بڑی دولت ہے، کچھ جاگیر ہے، کچھ بادشاہ انعام واکرام سے مدد دیں گے اس پر صبر کروں گا، سلام اور عافیت کے گوشے میں بیٹھوں گا...... افسوس کہ وہ بھی میسر نہ ہوئی۔ (ص ۴۳۸)

مزید یہ کہ ملا صاحب فوج کے علاوہ درباری خدمتوں سے بھی معذرت خواہ ہوئے، تو کیا اس کے باوجود یہ کہنا مناسب ہے کہ:

ملا صاحب بہت اچھی اٹھان سے اٹھے مگر افسوس کہ رہ گئے اور بری طرح رہ گئے۔ وہ ترقی پاتے اور خاطر خواہ سے بھی زیادہ پاتے۔ مگر ضدی شخص تھے اور بات کی پرورش ویسی کرتے تھے کہ اس پر ہر طرح کے نقصان اٹھائے۔ (ص ۴۳۸)

یہاں 'ترقی' سے آزاد کی مراد وہی ترقی ہے جو ابوالفضل کو حاصل ہوئی۔ یعنی پہلے دو ہزاری منصب اور پھر وزارت، مگر آزاد نے یہ نہیں لکھا کہ ہوس جاہ آدمی کو کس اسفل سطح تک گرا دیتی ہے۔ اکبر کی خوشنودی میں ابوالفضل دین اسلام سے منحرف ہو گئے۔ نقطویوں سے نکتہ پا کر صاف صاف اکبر کے ''انسان کامل'' ہونے کے قائل ہو گئے۔ یہاں تک کہ تصنیف و تالیف کی ہزار سالہ روایت کے مطابق پہلے حمد اور پھر نبی کریمؐ کی مدح کے بعد کتاب شروع کرنے کے بجائے اپنی تصانیف سے رسول کریمؐ کی مدح کا جز ختم کر دیا اور حمد کے فوراً بعد اکبر بادشاہ کی مدح شروع کر دی۔ عبدالقادر بدایونی اپنی علم سے دلچسپی اور دین پر استقلال کے سبب اس زوال پر راضی نہ ہوا تو آزاد کو بدایونی ''ملا کا ملا'' ہی معلوم ہوتا ہے۔ ابوالفضل کے معاملہ میں محمد حسین آزاد کی طرفداری بعض مقامات پر حیرت انگیز حد تک غیر متوازن معلوم ہوتی ہے۔ فیضی کے ترجمے میں دونوں بھائیوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

آج کل کے روشن دماغ کہتے ہیں کہ دونوں بھائی حد سے زیادہ خوشامدی تھے۔ درست ہے ان لوگوں کے سامنے بجلی چمکتی ہے۔ مگر پیچھے بالکل اندھیرا ہے انھیں کیا خبر ہے کہ موقت وقت کیا تھا...... خوشامد کیا آسان بات ہے، پہلے کوئی کرنی تو سیکھے (ص ۳۶۲)

یعنی اگر جواز موجود ہو تو خوشامد قابل تعریف ہے، لیکن یہ ایک مشکل فن ہے کہ اس سے بھی ابوالفضل کی تحسین کا پہلو نکلتا ہے۔

آزاد بعض معاملات میں خود کو بدایونی کا ہم تقدیر لکھتے ہیں۔ حالانکہ اکبر کے درباریوں میں کسی شخص سے ان کی تدبیریں ملتی ہیں تو وہ ابوالفضل ہے کہ آزاد اپنے حاکموں کے ساتھ وہی رویہ اختیار کرتے ہیں جو ابوالفضل نے اپنے بادشاہ کے ساتھ اختیار کیا تھا۔

ناکافی بلکہ قیاسی اسباب و علل اور ان کے سرسری تجزیوں کے سبب آزاد کی تاریخ نگاری کا استناد مجروح ہوتا ہے۔ ''روایت'' کی حد تک آزاد پر اعتبار کیا جا سکتا ہے، کہ واقعات کے بیان کرنے میں انھوں نے بیش تر اپنے ماخذوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ مگر وہ ''درایت'' کے آدمی نہیں۔ تجزیہ کرنا کیا دلائل پیش کرنا، جس کے لیے تخیل سے زیادہ تفکر اور استدلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ آزاد کا میدان نہیں۔ اور قیاس تاریخ نویسی کی اصل میں شامل نہیں۔

ابوالفضل کے ترجمے میں لکھتے ہیں:

جب شیخ مبارک مر گئے تو شیخ ابوالفضل نے مع بھائیوں کے بھدرا کیا۔ اصل فقط اتنی تھی کہ بادشاہ ہر مذہب

کے ساتھ محبت و رغبت ظاہر کرتا تھا، ہندوؤں کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اس لیے ان سے زیادہ تھے...... بادشاہ کی خوشی اسی میں دیکھی، انھوں نے بھی بھدرا کیا۔ یہ سب باتیں بادشاہ کی دلجوئی اور مصلحت ملکی کے لیے تھیں ورنہ فیضی اور فضل جو اپنی تیزیٔ فکر اور زورِ زبان سے دلائل افلاطون اور براہین ارسطو کو روئی کی طرح دھنکتے تھے وہ اور دینِ الٰہی اکبر شاہی پر اعتقاد لائیں گے یا جذبات مذکورہ ان کا عقیدہ ہو جائے گا۔ توبہ توبہ۔ سب کچھ کرتے ہوں گے اور پھر اپنے جلسوں میں آ کر کہتے ہوں گے کہ آج کیا احمق بنایا ہے۔ دیکھا ایک مسخرہ بھی نہ سمجھا......
(ص ۹۱-۴۹۰)

یہی آزاد کے خیال میں ابوالفضل کا مذہب یا اس کے اعمال صرف ایک دھوکے کی ٹٹی تھے کہ اکبر اور اس کے درباریوں کو دھوکہ دینے کے لیے تیار کی گئی حکمت عملی تھی۔ اور یہ دونوں بھائی اپنی ذاتی مجلسوں میں اس دھوکہ دھڑی کی کامیابی پر خوش بھی ہوتے تھے۔ اس قیاس کا جواز صرف طرفداری میں ہے۔ دلیل اس کی کہیں موجود نہیں۔

ہمارے زمانے کے معاصر تصورِ تاریخ میں واقعہ اور اس سے مربوط صداقت کو زبان کی تشکیل قرار دیا جا رہا ہے۔ واقعہ، جو زبان سے ماوراخارج میں اپنا خود مکتفی وجود رہتا ہے، زبان کی گرفت میں آ کر ایک سیاق و سباق پا لیتا ہے۔ خود یہ سیاق و سباق لکھنے والے کا نقطۂ نظر تشکیل دیتا ہے۔ 'واقعہ' اپنے بیانیے میں اسی سیاق و سباق کے حوالے سے ایک ''معنی'' پاتا ہے کہ ''معنی'' زبان/ بیان کی صفت ہے۔ واقعہ تو صرف ''واقعہ'' ہے۔ یعنی 'جو ہوا' اس کے 'معنی' اور معنی کی اقداری درجہ بندی بیان/ زبان کی صفت ہے تو وہ لفظ 'شناس' جو زبان کی اقداری درجہ بندی کی اس قوت سے واقف ہے بیان کو اس طرح مرتب کر سکتا ہے، جس سے واقعہ کی قدر (value) ٹھیک ایسے ہی قائم ہو سکتی ہے، جیسے اس کا مرتب چاہتا ہے۔ دربار اکبری کے تقریباً تمام صفحات اس کی مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مثالیں ضروری ہوں تو دربار اکبری میں مہیش داس راجہ بیربر کا ترجمہ پڑھیے۔ مشہور ہے کہ راجہ بیربر بہت شگفتہ طبیعت کے مالک تھے، لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی میں بے مثال تھے اور اپنی اس صفت کے سبب اکبر کے مزاج میں بہت دخل رکھتے تھے لیکن اس ساری شہرت کے باوجود، آزاد نے اکبر کے ساتھ بیربر کے معاملات میں دو واقعے بھی ایسے نہیں لکھے۔ جن سے ان کی طبیعت کا ہنسوڑ پن ظاہر ہو۔ ان کی روایتی شہرت سے متاثر ہو کر آزاد نے ان کی جو تصویر کھینچی ہے، اس میں وہ ایک مضحکہ خیز بھاٹ سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہوتے۔ راجہ بیربر خود آگے بڑھ کر فوج کشی کی اجازت طلب کرتے ہیں، کئی جنگی مہموں پر فوج کے ایک دستے کی قیادت کرتے ہیں مگر آزاد لکھتے ہیں کہ وہ فوج کشی اور جنگ و جدال سے ایسے گھبراتے ہیں، جیسے انھوں نے کبھی جنگ دیکھی بھی نہ ہو۔ وہ میدان جنگ میں لڑتے ہوئے مارے گئے مگر آزاد اس واقعہ کو بھی لطیفے کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ دربار اکبری میں بیربر کا ترجمہ ان کی عوام میں مشہور تصویر سے پوری مطابقت رکھتا ہے لیکن اس کی صداقت کی کوئی دلیل دربار اکبری میں موجود نہیں۔

مسلم تاریخ نویسی کے بعض مغربی اسکالرز نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مشرقی زبانوں (عربی اور فارسی) کے بیشتر مورخین خود بڑے ادیب، شاعر یا انشا پرداز تھے اور اپنے زمانے کے ادبی منظرنامے پر بہت نمایاں حیثیت کے مالک تھے تو ان کی ادبی صلاحیت اور شہرت کی بنیاد پر ان کی تاریخوں کو بھی مقبولیت کا وہ درجہ حاصل ہوا جو ادبی اعتبار سے کم مرتبت مورخین کو حاصل نہیں ہو سکا۔ خود آزاد نے تاریخ نویسی میں زبان کے کردار کے متعلق وہ باتیں کہی ہیں، جس سے اس مشاہدہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ بلکہ اس مشاہدے کے ثبوت میں ان ہی کی تصنیف دربار اکبری پیش کی جاسکتی ہے، جو بڑی حد تک مستند واقعات کی ایسی زبان میں بازتشکیل ہے کہ وہ واقعہ سے زیادہ محاکات اور مرقع نگاری کا اعلیٰ نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ انتہائی شگفتہ اور قدرے آرائشی نثر اس میں نہایت تازہ تشبیہیں، محاورے اور فقرے بیان کی روانی، تجریدی اصولوں کا واقعات کی شہادت کے ذریعہ بیان، دربار اکبری کے بیانیہ کو جس مرتبہ تک لے جاتا ہے، وہاں اس بیانیہ کا ادبی حسن، اس کے تاریخی استناد سے کہیں زیادہ قابل تحسین معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہی دربار اکبری کا امتیاز اور بحیثیت تاریخ اس کی کمزوری ہے۔

حواشی

۱۔ مضمون میں دربار اکبری کے حوالے اسی ایڈیشن سے دیے گئے ہیں۔

۲۔ آزاد نے کئی جگہ ''بیان'' کرنے کے لیے ''دکھانے'' کا signifier استعمال کیا ہے:

(الف) تاریخ فرشتہ میں بھی اس کے مصنف نے اس شہر کا حال اور آبادی کی رونق دکھائی ہے۔

(ب) جشن سالانہ کے درباروں کا انداز تم نے دیکھ لیا ہے۔ اس کے بازاروں کا تماشا محلوں کی بیگمات کو بھی دکھایا۔

۳۔ پروفیسر نذیر احمد: فرقہ نقطوی پر ایک طائرانہ نظر؛ مشمولہ تاریخی و ادبی مطالعے: ۱تا۱۲۶ اشاعت علی گڑھ ۱۹۶۱ء

۴۔ بحوالہ نذیر احمد: ۱۶

۵۔ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی:

Nuqtavi thinkers at the Mughal Court: A study of their impact on Akbar's religious and political ideas (Medieval India; Essays in Diplomacy and Culture. ۵۰

۶۔ بحوالہ نذیر احمد: تاریخی و ادبی مطالعے: ۲

مولانا حسین آزاد اور دربارِ اکبری

(ایک تہذیبی اور ثقافتی مطالعہ)

ڈاکٹر خلیل طوق آر

تاریخ کو ایک لحاظ سے ادب کی صنف میں شمار کرنا بجا ہوگا۔ بالخصوص دَورِ قدیم کی تاریخ کی کتابوں کو، جو کہ کہانی یا داستان نویسی کی کچھ خصوصیات کے ساتھ ساتھ قطعہ، قصیدہ، مرثیہ اور رباعی جیسی شاعری کے نمونوں کی بھی حامل ہیں، کو ایک ادبی تصنیف سمجھنا ضروری ہے اور وہ عصر حاضر کی جدید انداز میں لکھی گئی تاریخی معلومات پر مشتمل تصانیف سے زیادہ ادب پارے کہلانے کی مستحق ہیں۔

آثارِ تاریخ کو ادبی صنف کا ایک حصہ ماننے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادبی تصانیف کی تحقیق اور مطالعہ کرتے ہوئے کچھ علمی اور فنی اقدار کو مدنظر رکھ کر اور کچھ مددگار علوم سے بھی فائدہ اٹھا کر اُنھیں پرکھنا ضروری ہے جن میں اجتماعیات، روحانیات، فلسفہ اور Ethnology یا خلق شناسی جیسے علوم کی شاخیں شامل ہیں۔ اب مولانا حسین آزاد کی تصنیف دربارِ اکبری کو ethnology اور folklore کے ترازو میں ڈال کر پرکھا جائے گا جس کے موضوعات میں لوگوں کے رہن سہن، عادات و رسومات، طرز زندگانی، لوک داستانیں اور کہانیاں وغیرہ شامل ہیں۔

محمد حسین آزاد اردو ادب کی قد آور اور ممتاز ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کی ادبی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کی ایک ایک تصنیف قابلِ مدح و ستائش ہے اور اُن کی تصانیف کے گہرے مطالعہ اور باشعور تحقیق سے نہ صرف اُن کے عالی علمی اور ادبی اقدار اُجاگر ہوں گے بلکہ اردو ادب کے ماضی اور حال کو بہتر انداز میں سمجھنے میں یہ بڑی حد تک مددگار ثابت ہوں گی۔

محمد حسین آزاد کی تصانیف میں دربارِ اکبری ایک خاص مرتبہ رکھتی ہے۔ ہر چند اُن کی یہ تصنیف دوسری تصانیف کے زیر سایہ رہی ہے اور بعض محققوں کی تنقید کا نشانہ بنی ہے کہ دربارِ اکبری آزاد کی اکبر پرستی کی ایک

روشن دلیل ہے۔ یہ کتاب جس میں اکبر اور اس کے اہلِ دربار کے حالات مرقوم ہیں تقریباً ۸۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسلوب کے لحاظ سے یہ مصنف کے ذہنی انحطاط کی غمازی کرتی ہے۔ (ڈاکٹر محمد صادق، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ص ۳۲۶) اور کچھ زاویوں سے یہ تنقیدیں حق بجانب بھی ہیں۔ بالخصوص آزاد کی اکبر پرستی جو کی بات ہے وہ سو فی صد صحیح ہے لیکن ان تمام قابلِ تنقید پہلوؤں کے باوجود دربار اکبری ایک ایسا خزانہ ہے جس میں ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کے لحاظ سے بے شمار قیمتی جواہرات پائے جاتے ہیں۔ بالخصوص ہندوستان میں آباد ترک النسل لوگوں کی تہذیب و ثقافت سے متعلق اس نگارش میں جو معلومات ہیں وہ اس تصنیف کو ایک بے نظیر ماخذ بنائے رکھتی ہیں۔

مولانا حسین آزاد دربارِ اکبری میں ایک جگہ بیان کرتے ہیں کہ اپنی تصنیف میں وہ درست معلومات پیش کریں گے جو ہمارے مطالعہ کے لیے لازمی بنیاد فراہم کرتی ہیں:

> لوگ کہیں گے کہ آزاد نے دربار اکبری لکھنے کا وعدہ کیا اور شاہنامہ لکھنے لگا۔ لو اب ایسی باتیں لکھتا ہوں کہ جن سے شہنشاہ موصوف کے مذہب، اخلاق، عادات اور سلطنت کے دستور و آداب اور اس کے عہد کے رسم و رواج اور کاروبار کے آئین آئینہ ہوں۔ خدا کرے کہ دوستوں کو پسند آئیں۔ (دربار اکبری ص ۳۵)

مصنف کے بیان سے یہ امر واضح ہو جانے کے بعد جب کتاب کو نظرِ تحقیق سے دیکھا جائے تو تقریباً کتاب کے ہر صفحے پر نئی نئی اور مفید معلومات سامنے آتی ہیں جن سے نہ صرف اکبر بادشاہ کے عہد بلکہ ان کے کئی پرکھوں تک کی تاریخ کے ساتھ ساتھ تہذیبی اور ثقافتی منظر بہ آسانی کھینچا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے دربارِ اکبری میں مرقوم اکبر بادشاہ کی پیدائش سے قبل کے ایک واقعہ سے شروع کریں۔ آزاد لکھتے ہیں:

> جب اکبر کی ماں حاملہ تھی تو ایک دن بیٹھی سی رہی تھی۔ یکا یک کچھ خیال آیا۔ سوئی سے پنڈلی کو گودا اور اُس میں سرمہ بھرنے لگی۔ ہمایوں باہر سے آ گیا۔ پوچھا: بیگم یہ کیا کرتی ہو؟ اُس نے کہا: میرا جی چاہا کہ ایسا ہی گل میرے بچے کے پاؤں میں بھی ہو۔ خدا کی قدرت دیکھو، اکبر پیدا ہوا تو اُس کی پنڈلی میں بھی ویسا ہی سرمئی نشان تھا۔ (دربار اکبری، ص ۴)

دَورانِ حمل ماں جو کچھ کھائے اور اپنے جسم پر جو کچھ کرے اس کا اثر بچے پر ہوگا۔ یہ ایک ایسا اعتقاد ہے جو آج کے زمانے کی طب کے علاوہ کئی قوموں میں صدیوں سے متواتر چلا آتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی اس کے قریب قریب یقین یہ ہے کہ دَورانِ حمل اجازت لیے بغیر کسی اور کی ملکیت کا کچھ کھائے تو اُس کے بچے کے جسم پر سیاہ دھبے کا نشان ہوگا۔ اس لیے ہمارے ہاں خواتین pregnancy کے دَوران اجازت لیے بغیر کچھ کھانے سے گریز کرتی ہیں۔

اسی طرح جب اکبر پیدا ہوتے ہیں تو ہمایوں اُن کے لیے زیچ کا نقشہ خود نکالتے ہیں۔ یہ ایک ایسی قدیم رسم ہے کہ ہزار سالوں سے ہندو مذہب کے لوگوں میں جاری ہے اور خاص طور پر اسلامی سلطنتوں میں سلاطین اور امرا کے ہے پیدا ہونے والے بچوں کے لیے زائچہ نکالنے کی عادت پائی جاتی تھی۔ اس بارے میں آزاد لکھتے ہیں:

ولادت کی تاریخ ہوئی ع شبِ یکشنبہ و پنج رجب است ۹۴۹ء ہجری۔ بے سامان بچے کو جس طرح خدا نے تمام سامان ملک و دولت کے دیے اُسی طرح ولادت کے وقت ستاروں کو بھی اِسی نظام کے ساتھ ہر ایک برج میں واقع کیا کہ آج تک نجومی حیران ہوتے ہیں۔ ہمایوں خود ہیئت اور نجوم کا ماہر تھا۔ وہ اِس کے زائچے کو اکثر دیکھا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ کئی باتوں میں امیر تیمور سے بھی زیادہ مبارک ہے۔ (دربارِ اکبری، ص۴)

پھر ایک جگہ یہ عبارتیں ہیں:

جس بچے کی ماں کا دودھ دیتے تھے وہ بچہ شاہزادے یا امیرزادے کا کوکہ کہلاتا تھا۔ اُس کی اور اُس کے رشتہ داروں کی بڑی خاطر ہوا کرتی تھی اور اُن کا حق سلطنت میں شریک ہوتا تھا۔ بچہ مذکور کو کوکلتاش خاں خطاب ملتا تھا۔ اکبر نے دودھ تو آٹھ دس بیبیوں کا پیا تھا مگر بڑی حقدار ان میں ماہم بیگم اور جیجی یعنی میر شمس الدین خاں کی بیوی شمار ہوتی تھیں۔ (دربارِ اکبری، ص۴)

آج کل کی ترکی میں اس طرح کسی اور کے بچے کو دودھ دینے والی خاتون کو ''کوکہ'' نہیں، ''دودھ کی ماں'' کہتے ہیں اور اسے سگی ماں کی طرح احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہمارے ہاں یہ رسم بھی ہے کہ دودھ کی ماں کی اولاد سے شادی بالکل ناجائز ہے کیونکہ وہ بھی سگے بہن بھائی سمجھے جاتے ہیں۔

آگے چل کر آزاد ایک دلچسپ واقعہ کے بارے میں یوں بتاتے ہیں:

اس کی ماں کے ہاں کئی دفعہ برابر بیٹیاں ہی ہوئیں۔ کابل کے مقام پر پھر حاملہ ہوئی۔ باپ نے اس کی ماں کو بہت دھمکایا اور کہا: اب کے بیٹی ہوئی تو تجھے چھوڑ دوں گا۔ جب ولادت کے دن نزدیک ہوئے تو بے بس بی بی مریم مکانی کے پاس آئی۔ حال بیان کیا اور کہا کہ کیا کروں؟ اسقاط حمل کردوں گی۔ بلا سے گھر سے بے گھر تو نہ ہوں۔ جب وہ رخصت ہو کر چلی تو اکبر رستے میں کھیلتا ہوا ملا۔ اگرچہ بچہ تھا مگر اس نے بھی پوچھا کہ جی جی کیا ہے؟ افسردہ معلوم ہوتی ہو۔ اس بچاری کا سینہ درد سے بھرا ہوا تھا۔ اس سے بھی کہہ دیا۔ اکبر نے کہا: میری خاطر عزیز ہے تو ایسا ہرگز نہ کرنا اور دیکھنا بیٹا ہی ہوگا۔ خدا کی قدرت سیف خاں پیدا ہوا۔ اس کے بعد زین خاں پیدا ہوا۔ مرتے وقت اجمیری اجمیری اس کی زبان سے نکلا۔ شاید خواجہ اجمیر کا نام وردِ زبان تھا یا اکبر کو پکارتا تھا کہ کمال عقیدت کے سبب سے اس درگاہ کے ساتھ اسے نسبت خاص ہو گئی تھی۔ (دربار اکبری، ص۳۵)

اوپر منقول سطور میں جہاں اکبر کے مابعد الطبیعیاتی خصائص کی طرف اشارہ ہے وہاں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ آج کی طرح اُس وقت بھی مشرقی ملکوں میں بیٹی کی نسبت بیٹے کو اہمیت دی جاتی تھی اور والد کو بیٹے کا شوق ہوتا تھا جو اپنی نسل کو آگے بڑھانے کا ذریعہ اور والدین کے بڑھاپے کا سہارا سمجھا جاتا تھا اور ان سطور سے یہ بھی آشکار ہوتا ہے کہ اُس وقت بھی ڈر کے مارے کچھ بے چاری مائیں اسقاطِ حمل کرتی تھیں جس طرح آج بھی مشرقی قوموں میں بے چاری خواتین خوف و ہراس کی وجہ سے اپنی جان سے عزیز بچیوں کی زندگیوں کو اپنے ہاتھوں ختم کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ یہ صد افسوس کا مقام ہے کہ صدیاں گزرنے کے باوجود نہ صرف غیر اسلامی قوموں میں بلکہ بالخصوص اسلامی قوموں میں بھی یہ بُری اور عصر جاہلیہ کی عادت جاری ہے۔

یہ دربارِ اکبری سے منقول کچھ دلچسپ واقعات تھے جن کا تعلق اُس وقت کی خاندانی زندگی اور اعتقادات سے ہے۔ اسی طرح دربار اکبری میں بابری سلاطین، امرا اور سردار خاص طور پر اکبر کی دلچسپیوں، شوق اور عادات سے متعلق ایسی باتیں ہیں جنھیں پڑھ کر انسان خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل عبارتوں میں ایک فوجی کمانڈر کی حکمتِ عملی دیکھیے جس نے جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک کیا:

> اسی عرصے میں ہمایوں بھی لاہور سے پہنچا۔ ان میدانوں میں اکبر نے ہمت و جرأت کے خوب خوب نشان دکھائے اور آخر یہ معرکہ اُسی کے نام پر فتح ہوا۔ بیرم خاں نے کلّہ مینار یادگار بنایا۔ شاہانِ ایشیا کا قدیمی دستور ہے کہ جب لڑائی کا میدان مارتے ہیں تو مقامِ جنگ میں ایک بلند اور نمودار مقام پر بڑا سا گڑھا کھودتے ہیں۔ باغیوں کے سر کاٹ کر اُس میں بھرتے ہیں۔ اُس پر ایک بلند عمارت بشکل مینار بناتے ہیں کہ فتح کی یادگار رہے اور دیکھنے والوں کو عبرت ہو۔ اس کو کلّہ مینار کہتے تھے۔ (دربار اکبری، ص ۹)

جنگ کی یادگار دیکھیے "کلّہ مینار"!!! وہ کیا زمانہ تھا جس میں ہمارے بزرگ اس طرح کی یادگار چھوڑتے تھے۔ دربار اکبری میں اِس دل دکھانے والی مثال سے ہٹ کر بابری سلاطین کے شوقوں کے بارے میں بھی جامع معلومات ملتی ہیں۔ مثلاً:

> سلاطین سلف میں بہت سے شغل تھے کہ شوق ہائے شاہانہ سمجھے جاتے تھے۔ اُسی میں مصوری تھی۔ ہمایوں کو تصویر کا بہت شوق تھا۔ اکبر کو حکم دیا کہ تم بھی سیکھا کرو۔ جب سکندر کی مہم فتح ہو چکی (ہیموں کی بغاوت کا ابھی ذکر فکر بھی نہیں تھا) اکبر ایک دن تصویر خانے میں بیٹھا تھا۔ مرقع کھلے تھے۔ مصور حاضر تھے۔ ہر شخص اپنی دست کاری میں مصروف تھا۔ اکبر نے ایک تصویر کھینچی۔ کہ گویا ایک شخص کا سر، ہاتھ پاؤں الگ الگ کٹے پڑے ہیں۔ کسی نے عرض کی: حضور یہ کس کی تصویر ہے؟ کہا ہیموں کی۔

لیکن اسے شہزادہ مزاجی کہتے ہیں کہ جب جالندھر سے چلنے لگے تو میر آتش نے چاہا کہ عید کی مبارک باد

میں آتش بازی کی سیر دکھائے۔ اُنھوں نے اس میں یہ بھی فرمائش کی ہیمون کی مورت بناؤ اور راون کی طرح آگ دے کر اُڑاؤ چنانچہ اِس کی تعمیل ہوئی۔ (دربارِ اکبری، ص ۱۷-۱۸)

آزاد اپنی تصنیف میں مختلف مقامات پر اکبر کی علم دوستی اور دانش پروری کے متعلق ایسی عجیب باتیں پیش کرتے ہیں کہ سلاطینِ معزز کی گلکاریوں کی ہو بہ ہو تصویر کشی ہوتی ہے۔ آزاد کے کہنے کے مطابق یہ عظیم بادشاہ کی دانشوری دیکھیے جو ہٹلر کی کارکردگیوں کی یاد دلاتی ہے:

گفتگو ہوئی کہ انسان کی طبعی اور مادری زبان کیا ہے؟ خدا کے ہاں سے کیا مذہب لے کر آئے ہیں؟ اور پہلے پہل کیا ان کی زبان سے نکلتا ہے۔ ۹۸۸ھ میں اس کی تحقیق کے لیے شہر سے الگ ایک وسیع عمارت بنوائی۔ تقریباً ۲۰ بچے پیدا ہوتے ہی ماؤں سے لے لیے اور وہاں لے جا کر رکھا۔ اناّئیں، پالنے والی، خدمت گزار کیا عورتیں کیا مرد۔ سب گونگے ہی رکھے کہ گفتگوئے انسانی کی آواز تک کان میں نہ جائے۔ آرام و آسائش کے سامان کمال فارغ البالی کے ساتھ موجود تھے۔ مقام کا نام گنگ محل تھا، چند سال کے بعد آپ وہاں گئے۔ خدمتگاروں نے بچوں کو لا کر آگے چھوڑا، چھوٹے چھوٹے تھے۔ چلتے، پھرتے، کھیلتے، کودتے، بولتے بھی تھے مگر بات کا ایک لفظ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ جانوروں کی طرح غائیں بائیں کرتے تھے۔ گنگ محل میں پلے تھے۔ گونگے نہ ہوتے تو کیا ہوتے۔ الاسماء تنزل من السماء۔ (دربارِ اکبری، ص ۱۰۹)

دربارِ اکبری میں بادشاہوں کے شوق و عادات کے علاوہ سلاطین اور اہلِ سیاست کی حکمتِ عملیوں کے بارے میں بھی تفصیل موجود ہے۔ اِن میں سے ایک بادشاہوں کی موت کے بعد ولی عہد کے برسرِ اقتدار آنے تک پرانے بادشاہ کی موت کی خبر کو چھپانا ہے۔ اِس سلسلے میں آزاد لکھتے ہیں:

دربار میں شکیبی شاعر تھا کہ قد و قامت، صورت و شکل میں ہمایوں سے بہت مشابہ تھا۔ کئی دفعہ اسے بادشاہ کے کپڑے پہنا کر محل سرا کے کوٹھے پر سے اہلِ دربار کو دکھایا اور کہا کہ ابھی حضور کو باہر آنے کی طاقت نہیں۔ دیوانِ عام کے میدان سے مجرا کر کے رخصت ہو۔ جب اکبر تخت نشین ہوا اور سب طرف فرمان جاری ہو گئے تب بادشاہ کے مرنے کا حال ظاہر کیا۔ سبب یہی تھا کہ اُس زمانے میں بغاوت اور بدعملی کا ہو جانا ایک بات تھی۔ خصوصاً ایسے موقع پر کہ سلطنت کے قدم ہی نہ نکے تھے، اور ہندوستان افغانوں کی کثرت سے افغانستان ہو رہا تھا۔ (دربارِ اکبری، ص ۱۱)

تاریخ کی کتاب ہونے کی حیثیت سے دربارِ اکبری میں سیاسی امور کی بابت کافی معلومات ہیں۔ آزاد کی اس تصنیف کے اکثر حصوں میں اکبر کی ہندو، پارسی اور عیسائی مختصراً غیر مسلم جتنی بھی اقوام تھیں، ان سے محبت اور اُن کی ریت رسوم سے دلچسپی کا ذکر آتا ہے۔ اس کے تحت جا بجا اُن کے اعتقادات اور رسوم کا ذکر آتا ہے۔ اِس کی بعض

جھلکیاں اکبر کی ایک مہم کا بیان ہوتے ہوئے سامنے آتا ہے۔ وہ یوں کہ:

خاصے گھوڑوں میں ایک باد رفتار تھا۔ سر سے پاؤں تک سفید براق جیسے نور کی تصویر۔ اکبر نے اس کا نام نور بیضا رکھا تھا۔ جس وقت اس پر سوار ہوا، گھوڑا بیٹھ گیا۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ شگون اچھا نہ ہوا۔ راجہ بھگوان داس (مان سنگھ کے باپ) نے آگے بڑھ کر کہا۔ حضور فتح مبارک۔ اکبر نے کہا سلامت باشید۔ کیوں کر۔ اس نے کہا اس رستے میں تین شگون برابر دیکھتا چلا آیا ہوں۔

۱) ہمارے شاستر میں لکھا ہے کہ جب فوج مقابلے کو تیار ہو۔ اور سیناپتی کا گھوڑا اسواری کے وقت بیٹھ جائے۔ تو فتح اسی کی ہوگی۔

۲) ہوا کا رخ حضور ملاحظہ فرمائیں کہ کس طرح بدل گیا۔ بزرگوں نے لکھ دیا ہے کہ جب ایسی صورت ہو۔ سمجھ لیجیے کہ مہم اپنی ہے۔

۳) رستے میں دیکھتا آیا ہوں کہ گدھ، چیلیں، کوے برابر لشکر کے ساتھ چلے آتے ہیں، اسے بھی بزرگوں نے فتح کی نشانی لکھا ہے۔ (دربارِ اکبری، ص ۲۸۔۲۹)

اسی طرح پارسی قوم اور اُن کے مذہب سے اکبر کی دلچسپی کے بارے میں آزاد کی یہ سطور ملاحظہ ہوں:

آتش پرست پارسی نوساری علاقۂ گجرات دکن سے آئے، وہ دین زردشت کی کتابیں بھی لائے۔ ملکِ دل کا بادشاہ ان سے بہت خوش ہو کر ملا۔ شاہان کیانی کی رسم و رواج، آگ کی عظمت کے آئین اور اس کی اصلاحیں معلوم کیں۔ ملا صاحب کہتے ہیں: آتشکدہ محل کے پاس بنوایا۔ حکم تھا ایک دم آگ بجھنے نہ پائے کہ آیاتِ عظیمۂ الٰہی اور اس کے نوروں میں سے ایک نور ہے۔ ۲۵ جلوس میں بے تکلف آگ کو سجدہ کیا۔ جب چراغ یا شمع روشن ہوتی مصاحبان مقربین تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اہتمام اس کا شیخ ابوالفضل کے سپرد ہوا۔

(دربارِ اکبری، ص ۶۶)

خیر، بس اکبر نہیں تھا جس نے ہندو قوم سے محبت کی، بقولِ آزاد ہندو قوم بھی اکبر سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس ضمن میں آزاد لکھتے ہیں:

ہندوستان کے لوگ صبح کو بادشاہ کے دیدار کو بہت مبارک سمجھتے ہیں۔ جو لوگ دربار پر اشنان کو آتے تھے مرد عورتیں، بچے ہزار ہزار سامنے آتے تھے۔ ڈنڈوتیں کرتے۔ مہابلی بادشاہ سلامت کہتے اور خوش ہوتے۔ وہ اپنے بچوں سے زیادہ اُنھیں دیکھ کر خوش ہوتا اور خوشی بھی بجا تھی جس کے دادا (بابر) اپنی قوم (ترک) اس تباہی کے ساتھ اس موروثی ملک سے نکالے اور پانچ چھ پشت کی بندگی پر خاک ڈالے۔ یہ غیر قوم غیر جنس ہو کر اس محبت سے پیش آئیں ان سے زیادہ عزیز کون ہوگا۔ (دربارِ اکبری، ص ۶۳)

دربارِ اکبری کا سب سے اہم باب وہ ہے جس میں اکبر کے ایجاد کردہ دین الٰہی سے متعلق معلومات دی جاتی ہیں۔ دین الٰہی میں شمولیت کی خاطر جو چار ترک تھے اُس کا بیان ملاحظہ ہو:

انھی دنوں میں قرار پایا کہ جو شخص دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہو، چاہیے کہ اخلاص چارگانہ رکھتا ہو۔ ترکِ مال، ترکِ جان، ترکِ ناموس، ترک دین۔ ان سے جو چاروں رکھتا ہے وہ پورا ہے۔ ورنہ پون۔ آدھا۔ چوتھائی جیسا ہوگا ویسا اس کا اخلاص ہوگا۔ سب مخلص مرید درگاہ ہوگئے کہ ان کا دین دین الٰہی اکبر شاہی تھا۔

(دربارِ اکبری، ص۷۳)

آزاد کی تصنیف دربارِ اکبری میں تہذیب وثقافت کے مطالعے کے لیے مناسب اور بھی بے شمار معلومات ہیں لیکن ترک ہونے کی حیثیت سے اِس تصنیف میں میرے لیے سب سے اہم حصے وہ ہیں جو ترک قوم اور اُن کی عادات ورسومات سے متعلق ہیں۔ مثال کے طور پر ترکوں کی قومی رسومات اور عادات ورواج کے بارے میں آزاد ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے اکبر کی پیدائش کی خوش خبری ملازم کا لے کر آنا اور اِس پر ہمایوں کا ردِ عمل۔ اِس بارے میں دربارِ اکبری میں مرقوم ہے:

ترکوں میں رسم ہے کہ جب کوئی ایسی خوشخبری لاتا ہے تو اُسے کچھ دیتے ہیں۔ ایک سفید پوش اشراف ہوگا تو اپنا چغہ ہی اتار کر دے دے گا۔ امیر ہے تو اپنی دستگاہ کے موجب خلعت اور گھوڑا۔ نقد وجنس جو جو کچھ ہو سکے گا۔ سب کی ضیافتیں کرے گا۔ نوکروں کو انعام واکرام سے خوش کرے گا۔ ہمایوں کے پاس جب سوار یہ خبر لایا تو اُس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ دائیں بائیں دیکھا کچھ نہ پایا۔ آخر یاد آیا کہ کمر میں ایک مشک نافہ ہے، اُسے نکال کر توڑا اور ذرا ذرا سا مشک سب کو دے دیا کہ شگون خالی نہ جائے۔ (دربارِ اکبری، ص۲)

پھر اسی سلسلے میں ایک دوسری جگہ پر آزاد رقمطراز ہیں:

ترکوں میں رسم ہے کہ بچہ جب پاؤں چلنے لگتا ہے تو باپ دادا چچا وغیرہ میں سے جو بزرگ موجود ہو وہ اپنے سر سے عمامہ اُتار کر بچے کو چلتے ہوئے مارتا ہے۔ اس طرح بچہ گر پڑے اور اِس کی بڑی خوشی سے شادی کرتے ہیں۔ جب اکبر سوا برس کا ہوا اور پاؤں چلنے لگا تو ماہم نے مرزا عسکری سے کہا کہ یہاں تم ہی اس کی باپ کی جگہ ہو۔ اگر یہ رسم ادا ہو جائے تو شفقتِ بزرگانہ سے بعید نہ ہوگا۔

ترکوں کی قومی رسموں میں سے ''نوروز'' کے بارے میں بھی دربارِ اکبری میں منقول ہے:

...اس قسم کی رسمیں ہمایوں کے عہد میں بھی جاری تھیں۔ وہ قدیم سے نوروز کو عید مناتے تھے۔ اور خوان یغما لگا کر لوٹتے لٹاتے تھے۔ اسلام میں بھی ہر بادشاہ نے کہیں کم کہیں زیادہ اسے عید کا دن سمجھا ہے اور فی الحقیقت جس دن سے اکبر تخت پر بیٹھا تھا اس مبارک دن کو عالم کی عید سمجھ کر جشن کرتا تھا۔

اوپر میں دی گئی معلومات میں منقول ترکوں کی عادات و رسومات وہی ہیں جو آجکل بھی ترک قوموں میں کم و بیش جاری ہیں۔

اوپر منقول پیراگرافوں میں جو ترکوں کی عادات و رسومات سے متعلق ہیں، ان کے باوجود دربارِ اکبری سے صاف طور پر یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد کے دل میں ترکوں سے بغض و دشمنی کے اثرات بہت زیادہ ہیں۔ کیونکہ آزاد کی اکبر پرستی معقول کی حدود کو پار کر کے انتہا کی حد تک پہنچی ہے۔ چونکہ ترک، اُس وقت اکبر اور اُن کے دین الٰہی کے سامنے کھڑی ہونے والی طاقت تھی لہٰذا اکبر کے دشمن آزاد کے بھی دشمن تھے۔ اس لیے دربارِ اکبری میں جب جب ترکوں کا ذکر آتا ہے تب تب تحقیر و تذلیل کی باتیں بھی پیش ہوتی ہیں۔ ان کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

...اس کے گرد و پیش سوار دوڑا دیے اور کہا: کہتے چلے جاؤ کہ الور سے حاجی خاں افغان ہمایوں کی مدد کو پہنچا، اور تردی بیگ کو بھاگایا۔ مگر حاجی خاں بھی اس رستے پھرا آتا ہے کیونکہ جانتا ہے ترک دغاباز ہوتے ہیں، مبادا بھاگ کر پلٹ پڑیں۔ (دربارِ اکبری ص ۱۵)

پھر آزاد فرماتے ہیں:

...وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میرے باپ پر چچاؤں کے ہاتھ سے کیا گزری۔ چچاؤں کی اولاد اور ان کے نمک خوار موجود ہیں۔ اور جو ہم قوم ترک اس وقت میرے ساتھ ہیں یہ ہمیشہ دو دھاری تلوار ہیں۔ جدھر فائدہ دیکھا ادھر پھر گئے... (دربارِ اکبری ص ۶۲)

ہاں صرف ترک نہیں تھے جو آزاد کی مذمت کی زد میں آئے، ترکوں کے ساتھ ساتھ علمائے دین، فقہا اور قضاۃ بھی اس طرح تذلیل و تحقیر کے حقدار تھے کیونکہ وہ بھی اکبر کے عزائم کے سامنے رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

اکبر کو انھیں فرقوں سے تعلق تھا۔ اس لیے وہ بھی نوروز کے دن جشن شاہانہ کے سامان میں فصل بہار کی شان دکھاتا تھا اور سلطنت کا نوروز مناتا تھا۔ چونکہ وہ ہندوستان میں تھا اور ہندوؤں میں اسے رہنا سہنا اور گزارا کرنا تھا، اس لیے ان کی ریت رسوم کی بھی بہت باتیں داخل کر لی تھیں۔ تمھیں یاد ہے! اس بے علم بادشاہ کو علمائے زر پرست نے ذہن نشین کر دیا تھا کہ سنہ ہزار میں ملک و ملت بدل جائے گا اور اس کے صاحب فرمان آپ ہی ہوں گے۔ وہ اس خوشی میں ایسا بے قرار ہوا کہ جو باتیں سنہ الف پر کرنی تھیں پہلے ہی کر گزرا۔ یہاں تک کہ ۹۹۰ھ میں ہی سنہ الف کا سکہ لگا دیا اور جشن نوروزی کی شان و شکوہ میں بھی عمدہ عمدہ ترقیاں اور فائدہ مند اصلاحوں سے جاہ و جلال کو جلوہ دیا۔ جشن کے قواعد و آئین نے سال بہ سال کی ترقیوں سے پرورش پائی مگر آزاد سب کو ایک جگہ سے جاتا ہے کہ دلچسپ تماشا ہے۔ (دربارِ اکبری ص ۱۵۱)

آزاد پھر اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

وہ اپنے کام کی مصلحتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ قاضی و مفتی ان کے سر پر حاکم شرع تھے۔ بعض مقدموں میں لالچ سے۔ بعض جگہ حماقت سے۔ کہیں بے خبری۔ کہیں بے پروائی سے۔ کہیں اپنے فتوے کا زور دکھانے کو امرا کے ساتھ اختلاف کرتے تھے اور انھیں کی پیش جاتی تھی۔ اس صورت میں امرا کو ان سے تنگ ہونا واجب تھا۔ دربار میں اب ایسے عمال بھی آ گئے تھے کہ اقرباء دین قدرت کے عجائب نسخے تھے۔ خوشامد اور حصول انعام کے لالچ نے انھیں ایسے ایسے مسائل بتا دیے تھے کہ بادشاہوں کے شوق مصلحت سے بھی بہت آگے نکل گئے تھے۔ اور نئی اصلاح و انتظام کے لیے رستہ کھلا۔

ابوالفضل و فیضی کا ناحق نام بدنام ہے، کر گئے داڑھی والے پکڑے گئے مونچھوں والے۔ غازی خان بدخشی نے کہا کہ بادشاہ کو سجدہ جائز ہے۔ علما نے کان کھڑے کیے، غل مچایا، گفتگو کے سلسلے پھیل کر اُلجھے۔ معترض ملاؤں کے جوش نہ دم لیتے تھے نہ لینے دیتے تھے۔ جواز کے طرف دار بڑی ملائمت سے اُنھیں روکتے اور اپنی بنیاد جمائے جاتے تھے۔ کہتے تھے کہ عہد سلف پر نظر کرو۔ اُمت ہائے قدیمہ کو دیکھو۔ وہ عموماً اپنے بزرگوں کے سامنے تحفہ عجز و نیاز سمجھ کر ادب سے پیشانی زمین پر رکھتے تھے۔ ملائکہ کا سجدہ حضرت آدم کو کیسا تھا؟ ج: ظاہر کہ تعظیمی۔ باپ اور بھائیوں کا سجدہ حضرت یوسف کو کیوں تھا؟ ج: تحفہ ادب پیش کیا تھا نہ کہ پرستشِ بندگی۔ بس وہی سجدہ یہ ہے۔ پھر انکار کیوں؟ اور تکرار کیا؟ (دربارِ اکبری، ص۴۶۔۴۷)

دربارِ اکبری میں آزاد کی اکبر پرستی کی حد نہیں ہے۔ اکبر نے جو کیا ہے وہ آزاد کی نظر میں صحیح تھا اور اکبر نے چاہے اپنے مذہب اسلام کے خلاف ہو یا اپنی قوم ترک، جو بھی پالیسی اپنائی وہ ٹھیک تھی۔ جس طرح مندرجہ ذیل سطور میں آزاد نے اکبر کی اسلام اور شریعت سے دُور ہونے کا جواز نکالا ہے:

عہد قدیم میں ہر سلطنت کو شریعت کے ساتھ ذاتی پیوند رہا ہے۔ اوّل اوّل سلطنت شریعت کے زور سے کھڑی ہوئی۔ پھر شریعت اس کے سائے میں بڑھتی گئی۔ مگر اس دربار کا رنگ کچھ اور ہونے لگا۔ اوّل تو سلطنت کی جڑ مضبوط ہو کر دُور تک پہنچ گئی تھی۔ دوسرے بادشاہ سمجھ گیا تھا کہ ہندوستان میں اور توران و ایران کی حالت میں مشرق مغرب کا فرق ہے۔ وہاں بادشاہ اور رعایا کا ایک مذہب ہے۔ اس لیے جو کچھ علمائے دین حکم دیں اُسی پر سب کو ایمان لانا واجب ہوتا ہے۔ خواہ کسی ذات خاص یا ملکی امورات کے موافق ہو خواہ مخالف۔ برخلاف اس کے ہندوستان ہندوؤں کا گھر ہے۔ ان کا مذہب اور رسم و رواج اور معاملات کا جدا طور ہے۔ ملک گیری کے وقت جو باتیں ہو جائیں وہ ہو جائیں۔ جب ملک داری منظور ہو اور اس ملک میں رہنا ہو تو چاہیے کہ جو کچھ کریں نہایت سوچ سمجھ کر اور اہل ملک کے مقاصد و اغراض کو مدنظر رکھ کر کریں۔ (دربارِ اکبری، ص ۴۷)

الغرض آزاد کی اکبر پرستی، ترک دشمنی اور کچھ دیگر منفی پہلوؤں کے باوجود اوپر میں منقول عبارتیں اور دربار اکبری میں موجود دیگر معلومات اس امر کی روشن دلیل ہیں کہ دربار اکبری اسلامیانِ ہند کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ نویسی کے شمار میں اپنی مثال آپ ہے اور اس کی زبان اس قدر سلیس اور سہل فہم ہے کہ بہت سے اصطلاحی اور تکنیکی مسائل جو دوسری تاریخ کی کتابوں میں بمشکل سمجھ آتے ہیں اس تصنیف میں آسانی سے سمجھے جاتے ہیں۔

قصص ہند اور تاریخ نویسی کے تقاضے

ڈاکٹر یوسف خشک

مورخ ماضی کی تشکیل کرتے ہوئے اپنے عہد کے نظریات وافکار کو غیر شعوری طور مد نظر رکھتا ہے اور اسی بنیاد پر وہ ماضی کے واقعات کی تشریح کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں ماضی کی تشکیل نئے انداز میں ہوتی رہتی ہے۔ تاریخ، تاریخ نویسی کے تقاضوں کے تحت قصص ہند کا جائزہ لینے سے پہلے اس کی وجہ تصنیف کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

خطبات گارساں دتاسی کے مطابق:

> ۱۸۶۸ء میں ناظم تعلیمات پنجاب کی طرف سے اعلان ہوا تھا کہ اکیس مارچ ۱۸۶۹ء میں اردو تصانیف کا مقابلہ عمل میں آئے گا۔ یہ کتب چار موضوعوں پر ہونی چاہئیں۔ (۱) عام اصول صرف ونحو (۲) فارسی صرف و نحو (۳) تاریخ ہند سے ماخوذ کہانیاں جن میں اہم واقعات اور اشخاص کے تفصیلی حالات بیان کیے جائیں، جنھوں نے بڑے بڑے کام کیے ہیں (۴) اقلیدس کے ایک حصے کا ترجمہ۔ (۱)

اس اعلان سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا قصص ہند (حصہ دوم) لکھنے کا بنیادی مقصد طالب علموں کی تعلیمی ونصابی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اردو زبان میں تاریخ ہند سے وابستہ اہم واقعات کو پیش کرنا تھا۔ یہ قصص تین حصوں پر مشتمل ہیں۔ حصہ اول کو پیارے لال آشوب، دوم کو مولانا محمد حسین آزاد اور سوم کو ترجمان سرشتہ تعلیم پنجاب نے، میجر ہالرائڈ صاحب بہادر ڈائریکٹر مدارس پنجاب کے ایما پر مکمل کیا۔ (۲) بقول ڈاکٹر اسلم فرخی قصص ہند حصہ دوم نے جو مقبولیت حاصل کی اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) تک اس کے پچاس ایڈیشن شایع ہو چکے تھے۔ (۳)

مندرجہ بالا پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کتاب کے ضمن میں اول نکتہ جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ کتاب نصابی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تحریر کروائی گئی اور ہم سب اس چیز سے بخوبی واقف ہیں کہ نصاب میں

جملہ افکار وافعال، نجی وسماجی روابط، تہذیب وتمدن، حال اور ماضی، مملکت کا نظریہ، انفرادی، ذہنی، اخلاقی، جذباتی، روحانی، جسمانی، معاشرتی غرض زندگی کے ہر پہلو کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ یہ کتاب ان تمام توقعات کو کس طرح اور کس حد تک پورا کرتی ہے، یہ زاویہ ایک علیحدہ مضمون کا متقاضی ہے۔

اعلانِ ناظم تعلیمات پنجاب اور عنوان کتاب قصص ہند سے یہ واضح ہے کہ کتاب تاریخ ہند نہیں بلکہ تاریخ ہند سے وابستہ اہم واقعات اور اشخاص کے حالات پر مشتمل ہے۔ تاریخ اور تاریخ نویسی کے قدیم وجدید تقاضوں کی حدود کا دائرہ نہایت وسیع ہے لیکن اس سلسلے میں ہمیشہ تین اجزا کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ۱۔ ترتیب ۲۔ اخلاقی، سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی وثقافتی ورثے اور اقدار پر معلومات کا مشتمل ہونا اور درست ہونا ۳۔ مورخ کی زبان۔

سب سے پہلے واقعات کی ترتیب کو اگر سامنے رکھا جائے تو قصوں کا انتخاب بے شک آزاد نے اپنی مرضی سے کیا ہے لیکن چیدہ قصوں کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے تاریخی ترتیب کا ضرور خیال رکھا ہے۔ کتاب میں صرف بابا نانک کی شخصیت سنہ کی ترتیب کے مطابق شامل نہیں ہے اور اس کی وجہ آزاد نے خود ہی بیان کردی ہے:

> سکھوں کا فرقہ اگرچہ بابر بادشاہ کے عہد سے پیدا ہوا مگر مدت دراز تک یہ لوگ فقیرانہ وضع اور صلح کل کے لباس میں نشو نما پاتے رہے۔ عالمگیر کے عہد میں وضع ان کی بدلنی شروع ہوئی، یہاں تک فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد میں ملک گیری کے ہاتھ پاؤں نکال کر تلوار سنبھالی چونکہ اصل بانی اس فرقے کے گرونانک صاحب تھے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ ان کا حال بھی اس کتاب میں درج کیا جائے۔ (۴)

اس کے بعد اگر دوسرے نکتے یعنی کتاب میں موجود مواد جس کا تعلق تاریخ سے ہے، اس کے ماخذات کو دیکھا جائے تو اس کتاب کے حاشیوں میں جن ماخذات کو پیش کیا گیا ہے اس میں تاریخ فرشتہ، سیر المتاخرین اور خافی خان کی تاریخ شامل ہیں۔ اتنے وسیع مواد کے لیے آزاد نے یقیناً بہت سارے ماخذات سے استفادہ کیا ہوگا، لیکن قصص ہند میں موجود مواد کو پرکھتے ہوئے جو تاریخی کتب راقم کے سامنے رہیں، ان میں محمد قاسم فرشتہ کی تحریر کردہ تاریخ فرشتہ، مولوی ذکاءاللہ کی تاریخ ہندوستان، سلطنت اسلامیہ کا بیان، Vincent A. Smith, کی *The Oxford History of India*، ہاشمی فرید آبادی کی تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت اور Rima Hooja کی *History of Rajistan* شامل ہیں۔

آزاد کے بیان کردہ تاریخی قصوں میں سے، چند کو، مندرجہ بالا تواریخ میں موجود مواد سے ملا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آزاد نے تاریخی قصوں کو بیان کرتے ہوئے سچائی اور غیر جانبدارانہ حیثیت کو کس حد تک برقرار رکھا ہے۔

۱۔غزنوی خاندان کی ابتدا میں راجہ جے پال اور سبکتگین کے درمیان محاذ آرائی اور صلح کی کیفیت آزاد اور محمد قاسم فرشتہ کی زبانی ملاحظہ ہو:

آزاد:...... چنانچہ دونوں فوجیں آمنے سامنے پڑی تھیں، ایک دوسرے کی پیش دستی کا منتظر تھا کہ دفعتاً آسمانی گولا پڑنے لگا یعنی بے موسم برف گرنی شروع ہوگئی۔ وہ لوگ تو برف کے کیڑے تھے، انھیں خبر بھی نہ ہوئی۔ ہندوستانی بیچارے اپنے لحاف اور رضائیاں ڈھونڈنے لگے مگر وہاں رضائی کا گذارہ کہاں۔ سینکڑوں اکڑ کر مر گئے، ہزاروں کے ہاتھ پاؤں رہ گئے، جو بچے ان کے اوسان جاتے رہے۔ گھروں میں جو کہانیاں سنا کرتے تھے کہ ان پہاڑوں میں ایک چشمہ ہے کہ جب اس میں کچھ ناپاک چیز ڈالتے ہیں تو اتنی برف پڑتی ہے کہ شہر کے شہر دب کر رہ جاتے ہیں۔ جانا کہ یقیناً ان لوگوں نے ہمارے مارنے کے لیے کچھ ویسا ہی عمل کیا۔ اب گھر جانا اور گھر والوں کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔

راجا جے پال نے جب ان پہاڑوں میں بارش کی ایسی شدت دیکھی اور سردی کے مارے فوج کو بے کار پایا تو پیغام صلح کا بھیجا۔ (۵)

فرشتہ: ایک گروہ نے سلطان محمود سے جا کر کہا کہ راجہ جے پال کی فوج یہاں مقیم ہے وہاں قریب ہی ایک چشمہ ہے جس کی خاصیت یہ ہے کہ اگر اس میں تھوڑی سی نجاست ڈال دی جائے تو آندھی کے تیز تھپیڑوں، بادل کی گرج اور بجلی کی چمک دمک سے فوراً ایک طوفان برپا ہوتا ہے۔ (یہ سن کر) سلطان محمود نے حکم دیا کہ فوراً اس چشمے میں تھوڑی سی نجاست ڈال دی جائے۔ فوراً حکم سلطانی کی تعمیل کی گئی۔ نجاست جونہی چشمے میں پڑی آسمان پر انتہائی گہرے بادل چھا گئے۔ بادل کی گھن گرج اور بجلی کی چمک کڑک سے میدان کارزار میں عجیب و غریب کیفیت پیدا ہوگئی۔ لشکر کے تمام گھوڑے اور بار برداری کے دیگر جانور ہوا میں انتہائی ٹھنڈک پیدا ہونے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ لشکریوں کے بدن سردی کی شدت سے ٹھٹھر کر رہ گئے اور ہر فرد نقل و حرکت سے معذور رہ گیا۔ اس عالم میں ہر لشکری فریاد و زاری کرنے لگا اور جے پال کے لشکر میں ماتم بپا ہو گیا...... راجہ جے پال نے جب یہ دیکھا کہ آسانی صورت سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں تو اس نے چند قابل اعتبار ایلچیوں کو امیر سبکتگین کی خدمت میں روانہ کیا اور (ان کی معرفت) صلح کی درخواست کی۔ (۶)

ان دونوں بیانات کو ملا کر پڑھنے کے بعد چشمے اور نجاست سے متعلق بیان میں، آزاد کی تحریر منطق کے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح محمود غزنوی کے سومنات پر حملے کی وجہ کے سلسلے میں قصص ہند اور تاریخ ہندوستان سلطنت اسلامیہ کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

آزاد: ایک دن مصاحبوں کے ساتھ بیٹھ کر ادھر ادھر نظر دوڑائی تو صدہا کوس تک کوئی مملکت نظر نہ آئی جس کی

فتح سے پر مال خزانے کو مالا مال کرے۔ ارکان دولت کو جمع کیا، سب نے خیال کے عیار اور فکر کے جاسوس چاروں طرف دوڑائے۔ آخر معلوم ہوا کہ اسی خراب آباد ہندوستان میں جسے گیارہ دفعہ پامال کرلیا ہے، ملک گجرات میں سمندر کے کنارے ایک شہر عظیم الشان ہے اور اس میں ایک عبادت خانہ ہنود کا ہے کہ اپنے دیوتا کے نام سے سومنات کہلاتا ہے اور چونکہ ہزاروں برس ہوئے راجا سے لے کر پرجا ملک ملک خلقت اسے صدق دل سے مانتی ہے، اس لیے نہ مال و زر کا ٹھکانہ، نہ زر و جواہر کی کچھ انتہا ہے ......

یہ سن کر محمود کے دہانِ طمع میں پانی بھر آیا اور دل سانپ کی طرح لہرانے لگا۔ اسی وقت سپہ سالار کو حکم پہنچا کہ ہاں لشکر تیار ہو۔ (۷)

ذکاءاللہ: اب محمود کا دل لوٹ مار کے حملوں سے بھر گیا تھا اور ایسی مہموں میں اس کو فراغ نہ آتا تھا۔ قنوج کی فتح کے بعد جو حملے اس نے کیے وہ اپنی خوشی سے اس نے نہیں کیے بلکہ یہ مجبوری تھے۔ اب ساری توجہ اس بات پر تھی کہ اسلام کی اشاعت میں گو وہ کوئی بڑا آدمی نہ شمار کیا جائے مگر یہ بات تو حاصل ہو کہ بت پرستی کے حق میں وبا سمجھا جائے اور بت شکن نام پائے۔ اس لیے اس نے ارادہ سومنات کا کیا۔ (۸)

آزاد محمود کو ایک حملہ آور اور فاتح کے روپ میں جبکہ مولوی ذکاءاللہ اور ان ہی کی طرح محمد قاسم فرشتہ اور ہاشمی فرید آبادی محمود کو مجاہد کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔

قصص ہند میں واقعات کے کچھ حصے ایسے بھی ملتے ہیں جن کا ذکر دیگر تاریخوں میں نہیں ملتا، مثلاً رانی پدمنی کو علاءالدین حاصل کرنا چاہتا تھا، اس کی یہ خواہش تو تاریخ فرشتہ، اور تاریخ ہندوستان سلطنت اسلامیہ کا بیان میں ملتی ہے لیکن اس کے ستی ہونے کا قصہ تاریخ فرشتہ میں موجود نہیں، اور مولوی ذکاءاللہ تاریخ ہندوستان (جلد دوم) میں اسے بیان ضرور کرتے ہیں لیکن اس کے ستی ہونے والے حصے کو داستان شاعرانہ قرار دیتے ہیں (۹) جبکہ آزاد اس چتوڑ کی جنگ کی ابتدا کا سبب پدمنی کے حاصلات اور انتہا اس کے ستی بن جانے پر کرتے ہیں۔

ابتداءِ جنگ کی وجہ پدمنی تھی۔ اس سلسلے میں مندرجہ بالا تاریخیں خاموش ہیں۔ اکثر مسلمان محققین نے پدمنی کے ستی والے عمل کو ملک محمد جائسی کی پدماوت ۱۵۴۰ء کے تصوراتی قصہ سے منسوب کیا ہے۔ لیکن کچھ نامور شخصیات و محققین نے اسے سچ ثابت کرنے کے لیے دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: A. *History of Rajistan* by Rima Hooja جس میں پدمنی کے قصے کو زیر بحث لاتے ہوئے اس تاریخ کے صفحہ نمبر ۳۱۱ پر درج ذیل جملے کے بعد قصے کے حق میں مورخین کے دلائل پیش کیے گئے ہیں:

.....Some other historians, among them A.L. Srivastava, believe

that the Padmani story has a kernel of truth.(10)

اس واقعے کے سلسلے میں آزاد کے موقف کو اکثر تنقید کا نشانہ بھی بنایا جاتا رہا ہے لیکن اس سلسلے میں راقم دلیل کے طور پر ایک تاریخی واقعے کا ذکر کرنا چاہے گا جس واقعے سے اس وقت کے راجپوتوں کی رسوم و روایات کا پتا چلتا ہے اور اس پیغام کی گواہی اکثر تاریخوں میں ملتی ہے۔ جب سبکتگین راجا جے پال کے پہلے پیغام صلح کو مسترد کرتا ہے تو راجا جے پال انھیں دوسرا پیغام بھیجتا ہے۔ اس پیغام کو آزاد کے علاوہ فرشتہ اور مولوی ذکاء اللہ نے بھی پیش کیا ہے۔ تاریخ فرشتہ میں موجود راجا جے پال کا دوسرا پیغام ملاحظہ ہو:

> ابھی آپ اہل ہند اور خاص راجپوتوں کی جہالت اور تعصب کی حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں...... جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے (اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا) تو یہ آخر کار مجبور ہو کر یہ قدم اٹھاتے ہیں کہ اپنا تمام مال واسباب اور بیش قیمت اشیاء مایوس ہو کر آگ کی نذر کر دیتے ہیں اور اس فعل کو اپنی آخرت کی بہبودی تصور کرتے ہیں لیکن اگر اس کے بعد بھی اپنی مصیبت سے چھٹکارا پانے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی تو اپنے قدیم رواج کے مطابق اپنی عورتوں اور حرم سراؤں کو بھی نذر آتش کر دیتے ہیں اور پھر جب دیکھتے ہیں کہ ان کے پاس دنیاوی مال و متاع کچھ نہیں رہا تو پھر یہ دشمن سے معرکہ آرائی کرتے ہیں اور اس معرکے میں اپنے آپ کو بالکل فنا کر دیتے ہیں اور سوائے مٹی کے ان کا نام و نشان کچھ باقی نہیں رہتا۔ اب ان کی مصیبت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اپنے پرانے دستور کے مطابق عمل کریں۔ اگر آپ کو ان کی تباہی و بربادی ہی منظور ہے تو خیر، ورنہ بہتر یہی ہے کہ آپ صلح کر کے ہم سب کو اپنا ممنون بنائیں۔ (11)

اس پیغام سے یہ واضح ہے کہ ہندوستان میں راجپوتوں کی یہ روایت تھی کہ وہ جنگ میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے اور جہاں تک ستی کی روایت کا تعلق ہے تو یہ روایت تو برطانوی دور تک ہندوستانی معاشرے میں موجود تھی تو رانی پدمنی کے قصے کے اس حصے کی صداقت پر شک کیوں؟

محمد حسین آزاد نے نصیر الدین ہمایوں کے باب میں ہمایوں کے انتقال اور اکبر کی تخت نشینی تک رعایا کے سامنے درباری شاعر شکیبی کا اہم کردار دکھایا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

> اکبر اس وقت جالندھر کے پہاڑوں میں افغانوں سے لڑ رہا تھا۔ اہل مصلحت نے ادھر تو اسی وقت عریضہ لکھا ادھر بادشاہ کا مرنا مشہور نہ کیا۔ یہی کہتے تھے کہ ضعف بہت ہے اس لیے دربار نہیں کر سکتے۔ شکیبی شاعر بادشاہ سے بہت مشابہ تھا۔ اسے کبھی کبھی دیوان عام کے کوٹھے پر لباس شاہانہ پہنا کر بٹھا دیتے سب نوکر نیچے میدان میں کھڑے ہو کر مجرا کر لیتے اور یہی جانتے کہ بادشاہ بیٹھے ہیں۔ جب اکبر کلانور (ضلع گرداس پور) میں تخت نشین ہوا تب اس راز مخفی کو کھولا۔ (12)

اس سلسلے میں آزاد کے ماخذ کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا جب کہ مندرجہ بالا تواریخ میں اس قصہ کا ذکر نہیں ملتا ہے۔

جلال الدین اکبر اور ہیموڈ ہوسر کے قتل کے سلسلے میں آزاد اور اکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا میں مماثلت کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

آزاد: (ہیمو) کو باندھ کر سامنے حاضر کیا۔ خانخانان نے اکبر سے کہا کہ پہلی مہم ہے، حضور خود شگون فرمائیں کہ جہاد اکبر ہو۔ وہ ہنس کر بولا کہ بندھے ہوئے دشمن پر! غرض بادشاہ نے تلوار چھوا دی۔ خانخانان نے بیٹھے بیٹھے ایک ہاتھ ایسا مارا کہ اس کا سر پاؤں میں گر گیا۔ (۱۳)

Oxford History : Bairam Khan and Akber , who had left the conduct of the battle to subordinate officers, rode up from the rear. Their helpless dying opponent was brought before them. The protector desired his royal ward to earn the coveted title of Ghazi by slaying the infidel with his own hand. The boy, naturally obeying the instruction of his guardian , smote the prisoner on the neck with his scimitar , and the bystanders finished off the victim. The commonly accepted story that young Akbar exhibited a chivalrous unwilling- ness to strike a wounded prisoner is a later, courtly invention.(۱۴)

''محی الدین اورنگزیب کی عالمگیری'' کے باب میں آزاد لکھتے ہیں کہ ابتدائی جوڑ توڑ کے دنوں میں اورنگزیب نے چھوٹے بھائی مراد کو جو گجرات دکن میں اس کے قریب تھا، اسے نہایت دردمندی کے ساتھ ایک خط لکھا۔ خلاصہ اس کا یہ ہے:

مجھے سلطنت کی ہوس نہیں، مگر چونکہ داراشکوہ بدعقیدہ اور بد مذہب ہے اور تم جیسے چھوٹے بھائی پر کہ قابل سلطنت ہو، ناحق جبر کرتا ہے، میں برادر عزیز کی حق تلفی ناجائز سمجھ کر اعانت فرض سمجھتا ہوں۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ اس مہم کے بعد حج کو چلا جاؤں اور وہیں گوشہ عافیت میں بیٹھ کر یاد الٰہی میں خاتمہ کر دوں۔ (۱۵)

جبکہ اس سلسلے میں ہاشمی فرید آبادی خط کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آخر اس (اورنگزیب) نے مراد کی درخواست قبول کر لی اور یہ عہد نامہ لکھ کر بھیج دیا کہ اگر چھوٹا بھائی آخر تک

وفاداری سے رفاقت کرے گا تو دارا شکوہ کی شکست اور پوری سلطنت پر تسلط حاصل کرنے کے بعد میں خوشی سے کابل و کشمیر، شمالی پنجاب اور سندھ (یعنی موجودہ مغربی پاکستان) کے صوبے اسے دے دوں گا۔ اسے بھی چاہیے کہ راہ سعادت پر قائم رہے۔ خود غرض فریبی لوگوں کے کہنے میں نہ آئے اور معاہدے کی خلاف ورزی نہ کرے۔(۱۶)

ہاشمی فرید آبادی نے اس معاہدے کی نقل تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت میں نقل ''عہد نامہ کے بموجب التماس پادشاہ زادۂ محمد مراد بخش قلمی شد'' کے عنوان سے ص ۵۳۹ تا ۵۴۱ پر پیش کی ہے۔ اس معاہدے کے مطالعے سے آزاد کے پیش کردہ خلاصۂ خط میں اورنگزیب کی گوشہ نشینی اختیار کرنے کی خواہش درست معلوم نہیں ہوتی لیکن آزاد کے اس خلاصے کی وجہ اس کے ماخذ ہیں جو کہ انگریزی ماخذات برنیئر کا سفر نامہ اور انگریزی تاریخیں بھی ہوسکتی ہیں جس کے اشارے تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت کے صفحہ نمبر ۵۳۱ کے حاشیے پر موجود ہیں۔

واقعات کی صحت کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی میں زبان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ رابرٹ سی ولیم کے مطابق:

The language of historian is normally simple, direct and comprehensible ......using ordinary language well is therefore one of the historian's most important tools.(۱۷)

تاریخ نویسی میں زبان کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر قصص ہند میں آزاد کی زبان کو دیکھا جائے تو وہ مختلف سیاسی، سماجی، واقتصادی حالات سے بھرپور ہونے کے باوجود دلچسپ سلیس اور عام فہم ہے۔ بطور مثال ایک جھلک ملاحظہ ہو:

امیر مذکور کو خلوت میں یہ بھی سمجھا دیا کہ غرض اس وکالت سے فقط لڑائی کا بہانہ پیدا کرنا ہے، اس لیے تمھیں بھیجا جاتا ہے کہ تانا شاہ کی ہر ایک بات پر نظر رکھنا اور جس طرح ہو تکرار کے بڑھانے کی باتیں کرنا بلکہ اس طرح بیباکی اور گستاخی کی باتیں کرنا جن کا تانا شاہ متحمل نہ ہو سکے اور کسی طرح لڑائی کے لیے ایک سبب معقول پیدا ہو جائے۔۔۔ اس نے سر دربار سخت سخت کلام کرنے شروع کیے۔ پھر بھی تانا شاہ ایسے معقول جواب دیتا تھا کہ یہ بند ہو جاتا تھا اور کوئی بات ایسی نہ ہوتی تھی جس پر گرفت کر سکے۔۔۔ آخر باوجود ان سب باتوں کے شہنشاہ ہوس پناہ نے فوج کشی کے سامان کر دیے۔۔۔ غرض لشکر شاہی نے نشان چڑھایا اور دکن کو روانہ ہوا۔ سب سے پہلے ایک ہاتھی پر علم اژدھا پیکر، پیچھے اس کے ہاتھیوں پر ہندوستان کا ماہی مراتب، اپنی ولایت کے طوغ وعلم، برنجی اور فولادی نقارے اور دمامے، بعد ان کے ہزاروں ہاتھی، ہودج عماری سے سجے،

سونڈوں میں فولادی زنجیریں لیے، گلے میں ہینکلیں، پیشانیاں شام شفق کی طرح رنگین، اس پر سنہری رپہلی ڈھالیں، زربفت کی جھولیں پاؤں تک لٹکتی، کسی پر ہودج، کسی پر عماری، ریشمی اور کلابتونی رسوں سے کسی، گردنوں پر مہاوت، جن کے گلے میں زربفت کی کرتیاں، سر پر جوڑے دار پگڑیاں، کمر میں کٹار، ایک ہاتھ میں گج باگ ایک میں آنکس، جھومتے جھامتے چلے جاتے تھے۔ آگے پیچھے چرکٹے، سانٹے مار، بھالے بردار، برچھیت، بان دار، فتیلے سلگاتے بھاگے جاتے تھے۔ پھر ہزاروں سواروں کے پرے، سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبے، بہادر نوجوان ترک بچے، افغان، حبشی، راجپوت، دو دو تلواریں باندھے، فولادی خود سروں پر دھرے، کمر میں قرولی اور کٹار، پشت پر گینڈے کی ڈھال، چار آئینہ سجے، کہنیوں تک دستانے چڑھے، ہاتھ میں سات گز کا برچھا، نگاہوں سے خون ٹپکتا، موچھوں کو تاؤ دیتے، گھوڑا اڑاتے چلے جاتے تھے۔ پھر ہزار سانڈنیاں خوش رفتار کہ جن کو سو سو کوس کے دم۔ ان پر بانکے راجپوت لال پگڑیاں باندھے، زرد انگرکھے پہنے، آبی بانات کے پاجامے چڑھائے، ہتھیار لگائے، مہاریں اٹھائے۔ جب یہ گزر گئے تو سواری کے خاص خاصے نظر آئے۔ عربی، ترکی، عراقی، یمنی، کاٹھیاوار کے دکنی، چاندی سونے کے بھاری بھاری ساز، کسی پر جڑاؤ زین دھرا کسی پر جامہ کسا، قجریاں اور پاکھریں پٹھوں پر پڑیں، جن میں قاقم وسمور کی جھالر، کلابتوں کے پھندنے، گلے میں سُراگاے کی چوریاں لٹکتی، سر پر کلکیاں طلائی اور نقرئی ریشمی باگ ڈوریں سائیسوں کے ہاتھ میں الیل کرتے اور چوکڑیاں بھرتے چلے جاتے تھے۔ ان کے بعد عربی، رومی، تاتاری، فرنگی، ہندی باجے، نقیبوں اور چوبداروں کے آوازے، دمامے کی چوٹ کے ساتھ کڑکیتوں کے کڑکوں کا وہ سماں بندھا ہوا کہ بزدلوں کے دلوں میں لہو جوش مارنے لگے۔ ان کے بعد احدیوں اور خواصوں کا انبوہ، کندھوں پر بندوقیں جن پر بانات کے غلاف۔ پھر خواص برداروں کا غول سروں پر کشمیری شالیں بندھی، کمخواب انگرکھے، زربفت کی نیم آستینیں پہنے، گجراتی مشروع کے گھٹنے چڑھائے، اصفہانی تلواریں سونتے، مرصع قبضے ہاتھ میں، سنہری رپہلی میان کمر میں۔ ان کے بعد سقوں کا غول آیا کہ چھڑکاؤ سے روے زمین کو تر و تازہ کر دیا۔ غلام اور خواجہ سرا انگیٹھیاں اور عود سوز لیے، خوشبوؤں سے دماغ معطر کرتے چلے گئے۔ پھر ارکان دربار کے جمگھٹ، بیچ میں شاہ خورشید کلاہ، سفید ڈاڑھی، بڑھاپے کا نور منہ پر، ہوادار میں سوار، ساتھ ایک خاصے کا گھوڑا، پیچھے سونے کی عماری ہاتھی پر دھری، جریب کا پیمانہ اور کوس کا پیاپڑ تا چلا جاتا تھا۔ سواری سے کوس بھر پیچھے سینکڑوں ہاتھی مست جنگی دیوزاد کی صورت، مستکوں پر فولادی ڈھالیں، ایک کالی گھٹا چلی آتی تھی کہ جس سے بجائے پانی کے مستی ٹپکتی تھی۔ پیچھے چیتوں کے چھکڑے، آنکھوں پر زردوزی دیدہ بند، کمر میں کلابتونی اور ریشمی حلقے پڑے، ساتھ ہی شکاری کتے، تازی ولایتی، بودار، بلڈوگ کہ شیر کا سامنا کریں اور

پلنگ سے منہ نہ پھیریں۔ پیچھے کوسوں تک شہزادے اور ارکان دولت کے لشکر، راجوں اور مہاراجوں کی فوجیں، پیادوں کے غول اور سواروں کے رسالے، رنگا رنگ کے نشان، جدا جدا پھریرے اڑاتے چلے آتے تھے۔ بھیر و بنگاہ کا تانتا لگا تھا کہ جس کا صبح سے شام تک خاتمہ نہ تھا۔ (۱۹)

مندرج بالا مجموعی صورتِ حال سے جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر مورخ نے اپنے ماخذات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ہی قصے کو اپنے انداز میں یا اس میں سے پسندیدہ حصوں کو اپنی تحریر میں جگہ دی ہے اور ناپسندیدہ حصوں کو مختصراً بیان کیا ہے یا پھر خاموشی اختیار کر لی ہے۔

آزاد نے اپنے عنوان کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ آزاد کا مقصد باقاعدہ تاریخ لکھنا نہیں تھا اس لیے انھوں نے قصوں میں سنین و تاریخوں کا استعمال کم کیا اور ماخذات کا ذکر بھرپور طریقے سے نہیں کیا۔ آزاد کے پیش کردہ قصوں میں اگر صورتِ حال مختلف ملتی ہے تو اکثر تلاش کے بعد آزاد کا ماخذ سامنے آجاتا ہے۔ مولانا استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب تھے، انھوں نے تاریخ کو ادبی رنگ میں تحریر کیا ہے جس کی بدولت قارئین نہ صرف اخلاقی، سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی، تہذیبی ورثے اور اقدار سے واقف ہو جاتے ہیں بلکہ یہ کتاب تاریخ اور تاریخ نویسی کے قلعے میں داخل ہونے کے لیے کنجی کا کردار ادا کرتی ہے۔

حواشی

۱۔ خطبات گارساں دتاسی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ص ۱۷۹، بحوالہ محمد حسین آزاد حیات و تصانیف حصہ دوم، ڈاکٹر اسلم فرخی انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۶۵ء، ص ۶۱۴۔

۲۔ قصص ہند مولانا محمد حسین آزاد، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ط۔

۳۔ محمد حسین آزاد حیات و تصانیف، ص ۶۲۷۔

۴۔ قصص ہند، ص ۱۷۹۔

۵۔ ایضاً۔

۶۔ تاریخ فرشتہ (اردو)، محمد قاسم فرشتہ مترجم عبدالحی خواجہ ایم اے، بک ٹاک، لاہور ۱۹۹۱ء ص ۷۴۔

۷۔ قصص ہند، ص ۸، ۹۔

۸۔ تاریخ ہندوستان سلطنت اسلامیہ کا بیان، خان بہادر شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ، شمس المطابع، دہلی، ۱۸۹۷ء، ص ۲۸۱۔

۹۔ ایضاً ص ۶۶۔

10. A History of Rajistan, Rima Hooja,Rekha printers New Delhi 2006 P.311

۱۱۔ تاریخ فرشتہ (اردو)،ص ۷۵۔

۱۲۔ قصص ہند،ص ۷۶، ۷۷۔

۱۳۔ ایضاً،ص ۸۲۔

14. The Oxford History of India , by Vincent A. Smith, C.I.E. edited by Percival Spear, 4th edition Oxford University Press 1981,P- 338)

۱۵۔ قصص ہند،ص ۱۲۰

۱۶۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت (ہند) جلداول ودوم،تالیف سید ہاشمی فرید آبادی،انجمن ترقی اردو پاکستان،کراچی ۱۹۸۷ء،ص ۵۳۱۔

17. The Historian's Tool Box, Robert C. Willams, M.E. Sharpe Armonk, Londan England P-95

۱۸۔ قصص ہند،ص ۱۲۹۔۱۳۲

آزاد کی جذبہ آمیز اور تاثر آفریں نثر

ڈاکٹر اسلم انصاری

بیسویں صدی کو عام طور پر فلسفے کے زوال کی صدی کہا جاتا ہے، لیکن اگر جدید لسانی علوم کو دیکھا جائے تو اسے لسانی علوم اور لسانی نظریات کے فروغ کی صدی بھی کہا جا سکتا ہے، اس لیے کہ وہ خلا جو فلسفے کے زوال سے پیدا ہوا تھا، اسے لسانی نظریات نے پُر کیا۔ آج ان لسانی علوم میں اتنی وسعت پیدا ہو چکی ہے کہ ان کا استقصا بھی مشکل ہو گیا ہے، لیکن بیسویں صدی کے تیسرے عشرے کے وسط تک، جب آئی، اے، رچرڈز نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب اصولِ انتقادِ ادب مکمل کی، صورتِ حال یہ نہ تھی، اسی لیے وہ اس بات کا شاکی تھا کہ لسانی علوم کی پیش رفت نہ ہونے کے باعث اس کے معاصر یا پیش رو نقادانِ ادب یا ماہرینِ لسانیات زبان کے مختلف وظائف کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی درجہ بندی بھی نہیں کر سکے۔ یہ فریضہ خود ادا کرتے ہوئے اس نے زبان یا الفاظ کے استعمال کی دو قسمیں قرار دیں، یعنی اشاراتی (Referential) اور جذباتی یا جذبہ آمیز (Emotive)۔ ان دو اصطلاحوں کی تشریح جس دقیق انداز میں کی گئی ہے اس کا سمجھنا آسان نہیں [1] ان اصطلاحات کا مصدر ویانا سرکل تھا جس نے ۱۹۲۲ء میں ان اصطلاحات کو فروغ دیا۔ اسی حلقے کے دانشمندوں کی رو سے اگر ہم لفظ یا الفاظ کو سننے یا پڑھنے والوں کے رویّوں پر اثر انداز ہونے کے لیے استعمال کریں تو یہ زبان کا Emotive یا جذبہ آمیز بیان ہوگا۔ آج مولانا محمد حسین آزاد کی صد سالہ برسی مناتے ہوئے یہ حوالہ اس لیے کچھ اہمیت کا حامل ہے کہ ان کے ہاں الفاظ کا استعمال زیادہ تر جذبہ آمیز ہے، اور تخیل کو انگیز کرتا ہے۔

دوسری خصوصیات کے علاوہ مولانا آزاد کی جو خصوصیت انھیں اپنے معاصر انشا پردازوں سے ممتاز کرتی ہے، وہ ان کا اپنے عہد کے اعتبار سے گہرا علمی لسانی شعور ہے۔ وہ ہند یورپی زبان کے نظریے سے بخوبی آگاہ تھے اور اسی کی روشنی میں انھوں نے فارسی اور سنسکرت کے قدیم لسانی رشتوں کو ثابت کرنے میں بڑی کاوش کی۔ آبِ حیات کا ابتدائی باب اور سخن دانِ فارس کا بیشتر حصہ فارسی اور سنسکرت کے اشتقاقی رشتوں کو سمجھنے اور سمجھانے میں صرف کیا

ہے۔اردو، ہندی، فارسی اور سنسکرت کے فریم ورک میں انھیں اردو میں تقابلی لسانیات کا بانی قرار دینا غلط نہ ہوگا، اگرچہ برصغیر میں تقابلی لسانیات کا آغاز خان آرزو سے ہوتا ہے لیکن انھوں نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا فارسی میں لکھا، اس لیے اردو میں اولیت کا سہرا آزاد ہی کے سر بندھتا ہے۔علمی مفہوم میں آزاد کی زبان کی ماہیت پر بھی گہری نظر تھی، لفظ و معنی کے رشتے اور ابلاغ کے عمل کو وہ نظری طور پر خوب سمجھتے تھے۔ زبان کی ابلاغی قدر و قیمت کا حوالہ یوں تو ان کی تحریروں میں کئی جگہ آتا ہے۔مثلاً آبِ حیات کے مقدمے میں زبان کے وظیفۂ ابلاغ پر اچھی خاصی گفتگو کی گئی ہے، تاہم سخندانِ فارس کے پہلے باب میں خاصی تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔زبان کی بنیادی تعریف ان کے نزدیک یہ ہے کہ:

> وہ اظہارِ خیال کو وسیلہ ہے کہ متواتر آوازوں کے سلسلے میں ظاہر ہوتا ہے، جنھیں تقریر یا سلسلۂ الفاظ یا بیان یا عبارت کہتے ہیں۔اسی مضمون کو ایک شاعرانہ لطیفے میں ادا کرتا ہوں کہ زبان (خواہ بیان) ہوائی سواریاں ہیں جن میں ہمارے خیالات سوار ہو کر دل سے نکلتے ہیں اور کانوں کے رستے اوروں کے دماغوں تک پہنچتے ہیں۔ (۲)

دیکھا جائے تو یہ خاصی جدید تعریف ہے، یا زبان کی جدید تعریفات کے بہت قریب ہے۔لفظ و معنی کے حوالے سے بھی ان کے ہاں خاصا پختہ شعور ملتا ہے۔ ہمارے قدیم مفکرین کے ہاں لفظ و معنی کی بحث بہت دیر سے چلی آرہی ہے، لیکن اس سلسلے میں ایک تشبیہی تعریف زیادہ معروف اور مقبول رہی ہے، یعنی یہ کہ معنی یا خیال پیکر ہے اور الفاظ اس کا لباس ہیں۔خواجہ نصیر الدین طوسی نے اخلاقِ ناصری میں اسی خیال کا اعادہ کیا ہے۔مولانا روم نے البتہ مغز اور چھلکے کی تمثیل کے ذریعے لفظ و معنی کا رشتے کو بیان کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ان کے ہاں اسی تمثیل کی تفصیل میں لفظ و معنی کے نامیاتی رشتے کا اشارہ بھی موجود ہے۔اس ضمن میں داغ کا ایک شعر قابلِ ذکر ہے جس میں بیان کے نتائج کے بارے میں ایک انوکھا خیال موجود ہے، شعر ہے:

خار حسرت بیان سے نکلا
دل کا کانٹا زبان سے نکلا

غور کیا جائے تو اس شعر میں اظہار کے Kathartic Effects طرف اشارہ ہے۔ بہرحال، محمد حسین آزاد خیال اور زبان یا لفظ اور معنی کے ربط و تعلق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> خیالات کا مرتبہ زبان سے اول ہے، لیکن جب تک وہ دل میں ہیں، ماں کے پیٹ میں ادھورے بچے ہیں، تقریر میں آکر پورے ہوتے ہیں، اور تحریر کا لباس پہن کر بھرپور، لوگ جو خیالات سے مطلب نگاری اور نکتہ پردازی میں جان کھپاتے ہیں، اس نکتے کو انھیں کا دل جانتا ہے۔ (۳)

اس خیال کے رشتے بعض جدید ترین تصورات سے ملتے ہیں، جن کی رو سے خیالات یا معانی الفاظ سے الگ رکھی ہوئی اشیا نہیں ہیں، جنھیں الفاظ میں لپیٹ کر پیش کر دیا جائے، بلکہ یہ ماقبلِ کلام یا Pre-speech level کے وہ ادھورے اور نامکمل Thought Contents ہیں جو بیان میں ڈھل کر ہی ''صورت پذیر'' ہوتے ہیں۔ یہ خیال کہ اظہار کے پیرائے میں ڈھل کر خیال یا مضمون میں صراحت بلکہ بالیدگی غالب کے ہاں بھی موجود ہے۔ ان کا ایک نسبتاً غیر معروف شعر ہے:

اسد اٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

جدید معنیات (Semantics) اور لسانیات کے نقطۂ نظر سے اس سلسلے کے نمائندہ خیالات ۱۹۶۰ء کی دہائی میں مائیکل پولان ژی نے اپنے بعض مقالات میں بیان کیے تھے، ان میں سے ایک دو مقالات اردو میں بھی ترجمہ ہوئے۔ مقصد یہ ہے کہ آزاد کا تصورِ لفظ و معنی اپنے عہد کے اعتبار سے بہت ترقی یافتہ تھا۔ ہمارے ہاں بیسویں صدی کے وسطی عشروں میں آزاد پر جو کام ہوئے، ان میں آزاد کے اسلوب کے بارے میں دو باتیں کہی گئیں۔ ایک تو یہ کہ آزاد کا اسلوب شاعرانہ اور تخیلی ہے، دوسرے یہ کہ وہ تمثال آفرینی سے کام لیتے ہیں اور ان کے ہاں ایک خاص قسم کی امیجری بھی موجود ہے، لیکن یہ کہ ان کی نثر بنیادی طور پر Emotive یا جذبہ آمیز ہے، اس کو میرے خیال میں زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ آزاد کی تحریر کا ایک بنیادی خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر ہر قدم پر پڑھنے والے کی توجہ کسی خاص نکتے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں، اس لیے ان کے ہاں ہر مرحلۂ تحریر میں ایک نوع کی میلان آفرینی ہے، وہ پڑھنے والے کے جذبات کو تخیل کے ذریعے متاثر کرتے ہیں، اور بعض اوقات ڈرامائی انداز میں کوئی خیال اچانک پن سے منتقل کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کسی بیان (Narrative) کی ابتدا ہی میں اپنا میلان ظاہر کر دیتے ہیں۔ مثلاً قصصِ ہند کے ابتدائی ابواب میں محمود غزنوی کا ذکر شروع کرتے ہوئے وہ اس کے ستائشی پہلوؤں کو بھی قدرے ناگواری کے ساتھ بیان کرتے ہیں، چند جملے ملاحظہ ہوں:

> محمود اور اسمٰعیل دو بیٹے سبکتگین کے تھے، مگر محمود کا لڑکپن سے یہ حال تھا کہ فوج کشی اور لڑائیوں میں باپ کے ساتھ ہی رہتا تھا، بلکہ ہر مہم میں ایسا اپنی بساط سے بڑھ کر قدم مارتا تھا کہ تجربہ کار سپہ سالار دیکھتے رہ جاتے تھے۔ جب باپ مرا تو یہ نیشا پور میں حاکم تھا، تیس برس کی عمر تھی اور لیاقت، شجاعت کی رو سے ہر طرح نشینی کے قابل تھا، اتنی بات ضرور تھی کہ ماں کی طرف سے داغ دار تھا۔ (۴)

یہاں انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ آخر وہ کیا داغ تھا جو ماں کی طرف سے محمود پر لگا تھا، ظاہر ہے کہ یہ جملہ لکھتے ہوئے ان کے ذہن میں فردوسی کی معروف ہجو ہے جس کو علامہ محمود شیرانی نے بہت دن بعد ''تراشیدہ یا مجعول''

(Fabricated) ثابت کیا، لیکن اس بیان میں آگے چل کر وہ جو کچھ محمود کے بارے میں کہنے والے تھے، یہ چند جملے ان کی بہترین تمہید تھے، اس کے بعد وہ جو کچھ بھی کہیں گے، یہ داغ ساتھ ساتھ چلے گا۔ لیکن اس قصے کو یہیں چھوڑتے ہوئے ہم چندے علوم لسانی کے اساطینِ فکر سے رجوع کرتے ہیں۔

افادیت پسندوں کے سرگروہ جان اسٹوئرٹ مل نے کہا تھا: ''ہر جملہ منطق کے ایک سبق کی حیثیت رکھتا ہے۔''(۵) بعد ازاں اس خیال کو شدت سے رد بھی کیا گیا، (لیکن کیا وٹگن اشٹائن کے نظریات کا سرچشمہ یہی جملہ ہے؟) راقم کی رائے میں آزاد کے اکثر جملے علمِ بیان اور نفسیات کے اسباق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً آبِ حیات کا پہلا ہی جملہ دیکھیے: ''آزادِ ہندی نہاد کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغِ زبان کا جوہر جانتے تھے، مگر تخمیناً سو برس سے کل خاندان کی زبان اردو ہے۔'' آزاد نے اپنے آپ کو ہندی نہاد کہا، ہندی نژاد یا ہندی الاصل نہیں کہا، اس میں بھی یقیناً بہت سے نکتے پوشیدہ ہوں گے، کیونکہ علمائے بلاغت کا قول ہے کہ کوئی لفظ کسی دوسرے لفظ کا بدل نہیں ہوسکتا۔ ان کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغِ زبان کو جوہر جانتے تھے، یعنی اپنی زبان کی تلوار کی دھار جانتے تھے، سوال یہ ہے کہ یہاں انھوں نے زبان کے لیے تلوار ہی کی تشبیہ کیوں استعمال کی؟ کیا ہم اسے غالب کے ''سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری'' کا جواب بھی کہہ سکتے ہیں؟ علاوہ ازیں اس جملے کے بہت سے مطالب ممکن ہیں، لیکن ہم تفصیل سے گریز کرتے ہوئے صرف اتنا کہتے ہیں کہ آبِ حیات کے لفظ 'آب' اور تیغ (کی آب) میں جو تلازمہ ہے وہ تو ظاہر ہے، البتہ یہ کہے بغیر بھی چارہ نہیں کہ یہ تلوار انھوں نے چمکائی خوب!

آزاد کے اسلوب کو ان کے موضوعات سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا، اسی طرح ان کے موضوعات کو بھی ان کی پسند ناپسند سے الگ کر کے دیکھنا بہت مشکل ہے۔ انھوں نے اپنے پسندیدہ تاریخی کرداروں کے بیان میں لفظی مصوری کے فن کو انتہا تک پہنچادیا ہے۔ یوں تو انھوں نے آبِ حیات کی بیشتر شخصیات کو پورا احترام دیا ہے، تاہم اس کتاب کے فریم ورک میں ان کے ہیرو تین ہیں، یعنی مرزا سودا، سید انشاء اور استاد ذوق، لیکن دیکھا جائے تو جو جگہ ان کے دل میں سید انشاء کے لیے ہے اس میں اور کوئی ان کا شریک نہیں۔ سید انشاء کے عروج و زوال کی داستان کو انھوں نے کم و بیش یونانی تمثیل نگاروں کی طرح پیش کیا ہے۔ انشاء کے آخری ایام کی تصویر کشی انھوں نے سعادت یار خاں رنگین کے الفاظ میں کی ہے، لیکن ہم تو اسے آزاد ہی کی زبان کا کرشمہ سمجھتے ہیں، سعادت یار خاں رنگین نے انشاء سے چار ملاقاتوں کی تفصیل بیان کی ہے، باقیوں کا بیان چھوڑتے ہوئے ہم چوتھی اور آخری ملاقات کا بیان نقل کرتے ہیں، بقولِ سعادت یار خاں رنگین:

> چوتھی دفعہ جو لکھنؤ گیا تو پوچھتا ہوا گھر پہنچا۔ افسوس جس دروازہ پر ہاتھی جھومتے تھے وہاں دیکھا کہ خاک اڑتی ہے اور کتے لوٹتے ہیں۔ ڈیوڑھی پر دستک دی۔ اندر سے کسی بڑھیا نے پوچھا کہ کون ہے بھائی؟ (وہ ان کی

بی بی تھیں) میں نے کہا کہ سعادت یار خاں دلی سے آیا ہے۔ چونکہ سید انشا سے انتہائے درجہ کا اتحاد تھا، اس عفیفہ نے پہچانا، دروازہ پر آکر بہت روئیں، اور کہا کہ بھیا، ان کی تو عجب حالت ہے، اے لو، میں ہٹ جاتی ہوں، تم اندر آؤ، اور دیکھ لو۔ میں اندر گیا، دیکھا کہ ایک کونے میں بیٹھے ہیں، تن برہنہ ہے، دونوں زانوؤں پر سر دھرا ہے۔ آگے راکھ کے ڈھیر ہیں۔ ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ہے، یا تو وہ شان وشکوہ کے جمگھٹ دیکھتے تھے وہ گرمجوشی اور چہلوں کی باتیں ہوتی تھیں، یا یہ حالت دیکھی، بے اختیار دل بھر آیا، میں بھی وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ اور دیر تک رویا۔ جب جی ہلکا ہوا تو میں نے پکارا کہ سید انشا۔ سید انشا۔ سر اٹھا کر اس نظرِ حسرت سے دیکھا جو کہتی تھی کہ کیا کروں۔ آنکھ میں آنسو۔ میں نے کہا کیا حال ہے؟ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ شکر ہے، پھر اس طرح سر کو گھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ اٹھایا۔ (۶)

اس میں شک نہیں کہ تجسیم وتمثیل آزاد کے اسلوب کی نمایاں ترین خصوصیات ہیں، لیکن تجسیم کے عمل میں ایک تجرید بھی پیدا ہو جاتی ہے، جو آزاد کے اسلوب کی ایک انوکھی صفت بن کر ظاہر ہوتی ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مجردات اور تصورات کو، نیز اوصاف وصفات کو مجسم کر کے ان سے اعمال وابستہ کر دیتے ہیں، لیکن اس خصوصیت کا ظہور ایک اور انوکھے انداز سے بھی ہوتا ہے، وہ کسی کام کے اصل فاعل کو چھوڑ کر اس کام کو فاعل کی کسی صفت سے منسوب کر دیتے ہیں، چند جملے ملاحظہ ہوں:

یہ سن کر محمود کے دہانِ طمع میں پانی بھر آیا۔۔(قصصِ ہند۔ص ۲۲)

چاروں طرف سے خبریں چلی آتی تھیں، اور تدبیر کی نظر ہر طرف برابر دوڑ رہی تھی۔ (قصصِ ہند۔ص ۲۵)

ایک سقنی کو دیکھ کر شیخ صاحب کی شوخیِ طبع کے منہ میں پانی بھر آیا۔۔ یہ سب کچھ صحیح لیکن جس شخص کا قلم آٹھ دیوان لکھ کر ڈال دے۔ (آبِ حیات۔ص ۲۹۹)

وہ بھی (یعنی علامہ تفضل حسین خاں) ان کی لیاقت اور خاندان کے لحاظ سے پہلوئے عزت میں جگہ دیتے تھے۔ (آبِ حیات، ص ۲۵۵)

خیالات کی ترقی نے قدم آگے بڑھایا۔۔(سخندانِ فارس۔ص ۲۲)

جو کچھ آزاد کی ناتمام تحقیق نے میدانِ تلاش میں دانہ دانہ چن کر سرمایہ بنایا ہے، قلم کی معرفت کاغذ کے حوالے کرتا ہے (سخندان، ص ۲۴)

غرض ان کی تصانیف میں اس طرح کے جملے بے شمار ہیں جن میں اصل فاعل کو چھوڑ کر اس کی کسی صفت سے فعل کا صدور دکھایا ہے۔ اس عمل میں تشبیہ، استعارہ، تمثیل بعض اوقات سبھی شامل ہو جاتے ہیں، جیسے کہ وہ جملہ ''آزادِ ہندی نہاد کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغِ زبان کا جوہر جانتے تھے۔''

اسمائے صوت یا صوتی افعال و مصادر کا استعمال کوئی انوکھی بات نہیں، لیکن ان کا برمحل اور موزوں ترین استعمال ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ آزاد اس معاملے میں بھی تخصیص کے حامل ہیں۔ چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

آخر جب احمد آباد تین کوس رہا تو نقارۂ اکبری پر چوٹ پڑی، اور گورکھے کی گرج سے گجرات گونج اٹھا۔

گورکھا ایک خاص قسم کا نقارہ ہوا کرتا تھا، اس کی آواز کے لیے 'گرج' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، نیز یہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے کہ گ کی پے در پے تکرار سے کس طرح میدان جنگ کی گونج اور گرج دکھائی گئی ہے۔

اسی طرح کے ایک بیان میں کہتے ہیں کہ جب نور جہاں (کہ ابھی مہر النسا تھی) شاہی محل میں آیا جایا کرتی تھی تو ایک دن مینا بازار میں پھرتی تھی، جہانگیر کہ ان دنوں شاہزادہ تھا، دو کبوتر ہاتھ میں لیے روش پر جا نکلا۔ اس وقت سرور کے عالم میں تھا، مہر النسا کا البیلے پن میں چمن میں پھرنا بہت بھایا۔ آپ پھول توڑنے لگا، اور اس سے کہا کہ بی لڑکی ذرا ہمارے کبوتر تو لیے رہو۔ مہر النسا نے کبوتر اس کے ہاتھ سے لے لیے، اتفاقاً ایک کبوتر پھڑک کر ہاتھ سے چھوٹ گیا۔'' (قصص ہند، ص ۹۸) ذرا لفظ پھڑک پر غور کیجیے، کبوتر کی یہ 'پھڑک' تو آزاد ہی دکھا سکتے تھے۔

۱۹۴۰ء کے آس پاس وجودی مفکر ژاں پال سارتر نے ایک مجموعۂ مقالات شائع کیا جس کا عنوان تھا ادب کیا ہے؟ اس کے ایک باب میں اس نے شاعری کی زبان کو نثر کی زبان سے یکسر مختلف قرار دیا، اور کہا کہ شاعری میں الفاظ مقصود بالذات ہوتے ہیں، شاعر ان کو اس طرح استعمال کرتا ہے جس طرح مصور رنگوں کو استعمال کرتا ہے، وغیرہ۔ لیکن اسی سیاق میں سارتر کا پارۂ تحریر ایسا ہے کہ لگتا ہے اس نے آزاد کے اسلوبِ بیان کو سامنے رکھ کر لکھا ہے، شاعر کے اندازِ بیان کی بعض حالتوں کو بیان کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے:

یہ ہے سچا اور خالص ادب، داخلیت جو ایک طرح کی خارجیت کے جلو میں آئے، تقریر کچھ ایسے انداز سے مرتب ہو اس پر خاموشی کا شبہ ہو، خیال جو اپنے آپ پر حیران ہو، عقل جو جنوں کا لبادہ ہو، ابد جو یوں معلوم ہو کہ تاریخ کا ایک لمحہ، جو اپنی راہوں انسان کو ابد کی طرف موڑ دے۔ (۷)

سارتر کا یہ خیال کہ تقریر کچھ ایسے مرتب ہو کہ اس پر خاموشی کا شبہ ہونے لگے، آزاد کا تمام تر نثری بیانیہ بعض ایسے اجزا سے مرتب ہوتا ہے جن پر خاموشی کا شبہ ہو سکتا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم ان کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے الفاظ کی آوازوں کو سننا چھوڑ کر ان تصویروں کو دیکھنے میں کھو جاتے ہیں جو ان الفاظ کے شفاف شیشوں کے نیچے جگمگا رہی ہوتی ہیں۔ سینیماٹوگرافی کی تکنیک میں یہ ایسا ہے جیسے ہم منظر کو دیکھتے دیکھتے بھول جاتے ہیں کہ ان سب مناظر پر ایک Narrator مسلسل تبصرہ کر رہا ہے، اور ہم تمام مناظر کو اسی کے نقطۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ آزاد کے کامیاب ترین منظر نامے اسی خصوصیت کے حامل ہیں، ''سکوتِ صدا'' کی اس منزل تک پہنچنے کے لیے آزاد نے کتنا خونِ جگر صرف کیا

ہوگا، اس کا تو صرف اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے۔

حواشی

۱۔ Richards, I. A. *Principles of Literary Criticism*, London, 1959.p.263-267

۲۔ آزاد، محمد حسین، سخندانِ فارس، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۵، ۲۶

۳۔ ایضاً۔ ص ۲۶

۴۔ آزاد، محمد حسین، قصصِ ہند، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء۔ ص ۲۰

۵۔ Philosophy,XXXIXN.12(June,1942)p.309

۶۔ آزاد، محمد حسین، آبِ حیات، (طبعِ عکسی) لاہور (س ن) ص ۲۸۴، ۲۸۵

۷۔ اردو ترجمہ از لئیق بابری، مشمولہ نئی تنقید، سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی، گورنمنٹ کالج، لاہور، ۱۹۶۹ء ص ۲۰۷، ۲۰۸
نیز سارتر کی کتاب کے انگریزی ترجمے کے لیے دیکھیے:

What is Literature, Tr.UK.1970

محمد حسین آزاد کی تمثیل نگاری

پروفیسر سحر انصاری

محمد حسین آزاد (م: ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء) اردو کے مایہ ناز انشا پرداز کی حیثیت سے اپنا ایک منفرد مقام تاریخ ادب میں رکھتے ہیں۔ آزاد کی ادبی اور شخصی جہات اس قدر ہیں کہ کسی ایک پہلو پر اظہار خیال کرنے کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔

ایک انشا پرداز کی حیثیت سے آزاد نے جو مقام تاریخ ادب میں حاصل کرلیا ہے، اس کے معترف ان کے معاصرین سے لے کر دور حاضر تک بیش تر اہل دانش رہے ہیں۔ مولانا شبلی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ''آزاد گپ بھی ہانک دیں تو وحی معلوم ہوتی ہے۔'' مہدی افادی نے انھیں اردوئے معلیٰ کا ہیرو قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ آزاد کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ سید عابد علی عابد کا خیال ہے کہ:

> جو شخص شعوری کلمات کی جوہری تابناکی کو آہنگ اور نغمے کے مقام بلند تک پہنچاتا ہے، وہ مولانا محمد حسین آزاد ہے جس کی نثر نظم کو شرمندہ کرتی ہے۔ (اسلوب، سید عابد علی عابد، ص ۲۲۱)

آزاد شاعر، نقاد، محقق، ماہر لسانیات، تذکرہ نگار، مکتوب نویس، مورخ اور ادبی سماجیات کے ایک فعال وجود کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس مقالے میں مجھے آزاد کی تمثیل نگاری کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔

تمثیل ادبی اظہار کی مقبول صنف رہی ہے۔ یونان، مصر، ہندوستان اور قدیم زمانے کی داستانوں سے شروع کیجیے تو گل گامش کی داستان سے لے کر دور حاضر کی بعض منثور و منظوم تحریروں تک اس کا اثر قائم ہے۔ اردو میں اس کا ادبی اظہار وجہی کی سب رس سے ہوا۔ تاہم اس کی جانب شعوری توجہ انیسویں صدی میں ہوئی جب سرسید احمد خاں اور ان کے بعض معاصرین نے مغربی ادب کے زیر اثر اردو میں نئے اسالیب کو متعارف کرایا۔

تمثیل محمد حسین آزاد کی پسندیدہ صنف اظہار ہے۔ نیرنگ خیال تو خیر اس ضمن میں ان کا شاہکار ہے ہی لیکن آب حیات، قصص ہند، دربار اکبری، سخن دان فارس اور بعض مقالات میں اکثر جگہ انھوں

نے تمثیل نگاری کا وصف قائم رکھا ہے۔

آزاد اردو کے موجودہ ذخیرۂ نثر کے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے کہ ''ہمارے ہاں جو کچھ اردو کا رنگ نکلا تھا سبزۂ خودرو کی طرح نکلا تھا۔'' اس کے بعد اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

میں نے انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغ شوق روشن کیا ہے... بعض مضامین وہ ہیں جن میں انسان کے قوائے عقلی یا حواس یا اخلاق کو لیا ہے۔ انھیں انسان یا فرشتہ یا دیو یا پری تصور کیا ہے، اور ان کے معاملات اور ترقی و تنزل کو سرگزشت کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان میں شگفتگی طبع کے علاوہ یہ غرض رکھی گئی ہے کہ پڑھنے والے کو کسی صفت پسندیدہ پر رغبت اور کسی خلق بد سے نفرت ہو یا کسی حصول مطلب کے رستے میں جو نشیب و فراز آتے ہیں، ان سے واقف ہو... انگریزی میں یہ یونان اور روما کے مضامین کے ساتھ وہاں کے مذہب اور رسوم قدیم کی باتیں اب تک انشا پردازی کا جزو ہیں۔ (نیرنگ خیال، ص ۶، ۷، ۸)

محمد حسین آزاد کے ایک اہم محقق ڈاکٹر اسلم فرخی نے آزاد کی اس رائے سے جزوی اتفاق کیا ہے لیکن بیشتر خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

یہ تو محض ایک استعارہ ہے۔ تمثیل اور استعارے میں فرق یہ ہے کہ استعارہ اتنی طوالت کا حامل نہیں ہوتا۔ تمثیل میں طوالت بھی ہوتی ہے اور مکمل ترین تفصیل بھی ملتی ہے۔ تمثیل میں جو متوازیت پیدا کی جاتی ہے اس کا مقصد تخیل کو بہ راہ راست متاثر کرنا ہوتا ہے۔ (محمد حسین آزاد، جلد دوم، ص ۲۵۰)

آزاد کی تمثیل نگاری میں نیرنگ خیال سرفہرست ہے اور ناقدین کی یہ رائے نہایت صائب ہے کہ ''آزاد اگر نیرنگ خیال کے علاوہ اور کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی ان کا شمار اردو کے غیر فانی انشا پردازوں میں ہوتا۔''

آزاد کی تمثیل نگاری کا جائزہ لینے کے لیے زیادہ تر نیرنگ خیال کے مضامین ہی سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں جنت الحمقا، انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا اور شہرت عام و بقائے دوام کا دربار بہ طور خاص اہم ہیں۔

اردو شاعری میں بعض ایسے اسالیب بیان اختیار کیے جاتے ہیں جن میں انسانی محسوسات، تجربات اور نفسیاتی محرکات کو تجسیم (personification) کے ذریعے مرئی اور جیتے جاگتے پیکر میں پیش کیا جاتا ہے۔

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

یا جوش کی یہ رباعی:

غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے

بس ایک تبسم کے لیے کھلتا ہے؟
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

محمد حسین آزاد کلاسیکی شاعری کے تمام رموز و نکات سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے لیکن تمثیل یا Allegory کا طلسم ان کو عمر بھر اپنی گرفت میں لیے رہا۔ تمثیل (allegory) کا نیا تصور بھی انگریزوں کی صحبت اور انگریزی ادب کے توسط سے ہمارے ادب مین شامل ہوا۔ خود مغرب میں بھی تمثیل کو استعارے کی توسیع شدہ شکل کہا گیا ہے۔ Extended form of metaphor

آزاد انگریزی سے اتنی واقفیت ضرور رکھتے تھے کہ مافی الضمیر کو سمجھ سکیں۔ نبیرۂ آزاد محمد باقر نے لکھا ہے کہ ڈاک خانے کی ملازمت کے دوران وہ سرکاری دستاویزات کے ترجمے انگریزی سے اردو میں کرتے رہے تھے۔ پھر آزاد کا ذہن ایک خلاق ذہن تھا جسے صرف اشارے اور چند لکیروں کی ضرورت ہوتی تھی، ایک دلکش اور رنگا رنگ مرقع وہ خود تیار کر لیتے تھے۔

لفظ allegory یونانی زبان سے تعلق رکھتا ہے جس کے معنی speaking otherwise (اور طرح سے بیان کرنا) ہیں۔ مارٹن گرے (Martin Gray) نے تو اس اصطلاح کی تشریح کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ چوں کہ یہ علامت (symbols) اور اسطور (myth) سے بھی ملوث ہو سکتی ہے اس لیے اس کی کوئی بہت واضح اور حتمی تعریف ممکن نہیں۔ پھر بھی ڈرائڈن (Dryden) اسپنسر (Spencer) جان بینن (John Bunyan) کے حوالے سے اس نے تمثیل کی چند اقسام کا تعین کیا ہے۔ ان میں مرئی اور غیر مرئی - تجریدی اور تجسیمی دونوں شامل ہیں۔

محمد حسین آزاد نے تمثیلی تحریریں آزمائش یا (test case) کے طور پر پیش کی ہیں۔ وہ خود بھی تذبذب میں تھے کہ ''نکتہ شناس'' ان مضامین کو کس طرح دیکھیں گے۔ وہ لکھتے ہیں:

> یہ چند مضمون جو لکھے ہیں نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں۔ ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا، ہاتھوں نے اسے لکھ دیا۔ اب حیران ہوں کہ نکتہ شناس اسے دیکھ کر کیا سمجھیں گے۔

آزاد نے عربی، فارسی کی طرح انگریزی الفاظ کے استعمال کی سماجی اور لسانی ضرورت کی طرف توجہ دلانے کے بعد ''میتھالوجی'' کے تحت وقت، غصہ، عشق، افواہ یا شہرت اور حسن کی پری جیسے مرئی اور غیر مرئی موجودات پر روشنی ڈال کر اپنے قارئین کے ذہنوں میں تمثیل کے تصور کو واضح کیا ہے۔

آزاد کی تمثیل نگاری میں خیالی، تصوراتی، تجریدی اور غیر تجریدی موضوعات شامل ہیں۔ ''آغاز آفرینش

میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا۔'' میں تصورات اور حقائق کو آزاد نے یک جا کر دیا ہے۔ آغاز آفرینش کا احوال قرائن، تصورات اور دستیاب روایات کے حوالے سے بیان کیا ہے پھر جو تغیرات دنیائے اسباب و علل میں رونما ہوئے ان پر ''دیکھو اب انسان کی نیت میں فرق آتا ہے اور کیا جلد اس کی سزا پاتا ہے؟'' کے تحت لوٹ مار، غارت و تاراج اور احتیاج و افلاس جیسے عوامل کو بڑے عمدہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔

آزاد کے بعض تمثیلی مرقعے خالصتاً تجریدی ہیں جیسے سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ اس میں سلطان آسمانی، ملکہ صداقت زمانی، ملکہ دانش خاتون، دروغ دیوزاد جیسے کردار وضع کیے جو اپنے ناموں ہی سے اپنی خصوصیات منکشف کر دیتے ہیں لیکن آزاد نے انھیں زندگی کے حقائق و تجربات سے متصف کر کے جیتی جاگتی دنیا کا حصہ بنا دیا ہے۔

اسی طرح گلشن امید کی بہار اور انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا کے تمثیلی مرقعے بھی خیالی اور تجریدی تمثیل کی ذیل میں آتے ہیں۔

ای ایم فارسٹر (E.M. Forster) نے فکشن کے کرداروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک سپاٹ (flat) اور دوسرا متحرک (round)۔ اول الذکر سے مراد ایسے کردار ہیں جو اپنے نام اور لیبل ہی سے پہچان لیے جاتے ہیں جیسے مرزا ظاہر دار بیگ، مزاج دار بہو۔ آزاد نے مقامات اور افراد کے نام اس طرح رکھے ہیں: اقلیم خیال، ملک فصاحت، فرحت بانو کی بیٹی ذکاوت، علم، حسن اور ظرافت۔

تمثیل نگاری میں آزاد کا شاہ کار شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار ہے۔ اس میں تاریخ، فکریات، خیالی اور حقیقی کردار، نیز منظر نگاری، سراپا کشی، جزیات، انداز بیان، اس طرح باہم آمیز ہوئے ہیں کہ جب اس تحریر کا مطالعہ کیجیے ایک نیا لطف محسوس ہوتا اور آزاد کی جادو بیانی کا تاثر مزید گہرا ہو جاتا ہے۔

آزاد کو مکمل اندازہ تھا کہ وہ کیا اور کس طرح لکھ رہے ہیں ''خاتمہ'' کے یہ الفاظ اس سمت رہ نمائی کرتے ہیں:

خیالات کے جلسے جمے ہوئے ہیں اور اشخاص تصوری زبان ہائے بے اجسام سے طلسم کاری کر رہے ہیں۔

آزاد کی تمثیل نگاری کا کلیدی نکتہ اسی میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے خیالات کے جلسے جمائے اور اشخاص تصوری کو یک جا کر کے زبان ہائے بے اجسام سے طلسم کاری کروائی ہے۔

آزاد کے دیگر مضامین مثلاً مرقع خوش بیانی، سیر عدم اور جنت الحمقا میں بھی اسلوب اور اختراع کا یہی معیار پایا جاتا ہے۔

ان مرقعوں کے مطالعے کے دوران یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد نے خیالی تو تے مینا نہیں اڑائے ہیں بلکہ

اس عہد کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر عام انسانوں کی تہذیب اخلاق کی سمت بھی اشارے کیے ہیں۔ اگرچہ تہذیب اخلاق کے داعی سر سید احمد خاں تھے تاہم ان کی ہمہ گیر جدوجہد نے نہ صرف ان کے رفقائے کار مثلاً نذیر احمد، حالی اور شبلی ہی میں اصلاح مقصدیت اور افادیت کا جذبہ اور شعور پیدا کیا بلکہ محمد حسین آزاد جو اس حلقے میں براہ راست شامل نہ تھے، وقت کی راگنی سے لاتعلق نہیں رہ سکے۔ آزاد کی خوبی نگارش یہ ہے کہ انھوں نے تمثیلی مرقعوں میں بات بین السطور بھی کہی ہے اور ذیلی سرخیوں کے ذریعے مقصدیت کو بھی اجاگر کر دیا ہے۔ شاید انھی محاسن نے آزاد کی تمثیل نگاری کو وہ رفعت اور بلندی عطا کی ہے کہ جس تک کوئی دوسرا نہ پہنچ سکا۔

آزاد کی انشا پردازی...... جدید اردو نثر کے امکانات

سویامانے

یاد میں جس کی ملے فکر مند بھی ہیں
فکر آزاد میں سب لوگ پابند بھی ہیں

ادبی دنیا میں جدید نثر کی ترقی، عالمی سطح پر معاشی تبدیلی کے ساتھ ہی کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے ہوئی۔ صنعتی انقلاب کے بعد انسان ٹھیکے اور اجرت کی بنیاد پر معاشرے کے ساتھ وابستہ رہنے لگے جس کے متوازی انسان کی انفرادیت کا احساس بھی تیزی سے بڑھنے لگا۔ ظاہر ہے کہ معاشی ضروریات نے انسانی زندگی میں حقیقت پسندانہ شعور کو پختہ کیا۔ اسی احساس کا اثر ادب میں بھی در آیا۔ خیالی باتوں سے بھری ہوئی داستانوں کے زمانے کی جگہ حقیقت نگاری کا رجحان شروع ہوا۔ اردو کی ادبی تاریخ کو دیکھا جائے تو اس میں بھی مغربی تہذیب، خاص کر انگریزوں کے اثرات کو قبول کرتے ہوئے نثر اور نظم، اظہار کے دونوں میدانوں میں جدیدیت کا اثر نظر آتا ہے۔ سرسید کی تحریریں اس کی بہترین مثال ہیں۔ اب آزاد کی تحریروں کو دیکھا جائے تو اس میں روایات سے لگاؤ اور نئے پن کی قبولیت دونوں نظر آتے ہیں۔ بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ آزاد کی انشا پردازی خیالی باتوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کی انشا پردازی کو منفی انداز میں نہیں، بلکہ مشرقی اور مغربی احساس یا پھر روایت اور جدیدیت دونوں کا امتزاج سمجھنا چاہیے۔ آج کے ادبی رجحان میں استعارے کے طور پر یا علامتی طور پر داستانوی عناصر کا استعمال عام ہوا ہے۔ آزاد کا معاشی شعور تو آج کے زمانے سے مختلف ضرور ہے لیکن ان کی انشا پردازی نے جدید اردو نثر کے لیے روایت اور جدیدیت کے امتزاج کے امکان کو برقرار رکھا ہے جس کے نئے مطالعے کی ضرورت ہے۔ اس مختصر مضمون میں آزاد کی تحریروں کا جائزہ لیا جائے گا اور اس بات کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی کہ آزاد کی تحریروں کے کون سے عناصر ہیں جو جدید اردو نثر کی ترقی کے لیے قابل غور ہیں۔

آزاد کی انشا پردازی پر بات کرنے سے پہلے پس منظر کے طور پر اردو شاعری کی اصلاح کے بارے میں

بتانا ناگزیر ہوگا۔ آزاد نے انجمن پنجاب کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے جدید نظم کی ضرورت پر زور دیا۔ ان کا یہ خطاب جدید اردو نظم کی ترقی کے لیے بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ویسے تو خود آزاد کی شاعری کے یہاں قدرتی مناظر کا ذکر کثرت سے آتا ہے۔ 'رات کی آمد'، 'ابرِ کرم' کو دیکھیے تو ان نظموں میں روایتی انداز موجود ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب اپنی تصنیف محمد حسین آزاد میں مدت پہلے بحث کر چکے ہیں اس لیے یہاں اسے نہیں دہراؤں گا مگر اتنا کہنا ضروری ہوگا کہ ادبی میدان میں نیا رجحان کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں کئی شرائط ہمارے سامنے آئیں گی، لیکن سب سے نمایاں شرائط تو اسلوب اور موضوع سے متعلق ہوں گی اور آزاد کا زمانہ اسلوب اور موضوع دونوں کے حوالے سے تبدیلی کا خواہاں تھا۔

جہاں تک موضوع کا تعلق ہے، آزاد نے اردو شاعری کے موضوع میں تبدیلی لانے پر زور دیا۔ روایتی عشقیہ موضوع سے ہٹ کر زمانے کے تقاضے کے مطابق سیاسی یا معاشی یعنی نئے موضوع کو اختیار کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس جدید موضوع کی اہمیت کا احساس خود آزاد کے ذہن میں ضرور موجود تھا مگر اس کے ساتھ ان کی اس سوچ پر انگریزوں کا اثر لازمی دکھائی دیتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتیجے میں اپنے والد کو پھانسی کی سزا انگریزوں کی جانب سے ملنے پر آزاد کو انگریزوں کے لیے کام کرنا پڑ گیا۔ وسطی ایشیائی ممالک کے حالات کے بارے میں انگریزوں کو خبر دی۔ پھر لاہور کے تعلیمی اداروں سے منسلک ہو گئے اور جی ڈبلیو لائٹنر کے کہنے پر انجمن پنجاب کا مشاعرہ کروایا۔ چونکہ انجمن پنجاب کا مقصد ادب میں جدید موضوع لانا تھا، اس لیے آزاد نے اردو شاعری میں یہی تبدیلی لانے پر زور دیا تھا۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ لائٹنر کے بارے میں جتنا اہم مواد ہے اسے جی سی یو (GCU) اور اکرام چغتائی صاحب نے مرتب کر کے کتابی صورت میں چھپوایا ہے جس کی مدد سے کافی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

آزاد کا یہ وہی زمانہ تھا جب انگریز جنوبی ایشیا پر قبضہ کرنے کے بعد اصلاح کے نام سے مقامی لوگوں کے ذہن میں تبدیلی لانا چاہ رہے تھے۔ نذیر احمد کو دیکھیے۔ انگریزوں کے تحت کام کرتے ہوئے ناول لکھے اور انھوں نے اسی حکومت کی جانب سے اعزاز بھی حاصل کیا۔ ان کے پس منظر میں بھی آزاد کی طرح اپنے زمانے کے تقاضے اور مجبوریاں نظر آتی ہیں۔ نذیر احمد آخری زمانے میں مذہب کی طرف زیادہ راغب ہوئے۔ یعنی اس زمانے کے ادیب کو کسی ایک کام کی بنا پر کسی مخصوص ڈھانچے میں لانا مشکل ہے۔ خود آزاد بھی زمانے کے تقاضے اور مجبوریوں کو قبول کرتے ہوئے ایک نیا راستہ تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ یعنی آزاد کا زمانہ ایسا تھا جب برصغیر کے لوگ اپنی نئی شناخت کی تلاش میں تھے۔ بعض لوگوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ یعنی محکوم ہوتے ہوئے حاکم کے دائرے میں آ کر حاکمانہ نقاب پہنتے تھے۔ ابتدائی زمانے کے نذیر احمد بھی اس گروہ میں شامل ہو سکتے ہیں، جب کہ دوسرے انگریزوں کے

خلاف فکری مزاحمت کر رہے تھے۔ اس میں اودھ پنچ کی تحریریں نمایاں ہیں اور ایسے لوگ بھی تھے جو انگریزوں کے ذریعے متعارف ہونے والی جدیدیت کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس کو اپنا کر اس رجحان سے متعلق مضامین اپنے روایتی انداز میں تحریر کرتے تھے۔ آزاد کی انشاپردازی میں انھی رجحانات کا امتزاج نظر آتا ہے۔

یوں موضوعاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو انگریزوں کا اثر ضرور ہے مگر اسلوبیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس میں انگریزوں کے اثرات کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کے رجحان کی تبدیلی بھی بہت اہم ہے اور اسلوب کی حفاظت میں روایت کی طاقت نظر آتی ہے۔

جب آزاد لاہور میں آئے تھے تو اس زمانے میں لاہور سے بہت سے اخبارات اور رسائل چھپنا شروع ہو چکے تھے۔ لاہور میں ایک کالج بن چکا تھا اور ایک یونیورسٹی کے لیے منصوبہ بندی ہو رہی تھی اور پڑھے لکھے لوگوں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آ رہا تھا۔ چھاپہ خانے بھی لاہور میں قائم ہو رہے تھے۔ ۱۸۴۹ء میں جب لاہور انگریزوں کے قبضہ میں آیا تو اردو کے اخبارات اور رسائل یک دم چھپنا شروع ہوئے۔ لیکن چونکہ لاہور میں پنجابی زبان بولی جاتی تھی اس لیے اردو صحافت کے لیے کلکتہ یا دہلی سے منشی یا کاتب بلائے گئے۔ ۱۸۵۰ء میں اخبار کوہ نور چھپنا شروع ہوا تو یہاں منشی نول کشور کام کر رہے تھے جنھوں نے بعد میں لکھنو جا کر مشہور اشاعت خانہ بنایا۔ ۱۸۸۰ء کی دہائی میں لاہور سے شائع ہونے والے رسائل اور اخبارات کی تعداد دہلی کے مقابلے میں تین گنا ہو چکی تھی۔ یوں آزاد کے قیام لاہور کے زمانے میں برصغیر کے مسلمانوں کے یہاں پنجاب کی اہمیت بڑھ رہی تھی۔ سرسید نے بھی پنجاب کی سیر کی۔ رسالہ مخزن کے اجرا سے پہلے کی نصف صدی میں لاہور اردو کا نیا مرکز بن گیا تھا اور اسی نصف صدی نے یہاں کے لوگوں میں اردو بولنے والی دوسری یا تیسری نسل، نیا طبقہ پیدا کیا تھا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ لاہور میں بذریعہ اردو ایک نیا طبقہ ابھارنے میں نہ صرف انگریزوں کا ہاتھ تھا بلکہ مقامی لوگوں کا اثر بھی تھا۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ یعنی ایک تو مقامی لوگ انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ آزاد، سرسید، حالی اور نذیر احمد بھی ان میں سے تھے۔ دوسری طرف خود مقامی لوگوں کی جانب سے بول چال کی زبان کی اہمیت پر توجہ دی جا رہی تھی۔ شاہ ولی اللہ کو دیکھیے۔ انھوں نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور ان کے صاحب زادے شاہ عبدالعزیز نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ جس کی وجہ تو ظاہر ہے کہ عوامی سطح تک مذہب کی تعلیم پہنچائی جائے یعنی ادب یا علم اب صرف مخصوص طبقے کے لیے نہیں رہا۔ عوامی سطح پر اس کا رواج ہونے والا تھا۔ جس کے نتیجے میں اصلاحی تحریک بھی شروع ہو سکتی تھی۔ سرسید اور آزاد نے بول چال کی زبان میں تحریریں پیش کیں جس کے پس منظر میں بھی یہی اصلاحی مقصد موجود تھا۔

آزاد کی تحریروں میں روایتی انداز صاف صاف نظر آتا ہے مگر ان کی نثر صرف داستانوی نہیں ہے۔ اسلوب

داستانوی ضرور ہے مگر موضوع اصلاحی اور تعلیمی ہے۔ بعض نقاد کہتے ہیں کہ ان کی تحریریں خیالی اور واہمے پر مبنی ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں۔ نیرنگ خیال کو دیکھیے تو ہمیں ایسے مضامین نظر آتے ہیں جو تہذیب الاخلاق میں چھپے ہیں۔ یعنی اسلوب داستانوی ضرور ہے مگر جس طرح داستان میں ماورائی یا فوق الفطرت واقعات پیش کیے جاتے ہیں آزاد کے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ آزاد کی تحریریں داستانوی ہوتے ہوئے بھی موضوع کے اعتبار سے سچائی پر مبنی ہیں اور داستانوی اسلوب سے مراد باغ و بہار والا اسلوب یعنی سامعین سے مخاطب یا ہم کلامی کا اسلوب ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ اسلوب بول چال کا ہی ہوتا ہے جیسے غالب کے اردو خطوط میں نظر آتا ہے۔ نیرنگ خیال اور مکاتیب آزاد کو دیکھیے، ان کا اسلوب بول چال ہے۔ بول چال کے انداز میں جو کہنا چاہیے اسے تحریر کیا ہے۔ اپنے دل کی بات کا ذکر آزادی کے ساتھ کرنا ہی جدید دور کی خصوصیت ہے۔ ورنہ روایتی خطوط یا نثری تحریروں میں آغاز سے اختتام تک اظہار کے لیے ایک مکمل طریقہ کار موجود تھا جس کی پیروی یا تقلید کو ہی روش عام کہا جاتا تھا۔ جدید دور میں داخل ہو کر انسان کو انفرادی سطح پر اپنے بارے میں آزادی کے ساتھ لکھنے کی اجازت مل گئی اور اس سے لطف اٹھانے کی بھی۔ آزاد کی انشا پردازی میں یہی آزادی نظر آتی ہے۔ البتہ ایک تصرف کے ساتھ کہ اس میں لطائف اور نکات لطیف شامل ہوں۔ آزاد کا اسلوب سلیس ہے اور ان کا ذخیرۂ الفاظ بھی آسان۔ سلیس اسلوب ہوتے ہوئے بھی انھوں نے روایتی لطائف کو نہیں چھوڑا جس کی وجہ سے ان کی نثر میں خوب صورتی پیدا ہوگئی ہے جسے محض خیالی کہہ کر منفی انداز میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ یہ لطف ادبی ہے یعنی جس طرح شاعری میں شعریت ہے اسی طرح آزاد نے نثر میں ادبیت یا ادبی ذوق کو محفوظ کیا۔

ان کی اس ادبیت کے بارے میں بعد کی نسلوں میں بحث چلی آئی ہے کہ یہ بہت خیالی ہے لیکن اگر نثر میں سے ایسا رنگ منہا کر جائے تو ادب میں لطف کہاں باقی رہ سکتا ہے؟ مسئلہ تو کثرت کا ہو سکتا ہے۔ اگر آزاد کی انشا پردازی میں خیالی باتوں کی کثرت پر تنقید کی جائے تو اس پر غور کرنا پڑے گا لیکن کثرت کے بارے میں بھی بحث کرنا مشکل ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ آزاد کی تحریریں خیالی ہوتے ہوئے بھی موضوع کے اعتبار سے خیالی نہیں ہوتیں۔ پھر آج کے زمانے میں داستانوی انداز میں یعنی علامتی طور پر کہانی لکھنے کا رواج ہوا۔ ان تحریروں سے بھلا ہم انکار کیسے کر سکتے ہیں۔ آزاد کا تعلق علامتی کہانیوں سے نہیں لیکن داستانوی انداز میں لکھنے کا طریقہ آزاد جیسے تخلیقی ذہن رکھنے والے نے اختیار کیا تھا جس کی وجہ سے ایسی تحریروں سے اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ گو آزاد مغربی اور مشرقی، جدید اور روایتی دونوں اسلوب کو ملانے میں کامیاب ہوئے تھے۔

آخر میں ایک جاپانی کی حیثیت سے عرض کرنا چاہوں گا۔ جاپانی قوم نے دوسری جنگ عظیم کے بعد پرانی روایت کو چھوڑنے کی کوشش کی تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ پرانے زمانے کی قدر و قیمت کے نتیجے میں جاپانی لوگ جنگ کی

طرف متوجہ ہوئے تھے۔ مغربی خیالات کا تعارف بڑی تیزی سے ہوا۔ فی الحال ہمارے یہاں مشرقیت یا جاپانیت کچھ باقی ہے مگر رفتہ رفتہ پسپا ہوتی نظر آتی ہے۔ نئی تہذیب کے سامنے پرانی روایت بظاہر بوسیدہ نظر آتی ہے مگر پرانی روایت میں بھی کچھ نہ کچھ سچائی اور کشش بھی ہے۔ سب کچھ چھوڑ دینے کی ضرورت نہیں۔ آزاد نے اردو نثر کی روایت کو سامنے رکھتے ہوئے نئے موضوع شامل کرنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں نئے اور پرانے انداز کا خوب صورت امتزاج ہمارے سامنے آتا ہے۔ جدیدیت اور روایت کے امتزاج کی یہ آزمائش میر امن کے زمانے سے شروع ہو چکی تھی اور لگتا ہے کہ آزاد کے زمانے میں پختہ ہوگئی جس کی وجہ یہ ہے کہ باغ و بہار کے زمانے میں کتابیں پڑھنے والوں کی تعداد بہت محدود رہی تھی اور باغ و بہار انگریزوں کی تعلیم کے لیے محدود پیمانے پر شائع کی گئی تھی۔ آزاد کے زمانے میں پہنچتے پہنچتے اس نئے امتزاج سے مقامی لوگ آشنا ہو چکے تھے۔

نیرنگِ خیال اور اسلوب کی نیرنگی

وفا یزداں منش

اُردو ادب والوں کے لیے محمد حسین آزاد کا نام انتہائی جانا پہچانا ہے۔ ان کا نام سنتے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے آب حیات اور نیرنگِ خیال کی روشنیاں جھلملانے لگتی ہیں۔ دونوں جاوداں شاہکار ہیں۔ شعری اور کسی قدر تحقیقی امور میں آبِ حیات کا سہارا لیا جاتا ہے اور نیرنگِ خیال ایک سو تیس سال گزرنے کے باوجود قابلِ غور کارنامہ ہے۔ اس کی جاودانی کا سارا راز اس کے اسلوب کی رنگارنگی ہے۔

نیرنگِ خیال کا اسلوب محمد حسین آزاد کی قوّتِ متخیلہ سے براہِ راست وابستہ ہے۔ اسلوب کی خوبیاں مضمون کو سجاتی ہیں۔ ہر خوبی اپنی نوعیت میں لاجواب ہے۔ اسی لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف حکمت واخلاق کی نصیحتوں کو گلدستے کی صورت میں قاری کو پیش کرتے ہیں۔ اس میں الفاظ نگینے کی طرح متون میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم یہاں اس گلدستے کے چند پھولوں کا انتخاب کر کے ان کی خوبیوں کا جائزہ لیتے ہیں:

عطفی تراکیب:

نیرنگِ خیال، تراکیب کی ہر قسم سے مزین ہے لیکن عطفی تراکیب سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان تراکیب میں الفاظ 'اور'، 'و'، 'یا' کے ذریعے ملائے گئے ہیں۔ ان تراکیب میں آزاد اپنی مہارت کو بروئے کار لائے ہیں جس کا سراغ کسی دوسرے ادیب کے ہاں کم کم دیکھنے میں ملتا ہے۔ ہر ترکیب میں ہم معنی یا قریب المعنی الفاظ آئے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ مرکب ہو کر مضبوط ہوتے ہیں، ان کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آزاد نے ہر ترکیب کے الفاظ سے ایک ہی معنی نکالا ہے؟ اگر ایسا ہے پھر کیا ضرورت ہے کہ جگہ جگہ وہ اپنی ہر بات کے لیے ایک مترادف لفظ کا اضافہ کریں؟!

آزاد کو ہر لفظ کی پہچان ہے۔ نیرنگِ خیال میں الفاظ کی اعلیٰ سطح اور سنجیدہ انتخاب پر مبنی مضامین شامل ہیں۔ وہ ادبی کارنامہ تخلیق کرتے ہیں لیکن علمی پہلو کا دامن نہیں چھوڑتے۔

''علوم کی بدنصیبی'' میں جملہ ہے: ''خوشامد کے ہاں حقیقت اور واقعیت دونوں کو دخل نہیں۔'' اس جملے میں لفظ ''دونوں'' سے بات واضح ہے کہ حقیقت اور واقعیت کی حیثیت ایک جیسی نہیں اور آزاد کو ان کے فرق کا علم ہے۔ حقیقت یعنی: حق، ہر چیز کی اصل وہ جو ہونا چاہیے اور اس کی حمایت کرنا فرض ہے؛ واقعیت: وجود، موجود ہونا، حق ہونا اس کے لیے ضروری نہیں ہے۔

ایک اور مثال ہے: مناظرے و مباحثے: مباحثہ: بحث کرنا، مناظرہ: گفتگو اور بحث کرنا،

دیگر تراکیب ہیں: فلک کی سفلہ پروری یا قسمت کی یاوری، حکّام یا اہلِ دوَل، انصاف و عدالت، مکر و فریب، دشمن و بدخواہ، ایجاد و اختراع، تصدیق و تسلیم، خوف و ہراس، عجائب و غرائب، تکلیف و مصیبت، عیش و عشرت، انصاف و عدالت، آفرین و شاباش، بہادری و شجاعت، شدّتیں اور افراطیں، صراحت و وضاحت، صاف و مصفّا، خوش آمد و چاپلوسی، بھینٹ اور قربانیاں، اضطراب و گھبراہٹ، افسردہ و پژمردہ، چُپ چاپ و خاموش، ملالت و افسردگی، مہمان خانے اور آرام خانے، عجائب و غرائبات، پوچ و واہیات، صداقت و حقیقت، جانفشانی اور عرق ریزی، دشمن و بدخواہ، علمیت اور ذکاوت، لطائف و ظرائف، تسلّی و تشفّی، مایوسی و ناکامی، ملکِ فراغ و کشورِ راحت، غلط فہمی اور کوتہ اندیشی، اعمالِ قبیحہ یا حرکات ناپسندیدہ، فخر و ناز، خیالات، ہدایات و اشارات، رعنائی اور خوشنمائی، خودپسندی اور خودبینی، سنجیدگی اور متانت۔ عظمت و احترام، دانش و دانائی، خطاب و القاب، محنت و جانکاہی، سحرکاری و نیرنگ سازی، اضطراب و بےصبری، ویرانی و بربادی، احتیاج و افلاس وغیرہ

ادبی زبان میں مترادف الفاظ ایک دوسرے کے بہ جائے آسکتے ہیں لیکن علمی زبان میں ہر لفظ کا اپنا اپنا معنی ہوتا ہے اور کبھی دو الفاظ کے معنی پورے طور پر ایک ہی طرح نہیں ہیں یہاں تک کہ کبھی ایک لفظ دوسرے لفظ کی جگہ نہیں بیٹھ سکتا ہے اگرچہ ان دونوں کے معنی قریب ہی کیوں نہ ہوں۔ نیرنگِ خیال کی یہ تراکیب اسی بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ 'نیرنگِ خیال' ادبی اور علمی صلاحیتوں کا ایک منفرد نمونہ ہے۔

جہاں تراکیب میں موجود الفاظ قریب المعنیٰ ہونے کے باوجود ہمارے ذہن کو دو پہلوؤں کی طرف روشناس کرتے ہیں؛ اگرچہ ان پہلوؤں کا فرق کم ہوتا ہے۔ ان تراکیب میں آزاد سلیقہ مندی سے ہم جنس الفاظ کو ایک دوسرے کے ساتھ بٹھاتے ہیں اور ان کو ایک خاندان میں شامل کرتے ہیں۔ ان کے ہاں دایرۂ الفاظ بہت وسیع ہے۔ یوں لگتا ہے کہ آزاد ادب کے باغ کے باغباں ہیں اور الفاظ جو اس باغ کے پھل ہوتے ہیں آزاد کی دیکھ بھال سے رشد و نمو پاتے ہیں اسی وجہ سے آزاد بہت سلیقہ مندی سے ہر ایک کو چُنتے ہیں اور اپنے صفحاتِ خیال میں جڑتے ہوئے نیرنگِ خیال کو سامنے لاتے ہیں۔ ''آغازِ آفرینش میں باغِ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا' سے یہ جملہ ملاحظہ فرمایئے: ''احتیاج و افلاس کا ایک بیٹا بھی ہے جس کا نام محنت پسند خردمند ہے۔''

آزاد کو احتیاج وافلاس کا فرق اتنا واضح اور شفاف ہے کہ ان دونوں کی جنسیت کو بھی مختلف سمجھتے ہیں۔ وہ ایک کو تانیث دوسرے کو تذکیر سمجھے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آزاد احتیاج اور افلاس کو ایک جیسے نہیں دونوں کو برابر قرار رکھتے ہیں۔

ایک اور مثال ہے: سارا میدان گریہ وزاری، نالہ وفریاد، آہ وافسوس سے دھواں دھار ہورہا تھا۔ تین تراکیب ہیں۔ ہر ایک میں قریب المعنی الفاظ آئے ہیں اور ساری تراکیب ایک ہی کیفیت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہ تصویر کشی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ وہ ہر لفظ کو الگ الگ تمثیل نگاری کا جامہ پہناتے ہیں اور آخر میں ان الفاظ کو پیوند لگاتے ہیں۔

رعایت لفظی:

نیرنگ خیال میں رعایت لفظی کے دو پہلو نظر آتے ہیں: اول نثر کو مسجع کرنا اور دوم مصنف کی بات کو بہترین طریقے سے مخاطب کو منتقل کرنا۔ اس صنعت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کو الفاظ پر عبور حاصل ہے اور وہ الفاظ کے درمیان رشتہ برقرار رکھنے میں پوری مہارت رکھتے ہیں: معما و قلعہ، جادوگر و طلسمات و منتر، مرصع کار و دستکاری و تاج و زر و جواہر، عیار و گرہ لگانا و قفل کھولنا، مصور و مرقع، گلزار و گل و طوطی و بلبل، دراتی و کشت اسی قسم کی خوبی میں شامل ہیں۔ ''آغاز آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا'' میں یہ جملہ ہے: زمانے کے پیراہن پر گناہ کا داغ نہ لگا تھا اور دنیا کا دامن بدی کے غبار سے پاک تھا۔ پیراہن و دامن میں رعایت لفظی موجود ہے۔

آزاد الفاظ کو چننے میں احتیاط سے کام لیتے ہیں اور الفاظ کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔

تجنیس:

تجنیس شاعری کی ایک اہم خصوصیت ہے: اسی طرح جب نثر میں آئے تو اس کی زبان کو بلیغ اور عمدہ بناتی ہے۔ جب کسی زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں کیا جاتا ہے پہلے والی زبان کے بعض صنائع بدائع کی خوبیاں دوسری زبان میں محفوظ نہیں ہوسکتیں۔ خاص طور پر تجنیس پر یہ تعریف صادق آتی ہے۔ آزاد نے یہ خوبی پیدا کرنے کے لیے اپنی زبان سے اسلوب کو بنایا ہے اور معانی کو اپنے تخیل سے اس طرح آرائش دی ہے کہ ہم حیران ہوتے ہیں کہ وہ انگریزی مضامین سے ماخوذ کیسے ہوسکتا ہے؟!

یہ مثالیں دیکھیے: امید کی حمایت ..... بے حیائی کی عنایت، فیاضی سے فیضِ تعلیم، درس و تدریس، کڑک دمک، آرائش و زیبائش، امید کی حمایت، حقیقی و تحقیقی، آیت و روایت، اقوام مختلفہ، عہدہ ہائے متفرقہ، عمر ہائے متفاوتہ، گنجائش و آرائش۔

اس صنعت سے نثری متن موزوں بن گیا ہے اور سب سے برتر یہ کہ اگر کوئی بھی قاری اس کی زبان سے

نا آشنا ہو پھر بھی اس کے آہنگ سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اداس بے آس ہو کر.....سر پر تاج کلاہی دھرا تھا جس پر اندھا دُھند اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہ لوگ روتی صورت، سوتی مورت، دولت کے بندے تھے۔

اس کمالِ فن کے باعث ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ نیرنگِ خیال میں آزاد کے قوتِ متخیلہ کی کرنیں جلوہ فگن ہوتی ہیں۔

تکرار:

فن پارے میں دو طرح کی تکرار پائی جاتی ہے۔ ایک تکرارِ حرف ہے: کہیں ایک جملے میں الفاظ کی صوتی تکرار سے ایک موسیقی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً: ''آغاز آفرینش میں باغِ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا' میں جملہ ہے: ہر چند اس بیچارے ضرورت کے مارے کو خرچوں کی کثرت اور ضرورتوں کی شدت سے زیادہ سامان لینا پڑا۔ ضرورت، کثرت اور شدت میں 'ت' کی تکرار سے کلام میں ایک ضرب لگائی جاتی ہے جو متن کو دلچسپ بناتی ہے۔

دوسرے تکرارِ لفظی ہے: اس سے دو خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک آزاد کی جمال پسندی سے وابستہ ہے اس تکرار سے حسنِ متن میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ دوسری خوبی آزاد کے خیالات سے وابستہ ہے کہ وہ اپنی بات پر تاکید کے لیے تکرارِ الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی حکمتِ اخلاق پُر اثر ہوتی ہے اور قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے: ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، خوبصورت خوبصورت جانور کلیل کر رہے تھے۔ خوبصورت خوبصورت عورتیں، مگر ایسے ایسے اُلجھاوے۔ چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں، دہری دہری تہری تہری، جنگل کی سائیں سائیں، ٹہنی ٹہنی سے رونے کی آواز، ایسی ایسی باتیں کان میں پھونک جاتا تھا۔ جس شخص کے داغ لگتا تھا نیک نامی بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتی تھی۔

اسی طرز تکرار سے الفاظ میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے کہ نہ صرف ہماری سماعت میں سُننے کی حس کو جاگر کرتی ہے بلکہ ہمارے ذہن میں سوچ کی تاروں میں بھی حرکت پیدا کرتی ہے۔

تشبیہات واستعارات:

آزاد تشبیہات واستعارات سے رمز و اختصار کے لیے کام نہیں لیتے کیوں کہ وہ وجہ شبہ اور وجہ جامع کو جملوں میں ایسے واضح کرتے ہیں کہ قاری کے لیے کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر 'اردو اور انگریزی انشاپردازی پر کچھ خیالات' میں وہ زبان کو معمار، جادوگر، مرصّع کار، عیّار اور مصوّر کہتے ہیں۔ پھر ہر ایک مشبہ بہ کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثلاً: وہ ایک چالاک عیّار ہے جو ہوا پر گرہ لگاتا ہے اور دلوں کے قفل کھولتا ہے اور بند کرتا ہے۔ اسی رو سے ہر تشبیہ کے بعد لفظ 'جو' لایا گیا ہے جس کے بعد معترضی جملہ آتا ہے۔ ان کے اکثر مشبہ عقلی اور مشبہ بہ کہیں حسی اور کہیں عقلی ہوتے ہیں۔

آزاد بات ادھوری نہیں چھوڑتے لیکن کہیں کہیں ان کی تشبیہات و استعارات میں صفتِ ایہام موجود ہے، مثلاً نیرنگِ خیال کے پہلے مضمون میں وقت کو پیر کہن، شیشۂ ساعت اور غلام خونریز سے تشبیہ دیتے ہیں پھر پیر کہن کہہ کر اس کی تصویر کشی کرتے ہیں کہ اس کے بازوؤں میں پریوں کی طرح پر پرواز لگے ہیں کہ۔۔۔یہاں پیر کہن' گھڑی' کی طرف اشارہ بھی ہوسکتا ہے جن کی سوئیوں (سکینڈ اور منٹ) کو دو پروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

تلمیحات:

آزاد تمثیل نگاری کے لیے تلمیحات سے کام لیتے ہیں۔ان کی تلمیحات میں اکثر اساطیری تلمیحات شامل ہیں۔مثال کے طور پر: اولادِ آدم، آبِ حیات، طوفانِ نوح، درفشِ کاویانی، رستم، سکندر، دارا، افلاطوں، جالینوس، سقراط، سحرِ سامری، باغِ ارم، قارون، مانی، بہزاد وغیرہ۔

ان کی تلمیحات میں واقعات کی جگہ اکثر شخصیات شامل ہیں جو نیکی یا بدی کے مجسمے ہیں۔یہ نظر آتا ہے کہ ان میں بادشاہوں، افسانوی کرداروں اور شعرا کے نام خاص نمایاں ہیں۔

'اردو اور انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات' میں مانی و بہزاد کا نام لے کر کہتے ہیں: ''اس نادر دستکار کے پاس مانی اور بہزاد کی طرح موقلم اور رنگوں کی پیالیاں دھری نظر نہیں آتی ہیں، لیکن اس کے استعاروں اور تشبیہوں کے رنگ ایسے خوشنما ہیں کہ ایک بات میں مضمون کو شوخ کر کے لال چہچہا کر دیتا ہے۔'' یہاں تلمیح کی نوعیت وہی ہے جو کلاسیکی ادب خاص طور پر شاعری میں نظر آتی ہے۔

آزاد ہر تلمیح کے پس منظر سے آشنا ہیں اور اس کا سہارا لے کر اپنے نصائح اور پند کو بہترین تمثیل نگاری سے دل و جان میں سمو دیتے ہیں۔

اس فنی کارنامے میں اسلوب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ الفاظ اپنے حقیقی اور مجازی معنوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔اس میں مختلف صنائع بدائع کا تنوع اور تمثیل نگاری کا سحر ہونے کے باوجود تمام مضامین میں ایک ہی مقصد جاری ہے اور وہ یہ ہے کہ آزاد حکمت و اخلاق کے مضامین کو ادب کے سانچے میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔مثال کے طور پر مضمون ''علمیت اور ذکاوت کے مقابلے'' میں جملہ ہے: ''دوسرے رستے پر بھوت تھا اس کا نام حسد تھا۔پہلے بھوت کی طرح کچھ اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔لیکن ڈرانی آواز اور بھونڈی صورت اور مکروہ و معیوب کلمے جو اس کی زبان سے نکلتے تھے، اس لیے اس کا منہ ایسا برا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔۔۔'' یہاں تشبیہ، تمثیل نگاری نفس حسد کی وضاحت کرنے کے لیے استعمال ہوئی ہیں۔اور 'حسد' اپنے وضعی معنی سے باہر نہیں جاتا ہے۔اسی بنا پر نیرنگِ خیال میں الفاظ میں پیچیدگی نہیں ہے، ہم ان سے مانوس ہیں۔

اسی طرح نیرنگِ خیال کے اسلوب میں دیگر خوبیاں بھی موجود ہیں، مثلاً: مہمل (جھوٹ

موٹ، چھوٹے موٹے)، جملے کا مقفّیٰ ہونا (قلم سے موتی برستے ہیں اور منہ سے پھول جھڑتے ہیں) تکرارِ قوافی، تینوں سے صوتی خوبی پیدا ہوئی ہے، فارسی تراکیب (کوتہ اندیشی، پاک نہاد، رنگ آمیزی وغیرہ) جن سے کلام فصیح ہوا ہے۔

اردو ادب میں محمد حسین آزاد کا نادر اسلوب ایسا چراغ ہے جو رفتہ رفتہ بجھنے کی بجائے بھڑکتا جاتا ہے۔ آزاد نے اسلوب کی ساری خوبیوں کو اپنے فن پاروں میں یک جا کر دیا ہے اور ہر خوبی کو انتہائی مہارت سے ابھارا ہے۔

نیرنگ خیال میں اسلوب کی نیرنگی تمہید ہی سے شروع ہو جاتی ہے اور آخر تک دامن کشِ دل رہتی ہے۔

آزاداور تحقیقِ لغات

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

اس مقالے میں لغات سے مراد فرہنگ یا لغت یا ڈکشنری نہیں بلکہ وہ بامعنی کلمات یا تشریح طلب الفاظ ہیں جنھیں لغت میں درج کرنے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

محمد حسین آزاد کا شمار بجا طور پر ان اساتذۂ اردو میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو میں لسانیات کے موضوع پر اولین کام کیے۔ لفظیات اور لغات سے انھیں گہری دل چسپی تھی۔ ان کی کتاب سخن دانِ فارس اردو میں لسانیات اور تحقیق الفاظ کے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ اردو میں تقابلی لسانیات کے تو آزاد بانی کہلانے کے مستحق ہیں۔ اگرچہ لسانیات کا علم تو اب بہت آگے بڑھ چکا ہے اور خود آزاد کے زمانے میں بھی اتنا ترقی یافتہ نہ تھا لیکن آزاد کے لسانی نظریات (جن میں سے بیشتر اب درست نہیں رہے) سے قطع نظر انھوں نے اردو میں ایک کام ایسا کیا جس کے وہ نہ صرف بانیوں میں سے تھے بلکہ ان کے بعد بھی چند ایک اہل علم کے سوا کسی نے کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا اور وہ ہے الفاظ کی تحقیق اور ان کی اصل نسل اور تاریخ کا کھوج۔ آزاد نے اس سخن دانِ فارس کے ذریعے بالخصوص اور اپنی دیگر کتابوں کے ذریعے بالعموم اردو میں لسانی تحقیق اور تحقیق الفاظ کی جو روایت ڈالی تھی اگر اسے پروان چڑھایا جاتا تو اس موضوع پر ایک وقیع اور قابل ذکر ذخیرہ آج ہمارے پاس ہوتا۔ افسوس کہ ان کے بعد یہ روایت کچھ زیادہ نہ پنپ سکی اور اس موضوع پر صرف چند ہی قابل ذکر کتابیں اردو میں لکھی گئیں۔ ان میں سے ایک کتاب المفرد المرکب ہے جو مولوی عبداللطیف نے تحریر کی اور ۱۳۳۵ھ میں ذخیرہ پریس، حیدرآباد دکن، سے چھپی۔ تحقیق الفاظ پر ایک اور قابل ذکر کتاب آزاد ہی کے شاگرد مولوی احمد دین کی سرگزشت الفاظ ہے جو لاہور سے ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی اور جس کا حال ہی میں تیسرا ایڈیشن پورب اکیڈمی، اسلام آباد، نے شائع کیا ہے۔ اس ضمن میں سید سلیمان ندوی نے قابل تحسین کام کیا اور اس موضوع پر کئی دل چسپ مضامین معارف میں لکھے جو ان کی کتاب نقوش سلیمانی میں بھی شامل ہیں۔ ان کی بعض دیگر کتابوں مثلاً سیرۃ النبیؐ میں بھی تحقیق الفاظ پر وقیع مواد موجود

ہے۔

اس کے بعد اس طرف محققین نے ذرا کم ہی توجہ دی اور اردو میں اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ البتہ پچھلے دس بارہ برسوں میں اس طرف کچھ توجہ دی گئی ہے اور تحقیق الفاظ کے موضوع پر اردو میں دس بارہ کتابیں مہیا ہوگئی ہیں جن میں سے چند واقعی قابل تعریف ہیں۔ جرائد میں اس موضوع پر شائع ہونے والے مضامین، جو خاصی تعداد میں ہیں، ان کے علاوہ ہیں۔

آزاد نے جن فارسی، عربی اور سنسکرت الفاظ کی اصل، ان کے اشتقاق، معنی، معنی میں تغیر اور ان کے مرکبات پر اظہار خیال کیا ہے وہ کثیر تعداد میں ہیں۔ فارسی اور سنسکرت کی قدیم مشترکہ جڑوں کے اپنے گہرے مطالعے کے نتائج کو بھی آزاد نے اپنے مخصوص دل چسپ انداز سے پیش کیا ہے۔ تحقیق الفاظ اور ان کی وضاحت کے ضمن میں بھی آزاد کا مخصوص تخیلاتی، استعاراتی اور محاکاتی انداز موجود ہے۔ خوبصورت نثر میں آزاد نے تحقیق الفاظ کے ضمن میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی مختلف کتابوں میں بکھرا پڑا ہے۔ راقم نے کوشش کی ہے کہ الفاظ کی اصل، ان کے اشتقاق، معنی اور استعمال نیز بعض مرکبات اور محاورات کے بارے میں آزاد نے جو کچھ لکھا ہے اسے الفبائی ترتیب سے جمع کرلیا جائے۔ ان میں سے بیشتر مواد بہت مفید اور دلچسپ ہے اور نہ صرف درس وتدریس میں مفید ثابت ہوسکتا ہے بلکہ لغت نویسی میں بھی معاون ہوگا۔ ان میں چند الفاظ ایسے بھی جن کا اندراج لغات میں یا تو ندارد ہے یا ان کی تشریح تشنہ ہے۔

اس فہرست میں شامل الفاظ چند عنوانات کے تحت آزاد نے پیش کیے تھے۔ جو یہ ہیں:

۱۔ آزاد کے بقول بعض الفاظ کی آواز ان کے معنی کا پتا دیتی ہے۔ آزاد نے ایسے الفاظ جمع کیے تھے جن کے صوتی اثرات ان کی اصل اور وجہ تسمیہ بتاتے ہیں۔

۲۔ آزاد کہتے ہیں کہ فارسی اور سنسکرت کی قدیم جڑیں مشترک ہیں (ان کا یہ نظریہ درست ہے) اور دونوں زبانوں کے ایسے کئی الفاظ اس کے شاہد ہیں جن میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ آزاد نے دونوں زبانوں سے ایسے الفاظ کے اشتقاق اور معنی وضاحت کی ہے۔

۳۔ بعض اشیا کے نام وقت کے ساتھ بدل گئے یا بعض الفاظ نئے معنی میں آگئے۔ آزاد نے انھیں بھی پیش کیا ہے۔

۴۔ کچھ الفاظ ایسے ہیں جو دوسرے ملکوں یا زبانوں میں جا کر برے معنوں میں مروج ہوگئے بلکہ بقول آزاد ''بے عزت ہوگئے''۔ آزاد نے ان کے معنی اور مختلف استعمال بیان کیے ہیں۔

۵۔ آزاد نے فارسی کے کئی ایسے الفاظ اور مرکبات پیش کیے ہیں جو موسموں اور جغرافیائی حالات کی وجہ سے مخصوص معنوں میں مروج ہوگئے۔

ان تمام اقسام کے الفاظ اور مرکبات کو باعتبار حروف تہجی یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ الفاظ اور ان کی تشریح کو ہو بہو آزاد کے الفاظ میں بیان کیا جائے تاکہ منشاے مصنف صحیح طور پر سامنے آ سکے کیونکہ تشریح اور تحقیق الفاظ جیسے موضوع میں غلط انتساب کے خدشات نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر کہیں کسی سبب سے کسی لفظ یا چند الفاظ کا اضافہ کرنا پڑا ہے تو انھیں چوکور خطوط وحدانی میں درج کیا گیا ہے۔ آزاد نے کئی الفاظ کا ذکر ایک سے زیادہ مقامات پر کیا ہے اور احتیاط اور عقیدت دونوں کا تقاضا تھا کہ بعض صورتوں میں تکرار کے باوجود ان تمام تشریحات کو بتمام و بکمال درج کیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ہے۔ حذف عبارت کی صورت میں حسب دستور تین نقطے (۔۔۔) دیے گئے ہیں۔ البتہ املا کے سلسلے میں چند ایک مقامات پر جدید رجحان کو پیش نظر رکھنا پڑا۔

اس کے علاوہ کتابت میں اکثر مقامات پر قدیم رجحان کے مطابق املے کا خیال نہ رکھا گیا تھا، یہاں اس کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ آزاد کی کتابوں کے ناموں کا حوالہ متن ہی میں دے دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور ان کے اندراج کے ضمن میں یہ مخففات استعمال کیے گئے ہیں:

سخن: سخن دان فارس، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۷۹ء (عکسی طباعت ایڈیشن ۱۸۸۷ء)۔

حیات: آب حیات، مرتبہ ابرار عبدالسلام، ملتان، ۲۰۰۶ء۔

قواعد: جامع القواعد، تیرھواں ایڈیشن، مطبوعہ لاہور، ۱۹۰۷ء۔

ح: حاشیہ

نیز سخن دان فارس کے صفحات کا حوالہ دینے سے قبل اس کے پہلے اور دوسرے حصے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ مثلاً اگر کسی لفظ سے متعلق عبارت سخن دان فارس کے دوسرے حصے کے صفحہ ۲۲۳ کے حاشیے سے لی گئی ہے تو اس کا حوالہ اس عبارت کے متن کے اختتام پر اس طرح دیا گیا ہے:

سخن، ۲: ۲۲۳، ح

اب ہم الفاظ اور ان کی توجیہہ و تشریح حتی الامکان آزاد کے اپنے الفاظ میں بیان کریں گے۔ وھوہٰذا:

اجاغ / اجاغ زادہ

اجاغ ترکی میں چولھے کو کہتے ہیں۔ اُچ ۳ [یعنی اچ بمعنی تین] ایاغ پا [یعنی بمعنی پا] یعنی سہ پایہ۔ ایسا چولھا ضرورت وقتی کے لیے بناتے ہیں کہ پکایا، کھایا، اور روانہ۔ ہمارے تمھارے چولھے ایسے نہیں ہوتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی گزران ہمیشہ ان سے اجاغ بنواتی تھی۔ اب گھروں کے چولھوں کو بھی اجاغ کہتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ محاورے میں اجاغ زادہ خاندانی اشراف کو کہتے ہیں۔ (سخن، ۲: ۱۵۱)

بے منزل

بدیع منزل کا مخفف ومبدل ہے۔ دلی کے باہر شاہان قدیم کی تعمیرات سے ایک مشہور عمارت ہے۔ (حیات، ۲۳)

برسات

برسات: فارسی میں یہی موسم کا نام ہے۔ سنسکرت میں برشارُت۔ ش، س کا مبادلہ بمقتضاے طبیعت عام ہے۔اس لیے [برشا] برسا ہوا۔ ''ر'' بہہ گئی، برسات رہ گئی۔ (سخن، ۱:۸۱) [پلیٹس کے نزدیک برشا نہیں ورشا ہے۔ سنسکرت میں ب اور و کا تبادل عام ہے (مرتب)]

بندہ

بندہ فارسی میں غلام کو کہتے ہیں کیونکہ بند بمعنیِ قید ہے۔ یہ [یعنی بندہ] بھی قید حکم، قید اطاعت یا قید وفا میں ہوتا ہے اور سب سے بڑی قید اطاعت اور قید وفا خدا کی ماننی چاہیے۔ اس لیے بندۂ خدا ہوا۔ اسی سے بندگی بمعنیِ اطاعت اور عبادت ہوئی۔ اور سنسکرت میں وِند بمعنیِ سلام اور عجز ہے۔ (سخن، ۱:۴۳) بندہ فارسی میں خدمت گار و تابع فرمان کو کہتے ہیں۔ اسی سے ہے بندگی بمعنیِ طاعت واطاعت۔ سنسکرت میں وند بمعنیِ فرماں برداری ہے۔۔۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل دونوں کی ایک ہے۔ (سخن، ۱:۶۲)

بولی بھٹیاری

کوئی بوعلی بختیاری کا مخفف ومبدل کہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے بھولی بھٹی کا [مخفف ومبدل ہے]۔ (حیات، ۲۳)

پہلو، پہلوی

بعض کہتے ہیں کہ پہلو شہر کو کہتے ہیں، بعض کہتے ہیں چھاؤنی لشکر کو کہتے ہیں۔ ۔۔۔ بعض کہتے ہیں کہ پہلوانانِ فارس یہ بولی بولتے تھے اس لیے پہلوی اور پہلوانی بھی کہتے تھے۔ ۔۔۔ پہلو ایک راگ کا بھی نام ہے۔ ۔۔۔ بات یہ ہے کہ فصحاے فارس نے کسی موقعے پر اہل کوہ کی زبان کو کہ خالص اصلیت پر ہوتی تھی ''دری'' کے لفظ سے سراہا ہے۔ کسی موقعے پر اہل شہر کی زبان کو کہ تراش پا کر شستہ ورُفتہ اور بامحاورہ ہو جاتی ہے پہلوی کہہ کر تعریف کی ہے۔ ۔۔۔ بزرگانِ سلف اصفہان، رے (اب یہیں طہران آباد ہے) اور نہاوند کے علاقے کو پہلو کہتے تھے کہ آباد، شاداب، مہذب اور دربار دار شہر تھے اور ان کی زبان کو پہلوی یعنی شہری کہتے تھے، باقی کو دری اور تبری کہ تبرہ پشتے اور پہاڑی کو کہتے ہیں۔ اسی سے تبرستان بمعنیِ کوہستان ہے۔ (سخن، ۲: ۳۵۔۳۶) نیا نکتہ یہ ہے کہ پہلوی کا مٹا ہوا سراغ ہندستان میں آنکلا۔۔۔شارح۔۔۔ پہلو کے باب میں کہتا ہے یہ ایران میں آباد تھے جن کی پہلوی زبان میں ان کا نام باقی ہے۔ (سخن، ۲: ۳۶۔۳۷) کولڈ اسکر صاحب نے اپنی گریمر میں لکھا ہے کہ پہلو ایک کم مرتبہ فرقہ کھتریوں کا ہے۔

یہ راجا سگر کی رعایا تھے۔ ۔۔۔اس فرقے کے اکثر لوگ ہندستان کے جنوب میں آباد ہیں، کسی زمانے میں فارس کے کسی علاقے سے آئے تھے۔۔۔ان کے ملک کا نام پہلو تھا اور ان کی زبان پہلوی تھی۔ (سخن،۲:۳۷)

تاک

تاک سنسکرت میں دراکشا ہے۔''کشا'' [جو دراکشا میں ہے] اپنے گھر میں بھی کبھی ''کھیا'' کی آواز بھی دیتا ہے۔ اگر فارسی میں ''ک'' ہو گیا تو کچھ تعجب نہیں۔ (سخن،۸۵۔۸۶) [یہاں آزاد نے پوری طرح وضاحت نہیں کی ہے۔ تاک فارسی میں انگور کی بیل کو کہتے ہیں اور سنسکرت کا دراکشا فارسی میں تاک کی شکل میں اور اردو میں داکھ کی شکل میں ملتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی نے لفظ داکھ کشمش کے معنی میں استعمال کیا ہے جن کا مصرع ہے:

کیا داکھ، منقی، سونٹھ، مرچ، کیا کیسر، لونگ، سپاری ہے

اور اقبال نے کہا:

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است]

جیب

جیب عرب میں اول سینے کو اور دل کو بھی کہتے تھے۔ پھر گریبان کو کہنے لگے کہ سینے پر ہوتا ہے۔ بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ جوب بمعنی قطع ہے۔ گریبان کترا ہوا ہوتا ہے اس لیے اس کا نام جیب رکھا۔ عرب کے لوگ جبے یا کرتے کے گریبان میں ایک تھیلی ٹانک کر اس میں چیز رکھ لیا کرتے تھے۔ مدت کے بعد اسی کا نام جیب ہو گیا۔

فارس میں وہ تھیلی گریبان سے ڈھلک کر کمر کے نیچے آ گئی اور نام وہی جیب رہا۔ تماشا یہ کہ اب گھڑی کے شوقینوں نے چھاتی کے بائیں طرف جگہ دی اور کوٹ پتلون والوں نے کہیں کا کہیں پہنچا دیا پھر بھی وہی جیب ہے اور عرب میں جیب وہی گریبان ہے۔

جب عرب میں علم ریاضی کا چرچا اور علم مثلث کا یونانی سے ترجمہ ہوا تو جو خط کسی قوس یا اس کے زاویے کا انداز بتائے اسے جیب کہنے لگے کیونکہ وہ بھی قوس کے لیے ایسا ہے جیسا سینے کے لیے گریبان۔ (سخن،۱:۱۸)

دامن (سے متعلق مرکبات اور محاورات)

دامن کشاں رفتن، فخر و ناز سے چلنا۔۔۔ظاہر ہے کہ جس کے دامن ہی نہ ہو [یعنی مفلس ہو] وہ دامن کشاں [یعنی فخر و ناز سے] کیونکر چلے گا۔ ۔۔۔جس نے ٹھنڈے ملکوں میں جاڑا گزارا ہوگا وہ جانے گا کہ پا بدامن پیچیدن میں کیا مزا ہے اور اسی سے استعارہ نکلا پا بدامن صبر پیچید۔ بھلا کوٹ میں پانو [پاؤں] لپیٹ کر کیونکر بیٹھ سکتے ہیں۔ جس نے اس ملک میں گزران کی ہوگی وہی جانے گا کہ دامن بر آتش زدن سے آگ سلگانے کی اصطلاح کیونکر نکلی۔

اور اس کے لیے بڑا دامن کام دیتا ہے یا چھوٹا۔ اگر بڑے دامن نہ ہوتے تو چراغ زیرِ دامن کی اصطلاح کیونکر پیدا ہوتی۔ (سخن،۲: ۱۶۵۔۱۶۶)

دختر

دختر فارسی ہے۔ سنسکرت میں دُہتری کہتے ہیں۔ ایک یورپین محقق لکھتے ہیں کہ یہ سنسکرت سے مشتق ہے اس دُہ سے جس کے معنی ہیں دود[ھ] دُہنا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عہدِ قدیم میں ناکتخدا بیٹیوں کا کام اپنے گھروں میں دودھ دہنا ہوگا اس لیے دہتری کہتے تھے۔ لطف یہ ہے کہ فارسی میں بھی دوختن بمعنی دوشیدن ہے اور اسی سے دختر ہے۔ اور دوشیزہ فارسی میں دخترِ بکر کو کہتے ہیں۔ یہ بھی دوشیدن (دود[ھ] دہنا) سے مشتق ہے۔ خان آرزو کہتے ہیں کہ ابتدا میں دوشیزہ چھوٹی لڑکی کو کہتے تھے جسے دوش پر لیے پھرتے تھے پھر عموماً دختر کو دوشیزہ کہنے لگے پھر دخترِ بکر کے لیے خاص ہو گیا۔ ہزاروں برس کی باتیں ہیں۔ خدا جانے اصلیت کیا ہے۔ سند ایک کے پاس بھی نہیں۔ (سخن،۱: ۶۹)

ژندر پاژند

گشتاسپ کے عہد میں ابراہیم زرتشت نے کسی علمی اور درباری زبان میں ایک کتاب لکھی اور اس کا نام ژند رکھا۔ ژند چقماق کے اس جز[و] کو کہتے ہیں جو آگ نکالتا ہے۔ کتابِ مذکور بھی نورِ الٰہی کا جلوہ دکھاتی ہے اس لیے یہ برجستہ نام بہت مناسب ہوا۔ ژند سخت مشکل تھی۔ اس لیے شرح لکھنی پڑی اور اس کا نام پاژند رکھا۔ پاژند چقماق کے دوسرے حصے کو کہتے ہیں۔ جب ژند پاژند سے ٹکرائے تو جلوۂ حق روشن نظر آئے۔ (سخن،۲: ۲۷)

گریبان

گریبان کو فلسفیِ زبان نے دیکھا۔ ''بان'' پر جوڑ معلوم ہوا۔ اس نے ''گریے'' کو دیکھا تو فارسیِ قدیم میں بمعنی گلو پایا۔ سمجھ گیا کہ اس جزوِ لباس کا گلے پر قبضہ ہے اس لیے اس کا نام گریبان رکھا ہوگا کہ مالکِ گلو ہے۔ سنسکرت میں دیکھا تو وہاں گریوا انھی معنوں میں آیا ہے اور بان سنسکرت میں وان ہے۔ ثابت ہو گیا کہ ایک گھرانے کی نسل ہے۔ (سخن،۱: ۱۵) گری فارسی میں گلے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں گریوا کہتے ہیں۔ اسی سے ہے گریبان۔ (سخن،۱: ۹۰)

مضارع

مضارع کے معنی لغت میں ہیں مشابہ۔ چونکہ مضارع کے صیغے سے حال اور استقبال دونوں زمانے نکلتے ہیں اس لیے اسے مضارع کہتے ہیں۔ (قواعد،۳۱)

مقیش

مقیش اصل میں سنسکرت کا لفظ ہے، میکش کیش۔ اس میں میکش سورج کی کرن ہے اور کیش بال۔ دونوں مل کر موے شعاعی ہو گئے۔ تعجب ہے محقق ہند صاحب بہارِ عجم سے کہ اسے عربی کا لفظ مان کر کہتے ہیں کہ مقیش

ہے۔لیکن یہ نہیں لکھتے کہ عربی میں اس کا ماخذ اور اصل کیا ہے۔صاحب غیاث اللغات اس کا حوالہ دیتے ہیں اور توضیح میں اس سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ جب اصل نہیں تو زور کیا چل سکتا ہے۔ (سخن،۱:۸۵) سنسکرت میں کیش عموماً بالوں کو کہتے ہیں۔ (سخن،۱:۷۷)

مہتر

مہتر فارسی میں سردار کو کہتے ہیں۔ ہندوستان میں چوڑھا ہوگیا۔ (سخن،۱:۱۸) مِہ فارسی قدیم میں بڑائی کے معنی پیدا کرتا تھا اور اسی سے تھا، مہ آباد، شاہان قدیم کا سلسلہ۔اب تک بھی زبان مذکور میں مہ بمعنی بزرگ ہے اور اسی سے ہے مہتر اور مہتری۔سنسکرت میں دوسرے لفظ کے ساتھ مل کر بڑائی کے معنی پیدا کرتا ہے۔ (سخن،۱:۱۰۵)

مہمان

مہمان فارسی ہے۔اور اہل لغت کہتے ہیں کہ مِہ بمعنی سردار اور مان حرف تشبیہ ہے یعنی بزرگ وار۔ٹیک چند بہار کہتے ہیں کہ سنسکرت میں مہما بمعنی تعظیم وتوقیر ہے۔اور کبھی تعریف کے موقعے پر بھی آتا ہے۔ چونکہ مہمان کی تعظیم وتوقیر ہر قوم اور ملک میں رسم عام ہے عجب نہیں کہ مہمان کے لیے مستعمل ہوگیا ہو۔ (سخن،۱:۸۹)
جو شخص ان کے گھر آئے اسے تعظیمی لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی مہمان اور صاحب خانہ کا نام رکھا میز بان۔ گویا فرض اصلی اس کا دسترخوان سجانا ہے۔ (سخن،۲:۱۶۰)

موش

موش فارسی ہے۔سنسکرت میں موشک کہتے ہیں۔زبان مذکور میں موش چور کو کہتے ہیں۔ چوہا بڑا چھوٹا جانور ہے۔اس لیے یہ نام پایا۔سنسکرت کا ''ک'' خصوصی وصفیت پر دلالت کرتا ہے جیسے گندھک میں۔ (سخن،۸۶)

میز

فارسی قدیم میں میز دسترخوان کو کہتے تھے۔ (سخن،۲:۱۶۰(حاشیہ))

نابار/نہار

نابار اور نہار ہندوستان میں سب جانتے ہیں۔ فلسفی زبان نے دیکھا تو ''ن'' پر جوز معلوم ہوا۔ابار کو دیکھا فارسی بلکہ سنسکرت میں بھی بمعنی خورش آیا ہے۔ سمجھ گیا کہ صبح سے جب تک کچھ نہ کھایا ہو اس وقت تک نابار یا نہار ہے۔ (سخن،۱:۱۶) ایران میں کہتے ہیں نہار حاضر است یعنی دسترخوان پر صبح کا کھانا چنا ہوا ہے۔ آیئے نوش جاں فرمایئے۔
اور ہنوز نہار نہ کردم یعنی ابھی صبح کا کھانا نہیں کھایا۔ (سخن،۱:۱۶،ح) آبار فارسی میں بمعنی خوراک ہے۔
سنسکرت میں آبار خوراک کو کہتے ہیں۔فرق اتنا ہے کہ آبار اب فارسی کی تحریر اور محاورہ نہیں رہا۔ نابار محاورے اور تحریر دونوں میں ہے۔صبح سے جب تک کھانا نہ کھاؤ نابار ہو (یعنی کچھ نہیں کھایا)۔ (سخن،۱:۶۰)

[نیز ملاحظہ ہو: ناشتہ۔]

نیلوفر

[لفظ] نیلوفر کو بے خبر آدمی ایک گل خودرو سمجھے گا۔ فلسفی زبان دیکھے گا کہ نیلوپر، نیلوفل، نیلوپل، نیلپر، سب طرح استعمال ہوا ہے۔ تب ادھر ادھر نظر دوڑائے گا، اس وقت معلوم ہو گا کہ سنسکرت میں نیل نیلا، اُت پل پنکھڑی ہے۔ یعنی نیلی پنکھڑی والا پھول۔ فارسی میں ادل بدل ہو کر کچھ سے کچھ ہو گیا۔ (سخن، ۱:۱۶)۔ نیلوفر کو سنسکرت میں نیلوت پل کہتے ہیں۔ (سخن، ۱:۸۴) [نامکمل]

محمد حسین آزاد کے لسانی تصوّرات: مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

ڈاکٹر ناصر عباس نیر

محمد حسین آزاد (۱۸۳۰ء۔ ۱۹۱۰ء) پہلے اردو ادیب ہیں جنھوں نے فلالوجی یا تاریخی، تقابلی لسانیات پر باضابطہ قلم اٹھایا، مگر ان کی اس علمی خدمت کا اس کے درست سیاق میں تجزیہ کرنا تو در کنار، اس کا تفصیلی جائزہ مرتب کرنے کی زحمت بھی کم ہی کی گئی ہے۔ آزاد کے لسانی تصورات کا تذکرہ ان کے سوانح نگاروں اور آزادیات کے بعض ماہرین نے ضرور کیا ہے، مگر برسبیل تذکرہ کیا ہے۔ اس امر کی ایک وجہ خود آزاد اور دوسری وجہ اردو کے علما ہیں۔ آزاد انشا نہیں لکھتے، طلسم باندھتے ہیں۔ اس متفق علیہ تنقیدی رائے کی روشنی میں آزاد کا مطالعہ، ان کے بعض علمی افکار کی چمک دمک ماند کر دیتا ہے۔ دوسری وجہ اردو کے بیش تر علما کی لسانیات سے عدم دل چسپی اور بعض صورتوں میں بے زاری ہے۔ یہ محبّانِ اردو، زبان و بیان، اس کے چٹخارے یا قواعدِ زبان پر تو جان چھڑکتے ہیں، مگر زبان و بیان کی سائنس سے ان کی جان جاتی ہے۔ کم از کم آزاد کے سلسلے میں تو یہ بات ہرگز غلط نہیں۔

آزاد سے پہلے ٹیک چند بہار (بہار عجم، ۱۷۳۹ء) خان آرزو (مثمر، ۱۷۵۰ء) اور انشاء اللہ خان انشاء (دریائے لطافت، ۱۸۰۸ء) بعض لسانی تصورات پر اظہارِ خیال کر چکے تھے۔ ان سب کے یہاں معمولی فرق کے ساتھ لغت، صرف و نحو، منطق و عروض، فصاحت وغیرہ لسانی مباحث کی ذیل میں آتے تھے۔ گویا لفظ کی اصل، اس کی تصریفی شکلوں، اس کے معانی، معانی کے تغیرات، قواعدِ زبان، لفظ کے صحیح اور فصیح استعمال، شاعری میں لفظ کے درست محل سے متعلق بحثیں ایک ہی عنوان کے تحت روا تھیں۔ چوں کہ یہ بحثیں کثیر اللسانی سیاق میں ہوئیں، اس لیے مشترک لفظوں کی دریافت ایک فطری رجحان تھا۔ اس رجحان کا بے مثال اظہار خان آرزو کے یہاں ہوا، جنھوں نے توافقِ لسانین کا تصور پیش کیا۔ ''و آن اشتراک یک لفظ است در دو زبان یا زیادہ مثلاً فارسی و عربی، فارسی یا عربی و ہندی۔''[۱] توافقِ لسانین اپنی اصل میں لغاتی تصور تھا نہ کہ لسانیاتی۔ جن مختلف زبانوں میں لفظی اشتراکات کی نشان دہی کی گئی، وہ عربی، فارسی، سنسکرت، اردو/ہندی یا دوسری ہندستانی زبانیں تھیں جن پر ہمارے لغت نگاروں کو قدرت

حاصل تھی۔ ان اشتراکات کی بنیاد بھی صرف ظاہری مماثلتوں پر تھی۔ صوتیاتی وصرفیاتی اصول نہ وضع کیے گئے تھے نہ ان کے پیش نظر تھے۔ خود کو لغاتی سیاق تک محدود رکھنے کی وجہ سے ہمارے بزرگوں نے مختلف زبانوں کے لفظی مشترکات کے ذریعے ان زبانوں کے ثقافتی و آثاریاتی مطالعے کی طرف توجہ نہ کی۔ گویا ان کے نزدیک لفظ ایک لغوی تشکیل تھا، لسانیاتی یا ثقافتی اوضاع کا حامل نہیں تھا۔ لفظ کی مجازی تشکیل کی بحثیں ضرور ہوئیں جو ایک طرح سے لغوی معنوی سیاق کی توسیع کا عمل تھا، تاہم توسیعِ معانی کے لسانی، نفسیاتی اور ثقافتی عوامل کی تلاش نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان زبانوں کے مابین بھی توافق دریافت کرنے سے ہچکچاتے نہیں تھے، جن کی نحوی ساخت، صوتیاتی ضابطے، صرفیاتی وضعیں بالکل مختلف ہوتی تھیں اور جن کی بنیاد پر زبانوں کے گروہ یا خاندان تشکیل دیے جاتے ہیں۔ جیسے وہ سامی خاندان کی عربی اور آریائی خاندان کی فارسی و ہندی میں اشتراکات دریافت کرتے تھے۔ آزاد اس روش کے ناقد ہیں۔

انیسویں صدی کے اوائل تک زبان کی ساخت اور تاریخ پر تھوڑی بہت جو توجہ دی گئی، وہ بھی مذکورہ لغاتی سیاق میں دی گئی۔ مثلاً انشا اردو کی ساخت یا اجزاے ترکیبی کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ ''اردو زبان کئی زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ جیسے عربی، فارسی، ترکی، پنجابی، پوربی اور برجی وغیرہ۔'' اس رائے کی دلیل میں وہ یہ عبارت لاتے ہیں:

> واللہ باللہ تمام شب باجی جان یہی کہتی تھیں کہ مجھے چھوٹے بھائی پر تیہا آتا ہے کہ ناحق ناحق تگا جی کو ساتھ لے کر پائندہ بیگ کھتے کے گھر دوڑ دوڑ کے جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس جھلے کی دوستی میں اپنا سر کٹوا دے۔ میں نے کہا کہ آپ کاہے کو کڑھتی ہیں۔ اس لڑکے کا اللہ بیلی ہے، پائندہ بیگ کیا ہے؟

عبارت کے تجزیے میں فرماتے ہیں کہ واللہ باللہ عربی ہے، تمام شب فارسی ہے، باجی جو بہن کے لیے آتا ہے ترکی ہے، کھبا بمعنی چپ، بایاں ہے تو پنجابی لیکن اردو میں یہ لفظ اکیلا ہی استعمال ہوتا ہے جب کہ آدمی محذوف ہے۔ بیلی بمعنی نگہبان بھی پنجابی ہے، تگا دایہ کے شوہر کو کہتے ہیں۔ یہ ترکی لفظ، اتکہ، سے بگڑا ہوا ہے، کاہے کو جس کے معنی ہیں کیوں، کس واسطے یہ برج کی بولی ہے...... پنکھ بمعنی پر اردو نہیں، پوربی ہے۔ (۲)

اس طور یہ ثابت کرنے کی کوشش ہوئی کہ اردو کا مایہ خمیر مختلف زبانوں کی لفظیات سے تیار ہوا ہے، یا اردو ایک ملواں زبان ہے۔ (۳) اردو کی اصل اور اس کے ارتقا سے متعلق یہ ایک سادہ اور اسی قدر ناقص تصور تھا، جس کی بازگشت آج بھی کہیں نہ کہیں سنائی دیتی ہے۔ خصوصاً لسانی فرقہ واریت کے ماحول میں اس تصور کو زور وشور سے پیش کیا جاتا اور اردو کو برصغیر کی مختلف زبانوں اور ثقافتوں کے مابین ایک تہذیبی پل کے طور پر سامنے لایا جاتا ہے۔ یہ سب بجا، مگر دنیا کی کسی زبان کی اصل کا فیصلہ اس کی لغت سے نہیں، اس کی نحوی ساخت سے ہوتا ہے۔ ہمارے بزرگوں کو قواعد سے غیر معمولی دل چسپی تھی اور وہ عربی، فارسی، اردو/ہندی/ہندوی/ریختہ کی صرف ونحو کو موضوع بھی بناتے تھے، مختلف زبانوں کی قواعد کا فرق بھی پیش نظر رہتا تھا، مگر ان کا تقابل اس انداز میں نہیں کرتے تھے کہ نحوی اشتراکات واختلافات

سامنے آتے اور ان کی بنیاد پر زبانوں کی اصل و تاریخ کا علم وجود میں آتا۔ آزاد کے سامنے یہ لسانی تصورات موجود تھے، اور بعض مقامات پر آزاد نے ان سب سے اکتساب بھی کیا ہے، مثلاً خان آرزو کی طرح فارسی (قدیم فارسی) اور سنسکرت کو متحد الاصل قرار دیا ہے۔ آب حیات میں انشا اور مظہر جان جاناں کی گفتگو دریائے لطافت سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح سخندان فارس میں آزاد نے سنگترہ کو رنگترہ اور بلبل کو گلدم قرار دینے کی جو مثالیں درج کی ہیں، وہ دریائے لطافت میں بھی ملتی ہیں، نیز آزاد نے فارسی میں جامع القواعد اور اردو میں قواعد صرف و نحو، درسی مقاصد کے لیے روایتی انداز میں تصنیف کیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس روایت سے آزاد کا اکتساب اس قدر جزوی اور محدود ہے کہ انھیں اس روایت کا نمایندہ اور تسلسل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آزاد انیسویں صدی کی تقابلی و تاریخی لسانیات یا فلالوجی کی یورپی روایت کے خوشہ چیں تھے۔ ان کے لسانی تصورات کا ماخذ، اُن یورپی لسانی نظریات اور تحقیقات میں ہے، جو نوآبادیاتی عہد میں نوآبادیاتی ضرورتوں کے تحت کی جارہی تھیں۔ لہٰذا آزاد کی لسانی خدمات کا اصل سیاق، مشرقی نہیں، یورپی لسانی روایت ہے۔ یہاں دیکھنے کی بات یہ بھی کہ آزاد جب مشرقی روایت سے جزوی استفادہ کرتے ہیں تو کیا اس کا باعث اس روایت کے معاصر عہد میں غیر موزوں یا محدود سطح پر کارآمد ہونے کا احساس ہے اور اسی کے ساتھ جب وہ یورپی روایت کی ممکنہ حد تک تقلید کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے؟ ان کے لسانی تصورات آمیزش، تناؤ، تقابل، کسے پیش کرتے ہیں۔؟ ـــــ اصل یہ ہے کہ آزاد کے یہاں دو روایتوں اور ثقافتوں کے درمیان تناؤ اور تقابل، واضح صورت میں کہیں بھی موجود نہیں، البتہ آمیزش ضرور موجود ہے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ ان کے یہاں دست یاب مشرقی لسانی تصورات محدود سطح ہی پر کارآمد ہیں۔ علاوہ ازیں آزاد دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ ''یہی وہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مغرب و مشرق کا سنگم قائم ہوا۔ ایک ہی چھت کے نیچے، ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔''[۴] تاہم واضح رہے کہ اس سنگم کی نوعیت مکالمے کی نہیں، استفادے کی تھی: مشرقی و مغربی علوم برابر سطحوں پر روبرو اور ایک دوسرے پر یکساں انداز میں اثر ڈالنے کے عالم میں نہیں تھے۔ اردو زبان تراجم کے ذریعے یورپی علوم سے استفادہ کر رہی تھی اور ظاہر ہے استفادہ ممکن ہی اس وقت تھا، جب ایک طرف ان علوم کی اہمیت روشن ہو اور دوسری طرف ان کی طلب موجود ہو۔ اس طلب کا باقاعدہ اظہار دہلی کالج کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے ذریعے ہوا، جس نے دہلی کالج کے طالب علموں کے لیے ممکن بنایا کہ وہ ''ادب کے احیا اور ترقی'' اور ''سائنس کے علم کے فروغ'' دونوں میں شریک ہوں، دونوں کے مقاصد میں کسی ظاہری آویزش کے بغیر![۵] آزاد نے دہلی کالج سے استفادے کی وہ صورت سیکھی، جسے ہومی بھابھا کی اصطلاح میں نقل (mimicry) کہنا چاہیے۔ اسے ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات نے مزید پختہ کیا، جن میں تمام ہندستانیوں کے لیے بالعموم اور آزاد کے لیے بالخصوص فیصلے اور اختیار کی آزادی کو نہایت محدود کر دیا تھا۔

آزاد کے لسانی تصورات کا اظہار اوّل ان کے لیکچروں میں ہوا۔ یہ لیکچر انجمن پنجاب اور سنٹرل ٹریننگ کالج میں دیے گئے۔ آزاد جولائی ۱۸۶۷ء میں انجمن پنجاب میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ جولائی ہی میں انھوں نے پہلا لیکچر زبان اردو کی تاریخ اور نشوونما اور دوسرا لیکچر اصلیت زبان اردو پر دیا۔ (۶) اسے ترمیم و اضافے کے ساتھ آب حیات کے ابتدائی حصے کے طور پر شائع کیا گیا۔ جب کہ فلالوجی، فارسی و سنسکرت کے اشتراکات اور فارسی کی تاریخ سے متعلق لیکچر سنٹرل ٹریننگ کالج میں دیے گئے، جنھیں بعد میں سخندان فارس میں یک جا کیا گیا۔ لہٰذا آزاد کے لسانی تصورات ان درسی اور تعلیمی ضروریات کے تحت وضع اور ظاہر ہوئے، جن کا تعین سررشتہ تعلیم پنجاب (جس کے منتظم اعلیٰ کرنل ہالرائیڈ تھے) نے کیا تھا۔ ہر چند آزاد نے لکھا ہے کہ انھیں ''لسانی تحقیقات کا شوق نہیں، جنون تھا اور وہ لڑکپن میں بھی لفظوں کے حروف کو ہیر پھیر، ادل بدل کر فارسی اور سنسکرت کے لفظوں کو ملایا کرتے تھے''۔ (۷) لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر تقابل الفاظ کا یہ جنون معاصر تعلیمی ضرورتوں کے تابع نہ ہوتا تو خانِ آرزو کی وحدتِ لسانین کی اس روایت کا حصہ بن کر رہ جاتا، جس کی کارفرمائی لغات واشتقاق تک محدود تھی۔

انجمن برائے اشاعتِ مطالب مفیدہ پنجاب سرکار کے ایما پر بنائی گئی تھی (۸) گورنر پنجاب کے میر منشی اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، پنڈت من پھول نے ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو جب سکشا سبھا کے مکان پر اس کے پہلے جلسے کا اہتمام کیا؛ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر کو انجمن کا صدر منتخب کیا اور ممبران میں سرکاری عہدے داروں، رؤسا اور جاگیرداروں کو شامل کیا اور ۲۴ مارچ ۱۸۷۵ء کے جلسے میں جب ڈاکٹر لائنٹر نے اعلان کیا کہ نواب گورنر پنجاب نے اس انجمن کے قیام کی خبر سن کر خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے اور خواہش ظاہر کی ہے کہ اس انجمن کے مفصل حالات لکھ کر ان کو بھیجے جائیں۔ (۹) تو یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ کن مطالب مفیدہ کی سرکاری سرپرستی میں اشاعت مقصود ہے؟ انجمن کے اعلان کردہ مقاصد میں ''قدیم مشرقی علوم کا احیا اور لسانیات، بشریات، تاریخ اور ہندوستان اور ہمسایہ ملکوں کے آثار قدیمہ کے بارے میں تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی اور دیسی زبانوں کے ذریعے عوام میں تعلیم کا فروغ''، (۱۰) مرکزی اہمیت کے حامل تھے۔ گویا قدیم مشرقی علوم اور دیسی زبانوں کے ذریعے تعلیم ہی مطالب مفیدہ تھے۔ انجمن پنجاب ان مطالب / علوم کی اشاعت و فروغ کے لیے ''آئیڈیالوجیکل سٹیٹ آپریٹس'' تھی۔ انجمن کی فکری جہت علوم شرقیہ (اورینٹل لرننگ) کی اس تحریک کے ہاتھوں متعین ہوئی تھی، جسے برطانوی مستشرقین، انتظامی افسروں اور برطانوی جامعات (خصوصاً آکسفرڈ) کے اساتذہ نے شروع کیا تھا۔ برطانوی انتظامی، علمی، تعلیمی اداروں میں یہ اشتراک عمل، علم اور طاقت کے اس اٹوٹ رشتے کا نتیجہ تھا جو نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ کے استعمار پسند ذہن نے وضع کیا تھا۔ علوم شرقیہ کی تحریک نے اپنے خط وخال مشرقی لسانی مطالعات سے اخذ کیے تھے۔ علومِ مشرقیہ اپنی بنیاد اور اثر و عمل میں ایک کلامیہ (ڈسکورس) تھا: مشرق و یورپ کی اس ثنویت پر استوار تھا، جس میں مشرق ابدی، ہم رنگ اور خود کو واضح کرنے

کی اہلیت سے محروم تھا[۱۱] اور یورپ یہ ذمے داری اپنے سر لیتا ہے کہ وہ اپنی اصطلاحوں میں مشرق کی وضاحت کرے؛ مشرق کا علم پیدا کرے۔ لہٰذا مشرقی لسانی مطالعات ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی کی یورپی اصطلاحوں میں کیے گئے مطالعات ہیں۔

علوم شرقیہ کی تحریک / کلامیے کے بانی ولیم جونز نے جب سنسکرت کا مطالعہ کیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ زبان ''یونانی سے زیادہ مکمل، لاطینی سے بڑھ کر کثیر العلوم اور ان دونوں سے زیادہ شستہ ہے۔'' مگر اس کے باوجود وہ اسے یورپ کی کلاسکی زبانوں سے قدیم اور ان کی ماں تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوا۔ لہٰذا وہ اسی سانس میں کہتا ہے کہ ''بلاشبہ تاریخ زبان کا کوئی عالم اس یقین کے بغیر تینوں زبانوں کا تجزیہ نہیں کرسکتا کہ تینوں اسی ایک ماخذ سے نکلی ہیں جو شاید اب موجود نہیں''۔[۱۲] ولیم جونز کا یہی وہ یقین تھا جو اگلی صدی کے یورپی ماہرین السنہ اور مستشرقین کی ایک خاص جہت میں لسانی تحقیقات کا محرک بنا۔ وہ اس اصل کی تلاش میں سرگرداں رہے، جو شاید موجود نہیں تھی، مگر یہی وہ گم شدہ اصل تھی جس میں لسانی اسطورسازی کا بے پایاں امکان اور امکان کو مجسم کرنے کا جواز موجود تھا۔ اس گم شدہ اصل کو خالص اسطوری انداز میں ''آریائی'' قرار دیا گیا۔ یہ الگ شناخت کی حامل زبان نہیں، یورپ اور ایشیا کی زبانوں کا خاندان تھا؛ اس خاندان کا ایک جدامجد تھا جو اپنی اولاد کی صورت میں اپنے موجود ہونے کا اسطوری انداز میں اعلان کرتا تھا۔ آریائی لسانی خاندان کو ''ان تمام اعلا صفات سے متصف کیا گیا جو تاریخ کے تحرک کو ممکن بناتی ہیں: متخیلہ، استدلال، سائنس، فنون، سیاست''۔[۱۳] واضح رہے کہ یورپ و ایشیا کی کلاسکی زبانوں: سنسکرت، قدیم فارسی، یونانی، لاطینی کے باہمی رشتوں کی دریافت، تقابلی لسانیات کی تاریخ کا اہم واقعہ تھا، مگر آریائی خاندان کا تصور اور اس سے وابستہ کی جانے والی صفات نوآبادیاتی تاریخ کی ثقافتی حکمت عملی کا مظہر تھیں۔ دوسرے لفظوں میں شرق شناسی میں سائنسی علم اور ثقافتی تدبیریں ایک دوسرے میں مدغم تھیں۔ نوآبادیاتی ثقافتی حکمتِ عملی، یورپی نسلی و فکری مرکزیت باور کرانے سے عبارت تھی۔ ہیگل جیسا عظیم فلسفی رائے رکھتا تھا کہ آفاقی تاریخ کا نقطۂ آخر مطلقاً یورپ ہے اور ایشیا تاریخ کا محض آغاز ہے جہاں تاریخ کا سفر جلد ہی تھم گیا۔ یہ رائے قائم کرنے کے بعد وہ ایشیائیوں سے ہم دردی جتاتے ہوئے کہتا ہے کہ برطانیہ یا ایسٹ انڈیا کمپنی ہی ہندوستان کی آقا ہے، کیوں کہ ایشیائی سلطنتوں کی حتمی تقدیر یہی ہے کہ وہ یورپیوں کی غلامی میں آجائیں[۱۴] قصہ مختصر آریائی ایک نسلی تصور تھا، جس پر یورپ کے نسلی تفاخر اور تاریخ پر اس کے اجارے کا اعتقاد چسپاں تھا۔

مشرقی زبانیں، مشرق پر دست رس کا ذریعہ سمجھی گئیں۔ ایک طرف ان زبانوں کے ذریعے مشرق کو جاننے، ان کی تاریخ کا علم حاصل کرنے، ان کی ثقافت کی تھاہ پانے کی کوشش کی گئی اور یہ کوشش اس اعتقاد کی بنیاد پر تھی کہ ''زبان ہی ہندستان کی سیاہ فام اقوام اور ان کے پرانے نئے فاتحین (سکندر یا کلائیو) کے درمیان رشتوں کے

سراغ کی سب سے معتبر شہادت مہیا کرتی ہے"[۱۵] اور دوسری طرف مشرق کی نئی، یورپی نقطۂ نظر سے تاریخ کی تشکیل بھی انھی زبانوں کے علم کے ذریعے کی گئی۔ یورپی آبادکاروں، مشنریوں اور مستشرقین کے یہاں، کہیں نہ کہیں یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ یورپ کے بے محابا ثقافتی اثرات کے ردِ عمل میں ایشیائی (اور افریقی بھی) اپنی اصل کی طرف رجوع نہ کرنے لگیں، اپنی اصل کی تاریخ خود اپنے قلم اور اپنے زاویے سے نہ لکھنے لگیں اور مقامی لوگوں کے یہ مستند متون نوآبادیاتی ثقافت کے اجارے کے عمل کو زک نہ پہنچائیں۔ اس اندیشے کے ٹالنے کی موزوں ترین صورت یہ تھی کہ اہل یورپ، مشرق کی زبانوں، ان کی تاریخ و ثقافت کے علم کی تشکیل کریں اور اس کی اشاعت کریں۔ اس ضمن میں عیسائی مشنری ولیم کیری نے بہ طور خاص کوششیں کیں اور تمام مستشرقین کی مساعی کا اہم محرک یہی اندیشہ تھا۔

برطانوی انتظامی افسروں اور مستشرقین کو اس اعتراف میں تامل نہیں تھا کہ وہ ایشیائی اقوام کی لسانی و ثقافتی تاریخ کی تشکیل کے ذریعے ان کی تاریخ و ثقافت میں مداخلت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس اقبال کے باوجود وہ مداخلت ترک کرنے پر تیار تھے۔ ان مقاصد سے دست کش ہونے پر، جو مداخلت کے ذریعے انھیں حاصل ہو رہے تھے۔ چارلس ٹریویلین نے لکھا ہے:

> ہم نہیں کہہ سکتے کہ مغربی قوموں کی مشرقی معاملات میں یہ غیر معمولی مداخلت کب اور کہاں ہمیں پہنچائے گی اور میں ہندستان کے اپنے تجربے سے یہ جانتا ہوں کہ مقامی زبان کا علم، مقامی نسلوں کو سمجھنے اور ان میں دل چسپی لینے کے لیے ابتداً ناگزیر ہے، نیز ان کا خلوص جیتنے اور ان پر برتری حاصل کرنے کے لیے۔[۱۶]

اس طور علوم شرقیہ، ایک تیر سے کئی شکار کرنے کی تحریک تھی!

اورینٹل لرننگ [illegible] شرقیہ کی تحریک، ۱۸۵۰ء کی دہائی میں دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ پہلا مرحلہ کلاسیکی مشرقی مطالعات [illegible] تھا، جس کا مرکز کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی تھی۔ دوسرا مرحلہ ورنیکلر یا دیسی زبانوں کی تحقیق تھی جس پر توجہ فورٹ ولیم کالج میں ہوئی تھی۔ سوسائٹی اور کالج سے وابستہ مستشرقین میں اختلاف رائے تھا: سوسائٹی کلاسیکی مشرقی زبانوں کو اور کالج دیسی زبانوں کو اہمیت دیتا تھا۔ یہ اختلاف رائے مقصد پر نہیں، مقصد کے حصول کے ذریعے پر تھا۔ دونوں کا مقصد مشرق کا ایسا علم حاصل کرنا تھا جسے یورپ کی طاقت میں تبدیل کیا جا سکے۔ دونوں مشرق کا تصور 'زبان' کے طور پر کرتے تھے، تاہم سوسائٹی کے نزدیک مشرق سے مراد اس کی کلاسیکی زبانیں تھیں اور کالج کے نزدیک دیسی زبانوں کو خارج کر کے مشرق کا ادھورا اور ناقص تصور مرتب ہوتا تھا۔ بہ ہر کیف اس اختلاف کے باوجود انیسویں صدی کے پہلے نصف تک کلاسیکی و دیسی، دونوں قسم کی زبانوں کی تحقیقات جاری رہیں۔ فلالوجی ترقی کرتی رہی۔ ۱۸۵۰ء کی دہائی میں فلالوجی کی جگہ اورینٹل لرننگ کی اصطلاح نے لے لی۔ یہ تبدیلی دراصل لسانی مطالعات کی اصل جہت کو نمایاں کرنے کی غرض سے تھی۔

اورینٹل لرننگ کی تحریک چلانے میں میکس مولر پیش پیش تھا۔ اس نے حکومت پر زور دیا کہ آکسفرڈ یونیورسٹی میں اورینٹل لرننگ کو سائنسی مطالعات جیسی اہمیت دی جائے۔ اس نے حکومت کو قائل کرنے کے لیے فرانس، روس، ویانا، ڈنمارک، پروشیا کے اورینٹل فلالوجی اور اورینٹل سیمنری کی مثالیں دیں، جہاں ہندستانی، فارسی، عربی، آرمینی، چینی، ترکی زبانوں کی تدریس وتحقیق کے لیے ممتاز پروفیسر خدمات انجام دے رہے تھے۔ مولر نے واضح کیا کہ ان ممالک کے مقابلے میں انگلستان کے عملی مفادات مشرق سے زیادہ متعلق ہیں، جہاں فقط ہیلی بری کالج ہے، جس کی سرپرستی ایسٹ انڈیا کمپنی کرتی ہے (اور وہ محدود مفادات سامنے رکھتی ہے) لہٰذا یہ صحیح وقت ہے، انگلستان میں جامعاتی سطح پر مشرقی زبانوں کے مطالعات کا۔ میکس مولر کے نزدیک 'اورینٹل سکالر' 'سائنسی سکالر' سے کسی طرح کم نہیں اور وہ برطانوی حکومت کے لیے مفید خدمات انجام دیتا (خصوصاً ہندستان آنے والے یورپی منصفوں کے لیے) ہے اور نسل انسانی کی صلاحیتوں اور قسمتوں سے متعلق خیالات کو وسیع کرتا ہے۔ [۱۷]

میکس مولر کے خیالات کو ۱۸۷۴ء کی پارلیمانی رپورٹ کے ساتھ ملا کر پڑھیے، جو لائٹنر کی مشرقی زبانوں کی سرپرستی اور پنجاب میں اورینٹل یورنیورسٹی کے قیام سے متعلق تھی۔ رپورٹ کا مندرجہ ذیل اقتباس اورینٹل لرننگ کی حقیقی جہت کا انکشاف کرتا ہے:

> اسے [اورینٹل یونیورسٹی] ان تمام موضوعات پر بحث مباحثے کا مرکز بھی ہونا تھا جو تعلیم کے دائرے میں آتے ہیں اور آخر میں، ہم یورپیوں کے لیے جو خصوصی دل چسپی کا معاملہ ہے، اسے آثاریاتی اور فلسفیانہ تحقیقات کے فروغ واشاعت کی اکادمی بننا تھا اور یورپی مستشرقین کا ہاتھ بٹانا تھا۔ مقامی سطح پر تحقیق کر کے ان [یورپیوں] کے مطالعات کو آگے بڑھانا تھا۔ علاوہ ازیں یورپی اورینٹل لرننگ کو مقبول بنا کے یہ خود بھی استفادہ کرتی اور اس کے تنقیدی طریق کار کے طور پر مقامی زعما کی ادبی سرگرمیوں پر اثر انداز بھی ہوتی۔ [۱۸]

ان حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوگا کہ علوم شرقیہ کی تحریک دراصل مشرق کا یورپی علم تشکیل دینے اور اس کی مشرق میں اشاعت تھی۔ اس کی بنیاد میں یورپ کا یہ زعم پوری شدت سے کارفرما تھا کہ مشرق کا علمی بیانیہ وضع کرنے کی ذے داری اس کے کاندھوں پر ہے۔ یہ زعم، مشرق/ایشیا کی خود سے لاتعلقی اور یورپ کی مشرق سے ہم دردی کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ مشرق پر استناد واقتدار کے حصول اور مشرق ہی سے اپنے استناد اور اتھارٹی کو باور کرانے کی غرض سے تھا۔

علوم شرقیہ، مشرق کے یورپی علم کو مشرق میں فروغ دینے کی ''موزوں ترین'' حکمت عملی وہی تھی جسے نو آبادیاتی نظام میں عموماً اختیار کیا گیا۔ سرایڈورڈ کسٹ نے اسے واشگاف انداز میں پیش کیا ہے۔ ''لگتا ہے نو آبادیاتی حکمت عملی کے ہمارے نظام میں ایک بنیادی اصول کو فراموش یا نظر انداز کیا گیا ہے، یعنی نو آبادیاتی انحصار۔ کسی نو آبادی

کوخود انحصاری کی صورتوں سے ہمکنار کرنا، مضحکہ خیز بات ہے! وہ ایک گھنٹے کے لیے نو آبادی نہیں ہوگی اگر وہ ایک آزاد علاقے کے طور پر خود کو قائم رکھ سکے۔"[۱۹] لہٰذا علوم شرقیہ کو ایشیا میں فروغ دینے کا مطلب ایشیائیوں کو خود اپنے علم کے ضمن میں خود کفیل بنانا نہیں تھا۔ یورپیوں کا مدعا یہ کبھی نہیں رہا کہ مشرق کے علوم کی تخلیق میں خود مشرق کو مساویانہ طور پر شریک کیا جائے۔ یہ مدعا ان کے نو آبادیاتی نظام کی اس روح سے بری طرح متصادم تھا، جو یورپ اور ایشیا میں تفریق کو برقرار رکھنے میں سرگرم رہتی تھی۔ اسی تفریق کے ذریعے یورپ مشرقی امور پر مشرق کے لیے اتھارٹی بنتا تھا۔ یہ سمجھنا سادہ لوحی ہوگی کہ یہ تفریق فقط سیاسی تھی۔ یہ علمی، علمیاتی، لسانی، ثقافتی، تعلیمی، غرض کئی میدانوں میں موجود تھی۔ اسے گہرا کرنے کی بھی برابر کوشش ہوتی تھی۔ علوم شرقیہ کی تحریک نے جب مشرق سے متعلق جدید سائنسی انداز میں تحقیقات کا بڑا ذخیرہ پیدا کر لیا تو نہ صرف یورپ و ایشیا کی تفریق گہری ہوگئی بلکہ اس نے ایشیا کے یورپ پر انحصار کو بھی بڑھا دیا۔ چناں چہ یہ کہنا غلط نہیں کہ اس تفریق کے خاتمے کا مطلب نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ تھا۔

یہ وہ سیاق تھا جس میں آزاد کے لسانی تصورات وضع اور ظاہر ہوئے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آزاد اس سیاق یا علوم شرقیہ کی تحریک کی نو آبادیاتی جہات سے پوری طرح واقف تھے۔ اگرچہ آزاد اپنے یورپی مربیوں کی دو چہرگی سے لاعلم نہیں تھے۔ سیر ایران میں ڈاکٹر لائٹنر کا نام لیے بغیر لکھا ہے کہ "ایک صاحب جو دیسے دیسی لوگوں کی خیر خواہی کا دام بچھائے رہے ہیں اور حقیقت میں ماہیان شب گوں کے شکاری۔ دوست بن کر دشمنی کرنے والے ہیں۔"[۲۰] مگر آزاد کا یہ علم یہاں اس لیے قابل لحاظ نہیں کہ یہ مشرق کے یورپی علم سے آزاد کے تعلق پر اثر انداز نہیں ہوتا، جس کا تعین بھی علوم شرقیہ کی تحریک نے کیا تھا۔

علم کی تخلیق میں دیسی لوگوں کی مساویانہ شرکت کو ممکن بنانے کی بجائے انھیں انحصار و استفادے تک محدود رکھنا، علومِ شرقیہ کی تحریک کا اہم مقصد تھا۔ ویسے کسی بھی سطح پر مساویانہ شرکت کا تصور نو آبادیاتی نظام کی "روح" کے خلاف تھا۔ علم کی تخلیق میں مساویانہ شرکت کا مطلب، خود اس علم کی نوعیت، نہج اور مقصد پر سوال قائم کرنے کا حق دینا ہوتا۔ انحصار و استفادے کی صورت میں، سوال قائم کرنے کی اگر گنجایش ہوتی بھی ہے تو اس علم کی نوعیت و مقصد پر نہیں، اس کی تفہیم کے ضمن میں ہوتی ہے۔ آزاد نے کسی حد تک اپنے ذاتی حالات (خصوصاً ۱۸۵۷ء میں ان کے خاندان کے ماخوذ ہونے اور نتیجتاً در بہ در ہونے؛ مجبوراً وسط ایشیا کی سیاحت کے نام پر انگریز حکومت کے لیے جاسوسی کرنے) کی وجہ سے اور زیادہ تر اس عہد کی غالب آئیڈیالوجیکل صورت حال کے سبب علوم شرقیہ کی یورپی تحریک کی اردو میں مقبولیت کے لیے کوششیں کیں۔

آزاد کے لسانی تصورات، ان کی لسانی تحقیقات کا نتیجہ نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد انیسویں صدی کے تحقیقی معیارات کی رو سے بھی لسانی محقق نہیں تھے۔ انیسویں صدی کی فلالوجی یا تقابلی و تاریخی لسانیات، دنیا کی مختلف

زبانوں میں فرق ومماثلت دریافت کرنے سے عبارت تھی۔مماثل زبانوں کوایک خاندان میں یک جا کر دیا جاتا۔فرق ومماثلت دریافت کرنے کے تین اصولوں کو مدنظر رکھا جاتا: یک ہجائی (Monsoyllabic)،تصریف بغیر تالیف کے (Agglutination) اور تصریف (Inflection)۔[۲۱] آزاد نے ان اصولوں کی بنیاد پر یورپ،ایشیا،افریقا وغیرہ کی زبانوں پر تحقیق نہیں کی،تاہم آزاد یورپی لسانی تحقیقات سے استفادہ کرنے اور انھیں اردو میں متعارف کروانے کے لیے سرگرم ضرور رہے۔

اگر آزاد کے پیش کردہ لسانی تصورات کا مطالعہ،ان تصورات کے ماخذ یا انیسویں صدی کی یورپی فلالوجی کے متوازی کیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ آزاد یورپی فلالوجی کی علمیات میں شریک تھے نہ فلالوجی کی پوری روایت سے آگاہی کے لیے کوشاں تھے۔انھوں نے اس کے بعض حصوں کو اردو میں منتقل کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔یہ طے کرنا مشکل ہے کہ انیسویں صدی کی تقابلی لسانیات کے جن مخصوص حصوں کو اردو میں پیش کیا،ان کا انتخاب آزاد نے ایک آزاد تنقیدی ذہن کے ساتھ کیا یا جو کچھ دست یاب ہوا،اسے لے لیا یا اس ضمن میں اپنی افتادِ طبع کو راہ نما بنایا،مگر یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ آزاد کے پیش کردہ لسانی تصورات، یورپی فلالوجی کی مضحک نقل (Mimicry) ہیں۔تاہم واضح رہے کہ اس مفہوم میں مضحک نقل نہیں کہ آزاد یورپی لسانی نظریات کا مضحکہ اڑاتے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد سنجیدگی سے ان نظریات سے استفادہ کرتے ہیں،مگر یہ استفادہ اس قدر براہ راست،محدود،مقلدانہ اور غیر تنقیدی ہوتا ہے کہ یہ مضحک صورت اختیار کر جاتا ہے۔

ہومی بھابھا کے مطابق نوآبادیاتی معاشروں میں مضحک نقل،ایک طنز آمیز سمجھوتہ ہے، یہ ایک ایسا کلامیہ ہے جو دو جذبی رجحان (ambivalence) کے گرد تشکیل دیا جاتا ہے۔[۲۲] دوسرے لفظوں میں دیسی باشندوں کے یہاں اپنے نوآبادیاتی آقاؤں کے علم کے سلسلے میں طلب اور تردید کے متصادم جذبات موجود ہوتے ہیں اور یہی جذبات یورپی علم سے استفادے کو مضحک بنا دیتے ہیں۔ممکن ہے،آزاد کے پیش کردہ لسانی تصورات کو،انیسویں صدی کی یورپی فلالوجی کے متوازی رکھنا اور ان پر ایک تقابلی نگاہ ڈالنا قرین انصاف نہ لگے کہ آزاد کو یورپی مفکروں کی طرح لسانی تحقیق کی باقاعدہ روایت ورثے میں نہیں ملی تھی،مگر ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے تاکہ مشرق کے یورپی علم کی اردو میں اشاعت کے پیچیدہ عمل کو سمجھا جا سکے۔

آزاد کی فلالوجی سے دل چسپی کا ایک سبب اور محرک یہ ہے کہ ''ایشیائی زبانوں میں تحقیقاتِ فلالوجی کا ابھی تک رواج نہیں ہوا''۔انھوں نے اسے رواج دینے پر کمر باندھی۔انھیں اس اعتراف میں تامل نہیں کہ فلالوجیا سے متعلق اب جو کچھ ہے،انگریزی میں ہے اور انگریزی کے مصنف (فلالوجسٹ) کئی کئی زبانوں کے ماہر ہوتے ہیں۔ یہاں ان طرفوں میں اندھیرا ہے۔[۲۳] یہ اعتراف آزاد کے پیش کردہ لسانی تصورات کے حدود بھی واضح کر دیتا ہے۔

آزاد انگریزی اور مشرقی کلاسکی زبانوں کا علم رکھتے تھے، اس لیے وہ سنسکرت اور فارسی لفظوں کی چقماق ہی سے آگ نکالتے ہیں۔ اس بنا پر یورپی لسانی تحقیقات (مثلاً ولیم جونز، میکس مولر، فرانز بوپ، جیکب گرم وغیرہ کی تحقیقات) اور سخندانِ فارس میں ایک ایسی تفریق پیدا ہوتی ہے جو علم کی بڑے پیانے پر تخلیق اور علم سے محدود پیانے پر استفادے کی ''مضحک صورت'' ہی کو نمایاں کرتی ہے۔

آزاد فلالوجیا کی یہ تعریف کرتے ہیں:

> فلسفی لفظ کے جز جز کو الگ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وقت بوقت ان کی اصل کس کس ملک اور کس قوم میں پہنچتی آئی ہے۔ ان میں کیا رشتے ہیں؟ اور وہ کیوں کہ پیدا ہوئے ہیں اور ملک بملک ان کے معنوں یا حرفوں میں کیا تغیر پیدا ہوئے ہیں۔ پھر اور زبانوں کے لحاظ سے اپنی باتوں پر غور کرتا ہے۔ ان کے نتائج کو بھی جانچتا ہے اور مطابقت اور مقابلہ کرتا ہے ...... پھر ان سببوں کی جستجو کرتا ہے جو زبان میں تبدیلی کا عمل کر رہے ہیں۔ (۲۴)

آزاد نے فلالوجی یا تاریخی وتقابلی لسانیات کے اس مفہوم کی سادہ شرح کردی ہے جو ولیم جونز، میکس مولر، فرانز بوپ، جیکب گرم وغیرہ کے یہاں پیش کیا جا رہا تھا۔ یورپی ماہرین کے یہاں فلالوجی کے جو ''بلند'' اور ''وسیع'' مقاصد تھے، نیز ان کے جو سیاسی اور ثقافتی مضمرات تھے، ان کی طرف اشارہ تک آزاد کے یہاں موجود نہیں۔ مثلاً میکس مولر کے نزدیک فلالوجی اپنے بلند ترین مفہوم میں ایک ہی مقصد رکھتی ہے: آدمی کیا ہے، اسے آدمی کیا رہا ہے، کے ذریعے سمجھنا (۲۵) گویا فلالوجی کا سب سے بڑا مقصد آدمی کو سمجھنا ہے؛ زبان آدمی کے سمجھنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے؛ مطالعہ زبان، مطالعہ انسان ہے۔ زبان کو انسان شناسی کا سب سے معتبر ذریعہ قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس عہد میں زبان کا تاریخی وارتقائی مطالعہ کیا جا رہا تھا اور مختلف قوموں کے تہذیبی روابط کو لسانی اشتراکات کے ذریعے سمجھا جا رہا تھا۔ دوسری طرف میکس مولر اور ان کے معاصرین کے یہاں انسان کا تصور فلسفیانہ نہیں، تاریخی، سیاسی، مذہبی اور نسلی تصور تھا۔ زبان کہیں تو تصورِ انسان کی تشکیل کا ذریعہ تھی اور کہیں اس تصور کی توثیق وتائید کا وسیلہ تھی ــــ میکس مولر فلالوجی کے جس بلند ترین مفہوم کا اعلان کرتا ہے، اسے جب سنسکرت فلالوجی پر منطبق کرتا ہے تو کہتا ہے کہ اس کا مقصد نوعِ انسان کی تاریخ کے انتہائی اہم اور ابتدائی رشتوں کا علم حاصل کرنا ہے اور نوعِ انسان سے مراد آریائی انسان ہے۔ وہ سنسکرت فلالوجی کے ذریعے قدیم ہندستان کی عظمت کا جو قصیدہ لکھتا ہے، وہ آریائی نسل کی برتری کے کھلے اعتراف کی شکل اختیار کر لیتا ہے، ''ہندستان کے برہمن آریائی یا ہند یورپی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے پورے یورپ کو مہذب بنایا۔'' (۲۶) چناں چہ فلالوجی فقط زبانوں کی تاریخ وارتقا کی تحقیق نہیں کرتی تھی، یورپ سے متعلق تاریخی ونسلی کلامیہ بھی تشکیل دیتی تھی۔

یہ اتفاقی بات ہے یا ارادی، اس کا فیصلہ مشکل ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ آزاد فلالوجی کے ذریعے تشکیل کردہ ''آریائی کلامیے'' میں شریک ہیں اور ان کی شرکت کی صورت اس کلامیے کی تشکیل کے عمل میں نہیں، اس کی اشاعت میں ہے۔ گویا وہ اس کلامیے کے مرکز میں نہیں، حاشیے پر ہیں۔ وہ اس طاقت کی تخلیق اور اس پر اجارے میں شریک نہیں جو ہر کلامیے کا لازمی جزو ہوتی ہے، مگر وہ اس طاقت کے اظہار و عمل میں اپنے نوآبادیاتی آقاؤں کے معاون ضرور ہیں۔ آزاد کے یہاں آریائی نسل کی برتری کا احساس و اعتراف کئی جگہ ظاہر ہوا ہے، بالواسطہ اور براہ راست دونوں طرح سے۔ مثلاً آزاد نے انیسویں صدی کی لسانی گروہ بندی کے عین مطابق زبانوں کے تین خاندان بتائے ہیں: ایرین (ہندوستانی، ایرانی، یونانی، لاطینی، فرنچ، جرمن، روسی وغیرہ)۔ شیمٹک (عربی، عبرانی، کلدانی وغیرہ) اور تیورنین (تاتار، سیام، برما کھسیا، پیگو وغیرہ)(۲۷) مگر بحث کا موضوع فقط آریائی خاندان کی ذیلی شاخ ہندایرانی کو بنایا ہے۔ سامی لسانی خاندان کا ذکر تو کیا ہے لیکن اس کی وضاحت سے اجتناب کیا ہے۔ کیا اس لیے کہ عربی آریائی کلامیے کے بنیادی تصور اور مقصد سے غیر اہم آہنگ تھی؟ یہاں اس بات پر زور دینا مقصود نہیں کہ آزاد یورپی نوآبادیاتی فکر کو منفعل دیسی باشندے کے طور پر قبول کر رہے تھے یا نہیں، صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ انیسویں صدی کی یورپی نوآبادیاتی فکر کس نہج پر تشکیل پا رہی تھی اور کس طور پر ہندستان میں اشاعت پذیر ہو رہی تھی۔ انیسویں صدی میں غالباً یہ بات پوری طرح واضح نہیں تھی مگر اب واضح ہے کہ:

> اہل علم نے جب سامی اور ہند یورپی مطالعات کو شعبۂ علم (ڈسپلن) کے طور پر قائم کیا تو انھوں نے عبرانی اور آریا کی اسطوری صورتیں بھی ایجاد کیں، جو اس وجہ سے ''حسن اتفاق کی پیداوار جوڑا'' تھا کہ عیسائی مغرب کے لوگوں پر ان کی شناخت کا راز منکشف کرتا تھا۔ نیز انھیں اجازۂ تحفظ عطا کرتا تھا جو دنیا پر ان کے روحانی، مذہبی اور سیاسی غلبے کو جائز قرار دیتا تھا، تاہم اس جوڑے کے اجزا میں توازن قائم نہیں کیا گیا تھا۔ بلاشبہ عبرانی کے حق میں یہ بات جاتی تھی کہ وہ وحدانیت پسند تھی، مگر وہ خود میں مگن، جامد اور عیسائی اقدار اور سائنس و ثقافت میں ترقی، دونوں کے سلسلے میں سرکش تھی۔ دوسری طرف آریا کو ان تمام فضائل سے متصف کیا گیا جو تاریخ کی حرکیات کی رہبری کرتے تھے: تخیل، استدلال، سائنس، فنون، سیاست۔ (۲۸)

اس تناظر میں آزاد کا آریائی زبانوں کے بعض اشتراکات کا نحوی و معنیاتی مطالعہ اور ایرانی/ آریائی تاریخ کا مفصل مطالعہ خصوصی اہمیت اور خاص معنویت اختیار کر جاتا ہے اور اس معنویت میں اس وقت ایک نئی جہت پیدا ہو جاتی ہے، جب آزاد لفظ آریا کی وضاحت میں وہی تحسینی پیرایہ اختیار کرتے ہیں، جو ولیم جونز، میکس مولر(۲۹) اور دوسرے یورپی ماہرین السنہ کے یہاں ملتا ہے: ''جب یہ متبرک قوم ہندوستان میں پہنچی تو اس کی آبادی سے یہاں کا ملک ہماچل سے بندھیاچل تک آریہ ورت کہلاتا تھا۔ اس نے غیر قوموں سے امتیاز جتانے کو آرج اپنا نام رکھا اور غیر

قوموں کو انارج کہتے تھے۔ وہی آریا اوران آریا ہو گئے اور شاید اناڑی جو بمعنی نادان و بے ہنر و بے تمیز ہے وہ یہی ان آریا ہو۔ لطف یہ ہے کہ فارس کی کتب قدیم میں بھی ایرین یا ایران کے معنی شریف، دانا اور ہنرمند تھے۔ (۳۰) اس طور آزاد آریا کے نسلی تفاخر میں شریک نظر آتے ہیں (ممکن ہے اس میں کچھ حصہ آزاد کے ایرانی النسل ہونے کا بھی ہو!) اور اس تفاخر کی بنیاد کم و بیش وہی ہے، جسے اہل یورپ نے واضح کیا۔ کیا یہی تفاخر آزاد کو قدیم فارسی اور سنسکرت کے مشترک الفاظ کی تحقیق و تجزیے پر مائل کرتا اور سامی لسانی خاندان سے اغماض برتنے کی تحریک دیتا ہے اور وہ اپنی لسانی و ثقافتی شناخت کے لیے آریائی اسطورہ پر انحصار کرتے ہیں؟

انیسویں صدی کے یورپی تاریخی و ارتقائی مطالعات پر ڈارون کے نظریۂ ارتقا کا گہرا اثر تھا۔ ہر شے کی تاریخ کو زندہ انواع کے ارتقا کے مماثل سمجھا جا رہا تھا۔ طبعی اور سماجی مظاہر میں فرق نہیں کیا جا رہا تھا۔ ڈارون نے خود زبانوں اور انواع کے ارتقا کے یکساں ہونے کا تصور پیش کیا تھا۔ اس کے مطابق مختلف زبانوں اور متفرق انواع کی تشکیل...... حیرت انگیز طور پر یکساں ہے...... ہم مختلف زبانوں میں وہ مماثلتیں دیکھتے ہیں جو خاندان کی وجہ سے ہیں اور وہ مماثلتیں جو تشکیل کے یکساں عمل کی وجہ سے ہیں۔ (۳۱) زبانوں کو انواع پر قیاس کرنے کا یہ نتیجہ بھی نکلا کہ انواع کی طرح زبانوں کو بھی تنازع للبقا میں مبتلا دکھایا گیا اور زبانوں کی بقا و ترقی کے اسی اصول کو تسلیم کیا جانے لگا جو انواع کے ضمن میں ''بقائے بہترین'' کے نام سے پیش کیا گیا تھا۔

آزاد بھی زبانوں کی حیات و ممات پر لکھتے ہیں۔ ان کے یہاں زبان اور حیاتیات کی مماثلت (homology) کی بجائے، زبان اور تاریخ کی مماثلت ہے، گو تاریخ کا کم و بیش وہی تصور ہے جو ڈارون کے حیاتیاتی نظریات میں پیش کیا جا رہا تھا۔ آزاد زبانوں کی تاریخ کو قوموں کی تاریخ کے عین مماثل قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

......جس طرح قومیں بڑھیں، چڑھیں، ڈھلیں اور فنا ہو گئیں اور ہوں گی، اسی طرح زبانوں کا عالم ہے کہ اپنے الفاظ کے ساتھ آیا ہے۔ وہ اور اس کے الفاظ پیدا ہوتے ہیں، ملک سے ملک میں سفر کرتے ہیں، حروف و حرکات اور معانی کے تغیر سے وضع بدلتے ہیں۔ بڑھتے ہیں، چڑھتے ہیں، ڈھلتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں۔ (۳۲)

زبان کی تاریخ کے سلسلے میں تاریخ کی تمثیل کو آگے بڑھاتے ہوئے، آزاد زبان کی بقا و فنا کے چار اسباب گنواتے ہیں: قوم کا ملکی استقلال، سلطنت کا اقبال، اس کا مذہب، تعلیم و تہذیب۔ ''اگر یہ چاروں پورے زوروں سے قائم ہیں تو زبان بھی زور پکڑتی جائے گی۔ ایک یا زیادہ جتنے کم زور ہوں گے اتنی ہی زبان ضعیف ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ مر جائے گی۔'' (۳۳) گویا زبان کی بقا اور ترقی کا دارومدار، ریاست اور اس کے اداروں پر ہے

اوران اداروں کا ٹھیک وہی کردار ہے جو زندہ انواع کے سلسلے میں ان کے طبعی ماحول کا ہوتا ہے۔ طبعی ماحول بدلتا ہے تو انواع میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ___ آزاد سنسکرت کی مثال پیش کرتے ہیں۔ قوم قائم ہے مگر سلطنت کے اقبال کے ساتھ زبان کا اقبال رخصت ہوا۔ (۳۴)

آزاد سے یہ توقع کرنا کہ حیاتیاتی ارتقا اور سماجی و لسانی ارتقا کے فرق پر ان کی نظر رہی ہوگی، ان سے ناانصافی ہوگی، تاہم ان مضمرات پر نظر ڈالنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے جو مذکورہ فرق کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوئے۔ حیاتیاتی ارتقا میں ماحول کی جس جبریت پر ڈاروِن کے یہاں زور ملتا ہے، اسے آزاد نے زبان کے سلسلے میں یورپی ماہرین سے بے چون و چرا تسلیم کیا ہے۔ مختلف زبانوں میں اصوات کے فرق کا '' سبب ___ فلسفی زبان سے سنو۔ کہتا ہے کہ ملک کی آب و ہوا اور آفرینش خاک کے اختلاف سے جس طرح اہل فارس کے قد و قامت اور شکل و شباہت میں فرق ہے اسی طرح ان کے لب و دہان اور گلا و زبان کی ساخت میں فرق ہے اور اسی سبب سے ان کی حرکتوں میں بھی فرق ہے۔ (۳۵) اصوات کے فرق کی یہ توجیہ ڈاروِن کے نظریے کی اندھا دھند تقلید کا نتیجہ تھی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مختلف زبانوں کی اصوات ثقافتی تشکیل ہیں۔ اگر ہم کچھ دوسری زبانوں کی آوازوں کو ٹھیک طرح یا سرے سے ادا نہیں کر پاتے تو اس کی وجہ ہمارے جبڑے یا گلے نہیں، ہماری لسانی ثقافت ہے جس نے یہ آوازیں وضع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ___ اس طور آزاد کے یہاں زبان کی اصل اور اس کی تبدیلیوں کے لسانیاتی اسباب واضح کرنے کا رویہ نہیں ملتا۔ ان کے یہاں ملک کی آب و ہوا اور سلطنت کے اقبال، دونوں یکساں جبر اور فیصلہ کن قوت محرکہ کے طور پر نظر آتے ہیں۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ سلطنت کے اقبال کے پردے میں اس تجریدی قوت کی ہمہ جا موجودگی (Omnipresence) کو باور کرا رہے ہیں جو انگریز حکومت کی صورت میں موجود تھی۔ یعنی اس کے اقبال پر ہندستانی زبانوں کے اقبال کا انحصار تھا۔

آزاد لسانی تبدیلیوں میں سلطنت اور اس کے اداروں (تعلیم) کے جبر کو عصری سطح پر بھی محسوس کرتے ہیں۔ اکثر الفاظ ہیں کہ عربی، فارسی یا ہندی میں اپنے اپنے معنوں میں مستعمل تھے اور ہیں۔ ہماری آنکھوں کے دیکھتے دیکھتے انقلاب زمانہ نے نئے خیالات پیدا کیے اور وہی الفاظ جون بدل کر نئے معنوں کے لیے نامزد ہوئے۔ (۳۶)

آزاد جسے انقلاب زمانہ کہہ رہے ہیں وہ اصل میں '' حیاتیاتی و تاریخی جبریت '' ہے۔ اس کا وار سیدھا اور فیصلہ کن ہے۔ نہایت قابل غور بات یہ ہے کہ آزاد نے اس ضمن میں جن چند الفاظ کی مثالیں پیش کی ہیں، وہ الفاظ ریاست / سلطنت کے انھی اداروں یا آئیڈیالوجی کے نمائندہ ہیں جن کے ذریعے استعماری غلبہ ممکن ہوتا ہے۔ مثلاً سب سے پہلے وہ لفظ تہذیب کی مثال لاتے ہیں:

تہذیب کے معنی لغت میں ہیں پاک کردن، اصلاح کردن۔ اب سولزیشن کے معانی کی ہیئت مجموعی جو کچھ

ہے تمھارے ذہن میں ہے اور یہ خیال بھی انگریزی سے ہماری زبان میں آیا ہے۔ تم خود غور کر کے دیکھو! جن جن معنوں کی رعایت سے آج لفظ تہذیب بولا جاتا ہے اور اس میں کوٹ، پتلون اور پھندنے دار ٹوپی شامل ہے، وہ حقیقی معنوں سے کس قدر علاحدہ ہیں۔ (۳۷)

آگے لفظ تعلیم یافتہ کی معنوی قلب ماہیت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ''انگریزی میں جسے ایجوکیٹیڈ کہتے ہیں۔ اب ہم اسے تعلیم یافتہ کہتے ہیں، لیکن اس میں کئی صفتیں اور مقصود ہو گئی ہیں، جن میں شرافت کی بربادی اور کوٹ پتلون کی فرضیت لازم کی گئی ہے جو تعلیم یافتہ کے اصل معنوں سے بالکل الگ ہیں۔ یہ خیال انگریزی سے آیا اور حال ہی میں یہ لفظ بھی اس کے لیے نام زد ہوا۔ (۳۸) اس کے فوراً بعد بلند نظری، عزت طلب، وضعدار اور صاحب لوگ انگریزی خیالات کے اثر سے جن نئے معانی میں مستعمل ہوئے ہیں انھیں واضح کرتے ہیں۔ صاحب لوگ کے ضمن میں لکھتے ہیں: ''عرب میں صاحب بمعنی ہم صحبت ہے...... فارس میں آ کر صاحب ملک، صاحب دولت، صاحب مال رہا۔ ہندوستان میں آ کر لفظ تعظیمی ہوا۔ میر صاحب، مرزا صاحب، نواب صاحب۔ اسی نوے برس سے صاحبان انگریز کے نام کا جز ہو گیا۔ پھر جو کمینہ سے کمینہ کرستان ہو، وہی صاحب لوگ ہو گیا۔ (۳۹)

'مشرق کے یورپی علم' کی مضحک نقل میں جس دوجذبی رجحان یا طلب و تردید کا مظاہرہ بالعموم ہوتا ہے، اسے ہم مندرجہ بالا اقتباسات میں آزاد کے یہاں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ان اقتباسات سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ آزاد نئی تہذیب و تعلیم کے مشرقی تہذیب و تعلیم پر دھاوے یا جبر سے خوش نہیں ہیں۔ وہ اس جبر کو محسوس کرتے ہیں، اسے فیصلہ کن بھی سمجھتے ہیں، اس کے مقابلے میں بے بسی بھی محسوس کرتے ہیں مگر اس سے ذہنی ہم آہنگی پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ ان کی ناخوشی کہیں کہیں طنز و تضحیک کی صورت بھی اختیار کرتی ہے، گو اس طنز و تضحیک میں وہ شدت نہیں جو اکبر کے یہاں ہے۔ چوں کہ دوجذبی رجحان برقرار رہتا ہے، اس لیے آزاد طنز و تضحیک کے باوجود مشرق کے یورپی علم کی طلب سے بے نیاز نہیں ہوتے۔

آزاد اپنی محدود لسانی دل چسپیوں اور مطالعۂ لسان کو مطالعۂ انسان کا مرتبہ نہ دینے کے سبب اس امر کی مناسب وضاحت نہیں کرتے کہ لسانی تبدیلیاں ایک طرف گہری تہذیبی تبدیلیوں، تصور کائنات اور نظام اقدار کے بدلنے کی غماز ہوتی ہیں اور دوسری طرف قوموں کے تہذیبی روابط کی نوعیت کو سمجھنے میں کلید کا کام دیتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کے ذریعے ہندستانیوں کو مہذب بنانا، ایک ''عظیم الشان نو آبادیاتی ثقافتی منصوبہ'' تھا۔ اس منصوبے کی ''کام یابی'' کی ناقابل تردید شہادت ''لسانی'' ہے۔ جب کسی قوم کے تصور کائنات کے ترجمان الفاظ اپنے بنیادی معانی کو ترک کر دیں اور نئے تصور کائنات کے نمائندہ معانی کو گلے لگا لیں تو سمجھ لیجیے وہ قوم بدل گئی۔ تہذیب، تعلیم، بلند نظری روایتی مابعد الطبیعیاتی تصور کائنات کے ترجمان تھے۔ ان لفظوں کے مدلول (Signified) صدیوں کے ثقافتی عمل

سے وضع اور متعین ہوئے تھے۔ نوآبادیاتی نظام کی اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہوسکتی ہے کہ وہ صدیوں کے چاک پر وضع ہونے والے 'مدلول' کو اُس نئے 'مدلول' سے بدل دے جو بالکل مختلف تصوّرِ کائنات کے حامل ہوں۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ سراج الدین علی، خان آرزو، ۱۹۹۱ء، مثمر (مرتبہ ریحانہ خاتون)، کراچی، انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین سٹڈیز، جامعہ کراچی، ص ۱۷۵

۲۔ میر انشاء اللہ خان انشا، ۱۹۸۸ء، دریائے لطافت (مترجم: پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، مرتب مولوی عبدالحق) نئی دہلی، انجمن ترقی اردو، ص ۳۰

۳۔ تاہم انشا نے آج سے دو صدی پہلے ایک ایسے اصول کو ضرور پیش کیا جو نہ صرف ترقی پسندانہ تصور ہے بلکہ ایک بنیادی لسانی حقیقت کا درجہ بھی رکھتا ہے: ''ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہو گیا، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، از روئے اصل غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اردو کا ہے۔ اگر اصل کے مطابق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلاف اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اس کی صحت و غلطی اردو کے استعمال پر موقوف ہے۔'' (دریائے لطافت، ص)

۴۔ مولوی عبدالحق، ۱۹۸۹ء، (اشاعت سوم) مرحوم دہلی کالج، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ص ۱۸۲

۵۔ گیل مینولٹ (Gail Minault)، مشمولہ Delhi College، ص ۱۲۷

۶۔ آغا محمد باقر، فروری ۱۹۶۸ء، ''مرحوم انجمن پنجاب''، مشمولہ اورینٹل کالج میگزین، شمارہ ۱، جلد ۴۴، ص ۱۷۱۔۱۷۲

۷۔ محمد حسین آزاد، سخندان فارس، ص ۴

۸۔ آغا محمد باقر، ''مرحوم انجمن پنجاب''، مشمولہ اورینٹل کالج میگزین، ص ۱۳۱

۹۔ ایضاً، ص ۱۳۱۔۱۳۲

۱۰۔ ڈاکٹر صفیہ بانو، ۱۹۷۸ء، انجمن پنجاب: تاریخ و خدمات، کراچی، کفایت اکیڈمی، ص ۱۰۶

۱۱۔ ایڈورڈ سعید، ۱۹۸۵ء، (۱۹۷۸ء) Orientalism، پینگوئن، ص ۳۰۰

۱۲۔ ولیم جونز، ۱۸۲۴ء، Discourses and Miscellaneous Papers، (مرتبہ جیمز ایلمز) لندن، چارلس ایس۔ آرنلڈ، ص ۲۸۔۲۹

13. The Aryan was invested with all noble virtues that direct the dynamic of history : imagination, reason, science, arts, politics."

(ژاں پی الیغ ویراں ۱۹۹۲ء، (Jean-Pierre Verrant) پیش لفظ، The Language of Paradise، از

ماؤریس اولنیڈر، امریکا، ہارورڈ کالج، ص x)

14. "The British or rather the East India Company, are the masters of India because it is the fatal destiny of Asian empires to subject themselves to Europeans."

(ہیگل، ۱۹۷۵ء Lectures on the Philosophy of World History (ترجمہ ایچ۔ بی۔ نسبٹ) کیمبرج یونیورسٹی پریس ص ۱۳۸)

۱۵۔ مولر کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"It would have been next to impossible to discover any traces of relationship between the swarthy nations of India and their conquerors, whether Alexander or Clive, but for the testimony borne by language.

(A History of Ancient Sanskrit Litrature ص ۱۳)

۱۶۔ چارلس ٹریولین کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"We can not tell how far and how long this remarkable interaction of the Western nations in Eastern affairs may lead us , and I can know from my Indian Experience that knowledge of the native language is an indispensable preliminary to understanding and taking an interest in native affairs, as well as to acquiring their goodwill and gaining influence over them."

(۱۸۵۵ء، پیش لفظ، The Languages of the Seat of War in East، لندن، ولیمز اینڈ نورگیت، ص iv)

۱۷۔ میکس مولر، The Languages of the Seat of War in East، ص ix

۱۸۔ رپورٹ کی اصل عبارت یہ ہے:

"It was also to be a centre of discussion on all subjects affording education, and finally, a matter peculiar interest to us in Europe, it was to be academy for the cultivation of archaeologial and

philosophical investigation, and for giving a helping hand to European orientalists, whose enquiries it would advance by research on spot , whilst it would itself benefit by popularizirg European oriental learing, and being its critical method to bear on the literary labours of native Savants."

(جی۔ ڈبلیو۔ لائٹنر، History of Indigenous Education، ص vi)

۱۹۔ سرایڈورڈ کسٹ (Sir Edward Cust) کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"A fundamental principle appears to have been forgotten or overlooked in our systern of colonial policy__that of colonial dependeuce. To give to a colony the forms of indpendence is a mockery; she would not be a colony for a single hour if she could maintain an independent station."

Reflections on West African Affairs addressed to the ۱۸۳۹ء،)
colonial office، لندن، ہیچرڈ،)

۲۰۔ محمد حسین آزاد، سیر ایران، لاہور، کریمی پریس، ص ۶۰۔۶۱

[آزاد نے ڈاکٹر لائٹنر سے جھگڑے کے بعد یہ بات لکھی، اس لیے آزاد کے لفظوں سے غصے اور رنج کا اظہار ہو رہا ہے۔ غصے کے عالم میں آزاد کے منھ سے بے ساختہ سچ نکلا ہے یا رنج کی حالت میں آزاد نے غلو آمیز انداز میں طنز و ملامت کی ہے؟ یہ غور طلب بات ہے۔]

۲۱۔ ڈبلیو ڈی وٹنی، ۱۸۵۹ء، Modern Philology: Its Discoveries, History and Influence، نیو یارک، اے ایس برنس اینڈ برز، ص ۱۴۔۱۸

۲۲۔ ہومی بھابھا کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"....Mimicry represents an ironic compromise the discourse of mimicry is constructed around an ambivalence."

(۱۹۹۴ The location of Culture، روٹلیج، ص ۵۔۸

۲۳۔ محمد حسین آزاد، ۱۹۰۷ء، سخندان فارس، لاہور، رائے صاحب، منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، ص ۵

۲۴۔ ایضاً ص ۲۴

25. " The object and aim of philology, in its highest sense, is but one, to learn what man is, by learning what man has been ."

(A History of Ancient Sanskrit Literature، ص ۸)

۲۶۔ ایضاً ص ۱۲

۲۷۔ محمد حسین آزاد، سخندانِ فارس، ص ۲۹

۲۸۔ یہ خیالات ژاں ویراں (Jean-Pierre Verrant) کے ہیں:

"As scholars established the disciplines of Semitic and Indo-European studies, they also invented the mythical figures of the Hebrew and the Aryan, a providential pair which by revealing to the people of the Chiristianized West the secret of their identity , also bestowed upon them the patent of mobility that justified their spiritual, religious, and political domination of the world. The balance was not maintained however, between the two components of this couple. The Hebrew undeniably had the privilege of monotheism in his favor, but he was self-centered, static, and referectory to Christian values and to progress in culture and science. The Aryan, on the other hand, was invested with all the noble virtues that direct the dynamic of history: imagination, reason, science, arts, polices."

(دیباچہ، The Language of Paradise، ص x)

۲۹۔ دیکھیے میکس مولر کی کتاب On the Larguages of the Seat of Wars in the East کا حاشیہ ص ۲۷ تا ۲۹

۳۰۔ محمد حسین آزاد، سخندانِ فارس ، ص ۶۶

۳۱۔ چارلس ڈارون،

۳۲۔ محمد حسین آزاد، سخندانِ فارس، ص۲۶

۳۳۔ ایضاً ص۲۷

۳۴۔ ایضاً

۳۵۔ ایضاً ص۴۸

۳۶۔ ایضاً ص۲۴

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ ایضاً

۳۹۔ ایضاً ص۲۵

آزاد بحیثیت قواعد نگار

ڈاکٹر سہیل عباس بلوچ

برصغیر پاک و ہند میں اردو قواعد نویسی کی روایت کو معنوی اعتبار سے دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور جو کم و بیش ایک صدی کو محیط ہے، کلمے کی تین مختلف صورتوں؛ اسم، فعل اور حرف کی بنیاد پر قواعد نویسی کا دور ہے۔ اس دور کا آغاز انیسویں صدی کے عشرۂ اول سے ہوا، جب انشاء اللہ خان انشاؔ کی دریائے لطافت اور امانت اللہ شیداؔ کی صرف اردو سامنے آئیں۔ ابتدائی دور کے دوسرے مقامی اور غیر مقامی قواعد نویسوں میں روشن علی انصاری، محمد ابراہیم مقبہ، ڈاکٹر گل کرسٹ اور امام بخش صہبائی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان قواعد نویسوں میں سے انشاؔ کا موضوع خالصتاً قواعدی نہیں بل کہ اس میں قواعد کے پہلو بہ پہلو روزمرہ و محاورہ، فصاحتِ زبان، علم بیان، اقسام نظم اور عروض وغیرہ کے مباحث بھی موجود ہیں۔ مقبہ کی کتاب تحفۃ الفنسٹن کا ذکر ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری نے کیا ہے[1]۔ یہ کتاب دستیاب نہیں، البتہ تعلیم نامہ کی دوسری جلد[2] کے تناظر میں مقبہ کی قواعد نویسی کا مطالعہ ممکن ہے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کا رسالہ نایاب تو نہیں مگر کمیاب ضرور ہے۔[3] امام بخش صہبائی کی کتاب رسالہ قواعد صرف و نحو اردو میں اردو صرف اور نحو کے علاوہ لغت و محاورے کی بحث بھی شامل ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں مولوی کریم الدین کی کتاب قواعد المبتدی، نثار علی بیگ میرزا و منشی فیض اللہ خان کے رسائل بعنوان رسالہ قواعد اردو (سہ حصص) اور مولوی محمد احسن کی کتاب رسالہ قواعد اردو (۱۸۶۲ء)[4] منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں۔ یہ سلسلہ اس وقت جامعیت سے ہمکنار ہوا، جب ۱۹۰۴ء میں فتح محمد جالندھری کی کتاب مصباح القواعد سامنے آئی۔ اس دور کی قواعد نویسی کی مشترک صفات حسب ذیل ہیں:

۱۔ قواعد کی بنیاد عربی اور فارسی طرز پر کلمے کی تین اقسام: اسم، فعل اور حرف پر ہے۔

۲۔ عربی قواعد کا تمام تر اصطلاحاتی نظام قبول کر لیا گیا ہے۔

۳۔ صرف کے مباحث پر نحو کی نسبت زیادہ توجہ دی گئی ہے۔

۴۔ قواعدی سطح پر اردو کی مخصوص ساخت کا تجزیہ موجود ہے اور فعل مرکب، امتزاجی مرکبات، جملہ اسمیہ میں مبتدا اور خبر کے ہمراہ فعل ناقص (کلمہ ربط) کی موجودگی وغیرہ کا تجزیہ کیا گیا ہے، لیکن زمانے کے اعتبار سے فعل کی اقسام میں وہ تفصیلی تجزیے موجود نہیں ہیں جو اردو کی ساخت کا امتیازی پہلو لیے ہوئے ہیں۔

اسی زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد کی نصابی اور قواعدی کتب سامنے آئیں، تو کرنل ہالرائیڈ نے بھی سنجیدگی کے ساتھ نصابی مواد کی ترتیب وتہذیب کا آغاز کیا۔ آزاد کی جامع القواعد فارسی زبان کی قواعد پر مشتمل ہے۔ اشاعتِ اول ہی سے اس پر آزاد کا نام بطور مؤلف درج ہے جب کہ اس کے برعکس اردو زبان کی کسی قواعد پر آزاد کا نام بطور مؤلف درج نہیں لیکن علمی حلقوں میں بالاتفاق یہ رائے موجود ہے کہ مولانا آزاد نے اردو زبان میں بھی قواعد نویسی کی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی، آزاد کی ''غیر مطبوعہ تصانیف'' کے باب میں لکھتے ہیں:

> عالم ہوش کی غیر مطبوعہ تصانیف میں تاریخی مقدمات، ترکی قواعد، عربی قواعد، قواعد اردو اور قواعد فارسی ---اردو قواعد ستر صفحات پر مشتمل ہے اور غالباً نصاب کے لیے لکھی گئی تھی ---خدا معلوم اردو اور فارسی کی یہ قواعد شائع کیوں نہیں ہوئی۔ ان دونوں پر آزاد نے غیر معمولی محنت کی تھی۔ (۵)

ڈاکٹر فرخی محکمہ تعلیمات پنجاب کی ایک فہرست [۲۵ ستمبر ۱۸۸۵ء] کے مطابق آزاد کی گیارہ تعلیمی تصانیف کا ذکر کرتے ہیں، ان میں فارسی گرامر جامع القواعد کا اندراج ہے، لیکن اردو قواعد کا ذکر نہیں۔ وہ اس فہرست کو نامکمل تصور کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

> ''لیکن یہ فہرست بہ ہمہ وجوہ مکمل نہیں ہے۔''(۶)

مندرجہ ذیل کتابوں کے اضافے کے بعد اس فہرست کو مکمل کہا جا سکتا ہے:

(ا) آئینہ صحت (۱۸۶۱ء میں مکمل ہوئی)

(ب) نصیحت کا کرن پھول (۱۸۶۴ء میں مکمل ہوئی)

(ج) اردو قواعد

انھوں نے کتاب کے ماخذ و مصادر میں بھی قواعد اردو کو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ (۷) دونوں فہرستوں میں شامل کیا ہے۔ مطبوعہ شکل میں ''منشی گلاب سنگھ لاہور'' کے ۱۹۴۱ء کے ایڈیشن کو شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر انجم رحمانی نے بھی اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں قواعد اردو (۸) کا ذکر مولانا آزاد کی درسی کتب میں کیا ہے۔ ان کا ماخذ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر ملک حسن اختر اپنے مضمون ''مولانا محمد حسین آزاد کی درسی

کتابیں'' میں آزاد سے منسوب قواعد اردو کا جائزہ بھی لیتے ہیں۔ان کی بحث ملاحظہ ہو:

قواعد اردو کا ایک غیر مطبوعہ نسخہ بھی بتایا گیا ہے۔ جب کہ قواعد اردو شائع کردہ منشی گلاب سنگھ لاہور (۱۹۴۱ء) ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گزر چکی ہے۔ یہ ایک ہی کتاب ہے تو دونوں کا الگ الگ ذکر مناسب نہیں اور اگر دو ہیں تو یہ بتانا مفید ہوتا کہ دونوں میں کیا فرق ہے؟ قواعد اردو کا ایک نسخہ ہماری نظر سے گزرا ہے جو ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا۔اس کے سرورق کی عبارت یہ ہے:

''قواعد اردو، حسب الحکم میجر ہالرائیڈ صاحب بہادر ڈائرکٹر مدارس ممالک پنجاب وغیرہ، لاہور کے سرکاری مطبع میں ماسٹر پیارے لال آشوب کیوریٹر کے اہتمام سے چھپی۔۱۸۷۸ء اس سررشتہ کے بے اجازت کوئی نہ چھاپے۔ دفعہ ۱۸، تعداد جلد ۴۸۰۰، قیمت ۵ آنے۔'' اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''پہلا حصہ صرف کے علم میں۔صرف وہ علم ہے جس سے کلموں کی پہچان اور ان کے تغیر وتبدل کی شناخت ہوتی ہے۔''

قواعد اردو پنجاب گورنمنٹ گزٹ ۲۳ فروری ۱۸۷۲ء میں کتابوں کی فہرست میں موجود ہے۔لہٰذا یہ اس سے قبل چھپ چکی تھی۔ یہ کتاب گورنمنٹ کے ۱۸۶۸ء کے اشتہار کے جواب میں انعام کے لیے لکھی گئی۔ اردو قواعد پر دو انعام دینا قرار پائے تھے۔ پہلا انعام پانچ صد روپے اور دوسرا ایک سو پچاس روپے۔(پنجاب گزٹ اگست ۱۸۶۹ء) یہ قواعد مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف معلوم نہیں ہوتی کیوں کہ اس پر ان کا نام نہیں ہے۔جیسا کہ آئندہ کے صفحات سے معلوم ہوگا،اس زمانے میں کتابوں پر مولانا کا نام لکھا جانے لگا تھا۔ (۹)

محولہ بالا آراء دیکھنے سے ایک بنیادی مسئلہ سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آزاد نے قواعد نویسی کی، تو ان کی قواعد اردو یا اردو قواعد کہاں ہے؟ آج کل یونی ورسٹی آف سرگودھا کے شعبہ اردو کے استاد غلام عباس گوندل، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے ڈاکٹر شفیق احمد کی زیرنگرانی ''اردو قواعد کی مطبوعہ کتب کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ'' کے موضوع پر پی ایچ۔ڈی کی سطح کا تحقیقی کام کر رہے ہیں۔راقم نے اس ضمن میں جب ان سے استفسار کیا تو انھوں نے اپنے خط میں جو رہنمائی کی اس کے بنیادی نکات یہ ہیں:

۱۔ آزاد کی جس غیر مطبوعہ قواعد اردو کا تذکرہ ڈاکٹر اسلم فرخی نے کیا ہے وہ اس وقت آزاد کے ورثا کے پاس محفوظ نہیں ہے۔

۲۔ ورثائے آزاد URDU GRAMMAR -EDUCATION DEPARTMENT مطبوعہ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور (اردو ٹائٹل صرف و نحو اردو یا صرف و نحو

اردو کا ابتدائی رسالہ) کو آزاد کی کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ کتاب کم از کم پچاس مرتبہ شائع ہوئی۔ آزاد کے سوا کبھی کسی اور مصنف سے منسوب نہیں ہوئی۔

۳۔ انھیں ڈاکٹر سلیمان باقر کی جانب سے صرف و نحو اردو کے جس نسخے کی نقل ملی وہ ۱۹۴۱ء کا مطبوعہ ہے اور یہ کتاب کا چھیالیسواں اڈیشن ہے۔ انھوں نے اپنے نام ڈاکٹر سلیمان باقر کے ایک خط کے ایک اقتباس کی نقل بھی فراہم کی جو اس طرح ہے:

جو کتابیں نصاب میں شامل تھیں، اس زمانے میں یہ ادارہ چھاپا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ قصص ہند بھی اس نے چھاپی مگر آزاد کا نام نہیں لکھا۔ اس کتاب کے صفحہ نمبر ۱۰۳ پر آزاد نے اپنا حوالہ دیا ہے۔ زبان و بیان آزاد کا ہے۔ میرے علم کے مطابق یہ کتاب نصاب میں شامل ہوئی تو قواعد اردو کی بجائے صرف و نحو اردو کہلائی۔ یہ ایک واضح تاریخی بات ہے۔ اس کتاب کے لب ولہجہ تحریر میں آزاد ایک استاد کی طرح جماعت کو لیکچر دیتے محسوس ہوتے ہیں۔ اللہ کرے اس کا اصل مسودہ کہیں سے مل جائے تو مزید بات واضح ہو جائیگی۔ میرے ناقص علم کے مطابق یہی قواعد اردو ہے اور مولانا آزاد کی تصنیف ہے۔ (۱۰)

۴۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے جس اردو قواعد کا اندراج کیا ہے وہ اردو قواعد یہی صرف و نحو اردو ہے۔ اردو قواعد اس کے انگریزی نام URDU GRAMMAR کا ترجمہ ہے۔

۵۔ قواعد اردو میں الفاظ کی ترتیب، ڈاکٹر اسلم فرخی کے اندراجات اور ڈاکٹر ملک حسن اختر کے بیانات جس قواعد اردو کی نشان دہی کرتے ہیں، وہ ایک الگ کتاب ہے جو ۱۸۷۰ء میں "حسب الحکم کپتان ہالرائیڈ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن"، مطبع سرکاری لاہور سے شائع ہوئی۔

۶۔ اردو قواعد (صرف و نحو اردو) اور قواعد اردو مباحث کی پیش کش کے طریقے کی بنیاد پر الگ الگ نظر آتی ہیں لیکن اول الذکر قواعد اردو ہی کی نئی شکل ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۹۳ء میں مطبع مفید عام لاہور سے شائع ہوئی۔

۷۔ چوں کہ کسی کتاب پر مولانا آزاد کا نام درج نہیں، اس لیے جامع القواعد، قواعد اردو اور اردو قواعد (صرف و نحو اردو) کا تقابلی مطالعہ اس وقت ہمارے لیے نہ صرف معاون ہے بلکہ اس سے اتنی داخلی شہادتیں مل جاتی ہیں جس سے ثابت کیا جا سکے کہ یہ تینوں کتب ایک ہی مصنف کی تالیفات ہیں۔

ان نکات کی تصدیق اس وقت ہوتی ہے جب تینوں کتابوں کے تقابلی جائزے سے مندرجہ ذیل امور طے ہو جاتے ہیں:

۱۔ قواعد اردو اور اردو صرف و نحو اردو زبان کی جب کہ جامع القواعد فارسی زبان کی قواعد ہے لیکن دونوں کے موضوعات، ترتیب مباحث، تعریفات اور امثلہ تک میں اشتراک ہے۔ فرق یہ ہے کہ قواعد اردو بیانیہ انداز میں مسلسل عبارت کی شکل میں ہے جب کہ اردو صرف و نحو میں استقرائی اور خطابیہ انداز اختیار کر کے قواعد اردو ہی کے مواد کو استعمال میں لایا گیا ہے۔

۲۔ قواعد کی بنیاد کلمے کی تین قسموں کے بعد زیادہ تر اسم کی معنوی اقسام یعنی معرفہ اور نکرہ پر ہے۔

۳۔ 'ہے'، 'ہیں' وغیرہ کو فعل ناقص کی بجائے کلمہ ربط کہا گیا ہے۔

۴۔ کتب میں مماثلتیں تو ہر صفحے پر ہیں لیکن مختلف قواعدی نقشے بعینہٖ منقول ہیں۔

بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے صرف ایک نقشے کی کیفیت، ملاحظہ ہو:

جملہ اسمیہ میں مسندالیہ کو مبتدا اور مسند کو خبر کہتے ہیں اور جس کلمہ کے ذریعے ان دونوں میں ربط حاصل ہوتا ہے اسے کلمہ ربط یا علامت جملہ اسمیہ کہتے ہیں۔ جیسے 'زید دانا ہے' ۔ یہاں زید مبتدا ہے اور دانا خبر اور ہے کلمہ ربط۔ کلمے ربط کے یہ ہیں، ہے، ہیں، ہو، ہوں، اور نسبت کے نفی کے وقت 'نہیں' کلمہ ربط سے پہلے بڑھا دیا جاتا ہے جیسے زید دانا نہیں ہے۔ نقشہ ذیل سے کلمات ربط کے موقعوں کی تفصیل معلوم ہوگی۔

نقشہ روابط کے موقعوں کا

جنس مبتدا	کلمہ ربط	مثالیں	کیفیت
اسم مفرد یا ضمیر واحد غائب یا ضمیر واحد حاضر	ہے	زید دانا ہے وہ دانا ہے۔ تو دانا ہے۔	جب مبتدا اسم مفرد یا ضمیر واحد غائب یا واحد حاضر ہو تو 'ہے' کلمہ ربط ہوتا ہے۔
ضمیر واحد متکلم	ہوں	میں دانا ہوں	ضمیر واحد متکلم میں ہوں کلمہ ربط ہوتا ہے۔
اسم جمع۔ جمع ضمیر جمع غائب ضمیر جمع متکلم	ہیں	یہ لوگ دانا ہیں۔ یہ لڑکے پڑھے ہوئے ہیں۔ وہ دانا ہیں۔ ہم دانا ہیں۔	جب مبتدا ان اسموں میں سے کوئی اسم ہوگا تو 'ہیں' کلمہ ربط ہوگا۔

ضمیر جمع حاضر	ہو	تم دانا ہو	جب ضمیر جمع حاضر ہو تو 'ہو' کلمہ ربط ہوتا ہے۔[11]

اب اسی بحث کو صرف و نحو اردو میں ملاحظہ کیجیے:

جملہ اسمیہ میں مسندالیہ کو مبتدا کہتے ہیں اور مسند کو خبر۔ اور 'ہے' وغیرہ کو کلمہ ربط۔ ربط کے کلمے یہ ہیں: ہے، ہیں، ہو، ہوں اور نفی کے وقت ان سے پہلے نہیں لگا دیا جاتا ہے: جیسے دودھ سرخ نہیں ہے۔ لہو سفید نہیں ہے۔

نقشہ روابط کے موقعوں کا

جنس مبتدا	کلمہ ربط	مثالیں	کیفیت
اسم مفرد یا ضمیر واحد غائب یا ضمیر واحد حاضر	ہے	زید دانا ہے۔ وہ دانا ہے۔ تو دانا ہے۔	جب مبتدا اسم مفرد یا ضمیر واحد غائب یا واحد حاضر ہو تو 'ہے' کلمہ ربط ہوتا ہے۔
ضمیر واحد متکلم	ہوں	میں دانا ہوں	ضمیر واحد متکلم میں ہوں کلمہ ربط ہوتا ہے۔
اسم جمع۔ جمع ضمیر جمع غائب ضمیر جمع متکلم	ہیں	یہ لوگ دانا ہیں۔ یہ لڑکے پڑھے ہوئے ہیں۔ وہ دانا ہیں۔ ہم دانا ہیں۔	جب مبتدا ان اسموں میں سے کوئی اسم ہوگا تو 'ہیں' کلمہ ربط ہوگا۔
ضمیر جمع حاضر	ہو	تم دانا ہو	جب ضمیر جمع حاضر ہو تو 'ہو' کلمہ ربط ہوتا ہے۔[12]

قواعد اردو، اردو قواعد (اردو صرف و نحو) کے متعدد نسخے اور جامع القواعد کا ۱۸۸۵ء کا ایڈیشن اور پاکستانی ایڈیشن اب تک پنجاب پبلک لائبریری میں محفوظ ہے۔ ان میں مماثلتوں کی تصدیق زبان کا عام طالب علم بھی کر سکتا ہے اس لیے ان تینوں کتابوں کو آزاد کی کتب ماننا پڑتا ہے۔

اردو قواعد (اردو صرف و نحو) اور قواعد اردو میں موضوعاتی سطح پر اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں کہ اول الذکر کی ابتدا میں چند سطور میں اسم جامد، مصدر اور اسم مشتق کی تعریف کی گئی ہے جو قواعد اردو میں نہیں ہے۔ اس حوالے سے درجہ بندی کی مزید وضاحت نہیں ہے۔ کتب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتب بھی صرف

نحو کے روایتی تصور کے تحت لکھی گئی ہیں اور کلمہ کی تین قسمیں اسم فعل اور حرف بتائی گئیں لیکن یہ کتب سابق سے اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ اس میں اسم کی ذیلی درجہ بندی میں مختلف طریقہ اختیار کیا گیا۔ کتاب دو حصوں یعنی صرف اور نحو میں تقسیم ہے۔ صرف کی تعریف کے بعد مختصر احوال کلمے کا موجود ہے اور کلمے کو اسم فعل اور حرف میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بناوٹ کی رو سے اسم کی تین اقسام؛ اسم جامد، مصدر اور اسم مشتق بتائی گئی ہیں لیکن ان کے بیان میں وہ تفصیل موجود نہیں جو ہمیں امانت اللہ شیدا، امام بخش صہبائی، مولوی کریم الدین یا مولوی محمد احسن کے ہاں نظر آتی ہے البتہ معنی کے اعتبار سے اسم کی اقسام؛ معرفہ اور نکرہ کا بیان قدرے تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اسم معرفہ کی چار قسمیں بیان ہوئی ہیں، جو یہ ہیں:

۱۔ اسم علم: جو خاص چیزوں کا نام ہے اور اس کی ذیلی قسموں میں تخلص، خطاب، لقب، کنیت اور عرف شامل ہیں۔

۲۔ اسم ضمیر: نام کی جگہ استعمال ہونے والے لفظ ہیں۔ ضمیر کو غائب، مخاطب اور متکلم میں تقسیم کیا گیا۔ اس کی فاعلی، مفعولی اور اضافی حالت بیان کی گئی اور ادب کے مقام پر آپ، جناب، حضور وغیرہ کا قرینہ بتایا گیا۔ اسی طرح ضمیر متکلم میں انکسار کے لیے کمترین، غلام وغیرہ کا استعمال بتایا گیا۔ ضمیر کی تبدیل کے اہم اصول بھی بیان کیے گئے۔

۳۔ اسم اشارہ: نزدیک کے اشارے کے لیے ''یہہ'' اور ''یے'' اور دور کی اشیا کے اشارے کے لیے ''وہ'' اور ''وو'' بتائے گئے۔ ان میں سے ''یہہ'' کی املا اب ''یہ'' ہے۔ اور اشارہ قریب کی جمع بھی یہی ہے۔ ''یے'' اب متروک ہے۔ اسی طرح اشارہ بعید کی جمع میں ''وو'' بھی متروک ہے اور ''وہ'' جمع کے لیے بھی مستعمل ہے۔

۴۔ اسم موصول: ''جو'' اور ''جون سا'' کو اسم موصول کہا گیا ہے۔

سابقہ کتب میں ان چاروں کے مضاف اور منادیٰ کو بھی اسم معرفہ میں شامل کیا گیا تھا لیکن اس کتاب میں اسم معرفہ کی مذکورہ بالا چار اقسام ہی مذکور ہیں۔

اسم نکرہ کی سات قسمیں؛ اسم ذات، اسم استفہام، اسم صفت، مصدر، اسم فاعل، اسم مفعول اور اسم حالیہ بیان کی گئی ہیں۔ ان کی ذیلی اقسام اور دیگر اہم نکات ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ اسم ذات: تمیزی نام، اسم تصغیر، اسم آلہ، اسم ظرف، اسم صوت۔

۲۔ اسم استفہام: کون، کیا، کے (کتنے) کتنا، کیوں، کیسا وغیرہ۔

۳۔ اسم صفت: اس کی اقسام میں صفت مشبہ، صفت نسبتی، اسم عدد، صفت عددی درج ہیں۔ صفت مشبہ کی بحث میں درجات صفت کا بیان بھی موجود ہے۔ بابو کاہن سنگھ نے عدد سے متعلق وصف کو صفت عددی کا نام دے کر اسے تعدادی اور ترتیبی میں تقسیم کیا تھا۔ اس کتاب میں تعدادی کے لیے اسم عدد اور صفت ترتیبی کے لیے

صفت عددی کی اصطلاح الگ الگ موجود ہے۔

۴۔ مصدر: بناوٹ کے اعتبار سے وضعی اور غیر وضعی اور معنوی حوالے سے لازم اور متعدی کی تقسیم موجود ہے۔ مصدر متعدی کی مفعول اور بناوٹ کے لحاظ سے ذیلی اقسام بھی بیان کی گئی ہیں۔ حاصل مصدر کی بحث بھی اسی بحث کے ساتھ ملحق ہے۔ حاصل مصدر کی ساخت میں پہلے قواعد نویسوں کی نسبت زیادہ طریقے دریافت کر کے لکھے گئے ہیں۔ 'بہلاوا'، 'پھسلاوا'، 'بلبلاہٹ'، 'پلپلاہٹ'، 'لڑنت'، 'بکواس' وغیرہ ایسے حاصل مصدر ہیں جو اس سے پہلے کسی قواعد نویس نے درج نہیں کیے۔

۵۔ اسم فاعل: کھانے والا، پینے والا وغیرہ۔

۶۔ اسم مفعول: کھایا ہوا، پیا ہوا وغیرہ۔

۷۔ اسم حالیہ: علامت مصدر 'نا' کو 'تا' سے بدلنے سے اور بعض اوقات اس تبدیل پر 'ہوا' کے اضافے سے بنتا ہے جیسے 'روتا' یا 'روتا ہوا'

اسم نکرہ کے بعد اسم کی تذکیر و تانیث، وحدت و جمع، علامت تنکیر اور اسم کی تبدیلی کا ہے۔ اسم کی بحث میں اسم مشتق کی الگ سے بحث اور اسم کی حالتوں کا بیان سرے سے موجود نہیں۔

دوسری بحث فعل کی ہے۔ روایتی انداز میں تین زمانوں ماضی حال اور مستقبل کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ ماضی کی چھ قسمیں: ماضی مطلق، ماضی قریب، ماضی بعید، ماضی استمراری، ماضی شکیہ اور ماضی شرطی بیان کی گئی ہیں۔ فعل حال اور فعل مضارع کا بیان بھی موجود ہے۔ فعل مضارع کے بعد فعل مستقبل اور فعل امر کا بیان ہے۔ امر کو امر مطلق اور امر مدامی یا استمراری میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اردو میں امر صرف حاضر پر ثابت ہے لیکن عربی کی تقلید میں غائب اور متکلم پر بھی امر کا صیغہ درج کیا گیا ہے۔ تمام گردانیں صرف معروف افعال پر ہیں۔ امر کے بعد فعل نہی بنانے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے۔ وحدت و جمع اور تذکیر و تانیث کے لیے متعدی افعال کے اصول بھی مختصراً بیان کیے گئے ہیں۔ فعل مجہول کی تعریف اور صیغہ ماضی مطلق پر 'جانا' کے صیغوں کے استعمال سے مجہول کی تشکیل کا طریقہ بتایا گیا ہے لیکن گردانیں درج نہیں کی گئیں۔ سابقہ کتب میں فعل معطوف کی بحث عام طور پر ماضی سے خاص کی گئی تھی۔ اس کتاب میں فعل معطوف کی الگ بحث موجود ہے۔ یہ بحث مختصر ہے لیکن اس کو ماضی تک محدود کرنے کی بجائے یہ بتایا گیا کہ پہلا فعل دوسرے فعل کے تابع ہوتا ہے۔

حصہ صرف میں تیسری بحث حرف کی ہے۔ اس میں حروف جار، حروف اضافت، حروف ندا، حروف تاسف، حروف انبساط، حروف شرط و جزا، حروف عطف، حروف تردید، حروف استثنا، حروف استدراک، حروف جواب، حروف تنبیہ، حروف شرکت و اختصاص، حروف نفی، حروف بیانیہ، حروف ظرفیت، حروف مقدار اور حروف تشبیہ

کا ذکر ہوا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ نحو کے مباحث پر مشتمل ہے۔نحو کی بحث کی بنیاد میں مرکب کا تصور موجود ہے۔مرکب کی دو روایتی قسمیں مرکب مفید یا کلام تام اور مرکب غیر مفید یا کلام ناقص بیان کی گئی ہیں۔مرکب غیر مفید کو مرکب اضافی، توصیفی، تعدادی اور امتزاجی میں تقسیم کیا گیا ہے۔مرکب تعدادی وہی ہے جسے غیر امتزاجی بھی کہا جاتا ہے۔ مرکب مفید کو جملہ کہا گیا ہے اور اس کے دو بنیادی حصے مسند اور مسند الیہ بتائے گئے ہیں۔ان کے نزدیک مسند الیہ ہمیشہ اسم اور مسند کبھی اسم اور کبھی فعل ہوتا ہے۔اگر مسند اور مسند الیہ دونوں اسم ہوں تو جملہ اسمیہ اور مسند الیہ اسم اور مسند فعل ہو تو جملہ فعلیہ ہے۔جملہ اسمیہ میں مسند الیہ کو مبتدا اور مسند کو خبر کہتے ہیں۔'ہے'، 'ہیں'، 'ہوں'، 'ہو' وغیرہ کو ربط کے کلمے کہا گیا ہے۔جملہ فعلیہ میں مسند الیہ اسم اور مسند فعل ہوتا ہے۔بعض اوقات فعل کے ہمراہ مفعول بھی موجود ہوتا ہے۔دیگر کئی متعلقات بھی فعل کے ہمراہ ہوتے ہیں۔مفعول کی پانچ قسمیں؛ مفعول بہٖ، مفعول فیہ، مفعول لہٗ، مفعول منہٗ اور مفعول مطلق بیان کی گئی ہیں۔مفعول کی اقسام کے بیان کے بعد ایک بار پھر اقسام جملہ کی طرف توجہ دی گئی ہے۔اقسام جملہ میں اجزائے جملہ کے ربط باہمی کے اعتبار سے مختلف عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔اس میں جار اور مجرور، حال اور ذوالحال، تمیز اور ممیز، جملہ معللہ، مستثنیٰ و مستثنیٰ منہٗ، ندبہ اور مندوب، جملہ قسمیہ، جملہ شرطیہ، صلہ و موصول، معطوف علیہ اور معطوف، جملہ بیانیہ، مقولہ اور جملہ معترضہ کو زیر بحث لایا گیا ہے۔جملوں کی یہ قسمیں ان کے ذاتی اجزا کے تعلق کی بنا پر ہیں۔مؤلف نے اس جگہ یہ تصریح نہیں کی کہ اجزائے جملہ کلمات بھی ہو سکتے ہیں اور فقرات بھی۔اس لیے سادہ جملوں اور مرکب جملوں کا تصور واضح نہیں ہو سکا۔اسی طرح جملہ خبریہ اور جملہ انشائیہ کی مختصر بحث بھی شامل کتاب ہے لیکن مباحث کے آخر میں۔اس طرح مذکورہ اوّل جملوں اور جملہ کی اقسام میں کوئی ربط پیدا نہیں ہو سکا۔کتاب کے آخری صفحات میں توابع کی مختصر بحث ہے جس میں صفت اور موصوف، عطف بحرف، تاکید، بدل، عطف بیان اور تابع مہمل پر بحث کی گئی ہے۔

موضوعاتی اعتبار سے اس کتاب کی حیثیت اب تاریخی ہے۔اس کے مندرجات میں کلمے کی روایتی تقسیم کے بعد بناوٹ کی بجائے معنی کی بنا پر تقسیم اس کتاب کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔خوبی اس اعتبار سے کہ کتب سابق میں اسم معرفہ اور اسم نکرہ کو اسم جامد کی اقسام میں لکھا جاتا تھا۔پھر اقسام نکرہ میں کچھ ایسے اسمائے مشتق کو بھی شامل کر دیا جاتا تھا جو اصلاً جامد نہیں ہوتے تھے۔مثلاً اسم فاعل اور اسم مفعول وغیرہ کو بھی شامل کر دیا جاتا تھا۔اس طرح ایک تضاد کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔اسم معرفہ اور اس کی ذیلی اقسام کے تفصیلی مطالعے سے معنی کے اعتبار سے اسم کی اقسام کو سمجھنے میں تو مدد ملی لیکن اس سے کتاب میں یہ خامی در آئی کہ بناوٹ کے لحاظ سے اسم کا مطالعہ وہ توجہ حاصل نہ کر سکا جس کی توقع کی جا سکتی تھی۔

فعل کی بحث میں زمانے کی تین قسمیں اور پھر ماضی، حال اور مستقبل کی بحث میں چند ابتدائی قواعد ہی روایتی انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ اقسام جملہ کے مباحث میں عنوانات میں زیادہ مہارت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کہیں جملے کا نام قسمیہ، معللہ، وغیرہ دیا گیا اور کہیں ارکان جملہ کے اعتبار سے توضیح کی گئی جیسے صلہ موصول اور معطوف معطوف الیہ وغیرہ۔ کلمہ ربط اور افعال ناقص کی بحث بھی واضح نہیں۔ موضوعاتی سطح پر یہ چند ایسے نکات ہیں جو کتاب کو لمحۂ موجود میں غیر موزوں قرار دیتے ہیں۔

حواشی

۱۔ ابوسلیمان شاہ جہان پوری، ڈاکٹر، کتابیات قواعد اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص: ۲۹

۲۔ یہ کتاب ''نیٹو ایجوکیشن سوسائٹی ممبئی'' سے ۱۸۳۵ء میں شائع ہوئی۔

۳۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کا رسالہ قواعد زبان اردو مشہور بہ رسالہ گل کرسٹ کا قدیم ترین دستیاب نسخہ ۱۸۲۰ء کا مطبوعہ ہے۔ اسے ڈاکٹر خلیل الرحمان داؤدی نے مرتب کیا تو ''مؤلفہ میر بہادر علی حسینی'' لکھا۔ اس اندراج پر تحفظات موجود ہیں جس پر کسی اور مضمون میں بات کی جائے گی۔

۴۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ہندوستانی گرائمر کی تدوین کے دوران میں مولوی محمد احسن کی قواعد کو ۱۹۰۴ء کا مطبوعہ بتایا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۶۲ء میں لکھی گئی اور اسی زمانے میں شائع ہوئی۔

۵۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، محمد حسین آزاد۔ حیات اور تصانیف (جلد دوم)، کراچی، انجمن ترقیِ اردو، ۱۹۶۵ء، ص: ۶۶۴

۶۔ ایضاً، ص: ۶۰۷

۷۔ ایضاً، ص: ۷۳۵

۸۔ ایضاً، ص: ۷۳۴

۹۔ حسن اختر ملک، ڈاکٹر، تہذیب و تحقیق، لاہور، یونی ورسل بکس، ۱۹۸۵ء، ص: ۶۰۔۶۱

۱۰۔ سلیمان باقر، آغا، مکتوب بنام غلام عباس، شعبہ اردو یونی ورسٹی آف سرگودھا

۱۱۔ قواعد اردو، حسب الحکم کپتان ہالرائیڈ، لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۷۰ء، ص: ۹۰۔۹۱

۱۲۔ اردو صرف و نحو، لاہور، رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، دفعہ ۵۰۔۱۹۴۴ء، ص: ۸۰۔۸۱

کتابیات

۱۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، (مرتب) ہندوستانی گرائمر، لاہور، مجلس ترقیِ ادب، ۱۹۷۷ء

۲۔ ابوسلمان شاہ جہاں پوری، ڈاکٹر، کتابیات قواعد اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

۳۔ اردو صرف و نحو، لاہور، رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، دفعہ ۵۰۔ ۱۹۴۴ء

۴۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، محمد حسین آزاد۔ حیات اور تصانیف (جلد دوم)، کراچی، انجمن ترقیِ اردو، ۱۹۶۵ء

۵۔ حسن اختر ملک، ڈاکٹر، تہذیب و تحقیق، لاہور، یونی ورسل بکس، ۱۹۸۵ء

۶۔ عبدالحق، مولوی، قواعد اردو، لکھنؤ، الناظر پریس، ۱۹۱۴ء

۷۔ قواعد اردو، حسب الحکم کپتان ہالرائیڈ، لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۷۰ء

۹۔ کریم الدین، مولوی، قواعد المبتدی، لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۶۱ء

۱۰۔ محمد ابراہیم مقبہ، تعلیم نامہ، ممبئی، نیٹو ایجوکیشن سوسائٹی، ۱۸۳۵ء

آزاد اور تدوینِ دیوانِ ذوق

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام

انیسویں صدی کے نصف آخر کے جو ادیب اردو ادب کی آبرو کہے جا سکتے ہیں ان میں محمد حسین آزاد کا نام سرِ فہرست ہے۔ آزاد محض ایک مؤرخ، محقق، ادیب، شاعر اور صاحب طرز انشا پرداز ہی نہیں بلکہ اُن کی ایک حیثیت مدوّن کی بھی ہے جس کی طرف بالعموم توجہ نہیں دی گئی۔ ۱۸۸۸ء میں آزاد نے اپنے محترم استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کا کلام نہایت محنت سے ترتیب دیا۔ جس کی اشاعت ۱۸۹۱ء میں ہوئی [۱] آزاد سے قبل ذوق کے عزیز شاگردوں حافظ ویران، مرزا انور اور ظہیر دہلوی نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے ۱۲۷۹ھ میں دیوان ذوق شائع کیا تھا۔[۲] یہ پہلا دیوان ہے جو ذوق کا مستند دیوان کہا جا سکتا ہے۔ اسی سال نگارستان سخن کے نام سے بھی غالب، ذوق اور مومن کا منتخب کلام شائع ہوا۔ اس میں ذوق کا وہ کلام بھی شامل تھا جو دیوان ذوق مرتبہ ویران میں شامل نہیں ہو سکا تھا۔[۳] ان کے بعد یکے بعد دیگرے دیوان ذوق کے بہت سے جعلی ایڈیشن شائع ہوئے جن کی تفصیل مقدمہ کلیاتِ ذوق مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ سب دیوان کم و بیش دیوانِ ذوق مرتبہ حافظ ویران کی نقل ہیں۔[۴]

محمد حسین آزاد نے ان سب ترتیبوں سے ہٹ کر اپنے زمانے کے مروجہ طریقِ کار سے انحراف کرتے ہوئے خود ساختہ نئے اصولوں کے تحت دیوانِ ذوق کی تدوین کی۔ کلاسیکی شعرا کے کلام کی تدوین کی جو صورت آج ہمارے سامنے ہے وہ بیسویں صدی کے نصف اول تک دیکھنے میں نہیں آتی۔ اگر کچھ نقوش ملتے بھی ہیں تو وہ بکھرے ہوئے اور خال خال صورت میں نظر آتے ہیں۔ آزاد نے تدوین کا ایک ایسا جامع نظام وضع کیا جو بعد کے تدوین کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بنا اور آج انھی اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کلاسیکی ادب کی تدوین ہو رہی ہے۔ انھی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے آزاد نے اپنے استاد کے دیوان کی تدوین کی۔ یہ بات درست ہے کہ انھوں نے تدوین کے اصولوں پر براہ راست روشنی نہیں ڈالی لیکن ان کے نقوش کا سراغ دیوان ذوق کے مختلف صفحات میں بکھری ہوئی

عبارتوں اوراس کے طریقِ کار سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اپنے وضع کردہ اصولوں پر مکمل طور پر کاربند بھی نہیں رہے تاہم ایک حد تک اُنھوں نے اِن اصولوں پر عمل بھی کیا ہے۔

دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد سے قبل اردو میں تدوین کی روایت اپنے مضبوط قدموں پر کھڑی ہوئی نظر نہیں آتی۔ کسی شاعر کے کلام کی اشاعت میں وہ منظم طریقِ کار اپنایا نہیں جاتا تھا جو آزاد نے اختیار کیا۔ کسی استاد کا کلام شائع کرنا ہوتا تو اس کے شاگرد مل کر کلام کی جمع آوری کیا کرتے تھے۔ کبھی خود شاعر اپنا کلام مرتب کر دیتا تھا۔ (۵) کبھی یہ کام کسی عزیز وقریب کے ذمہ پڑتا جیسے حکیم غلام مولیٰ قلق کے کلیات کی اشاعت کی ذمہ داری ان کے بھائی نے لی۔ (۶) بعض اوقات یہ کام پبلشر خود بھی کر لیتا تھا یا کسی کے ذمہ لگا دیا کرتا تھا۔ خواجہ وزیر کے کلام کی ترتیب کا کام عبدالواحد خان مہتمم مطبع مصطفائی نے وزیر کے عزیز شاگرد سید ہادی علی بے خود کے ذمہ سونپا۔ (۷) کلام کی جمع آوری کے بعد آخر میں شاگرد، دوست احباب اور معاصرین مقفیٰ اور مسجع اسلوب میں تقریظیں لکھ کر شاملِ دیوان کر دیا کرتے تھے۔ جس میں شاعر کی سوانح اور شخصیت کے بیان سے زیادہ عبارت آرائی پر زور صَرف کیا جاتا تھا۔ اس انداز کو غالب نے ''بھاٹوں کی طرح بکنا'' کہا ہے۔ (۸) شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا کہ ان تقریظوں میں شاعر کی شخصیت اور کلام کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا لیکن تحقیق و تدوین کے لیے وہ محنت شاقہ جس کے لیے آزاد نے ''مہم سر کرنا''، ''راتیں صبح ہونا'' اور ''دن اندھیرے ہونے'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں وہ عمل تدوین کی روایت میں نظر نہیں آتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آزاد کے عہد تک تدوین کا دائرہ کار صرف مواد کی فراہمی اور اس کی ترتیب تک محدود تھا۔ ڈاکٹر انصار اللہ نظر کے خیال میں تدوین متن کی پہلی باضابطہ اور کسی حد تک سائنسی انداز میں کوشش دیوان ناسخ کی ترتیب میں کی گئی۔ دیوانِ ناسخ کی ترتیب کی ذمہ داری رشک کے ذمہ تھی انھوں نے اپنے استاد کے دیوان کی تدوین میں فراہمیِ مواد اور ترتیبِ مواد سے آگے بڑھ کر تنقید اور تصحیح کی بھی کوشش کی۔ (۹) آزاد نے دیوانِ ذوق کی ترتیب میں تدوین متن کے اصول اور ضوابط کو منظم اور سائنسی انداز میں برتا۔ اس عمل سے تدوینِ متن کی روایت کی حدود کو وسعت ملی اور یہ روایت نئے امکانات اور نئے جہان سے روشناس ہوئی۔ یہ انداز دیوانِ ذوق کی ترتیب کے بعد بھی کئی دہائیوں تک دیکھنے میں نہیں آتا۔

تدوینِ متن کے جدید سائنٹیفک اصولوں کو مدِ نظر رکھا جائے تو متن کی تدوین میں سب سے پہلا مرحلہ متن کی جمع آوری ہوتا ہے۔ آزاد، ذوق کے ہم عصر ہونے کے علاوہ ان کے شاگرد بھی رہے اور ان کی صحبتوں سے مستفید بھی ہوتے رہے۔ مزید یہ کہ ذوق اور آزاد کے والد مولوی محمد باقر کا دوستانہ بھی تھا۔ اس حوالے سے آزاد کو ذوق کے دوسرے شاگردوں پر تفوق بھی حاصل تھا۔ آزاد کا بیان ہے:

والدِ مرحوم کا، ان کا (یعنی ذوق کا) آغاز تحصیل میں ساتھ ہوا تھا۔ ساتھ پڑھے، ساتھ بڑھے، ہر معرکہ میں شریک حال رہے اور تھوڑے فاصلہ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ مجھے بیس برس تک اس طرح حضوری

خدمت رہی کہ ہر وقت پاس بیٹھ کر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا۔ جو حال نہیں دیکھے وہ بھی اس طرح سنے ہیں گویا سامنے گزرے ہیں۔ (۱۰)

مذکورہ بیان کی روشنی میں آزاد کی حیثیت فقط ذوق کے شاگرد کی ہی نہیں رہتی بلکہ وہ ان کے گھر کے ایک فرد بھی بن گئے تھے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے آزاد، خلیفہ اسماعیل (ذوق کے صاحبزادے) کے منہ بولے بھائی بن گئے تھے۔ سید ناصر نذیر فراق کے نام خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ویران سے بھی پہلے ان دونوں بھائیوں نے دیوان ذوق کی تدوین کا ڈول ڈال دیا تھا اور اسے مرتب بھی کر لیا تھا لیکن شومیِ قسمت کہ ۱۸۵۷ء کا سانحہ رونما ہو گیا اور دیوانِ ذوق کا وہ نسخہ ضائع ہو گیا۔ (۱۱)

آزاد کو ۲۰ سال تک ذوق کے قریب رہنے کا موقع ملا تھا۔ ذوق کی زبانی بہت سا کلام سن چکے تھے۔ بہت سا کلام والد کی وساطت سے حاصل ہو گیا تھا۔ کچھ لوگوں کے پاس محفوظ تھا۔ ان سب کو آزاد نے نہایت محنت اور عقیدت سے جمع کیا۔ لکھتے ہیں:

صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے ہیں۔ دیوان مروجہ میں کچھ چھپے ہیں اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سنے کبھی کچھ سنے۔ پھٹے پرانے مسودے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کی بہت سی تحریریں ہیں۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر و غائب لکھتا اور جمع کرتا تھا۔ (۱۲)

دیـــــوانِ ذوق کو ترتیب دینے کے لیے آزاد نے اپنی ذاتی بیاض، والد مرحوم کی بیاض، ذوق کے مسودات، حافظ ویران کے مطبوعہ نسخے، دوست احباب اور معاصرین سے استفادہ کیا۔ بہت سا کلام ذوق کے صاحبزادے خلیفہ اسماعیل کے ہاں سے دستیاب ہوا (۱۳) اور کچھ حافظ ویران کی زبانی ملا۔ (۱۴) جو غزلیں آزاد کے حافظے میں محفوظ تھیں انھیں دیوان میں شامل کیا۔ بدایوں میں ذوق کے شاگرد میاں مذاق کے متعلق معلوم ہوا کہ ان کے پاس دو غیر مطبوعہ قصائد ہیں، انھیں خط لکھا (۱۵) اس طرح تمام معلوم مواد کو نہایت محنت سے جمع کیا۔

متن کی جمع آوری کے بعد دوسرا مرحلہ جمع شدہ متن کی درست خواندگی، مصنف کے کلام کی متنی تبدیلیوں سے آگاہی، متن کی صحیح صورت متعین کرنا اور الحاقی متن کو اصل متن سے علیحدہ کرنا ہوتا ہے۔ یہی مرحلہ مشکل ترین اور صبر آزما ہوتا ہے۔ مواد کی جمع آوری کے بعد سب سے پہلے الحاقی متن کو حقیقی متن سے علیحدہ کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ کام آزاد ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے قبل خلیفہ اسماعیل کے ساتھ مل کر مکمل کر چکے تھے اور اس کام کی تکمیل میں ان کے کئی مہینے صرف ہوئے۔ (۱۶) الحاقی متن کو علیحدہ کرنے کے بعد وہ مرحلہ آتا ہے جس کے لیے آزاد نے ''مہم سر کرنے'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ مرحلہ درست متن کی خواندگی ہے اس عمل میں آزاد کی راتیں صبح اور دن اندھیرے ہو گئے۔ انھوں نے بڑی محنت اور مشقت سے اس مہم کو سر کیا۔ آزاد کا بیان ہے:

کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا، مٹے حرفوں کا اجالنا، اس زمانہ کے خیالات کو سمیٹنا، حالتوں کا تصور باندھنا، بھولے بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا، میرا کام نہ تھا۔ خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شامل حال تھی۔ میں حاضر اور خدا ناظر تھا۔ راتیں صبح ہو گئیں اور دن اندھیرے ہو گئے۔ جب یہ مہم سرانجام ہوئی۔ (۱۷)

مذکورہ بیان سے تدوینِ متن کی مشکلات کا اندازہ ہی نہیں ہوتا، تدوین متن کے طریقِ کار کا بھی علم ہوتا ہے۔ ''کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا، مٹے حرفوں کا اجالنا، اس زمانہ کے خیالات کو سمیٹنا، حالتوں کا تصور باندھنا، بھولے بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا'' تدوین متن کے یہ وہ پانچ مراحل ہیں جنھیں آزاد نے ایک مدوّن کے لیے متعین کر دیا ہے۔ آج بھی جو مدوِّن تدوین کا آغاز کرے گا اسے انھی مراحل کو عبور کرنا پڑے گا تب جا کر ایک مستند اور منشائے مصنف کے مطابق کلام سامنے آسکے گا۔ دیوانِ ذوق کے ص ۳۷۔۱۳۶ پر ۱۲۸ اشعار کی ایک غزل درج ہے جس کے حوالے سے آزاد نے لکھا ہے کہ ''طرح مشاعرہ کی غزل ہے جس کاغذ سے میں نے نقل کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ مشاعرہ کو چلتے وقت صاف کیا تھا۔ بڑی مشکل سے پڑھا گیا۔ پوری ایک رات کی نشست اس پر صرف ہوئی۔'' صرف تصحیحِ متن کے لیے آزاد نے ''دس مہینے دن رات آنکھوں کا تیل ٹپکایا'' (۱۸) تب جا کر وہ اپنے استاد کے کلام کی تدوین کر سکے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر شاعر کے خیالات بدلتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ اپنے کلام کی نوک پلک درست کرتا رہتا ہے۔ بعض اوقات شعر جب زبان در زبان سفر کرتا ہے تو متن اختلافی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے اور وہی صورت زیادہ درست متصور ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر غالب کی مشہور غزل ''آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک'' ان کے دیوان کی اشاعت اول میں ''ہوتے تک'' ردیف کے ساتھ آئی ہے۔ (۱۹) لیکن مشہور ''ہونے تک'' ہے اور اس کی بھی کوئی واضح شہادت موجود نہیں کہ ردیف 'ہوتے تک' کو 'ہونے تک' غالب نے ہی کیا ہے۔ بہرحال ایسے بہت سے متنی اختلافات مصنف کے زمانہ ہی میں رواج پا جاتے ہیں۔ ذوق بھی اپنے کلام کی نوک پلک درست کرتے رہتے تھے اور کلام میں ردّ و بدل کرتے رہتے تھے۔ آزاد نے دیوان ذوق کے مقدمہ میں اس بات کی صراحت کی ہے۔ ''ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں ہے؛ صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے ہیں اور دیوان مروّجہ میں کچھ چھپے اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سننے میں آیا کبھی کچھ۔'' (۲۰) ایک اور مقام پر لکھتے ہیں ''ہمیشہ فکر سخن میں غرق رہتے تھے اور اپنے کلام کو آپ الٹ پلٹ کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ بعض اشعار دو دو تین تین چار چار طرح سنے اور لکھے نظر آتے ہیں۔'' (۲۱)

مدوّن کا فرض ہے کہ وہ منشائے مصنف کا خیال رکھتے ہوئے متن کی تدوین کرے۔ مشہور اور مروّج متن خواہ کتنا ہی بہتر کیوں نہ ہو منشائے مصنف پر فوقیت نہیں رکھتا۔ آزاد نے تمام اختلافی متون کو تو دیوان میں شامل نہیں کیا

لیکن کہیں کہیں 'ن' کی علامت لگا کر اختلافی متن یا تبدیل شدہ متن کی نشاندہی کی ہے۔ آزاد کے خیال میں ذوق اپنے کلام میں تبدیلیاں کرتے رہتے تھے۔ حافظ ویران کو ان تمام تبدیلیوں کا علم نہیں تھا۔ اس وجہ سے ان کے مرتبہ دیوان میں بھی بعض ایسا کلام شامل ہو گیا ہے جو ذوق کا غیر اصلاحی کلام تھا۔ آزاد نے دیوان کو مرتب کرتے ہوئے متن میں صرف وہ کلام درج کیا ہے جس پر اصلاح نہیں دی گئی یا جس کلام پر اصلاح دی جا چکی تھی۔ وہ کلام جس پر اصلاح دی جا چکی تھی اس کی پہلی صورت کو حاشیے میں جگہ دی ہے۔ متن کی ایسی صورتیں دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد میں کم و بیش ۴۴ مقامات پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

کسی بھی شاعر کے کلام کی تدوین کرتے ہوئے سب سے بہتر صورت یہ ہوتی ہے کہ مدون جس شاعر کا کلام مرتب کر رہا ہے اس شاعر کے کلام کو تاریخی ترتیب سے درج کرے۔ اس سے شاعر کے شعری ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اس کی مثال دیوانِ غالب تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتبہ کالی داس گپتا رضا کی ہے۔ یہ کام بہت مشکل اور بسا اوقات ناممکن بھی ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اسلم فرخی کا بیان ہے:

> ردیف وار غزلیں جمع کرنے میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ شاعر کے ذہنی ارتقا کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا نہ اس کے فن کی تدریجی ترقی پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ بعض غزلیں یا اشعار کسی خاص واقعے یا موقع محل کی مناسبت سے وجود میں آتے ہیں لیکن ردیف وار دیوان میں شامل ہونے کے بعد ان کی مخصوص معنویت باقی نہیں رہتی۔ چینی ڈلی کے متعلق مرزا غالب کا ایک مشہور قطعہ ان کے دیوان میں موجود ہے۔ اگر غالب اس قطعہ کے متعلق اپنے ایک خط میں صراحت نہ کرتے اور اس کے وجود میں آنے کی وجہ نہ بیان کرتے تو ہم اسے مرزا کا ایک عام قطعہ سمجھتے لیکن صراحت کی وجہ سے اس قطعے کی قدر و منزلت بہت بڑھ جاتی ہے۔ آزاد اس رمز سے بخوبی واقف تھے۔ (۲۲)

دیوانِ ذوق کی تدوین کرتے ہوئے آزاد نے اس طریقِ کار کو استعمال نہیں کیا۔ یہ کام آزاد کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ذوق نے اپنے ابتدائی عمر اور عنفوانِ شباب کے کلام میں بہت تبدیلیاں کی تھیں۔ یہ تبدیلیاں مختلف اوقات میں سامنے آئیں۔ ایسے کلام کی زمانی ترتیب میں مشکل یہ پیش آتی ہے کہ اسے زمانی ترتیب میں کس مقام پر رکھا جائے؟ کیونکہ ابتدائی عمر کے کلام میں اگر اخیر عمر میں تبدیلیاں کی گئیں یا اشعار کے اضافے کیے گئے تو وہ نہ ابتدائی عمر کا کلام رہا اور نہ تمام اخیر عمر کا کلام۔ غالباً اسی مشکل کے پیشِ نظر آزاد نے اس طریقِ کار کو تدوینِ کلامِ ذوق میں نہیں برتا ہوگا۔ آزاد نے اس کی بجائے مروجہ طریقِ کار کو سامنے رکھتے ہوئے کلام کو ردیف وار درج کر دیا البتہ اس اندراج کے ساتھ اضافہ یہ کیا کہ بیشتر غزلوں یا قصائد وغیرہ کے اندراج کے سنہ تخلیق یا عہد کا تعین کر دیا جس سے ذوق کے کلام کے ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ڈاکٹر انصار اللہ نے کلام کے اندراج کے طریقِ کار پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

آزاد سے پہلے عام طور پر دواوین کی ترتیب بہ لحاظ ردیف ہوتی تھی۔ آزاد نے اس پر اضافہ کیا۔ یعنی ہر ردیف کی غزلوں کی ترتیب کرنی چاہی ہے کہ پہلے استاد کا معتبر اور مستند کلام ہے پھر وہ غزلیں ہیں جن پر انھوں نے نظرِ ثانی نہیں کی تھی۔ پھر وہ غزلیں جو کسی دوسرے (نسبتاً کم معتبر) ذریعہ سے ان تک پہنچی تھیں اور آخر میں ناتمام غزلیات اور ابیات۔ یہ صحیح ہے کہ آزاد نے اپنے اس طریقِ کار کی صراحت نہیں کی ہے لیکن دیوانِ ذوق کے بغور مطالعہ کے بعد اسے محسوس کر لینا مشکل نہیں۔ (۲۳)

ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال جزوی صداقت کا حامل ہے۔ آزاد نے بالعموم ایسا ہی کیا ہے لیکن ہر جگہ اس اصول کی پابندی نہیں کی۔ اس مؤقف کی تصدیق یائے تحتانی کی غزلوں سے ہوتی ہے۔ یائے تحتانی کے تحت درج پہلی غزل کے اندراج سے پہلے یہ عبارت تحریر ہے۔ ''بہت پرانی غزل ہے۔ والد مرحوم کے لڑکپن کی بیاض میں لکھی تھی۔ ص والے شعر کو دیکھو وارستگاں جمع ہے اور بے اضافت بے صفت باندھ دیا ہے۔ جب وقت کا محاورہ یہی تھا۔'' (۲۴) مذکورہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل ذوق کا ابتدائی کلام ہے اور ممکن ہے یہ کلام ''اصلاح کے نور سے بے نور'' بھی رہا ہو گا اسی طرح ص ۱۹۹ پر بھی ایک غزل کے اندراج سے قبل تحریر ہے کہ ''ابتدائے شباب کی غزل ہے۔ نظرِ ثانی نہیں ہوئی'' ۔ص ۲۰۸، ۲۰۹ اور اس کے بعد کے صفحات میں بھی اسی طرح کی عبارتیں لکھی گئی ہیں لیکن ص ۲۱۹ پر ذوق کی یہ غزل درج ہے جس کا مطلع ہے:

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے　　　اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

اس غزل سے پہلے کوئی عبارت تحریر نہیں۔ ڈاکٹر انصار اللہ کے مؤقف کے مطابق اسے بھی ابتدائی عمر یا ابتدائے شباب کا کلام ہونا چاہیے لیکن دیوان کے مقدمہ میں اسے اواخر عمر کا کلام بتایا گیا ہے۔ (۲۵) جس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آزاد نے غزلوں کے اندراج میں وہی طریقِ کار سامنے رکھا ہوگا جس کی نشاندہی ڈاکٹر انصار اللہ نے کی ہے لیکن اس کی مکمل پابندی نہیں کر سکے۔ اس کی تصدیق حافظ محمود شیرانی کے مقالے ''شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد اور دیوانِ ذوق سے بھی ہوتی ہے۔ (۲۶)

مُدَوِّن کا فرض ہے کہ وہ جس شاعر کا کلام مُدَوَّن کر رہا ہے اس شاعر کے منسوخ کلام کی نشاندہی بھی کرے۔ آزاد کے مرتبہ دیوانِ ذوق میں یہ خوبی بھی نظر آتی ہے۔ ص ۱۳۲ پر ذوق کی وہ غزل جس کا ردیف وقافیہ ''جدھر کو دیکھتے ہیں، کدھر کو دیکھتے ہیں'' ہے اس غزل کے اندراج سے قبل یہ شعر لکھا ہے:

گہر کو جوہری، صرّاف زر کو دیکھتے ہیں　　　بشر کو دیکھنے والے بشر کو دیکھتے ہیں

اور اس پر یہ حاشیہ ایزاد کیا ہے ''مطلع مرقومہ حاشیہ کو استاد مرحوم نے بیاض خاص میں سے کاٹ دیا تھا۔ میں نے پوچھا،

فرمایا' سودا کے ایک مطلع سے بہت ملتا ہے۔ لڑکپن میں خدا جانے کیوں کر ہو گیا تھا'۔ دیوانِ سابق میں یہ مطلع چھپ گیا۔ اہلِ تالیف بے چاروں کو کیا خبر۔ سب کو خدا مغفرت کرے،،(۲۷)

منشائے مصنف کے مطابق متن کے تعین کے بعد، متن کو قابلِ فہم بنانے، کلام میں موجود مشکل مقامات کی تسہیل کرنے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ کلام کی تخلیق کے محرکات اور اسباب پر روشنی ڈالنے کا مرحلہ آتا ہے۔ آزاد نے جگہ جگہ غزلوں، قصائد اور مثنویات کے اندراج سے قبل ان اسباب اور محرکات پر روشنی ڈالی ہے جس کی بنا پر وہ کلام تخلیق ہوا۔ آزاد کے اس طریقِ کار سے ذوق کے کلام کو اس کے صحیح پس منظر میں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس عمل نے ذوق کے کلام کی اہمیت دوگنا کر دی۔ اس کے علاوہ آزاد نے انیسویں صدی کی ادبی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس عمل سے ذوق کے کلام کی تفہیم کے علاوہ انیسویں صدی کے شعری منظرنامے کے بہت سے مخفی در وا بھی ہوتے ہیں۔

دیوانِ ذوق میں آزاد نے یہ چار شعر درج کیے ہیں:

ہیں بتاں محو خود نمائی میں	بیر ہے پر خودی خدائی میں
ہو کے اک بوسہ پر ترش ابرو	بات کو ڈالنا کھٹائی میں؟
نہیں بگی میں وہ فرنگی زاد	ماہ ہے منزل ہوائی میں
ذوق ہے ایک رند شاہد باز	اس کو کیا دخل پارسائی میں

ان اشعار کی آزاد نے جس انداز سے تفہیم اور تشریح کی ہے اس سے اشعار کی تفہیم کے علاوہ انیسویں صدی کی شعری اور تہذیبی صورت حال کو سمجھنے میں مدد بھی ملتی ہے۔

وہ ایسا زمانہ تھا کہ بتاں کا لفظ بے اضافت محاورہ میں عام تھا۔ میر و سودا کے دیکھنے والے موجود تھے۔ ولی کی زبان یہی تھی۔ اسی محاورہ میں انھوں نے شعر کہا۔ بگی کی سواری اور فرنگی زاد کا مضمون اس وقت نیا معلوم ہوتا تھا۔ فرمایا، یہ وہ زمانہ تھا کہ کوئی فرنگی دلّی میں نظر آتا تو ایک عجیب صنعت الٰہی سمجھ کر باہم دکھایا کرتے تھے کہ دیکھو وہ فرنگی جاتا ہے۔ زمانہ کا مزاج اور اس کی طبیعت کا ایک عالم ہے کہ بدلتا چلا جاتا ہے۔ جو لفظ آج سماعت کو ناگوار ہے۔ اس وقت خوشگوار تھا۔ ورنہ آسان ہے کہہ دیتے

ع ہیں صنم محوِ خود نمائی میں (۲۸)

حاشیہ نگاری تدوینِ متن کا ایک اہم اور لازمی جزو ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے خیال میں '' حاشیہ نگاری بیشتر حالتوں میں ایک مرتب متن کے لیے متن کے اساسی ڈھانچے سے باہر کا عمل ہوتا ہے۔،،(۲۹) اس کے باوجود اس کا تعلق متن کے ساتھ بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے متن میں موجود بہت سے مشکل اور قابلِ وضاحت مقامات کی تسہیل، تشریح، توضیح اور اختلافِ متن کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ محمد حسین آزاد نے دیوانِ ذوق کی تدوین کے ساتھ

ساتھ کلامِ ذوق کی تفہیم، تسہیل، توضیح اور تشریح کے لیے حواشی کا سہارا لیا۔ آج حاشیہ نگاری متن سے باہر کا عمل ہے لیکن آزاد نے اس کا استعمال درمیانِ متن اور حواشی دونوں مقامات پر کیا ہے۔

آزاد کے یہ حواشی کئی طرح کے ہیں۔ بعض حواشی وہ ہیں جن میں اشعار کی تفہیم اور تسہیل کو ممکن بنایا ہے تاکہ قاری شعر کی درست تفہیم کر سکے۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے:

پردہ میں چشم مست کے سرخوش ہیں جو مدام　　شرب الیہود کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم

اس شعر کے حاشیے میں لکھتے ہیں:

شرب الیہود، یہودی لوگ کئی ہزار برس سے ایسی حالت میں ہیں کہ جس ملک میں ہوں کمزور رہتے ہیں اور اس واسطے خواہ عیسائیوں خواہ مسلمانوں کے ماتحت ہوں، خوشحالی نہیں ظاہر کرتے۔ عیسائیوں سے زیادہ تر دبے رہتے ہیں۔ شراب بھی کم پیتے ہیں اور چھپ کر پیتے ہیں۔ اہلِ ایران نے شراب الیہود کی اصطلاح مقرر کر دی یعنی کم پینی اور چھپ کر پینی۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم شراب نہیں پیتے۔ چشم مست کی یاد میں در پردہ خوش رہتے ہیں گویا ہماری مے خواری یہودیوں کی شراب خوری ہے۔ (۳۰)

ایک اور مقام پر یہ شعر درج ہے:

جتنا ہے نمک، سب مرے زخموں میں کھپاؤ　　پلکوں سے اٹھاؤ گے نہ ہاتھوں سے گراؤ

اس شعر کے حاشیے میں لکھتے ہیں: ''ایک مسئلہ لوگوں میں عام زبان زد ہے کہ نمک پھینکنا یا بے پروائی سے گرانا منع ہے۔ استاد کہتے ہیں کہ جتنا نمک ہے سب میرے زخموں میں کھپاؤ گے اٹھانا پڑے گا۔'' (۳۱)

ایک اور شعر دیکھیے:

جل جائے خاک وحشیِ چشمِ بتاں پہ گھاس　　لیکن ہرن کھری نہ رہے بن ہری ہوئے

اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں۔ ''ہرن کھری ایک گھاس ہے اس کے پتے کی شکل ہرن کے سُم سے ملتی ہے اس لیے یہ نام پایا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ عاشق چشم کے دل میں آگ لگ رہی ہے۔ قبر پر جو سبزہ اُگے گا جل جائے گا۔ ہاں ہرن کھری ضرور اُگے گی کہ ہرن کی آنکھیں خوب ہوتی ہیں اور یہ آنکھوں کے عاشق ہیں۔'' (۳۲)

بعض حواشی ایسے ہیں جو اشعار میں موجود محاورات کی تفہیم میں مدد دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

یوں تن خاکی میں دل روشن ہمارا ہو گیا　　جس طرح پانی کنوئیں کی تہہ میں تارا ہو گیا

حاشیہ: کوئیں کی تہہ کا تارا یا کنوئیں کا تارا، زبان اردو کا محاورہ ہے۔ کبھی نہایت گہرے اور پرانے کنوئیں میں دیکھتے ہیں۔ اندھیرے کے سبب سے کچھ نظر نہیں آتا۔ غور کے بعد پانی چمکتا دکھائی دیتا ہے۔ دیکھنے والا کہتا ہے۔ وہ پانی کا تارا چمکتا ہے۔ کبھی کہتے ہیں بڑا عمیق کنواں ہے۔ ہمارا دیکھا ہوا ہے۔ پانی دور کہیں تہ میں تارا چمکتا ہے۔ (۳۳)

اسی طرح یہ دو شعر دیکھیے:

تھا ذوق پہلے دلّی میں پنجاب کا سا حسن　　پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہہ گیا

حاشیہ: ہندوستان میں محاورہ تھا کہ جب کوئی موقع ہاتھ سے جاتا رہتا یا کسی کام کا وقت گزر جاتا تو کہتے تھے اب وہ پانی ملتان بہہ گیا یعنی اب نہ ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دریائے راوی جو لاہور کے نیچے بہتا ہے ملتان کی جانب سے چل کر پنجاب کے اور دریاؤں سے ملتا ہوا دریائے شور جا پڑتا ہے پھر اُسے ادھر آنے کا موقع نہیں۔ پس جب کسی امر فوت شدہ کے باب میں کہیں کہ اب وہ پانی ملتان بہہ گیا تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ دریا کے بہاؤ کی طرح اس کا موقع گزر گیا۔ اب نہ ہو سکے گا۔ (۳۴)

آبِ خنجر ہے جو زہر آب وفاداروں کو　　ملک سرحد ہے وفا پانی ذرا لگتا ہے

حاشیہ: بعض بعض پہاڑوں یا جزیروں کا پانی خاص طبیعت کے اشخاص کو ایسا ناموافق ہوتا ہے کہ امراض ملک میں گرفتار ہو کر مر جاتے ہیں۔ محاورہ میں کہتے ہیں کہ فلاں مقام کا پانی لگتا ہے۔ فلاں شخص فلاں سفر میں مر گیا، پانی لگا تھا۔ (۳۵)

دیوانِ ذوق کے حواشی کی تیسری صورت یہ ہے کہ آزاد شعر میں استعمال ہونے والے الفاظ، اشیا کے نام اور رسوم و رواج جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مٹ گئے یا متروک ہو گئے، ان کے معانی و مفاہیم نئے عہد کے قاری پر منکشف کرتا ہے۔ آزاد کی عبارتوں میں بعض جملے ایسے بھی مل جاتے ہیں جن سے بدلتے ہوئے تہذیبی، معاشرتی اور تاریخی ماحول کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ آزاد کی عبارتیں نہ صرف انیسویں صدی کے ادبی اور تہذیبی ماحول کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں بلکہ بعض ایسے الفاظ بھی جو مرورِ زمانہ کے باعث نئے معانی سے متصف ہو چکے تھے۔ یہ عبارتیں اُن الفاظ پر پڑے ہوئے نئے پردوں کو ہٹا کر کلامِ ذوق کو سمجھنے میں مدد بھی دیتی ہیں۔ مثال میں اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

زبان ریختہ کر دی زباں اہل ولایت نے　　محبت ذوق کو از بسکہ ہے شاہِ ولایت سے

حاشیہ: ۳۰۔۴۰ برس ہوئے کہ اہل ولایت مرد تازہ ولایت، شمشیر ولایت، عناب ولایتی، مرد ولایتی اور مرد ولایت زا اور بلی ولایتی کہتے تھے اور لوگ اس سے ولایت ایران سمجھتے تھے۔ اب کوئی ولایت کہتا ہے تو انگلستان سمجھتے ہیں۔ دیکھو، لفظ وہی ہے مفہوم بدل گیا۔ (۳۶)

بلا سے ہووے مرا مرغ نامہ بر بھونرا　　کہ اس کو دیکھ کے وہ منہ سے خوش خبر تو کہے

حاشیہ: دلی میں رسم تھی کہ جب بھنورا اڑتا ہوا پاس آتا تھا تو اسے شگون نیک سمجھتے تھے اور کہتے تھے خوش خبر۔ خاندان تباہ ہو گئے۔ وہ لوگ نہ رہے۔ کون کہے اور کون سنے۔ (۳۷)

رتبہ گل بازی کا دِلا کاش تو پاتا (کذا) ہاتھوں سے جو گرتا تو وہ آنکھوں سے اٹھاتا

حاشیہ: ہندوستان کے نوجوانوں میں یہ بھی ایک کھیل ہے کہ دو یار آمنے سامنے ایک گلاب یا گیندے کا پھول لے کر چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ اس پر پھینکتا ہے وہ اُس پر۔ ۱۰۔ ۱۵ دفعہ برابر ردّ و بدل رہتی ہے۔ جس کے ہاتھ سے پھول گر پڑتا وہ ہار جاتا۔ ہارنے کی سزا یہ تھی کہ اٹھاؤ آنکھوں سے۔ جرأت کے شعر میں لطف یہ ہے کہ کہتا ہے کاش میرا دل یار کی گل بازی کے کام آتا۔ اگرچہ بہت سی چوٹیں کھانی پڑتی ہیں اور گرتا لیکن اس کے ہاتھوں اور ہاتھوں سے آنکھوں تک تو جا پہنچتا۔ (۳۸)

برنگ بیضۂ نوروز، توڑے دل اس نے ہزاروں، ایک ہمارا ہے کس قطار میں دل

حاشیہ: قطار۔ بہار نوروز میں لوگ ہار جیت پر انڈے لڑاتے تھے۔ اس کے کئی طریقے تھے۔ ایک یہ بھی تھا کہ دو دو آدمی ۲۰۔ ۲۰، ۳۰۔ ۳۰ انڈے لے کر اپنی اپنی قطار باندھتے تھے۔ ہر ایک اپنی قطار سے ایک ایک انڈا لیتا تھا اور حریف سے لڑایا جاتا تھا۔ جس کا انڈا آخر کو ٹوٹتا اس کی ہار ہوتی تھی۔ حریف ٹوٹے ثابت سب انڈے لے لیتا تھا۔ اسے قطار لڑانا کہتے تھے۔ یہ سب ایران، توران، افغانستان سے ہو کر ہندوستان میں آئی تھی۔ (۳۹)

حواشی کی چوتھی صورت یہ ہے کہ اشعار میں موجود مشکل الفاظ کے معانی بھی حاشیے میں درج کر دیے ہیں۔ آج فرہنگ علیحدہ درج کی جاتی ہے۔ یہ حواشیِ آزاد کی توسیعی صورت ہے۔ مثلاً یہ شعر:

تیرے عصا کو اس سے میں تشبیہ کیونکہ دوں ہے شاخ سدرہ ایک کنار کہن کی شاخ

حاشیے میں لفظ ''کُنار'' درج کیا ہے اور اس کے ساتھ اس کا معنی ''بیر'' درج کر دیا ہے۔ لفظ کُنار میں حرف کاف پر پیش کی علامت بھی لگا دی ہے جس سے لفظ کا صحیح تلفظ بھی معلوم ہوتا ہے۔ (۴۰)

اس حوالے سے تین اور شعر دیکھیے:

چھوٹے جلانے والوں سے وحشی نہ مر کے بھی انجن کے کام آئے اگر ہے ہرن کی شاخ

حاشیہ: انجن۔ سُرمہ (۴۱)

تو ہے وہ نسل خواقیں بہ تتار آفاق جس نے توراں سے کیا ہند میں آ کر قشلاق

حاشیہ: قشلاق۔ گرم ملک جہاں سرد پہاڑوں کے لوگ آ کر سردی کے دن بسر کریں (۴۲)

گر ترا مہر طبیعت ہو بہ جوزائے غضب زمہریر از پۓ آرام جہاں ہو ییلاق

حاشیہ: ییلاق۔ سرد ملک جہاں گرمی کے دنوں میں آرام کریں۔ (۴۳)

تیرے شیلان کرم پر ہے زمانہ مہماں مہ و انجم سے فلک پر ہیں مہیا اطباق

حاشیہ: شیلان۔ دسترخوان شاہ (۴۴)

دیوانِ ذوق میں حواشی کی ایک اور صورت بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہ حواشی کی وہ قسم ہے جس کا تعلق کلامِ ذوق سے تو نہیں لیکن آزاد کی اپنی عبارتوں سے ہے۔ آزاد ذوق کے ہم عصر اور شمالی ہند کی انیسویں صدی کی ادبی اور تہذیبی صورت حال کو دیکھے ہوئے تھے۔ مقدمہ لکھتے ہوئے یا غزلوں یا قصائد کے تخلیقی محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے جہاں کہیں بھی انھوں نے محسوس کیا کہ کوئی لفظ، فقرہ یا خیال وضاحت طلب ہے جس کی تفصیل اسی مقام پر درج کرنا ممکن نہیں یا غیر ضروری تھی یا تفصیل کے اندراج سے سلسلۂ خیال یا عبارت کا تسلسل ٹوٹتا ہو تو آزاد نے اس کے لیے بھی حواشی تحریر کیے ہیں۔ اس طرح کے حواشی تمام دیوان میں موجود ہیں۔ ان حواشی کو موجودہ دور میں تعلیقات کے نام سے موسوم بھی کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ عبارت دیکھیے:

''شہر کے اندر کابلی دروازہ کے پاس ہی استاد مرحوم رہتے تھے۔ باہر ایک باغ بادشاہی تیس ہزاری مشہور تھا۔''(۴۵)

اس میں ''تیس ہزاری'' پر یہ حاشیہ تحریر کیا ہے:

حاشیہ: اب تیس ہزاری باغ صاف ہو گیا۔ وہاں ریل چلتی ہے۔ زیب النسا کی قبر کا نام و نشان نہیں رہا۔ میں نے خود پڑھا ہے۔ 'فادخلی جنتی' عالمگیر کی کہی ہوئی تاریخ تعویز پر کندہ تھی۔ (۴۶) آزاد کے اس حاشیے سے نہ صرف تیس ہزاری باغ سے متعلق معلومات کے ساتھ ساتھ باغ کے مقام کا تعین بھی ہوتا ہے اور زیب النسا کی قبر اور اس کے کتبہ میں موجود قطعہ، تاریخ بھی سامنے آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ آزاد سے مادہ، تاریخ نقل کرنے میں تسامح ہوا ہے لیکن اس طرح کے حواشی بہت سی نئی معلومات اور ماخذ کا پتہ دیتے ہیں۔ اگر 'سیر المنازل' اور 'آثار الصنادید' جیسی تصانیف میں اس حوالے سے معلومات موجود نہ ہوں تو آزاد کی یہ عبارت بجائے خود ایک ایسی گم گشتہ ماضی کی یادگار ہے جس کی تصدیق کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود نہیں۔ (۴۷)

ایک اور مقام پر 'نصفی پلاؤ' کا لفظ استعمال کیا تو اس کے حاشیے میں لکھتے ہیں:

حاشیہ: اس پلاؤ کو کہتے ہیں کہ گوشت کی جگہ اس میں چنے کی دال دم دیتے ہیں گویا گوشت کا پلاؤ مراد ہے۔ (۴۸)

چند اور مثالیں ملاحظہ کیجیے:

(۱) اسی عالم میں یہ غزل ایک مرشد زادہ کی فرمائش سے کہی تھی۔

حاشیہ: مرشد زادہ۔ اہل قلعہ کے محاورہ میں عموماً شہزادہ کو کہتے تھے اور جو شہزادے قرابت قریبی کے لحاظ سے ایک وقت میں دعوے دار سلطنت کے ہو سکتے تھے وہ سلاطین کہلاتے تھے۔ مثلاً شاہِ موجود کا چچا بھائی وغیرہ وغیرہ (۴۹)

(۲) ابھی استاد تک شمع نہ آئی تھی کہ حضور کا خواص پہنچا۔

حاشیہ: بادشاہی ملازم جو بطور خدمت گار کاروبار کرتے تھے، خواص کہلاتے تھے۔ دیکھو! جمع کا صیغہ ہے مگر اراکین

دربار کی زبانوں اور دفتروں کے کاغذوں میں بمعنی واحد مستعمل تھا۔ (۵۰)

(۳) اسی وقت بیگم کا حکم پہنچا۔

حاشیہ: بیگم سے مراد زینت محل بیگم تھیں کہ بادشاہ نے وزارت سلطنت ان کے نام کردی تھی اور ان کی طرف سے محبوب خواجہ سرا کل دربار اور کاروبار کا انتظام کرتا تھا۔ خلیفہ اسمٰعیل کے پاس بعض خدمتیں تھیں وہ بیگم نے لے لی تھیں۔ اس لیے اسے ہمیشہ خطر تھا کہ شاید استاد بیٹے کی سفارش کریں یا میرے برخلاف کچھ کہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ بادشاہ استاد کی بات کا بہت لحاظ کرتے تھے مگر استاد نے نہ پہلے نہ بعد خلیفہ مرحوم کی سفارش میں کچھ کہا نہ بیگم کی شکایت کی بلکہ حق یہ ہے کہ کسی شکایت سے بھی زبان آلودہ نہیں کی۔ ان کا قول تھا کہ زبان جو ہر لطیف ہے اسے عیب سے آلودہ کرنا اچھی بات نہیں۔ (۵۱)

مذکورہ بالا حواشی سے نہ صرف متن میں موجود لفظ یا عبارت کی تفہیم ہوتی ہے بلکہ بہت سی تہذیبی اور ادبی معلومات سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ وہ معلومات ہیں جنھیں متن میں عبارت کے ساتھ بیان کیا جانا مناسب نہیں تاہم حواشی میں ان کا اندراج خوشگوار اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

متن میں موجود وضاحت طلب مقامات، اختلاف نسخ یا اسی طرح کی دوسری صورتوں کو حواشی میں پیش کرنے کے لیے مختلف قسم کی علامات کا استعمال موجودہ عہد کی تدوین میں کثرت سے کیا جا رہا ہے۔ اس کے ابتدائی نقوش بھی دیوانِ ذوق میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ دیوانِ ذوق میں تین طرح کے علامتیں موجود ہیں۔ ایک علامت حرف 'ن' کی ہے۔ یہ علامت متن میں موجود ذوق کے کسی شعر یا مصرع پر درج ہوتی ہے اور حاشیے میں یہی علامت درج کر کے اسی شعر یا مصرع کی دوسری متنی صورت درج ہوتی ہے۔ اس صورت میں کہیں لفظ کی تبدیلی ہوتی ہے تو کہیں پورا مصرع یا شعر مختلف ہوتا ہے۔ اس طریقِ کار کی وضاحت آزاد نے کہیں نہیں کی لیکن دیوانِ ذوق کا بالاستیعاب مطالعہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ آزاد نے متن میں اصلاح شدہ کلام درج کیا ہے اور حاشیے میں اصلاح سے قبل متن درج کیا ہے۔

دوسری علامت 'ؔ' کی ہے۔ آزاد نے اس علامت کو بھی شعر پر درج کیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ نشان زد شعر وضاحت طلب ہے۔ یہ وضاحت کسی لفظ کی یا کسی مخصوص صورت حال کی کرنا مقصود ہوتی ہے اور اس کی تصریح بالعموم جس غزل کے شعر پر یہ نشان موجود ہو اس سے قبل کسی واقعہ میں کر دی جاتی ہے۔ ذیل میں ایسی چار عبارتیں پیش کی جاتیں ہیں جن میں آزاد نے مذکورہ علامت کی نشاندہی کی ہے۔

(۱) ''بہت پرانی غزل ہے۔ والد مرحوم کے لڑکپن کی بیاض میں لکھی تھی۔ 'ؔ' والے شعر کو دیکھو وارستگاں جمع ہے اور بے اضافت بے صفت باندھ دیا ہے۔ جب وقت کا محاورہ یہی تھا۔ (۵۲)

(۲) جس شعر پر '' ہے اس میں شاہ نصیر کی برکت اور پیرانہ سالی کا اشارہ ہے۔ (۵۳)

(۳) مشاعرہ ہوا۔۔۔ہم نے بھی غزل پڑھی۔۔۔ بڑی تعریفیں ہوئیں اور '' والے شعر پر تو اللہ اللہ خوب غلغلے اور ولولے ہوئے۔ بات نہ سنائی دیتی تھی۔ (۵۴)

(۴) شعر '' کو دیکھو استاد کے ہاں بھی یہی مضمون تھا۔ (۵۵)

دورانِ غزل شاعر قطعہ بھی کہہ جاتے تھے۔ آزاد سے قبل بالعموم یہ روایت تھی کہ اس قطعہ کو علیحدہ قطعہ کا عنوان دے کر درج کرتے تھے۔ اور پھر غزل کے اشعار درج کرتے تھے۔ دیــوانِ ذوق مرتبہ ویران میں بھی بیشتر مقامات پر یہی طریقِ کار استعمال ہوا ہے۔ (۵۶) لیکن آزاد نے اس طریقِ کار کو تبدیل اس طرح کیا کہ غزل کا اندراج مسلسل رکھا اور دونوں مصرعوں کے درمیان ''ق'' کی علامت درج کر دی جس سے غزل کا تسلسل ٹوٹنے نہیں پاتا اور قطعہ کی موجودگی کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔ آج یہی طریقِ کار استعمال کیا جا رہا ہے۔

تدوینِ متن کا سب سے آخری مرحلہ مقدمہ تحریر کرنا ہوتا ہے جس میں مدون تفصیل سے تدوین کے مقاصد، تدوین کردہ کلام یا تصنیف کی اہمیت، شاعر یا مصنف کی سوانح، اور ادبی صورت حال میں مصنف یا شاعر کے کلام یا تصنیف کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے بغیر کسی شاعر یا مصنف کی تخلیق یا تصنیف کا عملی مطالعہ ممکن نہیں ہوتا۔ آزاد کے عہد میں شعرا کے جو دواوین و کلیات شائع ہوتے تھے ان میں شعرا کی سوانح، ادبی مقام اور عہد کے حالات پر کوئی تفصیلی مقدمہ نہیں ہوتا تھا۔ اس حوالے سے آزاد افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''ہر چند کلام ان کے کمال کی یادگار موجود ہیں مگر فقط دیوان جو بکتے پھرتے ہیں بغیر تفصیلی حالات کے اس مقصود کا حق پورا پورا ادا نہیں کر سکتے، نہ اُس زمانے کا عالم اس زمانے میں دکھا سکتے ہیں اور یہ نہ ہوا تو کچھ بھی نہ ہوا۔'' (۵۷)

آزاد نے دیــوانِ ذوق کے آغاز میں ایک جامع مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ آغاز میں کلام ذوق کی تدوین کے مقاصد پر روشنی ڈالنے کے بعد ذوق کی سوانح اور ان کی تخلیقی شخصیت کی صورت گری کی ہے۔ یہ مقدمہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ مقدمے کے آغاز میں کلام ذوق کی تدوین کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔ آزاد کا بیان ہے:

> یہ علم معنی کی روحیں ہیں کہ الفاظ کی دنیا میں اتری تھیں۔ ذوق و شوق کے وعدے تھے کہ دلوں کو آگاہ کریں گے۔ استاد مرحوم یہ حسرت ساتھ لے گئے۔ والد میرے شہید آرزو ہوئے۔ میں بڈھا ہو گیا۔ اب خطر ہے کہ امانت رہے اور آزاد کو مسافر خانہ سے کوچ کا حکم آ جائے۔ ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں۔ صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس لکھے تھے۔ دیوان مروجہ میں کچھ چھپے اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سُنے کبھی کچھ سُنے۔ پھٹے پرانے مسودے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت تحریریں، بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر و غائب لکھتا اور جمع کرتا تھا۔ کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا، مٹے حرفوں کا اجالنا،

اس زمانہ کے خیالات کو سمیٹنا، حالتوں کا تصور باندھنا، بھولے بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا ،میرا کام نہ تھا۔ خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شامل حال تھی۔ میں حاضر اور خدا ناظر تھا۔ راتیں صبح ہو گئیں اور دن اندھیرے ہو گئے۔ جب یہ مہم سرانجام ہوئی۔ (۵۸)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

انھوں نے (حافظ ویران وغیرہ) اس مہم (تدوینِ دیوانِ ذوق) کا سرانجام کیا اور ۱۲۷۹ میں ایک مجموعہ جس میں اکثر غزلیں تمام اکثر ناتمام بہت سے متفرق اشعار اور چند قصیدے ہیں چھاپ کر نکالا مگر دردمندی کی آنکھوں سے لہو ٹپکا کیونکہ جس شخص نے دنیا کی لذتیں۔۔۔ چھوڑیں اور ایک شعر کو لیا جس کی انتہا تمنا یہی ہوگی کہ اس کی بدولت نام نیک باقی رہے گا۔ تباہ کار زمانہ کے ہاتھوں آج اس کی عمر بھر کی محنت نے یہ سرمایہ دیا اور جس نے ادنیٰ ادنیٰ شاگردوں کو صاحب دیوان کر دیا اس کو یہ دیوان نصیب ہوا۔

ع یوں ہی خدا جو چاہے تو بندہ کا کیا چلے

میرے پاس بعض قصیدے ہیں اکثر غزلیں ہیں، یہ داخل ہو جائیں گی یا ناتمام غزلیں پوری ہو جائیں گی مگر تصنیف کے دریا میں سے پیاس بھر پانی بھی نہیں۔ جو غزلیں اپنے تخلص سے کہی تھیں اگر جمع کی جاتیں تو بادشاہ کے چاروں دیوانوں کے برابر ہوتیں۔ (۵۹)

آزاد کے مندرجہ بالا بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوق اپنا تمام کلام خود مرتب کرنا چاہتے تھے۔ مولوی محمد باقر (آزاد کے والد) کی خواہش بھی یہی تھی لیکن ان دونوں کی آرزوؤں کو تعبیر نہ مل سکی۔ ذوق کے دوسرے شاگردوں حافظ ویران، مرزا انور اور ظہیر الدین ظہیر نے یہ کام کیا لیکن ادھورا رہا۔ اب آزاد خود عمر رسیدہ ہو چکے تھے اگر وہ یہ کام نہ کرتے تو استاد اور والد دونوں کی خواہش کبھی پوری نہ ہو پاتی اور وہ علمی سرمایہ جو ذوق کی وساطت سے آزاد تک پہنچا تھا ضائع ہو کر رہ جاتا۔

دیوانِ ذوق کی تدوین کے مقاصد کے بیان کے بعد ذوق کی سوانح لکھی ہے۔ یہ محض واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ اس سے ذوق کی سوانح کے ساتھ ساتھ شخصیت، کردار اور علمی مرتبہ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ آزاد کا بیان ہے۔ ''پہلے مرحوم و مغفور کا حال سوانح عمری کے طور پر لکھتا ہوں اور جس جس موقع پر کوئی خاص صورت پیش آئی یا کوئی نظم کسی تقریبِ خاص سے لکھی گئی یا کوئی لطیفہ قابل آگاہی شگفتہ ہوا وہ بھی جا بجا درج کرتا ہوں۔'' (۶۰)

سوانح کے ضمن میں بہت سے ایسے واقعات اور لطائف و ظرائف بھی تحریر کیے ہیں جو بظاہر تضیع اوقات اور فضول لگتے ہیں۔ آزاد کو خود بھی اس کا احساس تھا کہ لوگ اس عمل پر چیں بہ جبیں ہوں گے۔

تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو بعض لوگ فضول سمجھیں گے مگر کیا کروں جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی

حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں ۔ یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے لیکن نہیں ۔ اس شعر کے پتلے کا ایک ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا ۔ ایک صنعت کاری کی کل میں کون سے پرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو ۔ یہ کام کا نہیں اور کونسی حرکت اس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا ۔ اسی واسطے میں لکھوں گا اور سب کچھ لکھوں گا جو بات سلسلہء حالات میں مسلسل ہو سکے گی ایک حرف نہ چھوڑوں گا ۔ (۶۱)

دراصل یہاں آزاد یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ سوانح کے ضمن میں وہ تمام باتیں تحریر میں آئیں گی جن سے ذوق کی شخصیت اور ادبی مقام کو سمجھنے میں مدد مل سکے ۔ اس کی تصدیق سید حسن بلگرامی کے نام خط سے بھی ہوتی ہے ۔ لکھتے ہیں ۔ ''میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ جس جس قصیدے یا غزل یا شعر کے موقع پہ کوئی معاملہ یا معرکہ پیش آیا تھا وہ بھی نقل کروں کیوں کہ میں ہر وقت کا حاضر باش تھا اور والد مرحوم اور وہ عالم طفولیت میں ساتھ رہے ۔ آپ اس کے لطف کو تصور فرمائیے گا ۔'' (۶۲)

آزاد کے ہم عصر جب کوئی دیوان ترتیب دیتے تو صرف کلام کو اکٹھا کرنے پر ہی محنت صَرف کرتے تھے ۔ شاعر کی سوانح اول تو لکھتے ہی نہیں تھے اور اگر کچھ لکھتے بھی تھے تو اس میں سوانح سے زیادہ عبارت آرائی اور لفاظی پر زور صَرف کیا جاتا تھا ۔ اس سے صاحب کلام کی نہ مکمل سوانح سامنے آتی تھی نہ شخصیت کے مخفی گوشوں سے پردہ اٹھتا تھا اور نہ ہی اس کا ادبی مقام متعین کیا جاتا تھا ۔ آزاد نے اس طرح کا خیال آبِ حیات کے دیباچے میں بھی پیش کیا ہے :

ہر چند کلام ان کے کمال کی یادگار موجود ہے مگر فقط دیوان جو بکتے پھرتے ہیں بغیر ان کے تفصیل حالات کے اس مقصود کا حق پورا پورا نہیں ادا کر سکتے نہ اس زمانہ کا عالم اس زمانہ میں دکھا سکتے ہیں اور یہ نہ ہوا تو کچھ بھی نہ ہوا ۔ (۶۳)

اس لیے آزاد نے سوانح ، شخصیت ، کردار سازی اور ادبی مقام کے بیان کو مقدمہ میں پیش کرنا ضروری خیال کیا ہے اور لوگوں کے اس گمان کو کہ مقدمہ میں شاعر کی سوانح اور ادبی مقام و مرتبہ کا بیان فضول ہوتا ہے ، کو دُرست خیال نہیں کیا ۔ بہر حال مقدمے میں شخصیت سازی اور سوانح نگاری کی جو مفصل روایت آزاد نے ڈالی ہے وہ اولیات آزاد میں سے ہے ۔ اس کا سہرا آزاد کو جاتا ہے ۔

سوانح کے ضمن میں آزاد نے ذوق کی پیدائش ، شعر گوئی کا آغاز ، اساتذہ سے اصلاح ، قلعہ معلی کی ملازمت ، شاگردوں سے سلوک ، اخلاق و عادات ، ادبی سرگرمیاں ، خطاب کا حصول ، تاریخ گوئی سے دلچسپی اور وفات کا بیان کیا ہے ۔ گویا پیدائش سے وفات تک کا تاریخی ارتقا ذوق کی سوانح میں ملتا ہے ۔ دوسرے حصے میں ذوق کی علمی استعداد ، عادات و اطوار ، کلام ، تدوین کلام اور کلام کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے ۔ تیسرے حصے میں ذوق کے کلام کے

تخلیقی اور سماجی محرکات پر روشنی ڈالی ہے اور ذوق کے معترضین کا جواب دے کر ذوق کے ادبی مرتبے کا تعین کیا ہے۔

یہ وہ متنی اصول ہیں جنھیں بروئے کار لاتے ہوئے آزاد نے اپنے استاد کے کلام کی تدوین کی ہے۔ دیوانِ ذوق کی تدوین کا خاکہ، ترتیبِ دیوان کے اصول اور طریق کار لاشعوری طور پر سامنے نہیں آیا بلکہ یہ سب کچھ دیوانِ ذوق کی تدوین سے پہلے آزاد کے ذہن میں موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میجر سید حسن بلگرامی کے نام خط میں لکھتے ہیں: ''آج تک کسی شاعر کا دیوان ایسا مرتب نہ ہوا ہوگا۔''(۶۴) دیوانِ ذوق میں برتے گئے یہی اصول آج کم و بیش متنی تدوین کے اصول قرار پاتے ہیں۔ آزاد کے مرتبہ دیوانِ ذوق پر حافظ محمود شیرانی، عطا کاکوی، ڈاکٹر انصاراللہ نظر، ڈاکٹر محمد صادق، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور ڈاکٹر عابد پیشاوری نے اپنی تحریروں میں روشنی ڈالی ہے(۶۵) اور اُن پہلوؤں کو بالخصوص نشان زد کیا ہے جن سے آزاد کا ایک منفی چہرہ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ اِن مضامین کے باعث آزاد کی شخصیت ایک ناکام مُدوِن کے طور پر سامنے آتی ہے لیکن ڈاکٹر انصاراللہ نظر نے اپنے مضمون ''اردو میں تدوین'' میں اُن مثبت پہلوؤں کی نشان دہی بھی کی ہے جس سے آزاد ایک اچھے مُدوِن کے طور پر سامنے آتے ہیں۔(۶۶) اسی طرح ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کلیاتِ ذوق کے مقدمے اور ڈاکٹر محمد صادق نے اپنے مضمون ''تدوینِ دیوانِ ذوق'' میں ذوق کے کلام میں آزاد کی خود کردہ تبدیلیوں کی ایسی وجوہات بھی پیش کی ہیں جن سے آزاد کی شخصیت کا ایک بہتر روپ بھی سامنے آتا ہے اور آزاد پر لگائے گئے الزامات کا کچھ ازالہ ضرور ہو جاتا ہے۔(۶۷)

یہ امر مسلمہ ہے کہ آزاد نے ذوق کے کلام میں دانستہ تبدیلیاں کی ہیں۔ ایک مُدوِن کو یہ عمل زیب نہیں دیتا لیکن کیا اس طرح کے جرم میں فقط آزاد اکیلے ہی شریک ہیں؟ کیا ان سے قبل میر علی اوسط رشک نے ناسخ کے کلیات کی ترتیب کے وقت اپنے استاد کے کلام میں اصلاح نہیں کی؟ کیا مصحفی کے کلام پر اس طرح کا عمل امیر اور اسیر نے نہیں کیا؟(۶۸) ۱۸۵۷ء کی گارساں دتاسی کی ایک تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے دیوانِ ولی کا ایک ایڈیشن بمبئی سے شائع ہوا۔ مرتبین نے زبان کی اجنبیت اور غرابت کو دور کرنے کے لیے اس کے کلام پر اصلاح دی اور قدیم الفاظ کی جگہ نئے الفاظ استعمال کر کے کلامِ ولی کو نئے لباس میں پیش کیا گیا۔ اسی طرح حمید عظیم آبادی کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے شاد کے کلام پر اصلاح دی(۶۹) اگر انھوں نے بھی ایسا کیا ہے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس طرح کا عمل حد درجہ بڑھی ہوئی عقیدت کے زیر اثر ہوتا ہے۔ آزاد کے عہد تک اس طرح کی روایت کے کچھ نہ کچھ عناصر موجود تھے اور یقیناً یہ آزاد کے علم میں بھی ہوگا۔ کلام ذوق میں تبدیلیوں کے پسِ پردہ ایک محرک یہ بھی رہا ہوگا۔ اس طرح کی تبدیلیوں کا مقصد صرف اور صرف یہ ہوتا تھا کہ شاگرد اپنے استاد کے کلام کو اپنی عصری زبان و بیان اور روزمرہ کے مطابق ڈھال دیں تاکہ وہ اس عہد کے لیے قابلِ قبول ہو جائے اور ان کا یہ عمل ان کی دانست میں استاد کے احسانات کا کچھ نہ کچھ بدلا اُتارنے کے مترادف ہوتا ہوگا۔

کلامِ ذوق کی اصلاح کے نتیجے میں آزاد پر جو لعن طعن ہوئی اس سے ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ بلاشبہ کسی شاعر یا مصنف کے کلام یا تصنیف کی تدوین کے لیے مذکورہ شخصیت سے محبت ایک ناگزیر ضرورت ہے اور اس کے بغیر اچھی تدوین ممکن بھی نہیں لیکن والہانہ عقیدت، حد سے بڑھی ہوئی محبت اور بے جا طرف داری بسا اوقات مُدوِّن کی محنتوں پر پانی بھی پھیر دیتی ہے۔ دیـــوانِ ذوق کی ترتیب کے حوالے سے آزاد کی مخالفت میں جو مضامین سامنے آئے اس کی ذمہ داری آزاد کی اسی حد سے بڑھی ہوئی عقیدت کا سبب ہیں۔

تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ دیوانِ ذوق کی تدوین کو آج کے رائج معیارات کی روشنی میں نہ دیکھا جائے بلکہ ایک صدی قبل کے مُروّجہ اصولوں کے تناظر میں دیکھا جائے۔ اس طرح آزاد ایک ایسے مُدوِّن کے طور پر سامنے آئیں گے جس نے تدوینِ متن کے نئے اصول ہی وضع نہیں کیے بلکہ تدوینِ متن کی ایک ایسی روایت بھی قائم کی جو آنے والے دور کے مُدوِّنین کے لیے راہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام دے رہی ہے۔ تدوینِ متن کی روایت میں آزاد کی یہی دین ہے جس کی اہمیت کو ان کی غلطیوں کے باوجود کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ فرخی، ص ۵۱۸

۲۔ دیکھیے: ویران، ص ۱۹

۳۔ دیکھیے: کاکوی، ص ۲۸۔۲۵

۴۔ دیکھیے: علوی، ۲۰۰۹ء، ص ۵۱۔۴۴

۵۔ دیکھیے: دفتر فصاحت، ص ۳۔ خواجہ وزیر نے اپنا کلام مرتب کر کے مالک مطبع مصطفائی کو دیا۔

۶۔ دیکھیے: کلیات اردو قلق، ص ا

۷۔ دیکھیے: دفترِ فصاحت، ص ۶

۸۔ غالب، ص ۵۲

۹۔ نظر، مئی ۱۹۶۸ء، ص ۱۲

۱۰۔ آزاد، ۱۹۳۳ء، ص ۲۔۱

۱۱۔ آزاد سید ناصر نذیر فراق کو لکھتے ہیں ''استاد مرحوم کا دیوان ایک دفعہ مرتب کیا وہ ضائع ہو گیا۔ اب فرصت پاؤں تو دوبارہ محنت کروں۔'' آزاد، محمد حسین: مکـــاتیـــب آزاد مرتب مرتضی حسین فاضل لکھنوی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۸۵۔ میں نے آزاد اور خلیفہ اسمٰعیل کو آزاد کے مذکورہ ذیل بیانات کی روشنی میں بھائی کہا ہے۔ آزاد مذاق

کو لکھتے ہیں: ''ان کا (ذوق) فرزند نہ رہا۔۔۔ یہ (اشعار) فرزندانِ معنوی ہیں۔ انھیں اللہ آپ کے اور میرے ہاتھوں عمر دیتا ہے۔'' (مکاتیبِ آزاد، ص۲۴۵) اسی طرح دیوانِ ذوق کے آخر میں 'نثر موزوں' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔ ''استاد کے کلام شاگرد کے لیے حقیقی اور تحقیقی بھائی ہوتے ہیں'' (ص۳۵۳) آبِ حیات میں لکھتے ہیں: ''خلیفہ محمد اسمٰعیل ان کے فرزند جسمانی کے ساتھ ہی ان کے فرزندانِ روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے'' (آزاد، ص۳۱۲) جس طرح شاعر کے اشعار اس کے فرزندِ معنوی ہوتے ہیں۔ اسی طرح شاگرد بھی معنوی فرزند ہوتے ہیں۔ اس طرح آزاد، ذوق کے معنوی فرزند اور خلیفہ اسماعیل کے بھائی قرار پاتے ہیں۔

۱۲۔ آزاد، ۱۹۳۳ء، ص۱

۱۳۔ آزاد، ۱۹۳۳ء، ص۲۷

۱۴۔ آزاد کا بیان ہے: غدر کے بعد عالم تباہی میں ایک دن میر موصوف (میر امیر علی) حافظ ویران کو مل گئے۔ حافظ کو اللہ مغفرت کرے۔ ان سے اشعار مفصلہ ذیل حاصل کیے اور مجھے دیے۔ (آزاد ۱۹۳۳ء، ص۳۵۰)

۱۵۔ آزاد، ۱۹۶۶ء ص۲۴۵

۱۶۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص۲۷

۱۷۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص۱۔ آزاد نے دیوانِ ذوق کی تدوین میں جتنی محنت صرف کی اس کی شہادت مولوی خلیل الرحمٰن کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے خود آزاد کو یہ مہم سر کرتے دیکھا تھا۔ ان کا بیان ہے: سخت گرمی، جون کا مہینہ دیوانِ ذوق کی ترتیب میں دن رات کی (بلا مبالغہ) مصروفیت، کتب خانے گیا تو ہر طرف سے دروازے بند، دستک دے کر ایک دروازہ کھلوایا اور فوراً بند کر دیا گیا۔ اندر اندھیرا گھپ، منت سماجت کر کے دروازہ کھلوایا۔ دیکھا کہ رقعہ متذکرہ بالا کے پانچ چھ (یا زیادہ، ٹھیک سے یاد نہیں رہا کہ کتنے) مختلف الٹ پھیر کے ساتھ، مسودے میز پر پڑے ہوئے ہیں۔ (صادق، ۱۹۷۳: حاشیہ ص۱۱۶۔۱۱۵)

۱۸۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص۳۵۳۔

۱۹۔ علوی، ۲۰۰۶ء، ص۲۱۵۔۲۱۴

۲۰۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص۱

۲۱۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص۳۲

۲۲۔ فرخی ص۵۳۷

۲۳۔ نظر، مئی ۱۹۶۸ء، ص۱۶

۲۴۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص۱۷۲

۲۵۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۳۷

۲۶۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۱۳۲۔۱۳۱

۲۷۔ دیکھیے: شیرانی، ص ۲۶۰۔۲۵۹

۲۸۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۱۴۵

۲۹۔ علوی، ۲۰۰۶ء، ص ۲۳۱

۳۰۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۱۲۲

۳۱۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۱۶۷

۳۲۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۲۲۵

۳۳۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۵۵

۳۴۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۶۱: حافظ محمود شیرانی نے آزاد کے محاورہ کے بارے میں تسامح کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

یہاں مولانا نے الٹی گنگا بہادی ہے۔ دریائے راوی ملتان کی طرف سے نہیں آتا بلکہ پنجاب کے اور دریاؤں کی طرح پنجاب کے شمالی پہاڑوں مقبوضہ ریاست چنبہ سے نکل کر شہر کے نیچے سے مادھو پور (ضلع گورداس پور) کے قریب میدان میں داخل ہوتا ہے اور جنوب مغرب کی سمت لے کر لاہور کے قریب ہوتا ہوا مادھو پور سے ۲۶۰ میل کے فاصلے پر دریائے چناب کے ساتھ جا ملتا ہے۔ یہ دریا ملتان کے علاقے سے گزرتے ہوئے پنجند پر، جو ریاست بہاول پور کی سرحد پر واقع ہے، دریائے ستلج سے جا ملتے ہیں۔ یہاں سے پانچوں دریا مل کر بہتے ہیں اور پنجند کے نام سے مشہور ہیں۔ مٹھن کوٹ کے مقام پر دریائے سندھ میں شامل ہو کر دریائے شور میں جا گرتے ہیں۔ (مقالاتِ شیرانی، جلد سوم، ص ۱۵۹)

۳۵۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۲۱۶

۳۶۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۳۱۸

۳۷۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۲۱۱

۳۸۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۱۶۶

۳۹۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۱۱۹

۴۰۔ دیکھیے: آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۱۰۱

۴۱۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۱۰۰

۴۲۔ آزاد ۱۹۳۳ء، ص ۲۷۹

۴۳۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۲۷۹

۴۴۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۲۷۹

۴۵۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۵۴

۴۶۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۵۴

۴۷۔ بیگ،ص۴۷میں یہ مادہ ءتاریخ ،'داخل جنتی' تحریر ہے۔اس سے زیب النسا کی وفات کی تاریخ (۶۵۱+۴۶۳=۱۱۱۴)ھ برآمد ہوتی ہے۔اس کی تصدیق خان،۲۰۰۳ء،ص۳۱۹ سے بھی ہوتی ہے۔

۴۸۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۴۲۔استاد محترم ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب نے نشاندہی کی کہ اسے قبولی بھی کہتے ہیں۔

۴۹۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۸۱

۵۰۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۱۷۴

۵۱۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۳۰۱

۵۲۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۱۷۲

۵۳۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۱۴۹

۵۴۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۱۷۹

۵۵۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۲۰۶

۵۶۔ دیکھیے:ویران ص۷۹، ۸۹، ۹۰

۵۷۔ آزاد۲۰۰۶ء،ص۳

۵۸۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۱

۵۹۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۲۸

۶۰۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۱

۶۱۔ آزاد۱۹۳۳ء،ص۲

۶۲۔ آزاد،۱۹۶۶ء،ص۲۲۴۔۲۲۳

۶۳۔ آزاد،۲۰۰۶ء،ص۲

۶۴۔ ایضاً ص۲۲۴

۶۵۔ محمد حسین آزاد کے مرتبہ دیوانِ ذوق پر درج ذیل محققین نے روشنی ڈالی ہے۔(۱)حافظ محمود شیرانی: حافظ محمود شیرانی نے 'شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد اور دیوانِ ذوق' میں تفصیل سے دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا

ہے۔ یہ مقالہ تین حصوں میں منقسم ہے۔(i) تنقید دیــوانِ ذوق (ii) دیــوان ذوق پر آزاد کی اصلاحات (iii) دیوان ذوق میں آزاد کے اضافے۔ یہ طویل مقالہ پہلے پہل رسالہ ہندستانی الہ آباد میں سات قسطوں میں اکتوبر ۱۹۴۴ء سے جنوری-اپریل ۱۹۴۷ء کے پرچوں میں شائع ہوا۔ یہ مکمل مقالہ مقالات شیرانی جلد سوم مرتبہ مظہر محمود شیرانی ص ۳۰۶ ۔ ۱۱۷ میں موجود ہے۔(ب) عطا کاکوی: عطا کاکوی کی تصنیف تحقیقی مطالعے میں دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد کے حوالے سے تین مقالات میں ان کے خیالات ملتے ہیں۔(i) ذوق کا کچھ نایاب کلام (ii) دیوانِ ذوق کی پہلی اشاعت (iii) ذوق کے کلام پر آزاد کی اصلاحیں۔ ان تینوں مقالات میں بالخصوص مؤخرالذکر مقالے میں ذوق کے کلام پر آزاد کی اصلاحوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ تینوں مقالات اولاً بالترتیب معاصر ۱۱۔۱۰، معاصر ۱۳، المجیب جنوری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئے۔(ج) انصاراللہ: (i) انصاراللہ نظر نے ''دیوان ذوق مرتبہ آزاد پر ایک نظر'' میں آزاد کے مرتبہ دیوان میں الحاقات کی نشاندہی، ذوق کے اشعار کی آزاد کی مختلف تصانیف میں اختلافی صورتوں اور بعض اشعار کی دیوان ذوق میں عدم موجودگی وغیرہ کے بارے میں روشنی ڈالی ہے۔(نگار، کراچی مارچ ۱۹۵۸ء ص ۳۵۔۳۱) (ii) دوسرے مضمون'' کلام ذوق میں الحاق'' میں دیــوانِ ذوق میں دانستہ اور نادانستہ ہونے والے کلام کے الحاق کی مختلف صورتوں اور وجوہات کی دریافت کی ہے (نگار کراچی، اگست ۱۹۶۳ء ص ۳۲۔۲۹)

(د) ڈاکٹر محمد صادق: انھوں نے اپنے دو مضامین (i) ''تدوینِ دیــــوانِ ذوق (حصہ غزلیات)'' (ii) THE RECENSION OF *DIVAN -E-ZAUQ* (یہی مضمون محمد حسین آزاد-احوال و آثار میں اردو میں شامل ہے) میں دیوان ذوق کی تبدیلیوں کے مثبت محرکات پر مشتمل ہے۔ (i) پہلے مضمون میں شیرانی صاحب کے اس موقف'' آزاد نے دیــوانِ ذوق کی ترتیب کے دوران بہت سی غزلیں خود کہہ کر شامل کر دی تھیں'' پر خیال ظاہر کیا ہے کہ آزاد کے پاس پرانے مسودات موجود تھے اور انھوں نے اپنے پاس موجود پرانے مسودات سے ذوق کا کلام ردیف وار نقل کیا تھا اور جو اشعار پڑھے نہیں گئے ان پر طبع آزمائی کی گئی۔ انھوں نے آزاد کی اصلاحوں کا نفسیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ آزاد نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ ذوق کی یہ غزلیں اتنی وقیع نہ تھیں جتنا ان کا باقی کلام لہٰذا انھوں نے سوچا ہوگا کہ ان کا جوں کا توں نقل کر دینا ذوق کے ادبی مقام کے منافی ہوگا اور جو اشعار انھیں مکمل یاد نہ رہے یا ان میں سے ایک آدھ مصرع یا مصرعے کا دھندلا سا نقش ان کے ذہن میں ہوگا اس کو مکمل کرنے کی خاطر آزاد نے شعر کہہ دیے ہوں گے۔ دوسرا سبب یہ ہوگا کہ آزاد اہلِ دنیا پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہوں گے کہ انھوں نے ذوق کی غزلیات کا جس تن دہی سے کھوج نکالا ہے وہ حافظ ویران سمیت کسی کے بس کا نہیں تھا اور یہ سب کچھ ذوق کے کلام کو دست بردِ زمانہ سے بچانے اور ذوق پرستی کے سبب کیا۔ مزید یہ کہ وہ ان تبدیلیوں کا ایک سبب آزاد کی ذہنی پراگندگی بھی بیان کرتے ہیں (صادق ۱۹۷۳ء ص ۳۵۳۔۲۲۱) (ii) دوسرے مضمون میں ذوق سے منسوب ۲۷

غزلیات اور ۳ قصائد کی فہرست اور ۲ غزلوں کے مسودوں کے عکس اور ان میں مصنف کے ہاتھ سے کی جانے والی تبدیلیاں پیش کی ہیں۔ ان کے مسودات ڈاکٹر محمد صادق کے پاس تھے۔ جن کے بارے میں ڈاکٹر محمد صادق کا کہنا ہے کہ آزاد نے اپنے اشعار کے کلام میں اس انداز میں تبدیلیاں کیں کہ ان غزلیات کو 'ایجاد بندہ' کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ اس کے باوجود ان کا خیال ہے کہ اس طرح کے کلام کو مکمل طور پر الحاقی نہیں کہا جا سکتا۔ (صادق (انگریزی) ۱۶۳۔۱۵۵، صادق (اردو) ص ۲۸۱۔۲۶۹) (ہ) ڈاکٹر اسلم فرخی: ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے محمد حسین آزاد ۔حیات اور تصانیف جلد دوم میں تفصیل سے دیوانِ ذوق کے حوالے سے متنی اختلافات، اصلاحاتِ آزاد بر کلامِ ذوق، تاریخی اور تحقیقی غلطیوں اور دوسرے حوالوں سے روشنی ڈالی ہے۔ آزاد کی اصلاحوں کو 'دراز دستیوں' سے موسوم کیا ہے اور دیـــوانِ ذوق کو 'مرقعِ آزاد کی بدترین تصویر' قرار دیا ہے۔ (دیکھیے: محمد حسین آزاد ۔حیات اور تصانیف جلد دوم ص ۵۵۰۔۵۱۴) (و) ڈاکٹر عابد پیشاوری: انھوں نے اپنی تصنیف ذوق اور محمد حسین آزاد میں تفصیل سے آزاد اور ذوق کے تعلق، آبِ حیات اور دیوانِ ذوق میں موجود آزاد کے بیانات کو کڑی تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں آبِ حیات میں ذوق کے حالات کے حوالے سے آزاد کے بیانات کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے۔ جب کہ دوسرے حصے میں دیوانِ ذوق میں آزاد کے بیان کردہ ذوق کے حالات، آزاد کے مرتبہ دیوانِ ذوق کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ جس میں ذوق کے کلام میں الحاقی عناصر اور آزاد کی اصلاحوں اور خود کردہ اضافوں کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ آزاد کی مخالفت میں لکھی گئی تحریروں میں یہ سب سے زیادہ سخت اور جارحانہ ہے۔ (دیکھیے: پیشاوری ص ۳۲۲۔۱) (ز) ڈاکٹر تنویر احمد علوی: ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنی تصنیف اصولِ تحقیق و ترتیبِ متن میں شامل مختلف مضامین اور کلیاتِ ذوق کے مقدمے میں تفصیل سے دیـوانِ ذوق پر آزاد کی اصلاحوں کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے اور ڈاکٹر محمد صادق کے آزاد کی حمایت میں پیش کیے گئے دلائل کو مزید تفصیل سے پیش کیا اور انھیں آگے بڑھایا ہے۔ (دیکھیے: علوی ۲۰۰۶ء ص ۵۱، ۵۲، ۸۷، ۸۸، ۹۱، ۲۲۴، علوی ۲۰۰۹ء مقدمہ)

۶۶۔ نظر، مئی ۱۹۶۸ء ص ۱۸۔۱۱

۶۷۔ دیکھیے: علوی، مقدمہ کلیاتِ ذوق

۶۸۔ نواب کلب علی خان کے عہد میں غالباً ان کے حسب الحکم منشی امیر احمد امیر مینائی اور ان کے استاد مظفر علی اسیر لکھنوی شاگرد مصحفی کی تصحیح سے ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں مطبع تاج المطابع رامپور سے مصحفی کے کلام کا ایک انتخاب شائع ہوا۔ یہ مصحفی کے چار دیوان کا انتخاب ہے اس پر منشی محمد احمد قمر و صریر مینائی خلف امیر مینائی کا مختصر سا سرنامہ ہے۔ جس میں انھوں نے مصحفی کے دواوین کی کمیابی اور موجودہ نسخوں کی فاحش غلطیوں کو اس انتخاب، تصحیح اور طبع کا باعث قرار دیا۔ اس

امر کا انکشاف کیسے ہوا اس کی تفصیل عبدالسلام نے تفصیل سے بیان کی ہے جس کی تلخیص یہ ہے۔ عبدالسلام مصحفی کے دیوان دوم کا ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۱ء کا مخطوطہ دیکھ رہے تھے کہ انھیں اس نسخے کی اکثر غزلوں پر جدید قلم سے کہیں شعر کے اوپر اور کہیں حاشیہ پر اصلاحات موجود تھیں۔ یہ اصلاحیں الفاظ، محاورات اور ترکیبوں سے گزر کر پورے مصرعوں اور شعروں تک حاوی تھیں۔ مطالعہ کرنے پر معلوم ہوا کہ مطبوعہ نسخے کی وہ تمام غزلیں جو دیوان دوم سے انتخاب کی گئیں ہیں کل ان اصلاحوں کی موافق تھیں۔ کتابخانے میں موجود امیر مینائی کی تحریر سے اس خط کا موازنہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ امیر مینائی کے قلم سے اصلاحیں ہوئی ہیں۔ (ا۔ خان، ۱۹۹۰ء ص ایک سے اٹھارہ)

۶۹۔ دیکھیے: کاکوی، ص ۸۱، خان ص ۱۹۸۴ء، ۱۲۶۔۱۲۳

فہرستِ اسنادِ محولہ

۱۔ آزاد، محمد حسین: ۱۹۳۳ء، (مرتب) دیوانِ ذوق مصنفہ محمد ابراہیم ذوق، دہلی، علیمی پرنٹنگ ورکس۔

۲۔ آزاد، محمد حسین: ۱۹۸۶ء، مکاتیب آزاد مرتبہ مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی، لاہور، مجلس ترقی ادب۔

۳۔ آزاد، محمد حسین: ۲۰۰۶ء، آب حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام، ملتان، شعبہ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی۔

۴۔ بیگ، مرزا سنگین: ۱۹۸۲ء، سیر المنازل، مرتبہ ومترجمہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، نئی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ۔

۵۔ پیشاوری، ڈاکٹر عابد: ۱۹۸۷ء، ذوق اور محمد حسین آزاد، دہلی، ادارۂ فکرِ جدید۔

۶۔ خان، رشید حسن: ۱۹۸۴ء، ''حوالہ اور صحت متن'' مشمولہ ادبی اور لسانی تحقیق۔ اصول اور طریقِ کار مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، بمبئی، شعبہ اردو، بمبئی یونیورسٹی۔

۷۔ خان، عبدالسلام: ۱۹۹۰ء، ''مصحفی اور اس کے دیوان کا ایک رامپوری نسخہ'' مشمولہ دیوان مصحفی مرتبہ ومنتخبہ امیر لکھنوی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔

۸۔ خان، سید احمد: ۲۰۰۳ء، آثار الصنادید جلد اول مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔

۹۔ شیرانی، حافظ محمود: ۱۹۶۹ء، ''شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد اور دیوانِ ذوق'' مشمولہ ''مقالات شیرانی جلد سوم'' مرتبہ مظہر محمود شیرانی، لاہور، مجلس ترقی ادب۔

۱۰۔ صادق، محمد: ۱۹۶۵ء، ''*Muhammad Husain Azad His life and works*'' لاہور، ویسٹ پاکستان پبلشنگ کارپوریشن لمیٹڈ۔

۱۱۔ صادق، ڈاکٹر محمد: ۱۹۷۳ء آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین لاہور، مجلس ترقی ادب۔

۱۲۔ صادق، ڈاکٹر محمد: ۱۹۷۶ء محمد حسین آزاد۔ احوال و آثار لاہور، مجلس ترقی ادب۔

۱۳۔ علوی، ڈاکٹر تنویر احمد؛ ۲۰۰۶ء اصول تحقیق و ترتیب متن، لاہور، سنگت پبلشرز۔

۱۴۔ علوی، ڈاکٹر تنویر احمد؛ ۲۰۰۹ء، (مرتب) کلیات ذوق مصنفہ شیخ محمد ابراہیم ذوق، لاہور، مجلس ترقی ادب۔

۱۵۔ غالب، اسداللہ خان؛ ۱۹۸۴ء تفتہ اور غالب مؤلفہ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، نئی دہلی، غالب اکیڈمی۔

۱۶۔ فرخی، ڈاکٹر محمد اسلم؛ ۱۹۶۵ء، ''محمد حسین آزاد۔ حیات اور تصانیف جلد دوم'' کراچی، انجمن ترقی اردو
۔

۱۷۔ کاکوی، عطا؛ ۱۹۸۵ء، تحقیقی مطالعے، پٹنہ، عظیم الشان بک ڈپو۔

۱۸۔ قلق، حکیم غلام مولی؛ ۱۸۸۳ء کلیات اردو قلق، دہلی، مطبع انصار۔

۱۹۔ نظر، انصاراللہ؛ مارچ ۱۹۸۵ء، ''دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد پر ایک نظر'' مشمولہ نگار، (کراچی)۔

۲۰۔ نظر، انصاراللہ؛ اگست ۱۹۶۳ء، ''کلامِ ذوق میں الحاق'' مشمولہ نگار (کراچی)۔

۲۱۔ نظر، انصاراللہ؛ مئی ۱۹۶۸ء، ''اردو میں تدوین'' مشمولہ قومی زبان (کراچی)۔

۲۲۔ وزیر، خواجہ محمد وزیر؛ ۱۲۷۲ھ، دفتر فصاحت مطبع مصطفائی۔

۲۳۔ ویران، حافظ غلام رسول، مرزا امراؤ انور، ظہیرالدین ظہیر؛ (مرتبین) ۱۲۷۹ھ دیوان ذوق مصنفہ شیخ محمد ابراہیم ذوق، دہلی، مطبع احمدی۔

مولانا محمد حسین آزاد-خطوط کے آئینے میں

ڈاکٹر انور سدید

اردو زبان میں میرزا اسد اللہ خان غالب کا ایک نشان امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی نجی خطوط نگاری کو ''ادب معلیٰ'' کے درجے پر پہنچا دیا۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام کی رائے میں:

> ہماری زبان میں مکتوب نگاری کی ابتدا غالب سے ہوتی ہے۔ ان سے پہلے بھی یہ ذوق عام تھا لیکن خواص کی ادبی زبان فارسی تھی۔ چنانچہ رقعات عالمگیری کے علاوہ جو مکاتیب شمالی ہند کے بزرگوں نے لکھے، وہ اس فارسی میں ہیں جو کانٹے پر تولی جا سکتی ہے... لیکن بدقسمتی سے ہمارے لیے ان میں دلچسپی کا سامان کم ہے۔ غالب سے پہلے شاید لوگ زندگی کو دور سے دیکھنے کے عادی تھے، انھوں نے زندگی کو برت کر نہیں دیکھا تھا... وہ (غالب) پہلے شخص تھے جنھوں نے وجدان اور فکر کو سمویا... قطرے پر گوہر ہونے تک جو کچھ گزری وہی ان کی شاعری اور خطوط کا موضوع ہے... انھوں نے فن کو زندگی پر فضیلت نہیں دی، ان کی زندگی ان کے فن کا وسیلہ بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب جو کچھ اپنی روزمرہ زندگی میں نظر آتے ہیں، وہی شاعری میں ہیں، وہی اپنے خطوط میں ہیں... ان کے مکاتیب زبان کے ارتقا میں نشان میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ [1]

اس اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نجی خط جس میں کسی فنی زاویے اور قاعدے کو ملحوظ نظر نہیں رکھا جاتا اور واقعات و حالات کا بیانیہ آغاز و انجام کو خاطر میں لائے بغیر اپنی روانی خود قائم کرتا ہے، روزمرہ زندگی کا عکاس ہوتا ہے اور مکتوب الیہ پر جو اس کا دوست ہے، اپنی ذات کی کمیں گاہ کے دروازے کھولتا چلا جاتا ہے اور مقصود تشہیر نہیں ہوتی بلکہ مکتوب نگار اپنی شخصیت کو بے نقاب اور ذاتی باتوں کو منکشف کر رہا ہے تو اسے اعتماد ہے کہ خط کی حقیقت مکتوب الیہ تک ہی محدود رہے گی۔ دوسری طرف علم و دانش اور فلسفہ و حکمت اور ادب سے وابستہ لوگوں کی زندگی علم و عمل اور مشاہدات و تجربات کا ایک جہان دیگر مرتب کرتی ہے اور ان کے ذاتی خطوط میں لاشعوری طور پر بہت سے ایسے نکتے

بھی سما جاتے ہیں جن سے ان کی خلوت تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے اور ان کی شخصیت کے ایسے نادر گوشے سامنے آ جاتے ہیں جن کے حصول کا وسیلہ ان کے خطوط ہی ہوتے ہیں۔

مکتوب نگاری کا با قاعدہ آغاز رومی دانشور سائی سیرو کے خطوط سے ہوتا ہے اور ''بہترین مکاتیب ان لوگوں کے تسلیم کیے گئے ہیں جن کی زندگی خاص معنی میں علمی زندگی تھی۔''[۲] چنانچہ غالب کو اردو ادب کا پہلا رومی دانشور قرار دیا جا سکتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے جس انداز میں اپنے دوستوں سے بے تکلف باتیں کی ہیں اس سے یہ خطوط غالب کی شخصیت اور اس کے عہد کے آئینہ دار بن گئے ہیں۔ حقیقت یہ بھی نظر آتی ہے کہ عہد غالب کے ادبا نے تصنیف و تالیف کے ساتھ خطوط نگاری کو بھی اہمیت دی اور اپنے حلقہ احباب کو کثرت سے خطوط لکھے جن میں ادبی امور کے علاوہ ان کی ذاتی زندگی، جذبات و احساسات اور شخصیت کی کرنیں بھی موجود ہیں۔ رجب علی بیگ سرور، سر سید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، الطاف حسین حالی، منشی ذکاء اللہ دہلوی، نواب محسن الملک، اکبر الہ آبادی، نواب وقار الملک اور شبلی نعمانی کے خطوط کے نہ صرف مجموعے چھپ چکے ہیں بلکہ متعدد نقادوں نے ان خطوط سے ان ادیبوں کی داخلی شخصی اور نفسیاتی زاویے دریافت کرنے کی کاوش بھی کی ہے۔

ان ادیبوں میں اردو کے ممتاز انشا پرداز، مرصع نگار اور مرقع ساز محمد حسین آزاد بھی شامل ہیں جنھیں ادبی وراثت اپنے دادا مولوی محمد اکبر اور والد مولوی محمد باقر سے ملی تھی۔ وہ دہلی کالج میں طالب علمی کے ایام ہی میں مختلف موضوعات پر ادبی اسلوب میں مضامین لکھنے لگے تھے۔ اس زمانے ہی میں اپنے والد کے اخبار دہلی اردو اخبار کے طابع و ناشر مقرر ہوئے اور یہ تعلق ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک قائم رہا، جب ان کے والد کو مسٹر ٹیلر کی موت کے الزام میں گرفتار کر کے گولی مار دی گئی اور آزاد اپنے استاد محمد ابراہیم ذوق کا دیوان سینے سے لگا کر اور جان بچا کر دلی سے نکلے اور مختلف مقامات کی ٹھوکریں کھانے کے بعد لاہور پہنچ گئے۔ آزاد دلی سے بے سروسامانی کی حالت میں نکلے تھے۔ لیکن لاہور ان کے لیے ایک ایسا عافیت کدہ ثابت ہوا جس نے آزاد کو اردو ادب کا مہرِ عالم تاب بنانے میں مدد دی۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ کرنل ہالرائیڈ کی تحریک پر انجمن پنجاب کے تحت نظم نگاری کی نئی تحریک شروع کی اور مختلف موضوعات پر نئی نظم کے مشاعرے منعقد کیے۔ وسط ایشیا کا سفر ایک خاص حکومتی مشن کے تحت کیا۔ اپنے ذاتی کتب خانے کی توسیع کے لیے ایران کی سیاحت کی۔ واپس آئے تو گورنمنٹ کالج نے علوم شرقیہ کا شعبہ پنجاب یونیورسٹی کے حوالے کر دیا گیا اور مولانا آزاد اورینٹل کالج لاہور میں تبدیل کر دیے گئے۔ ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کے تاج پوشی کے پچاس سالہ جشن پر انھیں ''شمس العلماء'' کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور ۵ جون ۱۸۹۰ء کو پچپن سال کی عمر کو پہنچ تو ریٹائر کر دیے گئے۔ اس دوران آزاد پر عالم جنوں طاری ہو گیا تھا، انھوں نے قریباً بیس برس اس حالت میں گزارے اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

مولانا محمد حسین آزاد کی ادبی زندگی کم وبیش ۶۰ برسوں پر محیط ہے۔ ان کی تصنیفات و تالیفات مطبوعہ میں نیرنگ خیال، آب حیات، دربار اکبری، سخندان فارس، نظم آزاد، نگارستان فارس، خمکدۂ آزاد، سیر ایران، کائنات عرب، فلسفہ الہیات، نصیحت کا کرن پھول، جانورستان، قصص ہند، سپاک و نماک، حکایات آزاد، دیوان ذوق اور قند پارس کے علاوہ اردو کی ابتدائی کتابیں اور جامع القواعد شامل ہیں۔ مولانا آزاد کی علمی، ادبی، صحافتی اور سیاحتی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہے۔ برصغیر کے بے شمار علم دوستوں سے ان کی ذاتی شناسائی تھی اور وہ ان سے ملاقاتوں کے علاوہ خط کتابت بھی کرتے تھے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کے زیادہ خطوط دستیاب نہیں۔ ایک مجموعہ شیخ عبدالقادر مدیر مخزن نے ۱۹۰۷ء میں شائع کروایا جس میں ۲۸ خطوط شامل تھے۔ ۱۹۲۳ء میں آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد نے مولانا آزاد کے عزیز ترین شاگرد لالہ دنی چند کے نام ان کے ۳۲ خطوط اور چند دیگر تحریروں کا مجموعہ شائع کیا۔ ۱۹۵۵ء میں سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے ''یوم آزاد'' کے اجتماع میں مولانا آزاد کے اب تک دستیاب مکتوبات کے مطالعے کے بعد ایک مضمون ''آزاد کے خطوط'' پڑھا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی تحقیقی حس جاگ اٹھی اور انھوں نے آزاد کے مزید خطوط تلاش کرنے کا بیڑہ اٹھا لیا تو انھیں یہ خیال بھی آیا کہ نئے مجموعے کو حواشی سے مرصع کیا جائے۔ اس محنت طلب کام میں ان کی معاونت آغا محمد باقر نے کی اور کچھ تعلیقات خود بھی لکھیں۔ فاضل لکھنوی صاحب نے ۱۹۶۶ء میں مکاتیب آزاد کا جو مجموعہ شائع کیا وہ ان کے خطوط اور متعدد تحریروں پر مشتمل ہے جن کی تعداد ۱۳۶ ہے۔ زیادہ تعداد میں خطوط میں لالہ دنی چند، میجر سید حسن بلگرامی، ڈاکٹر لائٹنر، حکیم محمد دین اور ناصر نذیر فراق دہلوی کے نام ہیں۔ (۳)

مولانا آزاد نے یہ خطوط ۱۸۵۹ء سے لے کر ۱۸۹۲ء کے ۳۳ برسوں میں لکھے۔ پہلا خط قیاساً معصوم علی کے نام فارسی میں اس وقت لکھا گیا جب سید رجب علی خان ارسطو جاہ نے مذہبی کتابیں چھاپنے کے لیے مجمع البحرین نامی پریس قائم کرنے کے لیے مولانا کی خدمات ریاست جیند کے راجا سروپ سنگھ سے مستعار لی تھیں۔ آخری خط قیاساً ۱۸۹۲ء کے بعد منشی ذکاء اللہ دہلوی کو جو دہلی کالج میں ان کے ہم درس تھے، لکھا گیا۔ اس وقت وہ پنجاب یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ لے کر پنشن پر تھے اور ان پر جنون و وارفتگی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے جس کا ایک بڑا باعث ان کی اکلوتی بیٹی امتہ السکینہ کی ۱۸۸۶ء میں وفات تھی۔ ۱۸۵۹ء سے ۱۸۶۹ء تک صرف ۲ تحریریں دستیاب ہیں۔ خطوط جو شخصیات کے نام لکھے گئے ان کی تعداد آٹھ ہے۔ اور ان میں بھی خطوط کی نوعیت رسمی اور بالعموم غیر ذاتی نظر آتی ہے۔ لیکن یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء کے سانحات یعنی ان کے والد مولوی محمد باقر کو گولی کا نشانہ بنانے اور ان کی دودھ پیتی بہن کا توپ کے دھماکے کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو جانے کے علاوہ خون کے سیلاب میں معصوم انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے مناظر کو شعوری طور پر دل کی کمیں گاہ میں چھپانے اور عملی زندگی میں ایک متوازن انسان

کی طرح قدم رکھنے پر آمادہ ہو چکے تھے۔ جیند کے راجہ سروپ سنگھ کے ہاں پناہ گزین ہونا جو انگریز حکمرانوں کی نظر میں معزز تھے، تحفظ ذات اور انگریز دشمنی کے تاثر کو ختم کرنے کا اقدام قرار دیا جا سکتا ہے۔ لدھیانے میں ارسطو جاہ کے مطبع مجمع البحرین سے وابستگی اور پھر لاہور میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں سر رشتہ دار کی ملازم قبول کرنا ''جو کچھ خدا دکھائے اسے ناچار دیکھنا'' کے مترادف قرار دیا جائے تو یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ''مولانا آزاد کے دل میں زندہ رہنے کی تڑپ موجود تھی'' اور وہ ماضی کا نوحہ کرنے کی بجائے مستقبل کی طرف دیکھ رہے تھے جوان کے لیے بقائے دوام کے اسباب فراہم کرنے والا تھا۔ محکمہ تعلیم پنجاب کے ڈائریکٹر میجر فلر کے نام مکتوب کا حسب ذیل سر نامہ:

بحضور لامع النور، سکندر ارسطو فطرت، آصف سلیمان رفعت، صاحب خدایگان خداوند، مراتب ارجمند، دام اقبالہم وضاعف اجلالہم۔

ہی اہم نہیں، مندرجہ ذیل اقتباس بھی آزاد کی دنیاوی خردمندی کا آئینہ دار ہے اور اس میں زندگی کے لیے آب و دانہ کی تلاش کا زاویہ بھی موجود ہے:

''حضور کو یاد ہوگا کہ ماہ دسمبر ۱۸۶۰ء میں حضور دورے سے مراجعت فرما کر تشریف لائے اور ڈاک بنگلہ لدھیانے میں رونق افروز ہوئے تو فدوی بھی شرف اندوز ملازمت ہوا تھا۔ اس وقت فدوی پرنٹر و پبلشر مطبع مجمع البحرین میں تھا کہ ارسطو جاہ مولوی رجب علی خاں بہادر نے بنا کیا۔ فی الحال بہ اتفاق آب و دانہ فدوی لاہور میں اور محکمہ حشمتہ حضور جنرل پوسٹ ماسٹر بہادر میں سر رشتہ دار ہے۔ چونکہ حضوری و خدمت حکام سے علاوہ اپنے نفع ذاتی کے اس قسم کے فوائد متصور ہیں، جن سے خلق خدا رضامند ہو اور واسطے ہمیشہ کے نام نیک یادگار رہے۔ اس واسطے فدوی بھی آرزو مند قدم بوسی حضور کا ہے۔ امیدوار ہوں کہ بہ نظر علم پروری و جوہر شناسی اپنے وقت فرصت سے فدوی کو مطلع فرمائیے کہ حاضر حضور ہو کر دولت لازوال حاصل کروں۔ فقط زیادہ آداب

آفتاب دولت و اقبال تاباں رہے۔ (مکتوب ۔ ۲۵ مئی ۱۸۶۱ء)

مولانا آزاد اس خط میں ایک عملی انسان کی صورت میں سامنے آتے ہیں اور زندگی کے لیے بہتر اور نفع مند مواقع کے متلاشی ہیں۔ انھیں محکمہ تعلیم پنجاب میں اپنے ذوق کے مطابق درس و تدریس کی ملازمت مل گئی اور تقرر گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوا جہاں انھوں نے ڈاکٹر لائٹنر جیسے آتشیں مزاج، سیماب صفت اور مغلوب الغضب پرنسپل کو اپنی محنت، دیانت اور فرائض منصبی کی خلوص سے ادائیگی سے اس قدر متاثر کیا کہ دونوں کے تعلقات گہرے، مشفقانہ اور دوستانہ ہو گئے۔ اور ڈاکٹر لائٹنر تعلیمی اور تدریسی امور میں ان سے مشورے کرنے لگے اور ان کی رائے کو وقعت بھی دینے لگے۔ اہم بات یہ ہے کہ آزاد نے ڈاکٹر لائٹنر کو جو خطوط لکھے ہیں ان کا انداز بھی دوستانہ ہے اور یہ میجر فلر

(ڈائرکٹر محکمہ تعلیم پنجاب) کے خط کے خطابیہ انداز سے مختلف ہیں۔ آزاد انھیں ''صاحب من''، ''بندہ پرور'' اور ''جناب عالی'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں جس میں تعظیم کا عنصر تو موجود ہے لیکن خاکساری، پابوسی اور فدویت نمایاں نہیں ہے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے ایک درسی کتاب کے بارے میں ان کی رائے اس زمانے میں پوچھی جب وہ گورنمنٹ کالج میں نہیں آئے تھے:

صاحب من۔ تسلیم!

اس کتاب کو میں نے اکثر جگہ سے دیکھا، بچوں کے مناسب حال ہے اور دیہاتی مدارس میں پڑھانے کے لیے خوب ہے۔ اگر چاہیں تو بعض جگہ توضیح کر کے دلچسپ بنا سکتے ہیں...... طریقہ تعلیم کی کتابیں اردو میں پہلے بھی لکھی گئی ہیں، جو بات اس کتاب میں ہے، کسی کتاب میں نہیں۔ مصنف نے مطلب کو خوب ادا کیا ہے۔ طرز ادا نے سہولت کے خط میں لیا ہے اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ انگریزی میں پہلے بھی جابجا جاری تھیں، مگر جو لوگ اس سے بے بہرہ تھے، وہ پوچھ پوچھ کر ترجے کرتے پھرتے تھے۔ اب اردو ہو گئی۔ گویا ہر شخص کے حصے میں آ گئی۔ (مکتوب قبل ۱۸۶۹ء)

ایک مدرسے کے معائنے کے بعد ڈاکٹر لائٹنر کو لکھتے ہیں:

مولوی حمید الدین کے مدرسے کو میں نے دیکھا اور طالب علموں کا امتحان بھی لیا۔ مولوی علمدار حسین نے جو ان کے بارے میں رپورٹ کی ہے صحیح و درست ہے۔ میری رائے میں ان طالب علموں کے لیے بھی انعام ملنا واجب ہے...... کی سرمایہ یونی ورسٹی پر نظر کر کے چاہیے کہ دس روپے مہینہ سے کم نہ ہو اور زیادہ کا اختیار ہے۔ (مکتوب ۱۸۷۴ء)

ایک اور خط میں چند طلبا کے بارے میں اپنی بے لاگ رائے یوں پیش کرتے ہیں:

طلبا کی کیفیت پیش کرتا ہوں۔ اس سے آپ انداز و فرمائیں گے اور میری زبانی عرضی کی بھی یاد دہانی ہو جائے گی۔

میر عبداللہ: بڈھا آدمی ہے۔ بکلی متصل ایبٹ آباد کا رہنے والا ہے۔ منطق بھی پڑھا ہے۔ اور کچھ نہیں آتا۔ تین مہینے سے مدرسے میں داخل ہوا ہے۔ جماعت فضیلت میں ہے مگر پڑھنا نہیں آتا (ہوتا؟) اور ریاضی سے کچھ واسطہ نہیں۔

شہداد: یوسف زئی کا رہنے والا ہے ادنیٰ فارسی میں قریباً تین مہینے سے داخل ہے۔ قریب پچاس برس کے عمر ہو گی۔ ریاضی سے کچھ تعلق نہیں۔ (مکتوب ۱۸۷۱ء)

ڈاکٹر لائٹنر عربی، فارسی، ترکی، اردو اور انگریزی کے فاضل تھے، عالم اور مصنف تھے۔ انھوں نے سنین

اسلام کے عنوان سے کتاب لکھنے میں مولانا آزاد سے معاونت حاصل کی تھی لیکن اشاعت کے بعد ان کی امداد کا انکار کر دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کی مغضوب الغضبی عود کر آئی اور وہ آزاد کے نہ صرف مخالف ہو گئے بلکہ انھیں آزار پہنچانے، سرکار انگریزی کی نظروں میں گرانے اور ملازمت سے موقوف کرانے کے درپے ہو گئے اور اخبار ہمائے پنجاب سے ان کا تعلق بے ضابطگی کی زد میں آ گیا اور الزام یہ بھی لگا کہ وہ ایک باغی کے فرزند ہیں اور ڈاکخانے کی بے ضابطگیوں پر سیالکوٹ کے ایک قاری کا جو خط ہمائے پنجاب میں چھپا تھا وہ حکومت انگلشیہ کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی کوشش تھی۔ ڈاکٹر لائٹنر نے نہ صرف جواب طلب کیا بلکہ تسلی بخش وضاحت نہ ملنے تک لاہور میں رہنے کی پابندی عائد کر دی۔ مولانا نے ہمائے پنجاب سے استعفیٰ دے دیا اور اپنی خودی اور خودداری کو قائم رکھنے کے لیے جو خط ڈاکٹر لائٹنر کو لکھا اس میں ایک مشفق دوست کی طوطا چشمی پر ملال نمایاں نظر آتا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

خدا بہتر جانتا ہے کہ میں نے جس کام کو چھوڑا ہے، اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے مجبور و ناچار ہو کر چھوڑا ہے کہ وہ عداوت کے سبب سے آپ کے کاموں کو بھی خراب کرتے ہیں، اس معاملے میں بھی یہی حال ہے۔ اگر آپ ان شیطنتوں کو روک سکیں تو میں بھی خدمت کے لیے حاضر ہوں اور اگر آپ بھی مجبور ہیں تو مجھے معاف رکھیں۔ البتہ اگر حضور بیچ میں ہوں اور بطور رنج کے مجھے کام دے دیں تو اس سے بھی کچھ عذر نہیں اور کمیٹی سے تعلق پیدا کرنا فدوی نہیں چاہتا۔ (مکتوب ۱۸۷۱ء)

ڈاکٹر لائٹنر نے مولانا آزاد پر لاہور سے باہر نہ جانے پر پابندی لگا دی تو ان کا مہذب احتجاج الفاظ کا جامہ پہنے بغیر نہ رہ سکا۔ انھوں نے لائٹنر کو مکتوب میں لکھا:

... میری اجازت فقط آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اگر روکیں تو کسی لیفٹیننٹ گورنر کو روکیں، کسی گورنر کو روکیں۔ محمد حسین عاجز غریب کا روکنا آپ کے لیے کچھ فخر نہیں، امید ہے کہ اجازت مرحمت ہوگی۔

(مکتوب ۲۱ جولائی ۱۸۷۱ء)

مولانا آزاد کا منفرد کردار یہ ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر لائٹنر کی دی ہوئی تمام تکالیف برداشت کیں لیکن صبر و شکیبائی کو قائم رکھا اور لائٹنر کو باور بھی کراتے رہے:

مجھے اپنے خراب ہونے کا افسوس نہیں۔ کیوں کہ جو سنتا ہے، افسوس کرتا ہے۔ اگر دشمنوں کے ہاتھوں مجھے خاک میں ملوا دیں گے تو مجھے افسوس نہیں کیوں کہ میرا فخر تنخواہ اور کرسی اور عہدے پر نہیں، میں اس خاک پر بیٹھا آپ کو دعائیں دوں گا۔

اور آزاد کا یہ انتباہ بڑا معنی خیز ہے کہ ان کے ہاتھ میں تلوار نہیں تھی، قلم تھا اور حاکم درپئے آزار ہو گیا تو الفاظ کو ڈھال بنانے کا ارادہ کر لیا اور لکھا:

...اور درختوں کے پتوں پر وہ وہ باتیں لکھ کر پھینکوں گا کہ جو پڑھے گا، وہ افسوس کرے گا۔ یعنی کون تھا جس نے ایسے شخص سے ایسا سلوک کیا۔ اگر قتل بھی ہوؤں گا تو جو کچھ اب تک لکھ چکا ہوں یہ خلق و عالم کو رلانے کے لیے کافی ہے۔ اب شکوے کی جگہ رہی نہ شکایت کا موقع: اب وہ وقت آ گیا ہے کہ بہ موجب اپنے وعدے کے جاؤں گا اور سینہ چیر کے دکھاؤں گا کہ کتنے زخم لگے ہیں۔ مجھے یہ زخم بھی عزیز ہیں کہ آپ کے لگائے ہوئے ہیں۔ (مکتوب اگست ۱۸۷۱ء)

لیکن ڈاکٹر لائٹنر اپنی بدطینتی سے باز نہ آیا اور ایک دن جب مولانا آزاد کمرے میں سیکنڈ ایئر کلاس کو پڑھا رہے تھے تو کمرے کی چھت ٹپکنے لگی۔ پانی آزاد کے سامنے رکھے ہوئے میز پر گرنے لگا۔ یاسین چپڑاسی اور پھر سید نیاز علی، ممتاز علی اور محمد اشرف طالب علموں کو بھیج کر تحقیق کرائی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ پانی نہیں کسی نے پیشاب کیا تھا۔ لٹمس پیپر سے امتحان کیا گیا تو کوئی شک باقی نہ رہا۔ مولانا آزاد نے ڈاکٹر لائٹنر کو متوجہ کرایا کہ یہ پہلا واقعہ نہیں تھا بلکہ

...پہلے بھی یہ عمل نجس اوپر کے کمروں میں ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ نجاست کا عمل صغیر تھا، وہ اعمال نجاست کبیرہ کے ہیں۔ بس اس لیے کہ بڑھتے بڑھتے یہ نوبت پہنچ گئی ہے اس لیے اطلاع حضور میں واجب ہے کہ آئندہ اس سے زیادہ ترقی نہ کریں، معاملہ نازک ہے۔

حضور کو یہ بھی خیال رہے کہ عمل مذکور کسی طالب علم کا تنہا نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں اور بھی تائیدیں شامل ہوں گی۔ حضور، تفتیش فرمادیں گے تو سب حال معلوم ہو جاوے گا۔ (مکتوب ۱۸۷۲ء)

ڈاکٹر لائٹنر ۱۸۸۶ء میں واپس لندن چلے گئے تھے لیکن اس نے مولانا آزاد کو جو ذہنی تکالیف پہنچائیں ان کے کچھ نقوش آزاد کے خطوط میں موجود ہیں اور لائٹنر کے اس معاندانہ سلوک کو ان کی دیوانگی کا ایک باعث بھی شمار کیا جاتا تھا۔ آزاد اپنے بعد کے خطوط میں لائٹنر کا ذکر کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کی فطرت کو پہچان چکے ہیں اور ذاتی وقار اور عزت نفس کا تحفظ کر رہے ہیں اور سرکاری سطح کے تعلقات میں بھی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ لالہ دنی چند کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

میرا حال یہ ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب آئے تو میں ان سے کالج ہی میں ملا۔ استقبال کو اسٹیشن پر نہیں گیا۔ دوسرے دن گھر پر ہی جا کر مل آیا۔ اس دن سے پھر گھر پر نہیں گیا اور طریقہ یہی رکھا ہے کہ گھر پر بے بلائے نہ جانا اور زیادہ اختلاط نہ بڑھانا۔ ابھی تک وہ بھی سیدھے سیدھے چلے جاتے ہیں۔ میں بھی چلا جاتا ہوں۔ آگے خدا مالک ہے (مکتوب ۱۲ اپریل ۱۸۷۶ء)

انھیں دنی چند کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ ان کی جو تحریریں لالہ جی کے ہاتھ میں ہیں، انھیں حفاظت سے رکھیں کیونکہ بقول آزاد:

...مجھ سے ڈاکٹر (لائٹنر) صاحب سے اب کی دفعہ بڑی سخت طور پر جنگ ہوئی۔ نہیں جانتا کہ اب پہاڑ سے اتر کر کیا رنگ ہو۔ یا تو بھارت کا یدھ ہوا یا گول مول ہو گئی۔ مجھ سے ملنے کو جی چاہتا ہوگا تو آپ ان سے بھی اجازت لے لیجیے گا۔ (مکتوب یکم جولائی ۱۸۷۷ء)

اس قسم کا ایک اشارہ اس خط میں بھی موجود ہے:

...''مولوی محمد حسین کوشش تو بہت کرتے ہیں مگر چونکہ ڈاکٹر (لائٹنر) صاحب کا ان سے دل صاف نہیں ہے، اثر نہیں ہوتا۔'' ضرور ضرور کہنا۔ (مکتوب ۱۸۷۷ء)

ڈاکٹر لائٹنر کے نام خطوط جہاں ایک طرف محبت کو نفرت میں تبدیل ہونے کا دردناک منظر پیش کرتے ہیں وہاں ایک انگریز پرنسپل کی اپنی غلام نو آبادی کے ایک معلمِ ادب سے غایت درجے کی کینہ پروری بھی ظاہر ہوتی ہے اور مخبروں کی جھوٹی اطلاعات کا زاویہ بھی سامنے آتا ہے۔ دوسری طرف مولانا آزاد نے کالج کی ملازمت کے حوالے سے پرنسپل لائٹنر کی حیثیت، مقام اور مرتبے کو تو نظر انداز نہیں کیا لیکن اپنی خودداری کو بھی قائم رکھا اور ایک صداقت پسند انسان اور علم دوست ادیب کی حیثیت میں اپنی غیرت پر حرف نہ آنے دیا(۵) لیکن اس ''سرد جنگ'' نے مولانا محمد حسین آزاد کو ذہنی طور پر پریشانیوں سے دوچار رکھا۔ شمس العلماء مولوی ممتاز علی کے نام ان کے ۱۸۸۸ء کے خط کا یہ جملہ بڑا معنی خیز ہے:

کئی وارداتیں مجھ پر یہاں گزری ہیں، جنھیں دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں کہ آئندہ خدا جانے کیا ہوگا۔

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ دہلوی کو انھوں نے ۱۸۹۱ء میں ذہنی اضمحلال و تعطل کے دور میں خط لکھا، اس میں چند نصیحتیں کسی پر اسرار ہستی سے منسوب ہیں۔ جن سے آزاد کی ملاقات صبح کی سیر کے دوران ہو جاتی ہے۔ میرا قیاس ہے کہ یہ مخفی ہستی مولانا کی اپنی ذات ہے اور مندرجہ ذیل جملوں میں ان کا وہ تاثر موجود ہے جو ڈاکٹر لائٹنر کے منفی طرزِ عمل نے ان کے لاشعور میں محفوظ کر دیا تھا۔

۱۔ یاد رکھو کہ دنیا میں دوست تو کوئی ہے ہی نہیں۔ جو زیادہ دوستی برتے اس کو دشمن سمجھنا۔

۲۔ دشمن سے ایسی دلفریب محبت برتو کہ دوستوں کی دوستی بھی نابود ہو جائے...... آدمی ہو تو الّو بن جائے......

۳۔ نہ محبت کو نیکوں کی نیکی پر منحصر رکھو، نہ اسے ان کی نیکی کی مقدار پر خرچ کرو......

۴۔ ...... یہ اعتقاد رکھو کہ دنیا میں اچھا تو کوئی نہیں...... (مکتوب ۱۸۹۱ء)

مولانا محمد حسین آزاد اور ڈاکٹر لائٹنر کی شکر رنجی آزاد کی زندگی کا ایک دردناک باب ہے اور اس کے اثرات بھی دوررس ہیں لیکن آزاد کا سماجی روپ لالہ دنی چند کے نام خطوط میں سامنے آتا ہے اور یہ وہ آزاد ہے جسے سیر و

سیاحت میں گہری دلچسپی ہے۔ تصنیف و تالیف کے لیے کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے اور یہ علم دوست آزاد طلبا کی تعلیمی ترقی کے لیے اپنے گھر اور دل کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھتا ہے۔ لالہ دنی چند کے نام ۲۷ فروری ۱۸۷۶ء کے خط میں دو طلبا بسنت سنگھ اور برجومل کا ذکر ہے جنھیں لالہ جی حصول تعلیم کے لیے لاہور بھیجنا چاہتے تھے اور مولانا کوشش کر رہے تھے کہ ان کے تعلیمی اور آرائشی اخراجات کے لیے وظیفہ مقرر کرا لیں۔ فاضل لکھنوی صاحب نے اس مکتوب کے حاشیے میں لکھا ہے کہ مولانا خاص طور پر طلبا کے لیے اپنے گھر کے قریب کرائے پر مکان لے لیا کرتے تھے۔ وہ رہتے اس مکان میں تھے اور کھانے پینے کا بندوبست ادھر ادھر کر لیتے تھے۔ اس خط میں لکھتے ہیں:

بسنت سنگھ اور برجومل کے لیے آج جا کر پختہ گفتگو کرتا ہوں اور پھر آپ کو لکھتا ہوں۔

اور گفتگو ہو گئی تو لکھا:

لو صاحب! میں پنڈت جوالا مل سے پھر مل آیا اور ان سے دونوں کی منظوری کروا لی۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ پہلے ایک کو بھیجو، جب پندرہ بیس دن میں اس کے پاؤں جم جائیں تو دوسرے کو بھیجو اور یہ تم کو اختیار ہے کہ جس کو چاہو پہلے بھیجو۔ اور اتنی بات اور بھی دیکھ لیجئے گا کہ وہ شخص نیک طبع ہو۔ نیک طبع کیا؟ اس سے یہ مطلب نہیں۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم مولوی، متقی، پرہیزگار ہو، پناہ بخدا! ایسے سے تو میں بڑا ڈرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ ضرور دغا دے گا۔ (مکتوب ۲۷ فروری ۱۸۷۶ء)

اتنا کچھ لکھنے کے بعد شاید انھیں خیال آیا کہ پوری وضاحت نہیں ہوئی، چنانچہ مزید لکھا اور وجہ احتیاط بھی کھول دی:

آپ نے مجھے دیکھ لیا کہ ہنستا ہوں، ہر طرح تمسخر کرتا ہوں۔ مگر وہ خوشی اتنی ہی ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہتی۔ بس وہ بھی اس قدر شگفتہ مزاج ہو تو ہرگز عیب نہیں۔ یہ اس واسطے میں نے لکھا کہ مکان گھر کے پاس ہے اور جب میرے پاس ہو گا تو اتفاق سے کبھی کبھی دروازے پر بھی آنا جانا رہے گا۔ اس لحاظ سے جسے آپ مناسب سمجھیں اسے پہلے بھیجیں۔ (مکتوب ۲۷ فروری ۱۸۷۶ء)

ایک خط میں بسنت سنگھ کی لاہور آمد کا حال ان الفاظ میں لکھتے اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں:

گھر آیا تو دیکھتا ہوں، بالا خانے کی کھڑکی میں ایک خالصہ جی بیٹھے ہیں ...... گھوڑے پر چڑھے چڑھے پوچھا تو معلوم ہوا کہ بسنت سنگھ جی ہیں۔ بہت خوش ہوا۔ مگر، عقدہ ہوا کہ پرسوں یونیورسٹی بند ہو گی۔ اگر یہ دن نہ ہوتے وہاں داخل کر کے وظیفے کا بندوبست کرتا۔ غالباً ہو بھی جاتا۔ کل وہاں بھی حکم چھٹی کا لکھا جائے گا۔ ڈاکٹر (لائٹنر) صاحب کا ہے کو وظیفہ مقرر کریں گے اور یوں ہی مفت دو مہینے ضائع کریں گے۔

(مکتوب ۲۷ جولائی ۱۸۷۶ء)

اب بسنت سنگھ کی حالت اور مولانا کی مشفق شخصی کا زاویہ اس اقتباس میں دیکھیے :

میں نے بسنت سنگھ کی بہت دلداری کی ہے کہ یہ بے چارہ اس شوق سے آیا ہے ایسا نہ ہو کہ اس حالت کو دیکھ کر دل شکستہ ہو جائے۔ مسافر کا دل بہت نازک ہوتا ہے۔ یہ بہت مفلس معلوم ہوتا ہے۔ خرچ کچھ نہیں لایا...... مگر میں نے اس کی خاطر جمع کر دی ہے۔ اللہ مالک ہے۔ اس کے قدم کی برکت سے وسعت دے گا۔

(حوالہ ایضاً)

دوسرے طالب علم ہیرا سنگھ کی علالت میں تیمارداری کے فرائض یوں ادا کرتے ہیں:

... ہیرا بے چارہ تپ میں مبتلا تھا۔ اسے جلاب دیا۔ الحمد للہ آج اس کی دو باریاں ٹل گئیں۔ یہ دنوں بھائی بڑے غریب ہیں۔ میں ان سے بہت شرمندہ ہوں کہ جیسے جی چاہتا ہے ویسی ان کی مدد نہیں کر سکتا۔

(مکتوب ۲۷ جولائی ۱۸۷۶ء)

ایک اور خط میں لالہ دنی چند سے پوچھتے ہیں:

تم مجھے اس امر سے اطلاع دو کہ اور کوئی ہونہار اور محنتی طالب علم بھی ہے جو یہاں آنا چاہتا ہو... تم نے اب تک نہیں لکھا کہ بسنت سنگھ کے لیے پنجاب یونیورسٹی اچھی ہے یا گورنمنٹ سکول میں پڑھنا مناسب ہے؟

(مکتوب ۱۳ اکتوبر ۱۸۷۶ء)

مولانا آزاد اپنے شاگردوں کی کامیابیوں پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ اور ان کی ترقی کے لیے نہ صرف مفید مشورے دیتے تھے بلکہ اپنے وسائل اور تعلقات کو بھی روبہ عمل لاتے تھے کہ انھیں دنیاوی کامیابیاں نصیب ہوں۔ لالہ دنی چند نے ایک امتحان دیا تو انھیں لکھا:

امتحان کی خوش اسلوبی سے کمال خوشی ہوئی، خدا تمھاری محنتوں کو ہمیشہ کامیاب اور مثمر خیر و برکات رکھے۔

اور وہ انگریزی سرکار میں ایک اچھی ملازمت پر فائز ہوئے تو یہ تہنیت نامہ بھیجا جس میں:

عزیز من!

لو صاحب، مبارک ہو! نائب تحصیلداری کیجیے اور جس طرح چاہے ہم ریتی لوگوں لوگوں کو دبائیے۔ الحمد للہ، الحمد للہ! اگرچہ میں جانتا تھا کہ کوہ نور نکلنے والا ہے۔ تمھیں خبر ہو ہی جائے گی۔ مگر خوشی کے مارے مجھ سے رہا نہ گیا۔ خیر اللہ مبارک کرے۔

مولانا اس وقت سیر و سیاحت کے لیے دہلی جا رہے تھے۔ گاڑی چھ بجے چلنی تھی۔ یہ خط پانچ بجے لکھا:

... یہ خط جگراؤں کی طرف پھینکتا ہوں، خدا کرے پہنچ جائے۔ پتا مجھے معلوم نہیں، خدا جانے تمھیں کب پہنچے اور میرے لکھنے کا فائدہ بھی حاصل ہو یا نہ ہو خیر ہو یا نہ ہو میرے دل کا ارمان تو اس وقت نکل گیا۔ میں بھی

لودھیانہ اسٹیشن پر، کھنے اسٹیشن پر جا بہ جا کہتا چلا جاؤں گا ''وہ پاس ہو گئے'' ''وہ پاس ہو گئے'' اب خدا تمھیں تحصیلدار اور تحصیلدار سے ڈپٹی کر کے مجھے دکھائے۔

(مکتوب ۲۴ دسمبر ۱۸۷۵ء)

لالہ دنی چند پنجاب یونیورسٹی سے فارسی زبان کا امتحان فضیلت پاس کر چکے تھے اور قانون کا امتحان دے کر وکالت کی سند حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن لاہور سے باہر قیام پذیر ہونے کی وجہ سے لاء کالج کے لیکچروں میں شامل نہیں ہو سکتے تھے اور قاعدۂ استثنٰی کے خواہش مند تھے۔ مولانا نے نہ صرف ان کی حوصلہ افزائی کی بلکہ درخواست کا مسودہ بھی خود انھیں بنا کر بھیج دیا۔ جب اس نوع کے دوسرے درخواست گزاروں کا فیصلہ سامنے آ گیا اور لالہ دنی چند کی درخواست کا نتیجہ سامنے نہ آیا تو مولانا پریشان ہو گئے اور ایک عرضی لالہ دنی چند کی طرف سے خود لکھ کر دے دی۔ اس خط کا دلچسپ اقتباس حسب ذیل ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ انھیں اپنے شاگرد کے مفاد کا کتنا خیال تھا اور اس کے تحفظ کے لیے کیسے کوشاں رہتے تھے:

اس وقت یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ تمھاری ذیل کے تھے سب کے باب میں... منظور و نامنظور جو ہونا تھا ہو گیا مگر تمہارے باب میں کچھ معلوم نہیں۔ مجبوراً ایک عرضی اور خدمت میں صاحب رجسٹرار یونیورسٹی کے تمھاری طرف سے لکھ کر دی ہے کہ آپ پھر اس باب میں رجسٹرار چیف کورٹ کو لکھیں تا کہ کچھ حال تو معلوم ہو اسی قدر چاہیے تھا۔ وہی تم کو لکھ دیا اور اس میں یہ بھی مطلب ہے کہ تمھیں معلوم رہے کہ تمھاری طرف سے میں نے عرضی دی ہے۔ یعنی تمھاری طرف سے مجھے اجازت ہے کہ مناسب حال تحریر کرتا رہوں اور میری تحریر تمھارے اس معاملے میں بہ منزلہ تمھاری تحریر کے ہے۔ (مکتوب ۶ دسمبر ۱۸۷۶ء)

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد کے دستیاب خطوط میں زیادہ تعداد لالہ دنی چند کے نام خطوط کی ہے اور ان میں مولانا نے اپنے دل کی باتیں بڑے بے تکلف انداز میں اس طرح لکھی ہیں جس طرح میرزا غالب اپنے شاگرد ہرگوپال تفتہ کو لکھتے تھے۔ متعدد خطوط سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آزاد کے نزدیک زر و مال کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور وہ صرف تحصیل علم کے شائق تھے، اپنے خیالات کو تصنیف و تالیف کے ذریعے سے خلق خدا تک پہنچانے کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے اور تصنیفی کاموں کو زندگی کے تمام معمولات پر فوقیت دیتے تھے۔ اس ضمن میں اپنے پسندیدہ موضوعات کی کتابوں کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے اور اپنے شاگردوں اور دوستوں سے فرمائش کر کے بھی کتابیں منگواتے تھے۔ اپنے عزیز ترین شاگرد لالہ دنی چند کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

اور کتابوں کے باب میں خدا جانے تم نے کیا بندوبست کیا؟ دیکھوں تو کتنے کتب خانے میرے لیے لاتے ہو۔ اجی صاحب! وہ قاطع برہان اور قاطع انتصار اور قاطع البرہان اور فلاں فلاں کی ذیل میں ایک

موید البرہان۔ ہگلی کے پروفیسر فارسی نے لکھی تھی اور ایک موقع پر تو دکان پر پڑی رہی، کسی نے نہ پوچھا، اب میں دکان دکان پوچھتا ہوں تو کوئی جواب نہیں دیتا۔ اگر لدھیانے میں کسی کے پاس ملے یا میر صاحب قبلہ کے پاس ہو تو ضرور لیتے آیئے، یا بندوبست کرتے آیئے۔ اور شرح سہ نثر تصنیف پہلے چھاپے کی، شرح پنج رقعہ ،شرح شبنم شاداب ،شرح بحھیر اور ایک جواہر الحروف چھاپہ دہلی کی محشی بھی تھی۔ وہ اگر ملے تو ضرور خیال رکھیے گا۔ (مکتوب ۱۶ جنوری ۱۸۷۶ء)

مولانا آزاد جن دنوں دربار اکبری لکھ رہے تھے تو ان کی خط کتابت میجر سید حسن بلگرامی سے بھی تھی۔ اس زیر تصنیف کتاب کے ماخذات کے سلسلے میں ایک خط میں ارشاد فرماتے ہیں:

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ مآثر الامرا اور سوانح اکبری کس زمانے میں دیکھی تھیں۔ یہاں تلاش کی تھی اور نہیں ملتی تھیں۔ چند مقاموں میں پرانی کتابوں کا پتا لگا یا تھا۔ چھ دن بھاگا بھاگا گیا اور دوڑا دوڑا آیا۔ جو کچھ ہاتھ لگا اسے دیکھتا گیا اور یادداشتیں لیتا گیا۔ مآثر الامرا بھی مل گئی، شکر کا مقام ہے کہ جو کچھ میں نے دانہ دانہ اور قطرہ قطرہ کر کے جمع کیا ہے، وہ مآثر الامرا سے بہت زیادہ نکلا۔ پھر بھی حق سے گزرنا کفر ہے، ہر شخص کے حال میں تین تین چار چار نکتے مل گئے اور اچھے مل گئے۔ سب سے زیادہ یہ ہے کہ اب جو دربار اکبری کا مشاہدہ کرے گا، وہ یہ نہ کہہ سکے گا کہ آزاد کو مآثر ہاتھ نہ آئی۔

(مکتوب ۲۶ ستمبر ۱۸۸۲ء)

دربار اکبری کی تالیف کے دوران ہی امرتسر اور لاہور کے تاجر امراء نے ان کی مدد کرنی چاہی لیکن مولانا آزاد نے ان کی پیشکش کو قبول نہ کیا۔ اس کا احوال حسن بلگرامی کو سناتے ہیں:

پرسوں اتوار کو یہاں ایک بڑا جلسہ تھا۔ لاہور و امرتسر کے دولت پرست جمع ہوئے تھے کہ کپڑے کی کل پنجاب میں جاری ہو۔ وہاں کوئی بولا کہ آزاد کہاں ہے؟ اس سے بھی تو پوچھو؟ وہیں سے کوئی بولا کہ اس نے کمیٹیوں کو بالکل استعفا دے دیا ہے۔ وہ تو اب تصنیفات میں غرق رہتا ہے۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ آج کل وہ دربار اکبری لکھ رہا ہے مگر اکیلا ہے۔ کوئی رفیق اور مددگار نہیں۔ کئی شخصوں نے کہا کہ وہ کس طرح کی مدد چاہتا ہے؟ جو ہم سے ہو سکتی ہے، ہم بھی کریں۔ میں درماندۂ تائید و تعبیر کیا کہوں کہ میرا کام سوا خدا اور مولیٰ کے مدد پذیر نہیں۔ یا علی مدد! چار بجے ہیں، صبح قریب ہے۔ وقت تو قبول کا ہے۔ اگر سائل کی آواز حضور تک پہنچ جائے۔ (مکتوب ۲۵ مارچ ۱۸۸۳ء)

اس قسم کا ایک اور واقعہ یوں ہے کہ جموں سے انھیں کسی دوست نے لکھا کہ مہاراجہ کشمیر اپنے خاندان کی تاریخ کی کتاب لکھوانا چاہتے ہیں۔ دریافت کیا کہ مولانا یہ کام اپنے ذمے لیں تو کیا تنخواہ لیں گے؟ انھوں نے عدیم

الفرصتی کا عذر کیا تو آٹھ دس دن کے بعد خود پہنچ گئے۔ نوکری کے لیے اصرار کیا اور تنخواہ کا پوچھا تو مولانا نے صاف جواب دے دیا[۸] اور فوقیت اپنی کتابوں کو دی۔ حتیٰ کہ پنشن کی وجہ سے مالی آمدنی کی کمی کو بھی درخور اعتنا نہ سمجھا۔ لکھتے ہیں:

... میری اپنی کتابیں ناتمام پڑی ہیں کہ لوگوں کی آنکھیں اور میری جان انھیں میں لگی ہے۔ میں کسی کی کتاب کیوں لکھوں؟ طمع کا منہ کالا ہے۔ آپ نے اخباروں میں دیکھا ہوگا کہ ڈسٹرکٹ مدارس سررشتہ تعلیم سے الگ ہو کر انتظام جدید میں آ گیا ہے۔ کالج کا بھی ایسا ہی حال ہوگا۔ کالج کا مولوی اور پنڈت ضرور تخفیف میں آئے گا کیوں کہ یونیورسٹی پنجاب میں مولوی اور پنڈتوں کی کیا کمی ہے۔ اچھا مجھے پنشن بھی دے دیں گے تو قناعت کروں گا اور تصنیفات کو پورا کروں گا۔ اپنے لخت جگر بچوں کو نیم جان تڑپتا نہ چھوڑوں گا۔

(مکتوب ۱۸ اپریل ۱۸۸۳ء)

اس خط میں ''لخت جگر بچوں'' سے مولانا آزاد کی مراد اپنی تصنیفات ہے اور ان کی تکمیل میں ان کی گہری دلچسپی کا اندازہ ان اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے:

دربار اکبری کو لپیٹ رہا ہوں۔ مگر دو ہی دن جم کر بیٹھا تھا کہ آنکھوں نے رنگ بدلا اور دماغ جواب دینے لگا۔ خیر میں نے ایک دن آرام دیا۔ تخفیف معلوم ہوئی، اب آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ خیر۔ کام خدا کے فضل سے ہو گیا (مکتوب ۱۰ اگست ۱۸۸۳ء)

حقیقتاً اب اپنا حال کیا عرض کروں۔ ڈیڑھ مہینے کے بعد آج انشاء اللہ نہانے کا ارادہ کیا ہے۔ اگر خدا پورا کرے۔ کیا کروں فرصت نہیں ہوتی اور جو وقت بچتا ہے کہتا ہوں، چار سطریں لکھوں گا۔ نہانے کو پھر دیکھ لیا جائے گا (مکتوب فروری ۱۸۸۲ء)

کتاب سے مولانا آزاد کی محبت ان کے ایک خط سے یوں سامنے آتی ہے:

مکانوں کی تکلیف اور اسباب کی برداشت میں جو تکلیفیں ہوئیں میں ضرور بھول جاتا۔ مگر کئی لاجواب اور نایاب کتابیں گم ہو گئی ہیں۔ ان کا افسوس نہیں بھولتا۔ (مکتوب ۱۸۸۲ء)

سید علی بلگرامی کے نام خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتابیں مستعار دینے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ لیکن اپنی کتابوں کی واپسی کی نہ صرف توقع رکھتے بلکہ اصرار بھی کرتے تھے۔ اس کی مثال بلگرامی کے نام خطوط کے یہ اقتباسات ہیں:

نامہ خسرواں یقین ہے کہ بعد ملاحظہ آپ نے روانہ کر دیا ہوگا۔ اس کے باب میں آپ کے جو خیالات ہوں، کچھ کچھ ضرور تحریر فرمائیے۔ (مکتوب ۱۱ جنوری ۱۸۸۳ء)

خان لنکران آج روانہ کیا ہے۔کل انشاءاللہ باریاب خدمت عالی ہوگا۔

(مکتوب ۲۳فروری ۱۸۸۳ء)

شـــفـــق کے تین پرچے، ایک ہی لفافے میں......کل صبح کی ریل میں روانہ کیے ہیں۔رسید ضرور عنایت فرمایئے گا۔خدا کرے پہنچیں کہ شفق کی طرح سرخ رو ہوں۔ڈاک کا مطلق اعتبار نہیں۔روز نقصان اٹھا رہا ہوں۔

(مکتوب ۱۶اپریل ۱۸۸۴ء)

کتابیں مستعار دینے کے سلسلے میں ہی ایک واقعہ محمد دین صاحب کے نام خطوط سے سامنے آتا ہے جن کے بارے میں فاضل لکھنوی صاحب نے لکھا ہے کہ انھیں پڑھ کر ایک افسانے کی سی لذت حاصل ہوتی ہے لیکن یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ جب مولانا کو صادق حالات معلوم ہوجاتے تھے تو وہ ابریشم کی طرح نرم ہوجاتے تھے اور غلط اقدام کرنے والے کو کشادہ دلی سے معاف کر دیتے تھے۔یہ واقعہ یوں ہے کہ ایک شخص غلام رسول نے ان سے کتاب الف لیلـہ مستعار لی اور واپس کرنے کی بجائے لکھا کہ ''کتاب تو میرے پاس سے کھوئی گئی ہے۔کہو تو بمبئی سے اور منگا دوں یا چاہو تو اس کی قیمت لے لو۔'' مولانا کو یہ جواب مناسب معلوم نہ ہوا بلکہ گمان یہ بھی تھا کہ ''غلام رسول ہر شخص سے نیا عذر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عذر بھی ٹھیک نہیں۔'' مولانا آزاد کے اندیشہ ہائے دور دراز ان اقتباسات سے بھی ظاہر ہوتے ہیں:

......کہتے ہیں کہ الف لیلـہ فارسی بازار میں نہیں ملتی مگر قیمت دیتے ہیں۔میں نے اس معاملے میں بہت سوچا۔ان کا اصل مطلب یہ معلوم ہوا کہ راقم آثم قیمت لیتے ہوئے شرمائے۔وہ برائے نام بھی کتاب نہ دیں اور چند روز کے بعد یاروں میں قہقہے اڑائیں کہ دیکھو باتوں باتوں ہی میں اڑا دیا......شرمندہ ہوں کہ بار بار آپ کو تکلیف دیتا ہوں لیکن کیا کروں کہ آپ کی توجہ کے بغیر اس عمل کی عقدہ کشائی ممکن نہیں اور اگر میں اس معاملے میں خاموش رہوں گا تو ایسے لوگ ایک ایک کر کے میری ساری کتابیں مار رکھیں گے۔ایسے آدمیوں کا تدارک آپ کے سوا کون کر سکتا ہے۔

(مکتوب ۱۹اپریل ۱۸۷۹ء)

اس دوران انھیں ایک کتب فروش الٰہی بخش سے معلوم ہوا کہ منشی غلام رسول نے الف لیلـہ فارسی درحقیقت ان کو دی تھی اور مبادلے میں ایک قرآن شریف لیا تھا۔الٰہی بخش نے الف لیلـہ فارسی چار روپے آٹھ آنے میں بیچ ڈالی تھی اس کے ساتھ ہی انھیں معلوم ہوا کہ منشی غلام رسول نے بمبئی سے یہ کتاب خرید کر منگوانے کی لیے انھیں انیس روپے دیے تھے تو ان کا دل پسیج گیا، ہمدردی کا جذبہ عود کر آیا کہ ۲۵، ۳۰روپے کے نوکر کو انیس روپے کا داغ نہایت تکلیف دینے والا ہے۔انھوں نے حکیم محمد دین کو بتایا:

اس تقریر نے میرے دل پر بھی پر درد اثر پیدا کیا۔اور میں نے کہہ دیا کہ یہ روپے تم انھیں واپس کر دو اور کہہ دو

کہ کتاب مجھے پہنچ گئی...... میں منشی صاحب کے دعوے سے دست بردار ہوا۔ اب فقط خدا سے دعویٰ ہے۔ اس کا خزانہ بے شمار ہے اور کتب خانہ بے تعداد ہے اور یقین واثق ہے کہ وہ دے گا اور ضرور دے گا اور بہت زیادہ دے گا۔ آمین، آمین، آمین! (مکتوب ۱۸۷۹ء)

مولانا محمد حسین آزاد کے یہ خطوط ان کی پوری شخصیت کے آئینہ دار ہیں اور ان کی علمی اور ادبی سرگرمیوں، تخلیق و تصنیف میں دلچسپی اور معاشرتی اور تمدنی مسائل میں ان کے رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بلاشبہ ان خطوط میں دربار اکبری، آب حیات، سخندان فارس اور قصص ہند کا مرقع نگار بہت کم جلوہ گر ہوتا ہے لیکن قلم برداشتہ لکھے ہوئے ان خطوط میں رہ و رسم آشنائی کا نادر انداز جلوہ گر ہے۔ سرکاری ملازمت کے تقاضے پورے کرنے کے علاوہ سماجی امور پر اخبارات میں اظہار خیال بھی کرتے ہیں لیکن کتاب ان کی پہلی اور آخری محبت نظر آتی ہے۔ تخلیقی عمل میں متخیلہ ان کی پناہ گاہ تھا۔ محویت و استغراق کے اس عالم میں دوست نوازی اور شاگرد پروری ان کی فطرت کا اہم جز معلوم ہوتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے بلاشبہ اپنی کتابوں کی تکمیل کے لیے سینکڑوں خطوط لکھے ہوں گے لیکن ان کی زیادہ تعداد دستیاب نہیں اس کے باوجود ۱۳۶ خطوط، رقعات، اخبارات اور سرکار کے نام مراسلات کا ایک مختصر سا مجموعہ جو مکاتیب آزاد کے نام سے سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد کے تعاون سے قیمتی حواشی کے ساتھ شائع کر دیا ہے تو اس کتاب میں مولانا محمد حسین آزاد اپنی خلوت میں کسی محرم راز سے سرگوشیاں کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ خطوط ان کی شخصیت اور سیرت کا آئینہ ہیں۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام۔ تنقیدیں۔ ص ۱۸، ۱۹۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ۔ طبع دوم ۱۹۶۴ء

۲۔ ایضاً، ص ۱۸

۳۔ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے لکھا ہے:

''میں نے تمام خطوط کو مکتوب الیہ کے اعتبار سے مرتب نہیں کیا بلکہ تمام تحریروں کو تاریخ وار رکھا ہے۔ میرے خیال میں اس سے مکتوب نگار اور مکاتیب کے بارے میں تدریجی حالات کا علم بھی حاصل ہوتا ہے اور خطوط کا پس منظر بھی نمایاں ہوتا ہے۔'' (بحوالہ مکاتیب آزاد۔ پیش لفظ، ص ۱۶۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۶۶ء)

۴۔ لالہ دنی چند نے جو جگراؤں ضلع لدھیانہ کے رئیس تھے مولانا آزاد سے تعلیم حاصل کی تھی۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو مولانا ان کی ملازمت اور ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ مولانا سے لالہ دنی چند کی عقیدت اس زمانے میں پیدا ہوئی جب وہ جگراؤں میں رجب علی شاہ ارسطو جاہ کے پریس اور اخبار کی نگرانی کرتے تھے۔ اپنے شفیق استاد کے ان خطوط کو عزیز

از جان سمجھتے اور آغا محمد طاہر کے حوالے کیے تو لکھا کہ ''میرے گھر کی خیر و برکت انھیں سے وابستہ ہے۔'' پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔ سیاست سے دلچسپی کی وجہ سے کانگریس سے منسلک رہے۔ ۱۹۳۳ء تک زندہ رہے۔ (بحوالہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی)

۵۔ اس ضمن میں مولانا آزاد کے ۱۲ اپریل ۱۸۷۶ء کے خط بنام لالہ دنی چند کا یہ اقتباس معنی خیز ہے:

''میرا حال یہ ہے کہ جب ڈاکٹر (لائٹنر) صاحب آئے تو میں ان سے کالج میں ملا۔ استقبال کو اسٹیشن پر نہیں گیا۔ دوسرے دن گھر پر ہی جا کر مل آیا۔ اس دن سے پھر گھر پر نہیں گیا۔ اور طریقہ یہی رکھا ہے کہ گھر پر بے بلائے نہ جانا اور زیادہ اختلاط نہ بڑھانا۔ ابھی تک وہ بھی سیدھے سیدھے چلے جاتے ہیں۔ میں بھی چلا جاتا ہوں۔ آگے کا خدا مالک ہے۔''

۶۔ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کے مطابق ''میجر سید حسن بلگرامی نواب عماد الملک کے سوتیلے اور سید علی بلگرامی کے حقیقی بھائی تھے۔ وہ انڈین میڈیکل سروس میں ملازم تھے۔ لیکن فوج سے مستعفی ہونے کے بعد انگلستان چلے گئے۔ ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں واپس آئے تو علی گڑھ میں قیام کیا۔ عارضہ قلب سے ۱۹۱۵ء میں وفات پا گئے''۔

۷۔ آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد نے لکھا ہے کہ ''مولانا آزاد کا قاعدہ تھا کہ جب فرصت ملتی تھی کتابوں کی تلاش میں شہر شہر اور قریہ قریہ کا سفر کرتے تھے۔ دوستوں اور طالب علموں کے ذریعے معلوم کرتے تھے کہ کہاں کہاں اور کس کس کے پاس پرانی کتابیں ہیں۔ کتاب مل جاتی تو وہیں بیٹھ کر پڑھتے اور علمی تشنگی دور کرتے۔ اگر ممکن ہوتا تو قیمتاً خرید لیتے تھے۔ اگر خرید نہ سکتے تو ضروری حصے نقل کر لیتے۔'' (مکاتیب آزاد، ص ۱۶۶)

۸۔ مکاتیب آزاد۔ مولفہ فاضل لکھنوی۔ ص ۱۹۰

۹۔ فاضل لکھنوی صاحب کے مطابق نامہ خسرواں اس زمانے میں ایران کے ایک شہزادے نے لکھ کر خوبصورت تصویروں کے ساتھ جرمنی سے چھپوائی تھی۔ (مکاتیب آزاد۔ ص ۱۷۵)

آزاد کی مکتوب نگاری: مابعد جدید تناظر میں

ڈاکٹر قاضی عابد

بیسویں صدی کے نصف آخر سے اکیسویں صدی کی اوائلی دہائی تک ادبی مطالعات کو کسی ادبی صنف یا روایت کی شعریات کی تشکیل اور معنی فہمی کے مسائل کے درمیان ایک کشاکش یا کشمکش کی صورت درپیش رہی ہے۔ جوناتھن کیولر نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ساختیاتی شعریات کے کلاسیک ایڈیشن کے تازہ پیش لفظ میں اسی الجھن کی طرف اشارہ کیا ہے:

The goal was a poetics, an understanding of devices, conventions and strategies of literature, of the means by which literary works create their effects. In opposition to poetics I set hermeneutics, the practice of interpretation, whose goal is to discover or determine the meanings of a text.(۱)

اسی تناظر میں تھیوری کی طرف سے اٹھائے گئے سوالات کے حوالے سے جب مصنف کی ارادی معنویت کے ضمن میں مکتوب نگاری کی شعریات کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو متن فہمی کی راہ میں کئی دشواریاں پیش آتی ہیں اور آخر میں یہ ماجرا بھی بڑا دلچسپ لگتا ہے کہ مکتوب نگاری یا خط نویسی کو آپ ادب کے دائرے کے اندر بھی رکھ سکتے ہیں یا نہیں اور اگر رکھ سکتے ہیں تو وہ کون سی شے ہے جو خط نویسی یا مکتوب نگاری کو دائرۂ ادب میں لے آتی ہے۔ مکتوب نگاری کی شعریات کو وضع کرنے کی سب سے اچھی کاوش ہمیں خورشید الاسلام کے ہاں نظر آتی ہے:

خطوں کو نجی ہونا چاہیے، نجی باتوں میں رنگا رنگی، دلچسپی، تنوع اور عمومیت پیدا کرنا اچھے مکتوب نگار کا کام ہے۔ یہ ساری خوبیاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ وہ دیکھے اور محسوس کرے۔ دیکھنے اور محسوس کرنے ہی سے اسلوب بنتا ہے۔ دیکھنے اور محسوس کرنے میں ہی جدت ہوتی ہے۔ دیکھنے اور محسوس کرنے ہی میں وہ

بصیرت ہے جو جز و کو کل سے زیادہ حسین بنا دیتی ہے۔ جن خطوں میں انسان نے اپنے او پر قابو پالیا ہو، جہاں وہ خود ہو، جہاں آپ اس کے گدگدیاں کریں اور وہ مچل جائے، وہیں فتح ہے۔ وہ خط ادبی کارنامہ ہے جس کی بدولت لکھنے والا ان چند لمحوں کی طرح لازوال ہو جائے جنہیں جنبشِ قلم نے محفوظ کر لیا ہو۔ (۲)

خلیق انجم نے بھی غالب کے خطوط کی تدوین کے وقت مکتوب نگاری کی شعریات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں بہت کارآمد باتیں کی ہیں:

خط شخصی چیز ہے۔ اس میں صرف ایک آواز ابھرتی ہے اور وہ ہے مکتوب نگار کی آواز جو سو فی صد ذاتی ہوتی ہے۔ یہ آواز مکتوب نگار کی دوسری آوازوں سے مختلف ہوتی ہے، اس آواز سے بھی جو مکتوب نگار کی سماجی آواز ہوتی ہے اور اس آواز سے بھی جو اس کے تخلیقی فن میں گونجتی ہے۔ یہ آواز ایک ایسے انسان کی ہوتی ہے جو عظیم فنکار ہوتے بھی ایک عام انسان ہے اور عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا، جاگتا اور سوتا ہے۔ جو خلوت کدے میں اپنے چہرے اور تہ در تہ شخصیت پر سے تمام پردے ہٹا دیتا ہے۔ (۳)

غزل کی طرح خط لکھنا بھی بہت آسان ہے لیکن ایک اچھا خط یا اچھی غزل لکھنا بہت مشکل ہے۔ جس طرح یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کا لکھا ہوا خط اہم ہو اس طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر عظیم مکتوب نگار کے تمام خطوط ایک ہی درجے کے ہوں۔ (۴)

اس قابلِ قدر تناظر اور تھیوری کی طرف سے متن کی تفہیم کی متنوع جہات کی روشنی میں آزاد کی ان مکتوبات کی تفہیم و توضیح سے پہلے آزاد کے مکتوبات کے حوالے سے بنیادی معلومات پر گفتگو بے حد ضروری ہے۔ اپنے تمام اہم معاصرین کی نسبت آزاد کے دریافت شدہ مکاتیب کی تعداد غیر معمولی حد تک کم ہے۔ تا حال آزاد کے سو سے بھی کم خطوط اور رقعے دستیاب ہو سکے ہیں۔ اسی نسبت سے مخاطبینِ آزاد (مکتوب الیہان) کی تعداد بھی بے حد کم ہے۔ سید حسن بلگرامی کے نام آزاد کے مکاتیب پہلی بار بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں فنون لاہور میں شائع ہوئے (۵) اور بعد میں سید عبدالقادر کے ایما پر مکتوباتِ آزاد کے نام سے ۱۹۰۷ء میں ایک مختصر مجموعہ شائع ہوا جس کے مدوّن حسن بلگرامی تھے (۶) ۱۹۲۳ء میں خانوادۂ آزاد کے نامور فرزند آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد نے لالہ دنی چند سے بڑی مشکلوں سے ۳۲ خطوط حاصل کیے اور حسن بلگرامی اور کچھ اور لوگوں کے نام آزاد کے خطوط حاصل کر کے مکتوبات آزاد کے نام سے ہی شائع کر دیے۔ دوسرا اور آخری ایڈیشن ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔

۱۹۲۳ء میں جب میں نے ہوش سنبھالا تو پھر یہ خیال تازہ ہوا۔ بہت کوشش اور جستجو سے اور بہت سے خطوط جمع کیے جنہیں ''مکتوباتِ آزاد'' کے نام سے چھپوا دیا جس کا دوسرا ایڈیشن یہ ہے۔ (۷)

۱۹۶۶ء میں سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے اس وقت (اور شاید آج تک) میسر آزاد کے مکاتیب اور

مکاتیب نما تحریریں (کل تحریریں:۱۲۶) مدوّن کر کے مجلسِ ترقی ادب لاہور سے امتیاز علی تاج اور آغا محمد باقر کے اصرار پر شائع کرا دیں۔ اس مجموعے کے بعد آزاد کے مکاتیب کا کوئی اور مجموعہ یا آزاد کا کوئی اور غیر مدون یا غیر اشاعت پذیر مکتوب سامنے نہیں آیا۔ اس مجموعے میں سید حسن بلگرامی، لالہ دنی چند، ڈاکٹر لائٹنر، حکیم محمد دین، مولوی ذکا اللہ، ناصر نذیر فراق، میجر فلر اور کچھ نسبتاً غیر معروف لوگوں کے خطوط کے علاوہ اخبارات کو لکھے گئے مراسلے اور درخواستوں کے ساتھ ساتھ فارسی میں تحریر شدہ کچھ مکاتیب بھی شامل ہیں۔ یہ خطوط آزاد کی زندگی کے کم و بیش تیئس برسوں پر محیط ہیں۔ پہلا اُردو خط میجر فلر کے نام ہے جو ۱۸۶۱ء میں تحریر کیا گیا جبکہ آخری خط منشی ذکا اللہ کے نام ہے جو ۱۸۹۲ء کا محررہ ہے۔ فارسی مکتوبات کو اُردو مکتوبات پر زمانی تفوق حاصل ہے اور یہ آزاد کی زندگی کے اُس زمانے کی یادگار ہیں جب وہ دہلی سے نکلنے کے بعد لکھنو چھوڑ کے پنجاب کی طرف آ گئے تھے اور ریاست جیند میں ملازمت کر رہے تھے۔ یہ دو خط کسی 'معصوم علی' کے نام تحریر کیے گئے ہیں جن کے بارے میں آزاد پر کام کرنے والے محققین کچھ زیادہ معلومات فراہم نہیں کر سکے بلکہ ان دو خطوط (محررہ ۱۸۵۹ء، ۱۸۶۱ء) کا معصوم علی سے انتساب بھی قیاسی ہے۔ (۸) ان خطوط کی اہمیت یہ ہے کہ ان سے آزاد کے پنجاب میں جیند اور لدھیانے میں قیام کی طرف اشارے ملتے ہیں:

تفصیل ایں اجمال آں کہ سابق ازیں حقیقت تقرری خود بر عہدۂ محافظ دفتری فوجداری سرکار جیند عرض خدمت کردہ بودم و بہان جاپسری نمودم کہ بہ چندی مولوی رجب علی خاں صاحب بہادر بہ بندہ نبشتند کہ ایں جانب را چاپ نمودن بعضی از کتب ضرور بہ مرکوزِ خاطر ست: می خواہم تا طرح مطبع از آں خود اندازی۔ زرے کہ برای مصارفش بکار باشد بطور قرض حسنہ تلکفش ما می کنم۔ (۹)

بالجملہ الحال بہ لودھیانہ ام انداختہ اند وایں ہمہ بار گراں را بر سرایں ضعیف البنیان انبار ساختہ و بہ پزیرای عرض بندہ صورت چنین قرار دادہ اند کہ برعایت مصلحت ہائی چند در چند کہ مطبع و ضروریات مطبع ہر چہ باشد از ان خود جناب شان باشد بندہ خدمت گزار را برائے رفع حوائج ضروری کہ از اں ہیچ کس را گریزی نہ باشد نہ بطور مشاہرہ عطامی کردہ باشند۔ الغرض آلات وادوات مطبع ہمہ بہم رسیدند و ملازمان نوکر شدند۔ (۱۰)

دہلی میں بھرپور صحافتی زندگی، ذوق کے ساتھ دہلی کی تہذیبی و ثقافتی زندگی سے آشنائی، شعر و ادب کی دنیا سے تعلق، اپنے والد کی وجہ سے دہلی کی اشرافیہ کے ساتھ تعلقات، پھر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ذاتی سطح پر والد کی پھانسی کا المیہ، دہلی سے اجڑنے کی داستان، لکھنو کی طرف روپوشی اور پھر پنجاب کی طرف پیش قدمی، یہ آزاد کی زندگی کے ایسے اہم واقعات ہیں جن کا ذکر اُن کے دستیاب خطوط میں کہیں بھی نہیں ہے۔ پہلا دستیاب اُردو مکتوب دراصل ایک عرضی ہے جس میں 'میجر فلر' سے ملازمت کی درخواست کی گئی تھی اس مکتوب کی اہمیت کئی طرح کی ہے، ایک تو یہ کہ یہ خط ظاہر کرتا ہے کہ آزاد کی ملازمت کے سلسلے میں لائٹنر وغیرہ کا کوئی زیادہ کردار نہیں تھا، دوسرے یہ کہ میجر فلر جو کہ محکمہ

تعلیمات میں اہم ترین عہدے پر فائز تھے ان سے تعارف کا وسیلہ بھی ڈاکٹر لائٹز نہیں تھے۔ اسی طرح سے اس خط سے آزاد کے ان محققین کی اس رائے کی بھی تردید ہو جاتی ہے جن کے خیال میں میجر فلر سے ان کی ملاقات پیارے لال آشوب نے کرائی تھی۔ آزاد کا یہ خط لاہور میں ان کے عرصۂ قیام کے بالکل اوائل کا ہے جب وہ اپنے ایک ایسے رشتے دار کے توسط سے جو بعد میں ان کی شہرت سے محسود ہو کر ان کے درپے آزار ہو گیا تھا، محکمہ ڈاک میں ملازم ہوئے تھے مگر یہ ملازمت ان کی طبیعت سے لگا نہیں کھاتی تھی۔

> حضور کو یاد ہو گا کہ ماہ دسمبر ۱۸۶۰ میں حضور دورے سے مراجعت فرما کر تشریف لائے اور ڈاک بنگلہ لدھیانے میں رونق افروز ہوئے تو فدوی بھی شرف اندوز ملازمت ہوا تھا۔ اس وقت فدوی پرنٹر و پبلشر مطبع البحرین میں تھا کہ ارسطو جاہ مولوی رجب علی خاں بہادر نے بنا کیا۔ فی الحال بہ اتفاق آب و دانہ فدوی لاہور میں اور محکمہ محتشمہ حضور جنرل پوسٹ ماسٹر بہادر میں سررشتہ ہے۔ چوں کہ حضوری و خدمت حکام سے علاوہ اپنے نفع ذاتی کے اس قسم کے فوائد متصور ہیں، جن سے خلق خدا رضامند ہو اور اس واسطے ہمیشہ کے نام نیک یادگار ہے؛ اس واسطے فدوی بھی آرزومند قدم بوسی حضور کا ہے۔ اُمیدوار ہوں کہ بہ نظر علم پروری و جوہر شناسی اپنے وقت فرصت سے فدوی کو مطلع فرمایئے کہ حاضر حضور ہو کر دولت لازوال حاصل کروں۔ (۱۱)

یہ خط آزاد کی زندگی کے ایسے دور سے تعلق رکھتا ہے جب وہ ایک بہت بڑے حادثے سے گزرنے کے بعد زندگی کے ساتھ ایک مفاہمانہ رویہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اپنے لیے ایک نئے اور نسبتاً بہتر مستقبل کی بنیاد رکھنے کے لیے بے حد مضطرب تھے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب انہوں نے جان لیا کہ اب زندہ رہنے کے لیے انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطحوں پر کس طرح سے آشوبِ حیات کا مقابلہ کرنا ہے اور نئی زندگی سے کس طرح تعلق استوار کرنا ہے۔ عین ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو اس میں خوشامد یا پھر کچھ اور نظر آئے لیکن اصل بات یا ماجرا یوں ہے کہ آزاد قدیم اور جدید دور کے ایسے سنگم پر پیدا ہوئے تھے جہاں انھیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ ماضی کی طرف مراجعت کر کے موت کو گلے لگا لیتے ہیں، ماضی میں زندہ رہنا پسند کرتے ہیں یا پھر وہ نئی زندگی میں اپنی ذہنی استعداد اور صلاحیتوں کی شمولیت سے اپنے اور اپنے ماضی کے مزار پر کوئی نئی عمارت تعمیر کرنا پسند کرتے ہیں۔ سرسید سے لے کر آزاد تک اس دور کے تمام مسلم دانشور اس ذہنی عذاب اور خلجان سے گزرے ہیں۔ ان پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ اپنے اپنے آثار الصنادید کو اپنے اپنے دل میں زندہ رکھنا بھی اور ایک نئے معاشرے کی تعمیر بھی۔ سو اس نسل نے یہ ذمہ داری پوری طرح نبھائی اور شاید اس ذمہ داری کے نبھانے کے عمل میں وہ نو آبادکاروں کے ہاتھوں میں اُن کے سیاسی ایجنڈے کی تکمیل کے لیے آلۂ کار بھی بنے مگر تاریخ کا اپنا ایک جبر اور طریقِ کار ہوتا ہے۔ آزاد کی ذہنی ساخت کو سمجھنے میں یہ خط ہماری پوری معاونت کرتا ہے۔

آزاد اور ڈاکٹر لائٹنر کے تعلقات کے اتار چڑھاؤ پر بہت کچھ لکھا گیا۔ خانوادۂ آزاد سے لے کر ڈاکٹر محمد

صادق اور ڈاکٹر اسلم فرخی سے لے کر تازہ واردانِ بساطِ تحقیق و آثار تک کوئی بھی اس مخمصے کو پوری طرح اور استناد کے ساتھ حل نہیں کر سکا کہ آخر وہ کیا وجوہات تھیں جن کی بنا پر تعلقِ خاطر تو خوابِ ماضی ہو ہی گیا، دونوں کے درمیان بہتر تعلقات کار بھی نہ رہے۔ آزاد پر تحقیق کرنے والے بالعموم اسباب کا تعین کرتے ہوئے قیاس سے کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہر حال یہ طے ہے کہ یہ خطوط بھی آزاد اور لائٹنر کے درمیان تعلق خاطر کے اچھے دنوں کی کہانی سنانے کے ساتھ ساتھ تعلقات میں درآنے والی تلخی کی گواہی دیتے ہیں مگر یہ بھی کوئی خاص گرہ اس باب میں کھولنے میں ناکام رہتے ہیں۔

لائٹنر کے نام پہلا خط سرکاری نوعیت کا یوں لگتا ہے کہ آزاد سے اُردو زبان کی تدریس کے لیے لکھی گئی کسی کتاب پر رائے مانگی گئی ہے اور آزاد اس ابتدائی قاعدے رکتاب پر ایک منجھے ہوئے ماہر تعلیم کی طرح جانچ رپورٹ پیش کر رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اسی حوالے سے خود آزاد کو بھی بچوں کے لیے کتابیں تحریر کرنے کا شوق پیدا ہوا ہو اور قصص ہند اور اس سلسلے کی دیگر کتابوں کا سلسلہ اسی تحرک سے شروع ہوا ہو۔ بہر حال یہ جانچ رپورٹ آزاد کی ذہنی اور نوآبادیاتی دباؤ کی تفہیم اور اس طرز کی کئی اور باتیں سمجھنے میں آسانی پیدا کرتی ہے۔ اس خط میں جو تجاویز انھوں نے دی ہیں ان کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ اس متن کی کئی طرفیں کھولتا نظر آتا ہے۔

> ملتان کی چھینٹ ایک زمانے میں اور شہروں میں جا کر اشرفی گز بکا کرتی تھی۔ اس کی آب و ہوا کو رنگ کی شوخی اور پختگی میں قدرتی تاثیر ہے۔ انگریزی چھینٹوں کے آنے سے وہاں کے کارخانے بند ہو گئے۔۔۔۔ شہر ملتان بہ سبب راہ گزر کے ہندوستان اور خراسان کی منڈی ہے، لیکن پشاور سے دوسرے درجے پر۔ امیر تیمور اسی راستے سے ہندوستان آیا تھا، اور بادشاہ بھی اسی راستے سے گزرتے رہے ہیں۔ (۱۲)

یہ جملہ آزاد کے ذہن کی کئی گرہیں کھولتا ہے کہ ''انگریزی چھینٹوں کے آنے سے وہاں کے کارخانے بند ہو گئے''۔ یہ نوآبادیاتی ذہن کی کشمکش کا پوری طرح غماز ہے۔ وہ کشمکش جو بنیادی طور پر شناخت کے بحران کو جنم دیتی ہے۔

> In studies of identity in Colonial and Post Colonial Studies, for instance there has been heated debate about the agency of native or 'Subaltern' (the term for a subordinate or inferior). Some thinkers, interested in the point of view and agency of the subaltern, have stressed acts of resistance to or compliance with Colonialism, and then accused of ignoring the most insidious effect of Colonialism: the way it defined the

situation and the possibilities of action, making the inhabitants 'natives' for example. Theorists describing the pervasive power of "Colonial Discourse", the discourse of Colonial Powers which create the world in which Colonized subjects live and act or accused of denying agency to the native subject.(۱۳)

شناخت کا یہی بحران بعض اوقات ماضی تمنائی میں بھی لے جاتا ہے مگر آزاد کی اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ نوآبادیاتی استعمار نے مقامی کاری گر، مقامی ذہن اور مقامی مزدور کو ازکار رفتہ بنانے کی پوری منصوبہ بندی کر رکھی ہوتی ہے۔

تکثیریت کے حامل اس متن کا ایک تعبیری پہلو یہ بھی ہے کہ اسی مکتوب نے آزاد اور لائٹنر کے مستقبل کے علمی روابط کی اساس فراہم کی ہے اور اسی مکتوب کے ذریعے لائٹنر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ آزاد سے مزید علمی استفادہ ممکن ہے اور مشرقی علوم کی دنیا میں وہ ایک ایسے فرد سے تعلق پیدا کر سکتے ہیں جو خاموشی (اگرچہ یہ خاموشی زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی اور آزاد اور لائٹنر کے تعلقات کے خاتمے کا سبب بنی) سے اُن کی مدد کر سکتا تھا۔ اس خط سے اگلے دو خطوط کا بین المتنی تعلق اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ لائٹنر آزاد سے متاثر ہوئے ہیں اور ان سے علمی استفادے کے خواہاں ہیں۔ آزاد کے جواب ان کے تبحر علمی کے ساتھ ساتھ ان کی تجزیاتی قوت پر بھی دلالت ہیں۔ ان جوابات میں آزاد ایک وسیع المطالعہ عالم (آزاد کو محقق اس لیے نہیں لکھا کہ ہمارے ہاں سطر شماری اور گورکنی کرنے والے لوگ ہی محقق کہلاتے ہیں اور خاص وضع کی کند ذہنی ان کے اندر وہ تجزیاتی قوت پیدا نہیں ہونے دیتی جو آزاد جیسے علماء کو فراواں طور پر حاصل تھی) کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

دوسری جلد میں فقط ایک کتبے کی تصویر ہے، جس کی سطریں اور اصل رسالے میں بھی اس کی عبارت کو صاف کر کے لکھا ہے، مگر میری رائے ناقص میں اس کے اکثر الفاظ میں اختلاف ہے۔ اس کے آخر کی دو سطروں کی عبارت کو جو کتاب میں لکھا گیا ہے، غالباً وہ کچھ اور ہے مگر مجھ سے بھی پڑھا نہیں گیا جو کچھ پڑھا گیا، وہ عرض کرتا ہوں۔(۱۴)

لاہور کے اختلاف لفظی کو تاریخ ہفت اقلیم میں لاہور کے بیان میں دیکھنا چاہیے۔ اس نے اسے 'لُہر' بھی لکھا ہے، مگر وہ حقیقت میں اس قسم کا تصرف ہے جیسے غیر زبان کے الفاظ کو صاحب زبان شاعر اپنی زبان میں تصرف کر کے لے جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چوں کہ ترکوں کا قاعدہ ہے کہ وہ تحریر میں اپنے اعراب حروف کے

ساتھ ادا کرتے ہیں اس لیے عجب نہیں کہ شاعر مذکور نے لاہور کو شعر میں 'لہر' باندھ دیا ہے۔

اور امیر خسرو کے شعر کے باب میں جو حضور نے استفسار فرمایا ہے تو شعر مذکور کو قـــــران السعدین میں معلوفی کی تر کتار میں لکھا ہے اور تاریخ ہفت اقلیم میں بھی مندرج ہے، بلکہ مجھے یاد ہے کہ فرشتہ میں، بدایونی اور خلاصة التواریخ والے نے بھی لیا ہے۔ مگر اس وقت ان میں نشان نہیں دے سکتا۔ قران السعدین اور ہفت اقلیم میں کچھ شبہ نہیں۔ آپ بے تامل کمیٹی میں پیش کریں۔ (۱۵)

ان اقتباسات میں لفظ ''لہر'' کی جو توجیہہ بیان کی گئی ہے وہ آزاد کے تجزیاتی ذہن کا کمال ہے وگرنہ ہمارے ہاں کے عام محقق اس بات کو فوراً ہی تسلیم کر لیتے ہیں کہ ''لہر'' لاہور کا قدیم نام ہے۔ یہ آزاد کا بین العلومی ذہن ہے جو اس طرح کی تاویل کو تسلیم کرنے کی بجائے اجتہاد کرتا ہے اور اپنے اجتہاد اور تعبیر کی بنیاد علم عروض اور علم ہجا پر رکھتا ہے۔

اس ہی مکتوب سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر تعلقات جب اس سطح پر پہنچ چکے تھے تو آخر کیا وجہ ہوئی کہ یہ تعلقات دشمنی میں اور بے حد سخت دشمنی میں ڈھل گئے۔ آزاد کے تمام محققین نے قیاساً سنینِ اسلام کو ہی بنیادی وجہ قرار دیا ہے اور دلائل اور نظائر میں قیاس سے ہی زیادہ کام لیا ہے۔ حالانکہ آزاد کے ایک مکتوب کے لہجے سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے اور آزاد کے کچھ اور مکاتیب اس نقطۂ نظر کو تائید فراہم کرتے ہیں۔ ذیل میں وہ اہم اقتباس اور پھر دیگر خطوط سے تائیدی اقتباس درج ہیں:

میں اس تحریر سے آپ کا وقت ضائع نہ کرتا، مگر کئی دن سے سنتا ہوں کہ سنین الاسلام میں کسی نے بہت غلطیاں کر دی ہیں اور دوسرے نے تصدیق کیں۔ میں نے بہ موجب اپنے عہد کے اس کی بھی تفصیل نہ چاہی، مگر آج ایک نئی بات سنی کہ سنین الاسلام کی ترکیب ہی غلط ہے۔ مجھے ضبط کی طاقت نہ رہی: چناں چہ اس کی ضرورت نے مضطرب کر دیا اور یہ مختصر سی عرض داشت انگریزی میں لکھتا ہوں۔ (۱۶)

خیر جو کچھ کیا اچھا کیا؛ مجھے اپنے خراب ہونے کا افسوس نہیں، کیوں کہ جو سنتا ہے افسوس کرتا ہے۔ اگر دشمنوں کے ہاتھ سے مجھے خاک میں ملوا دیں گے تو مجھے افسوس نہیں کیوں کہ میرا فخر تنخواہ اور کرسی اور عہدے پر نہیں، میں اسی خاک پر بیٹھا آپ کو دعائیں دوں گا اور درختوں کے پتوں پر وہ باتیں لکھ کر پھینکوں گا، جو پڑھے گا وہ افسوس کرے گا، یعنی کون تھا جس نے ایسے شخص سے ایسا سلوک کیا۔ اگر قتل بھی ہو جاؤں گا تو جو کچھ اب تک لکھ چکا ہوں، یہ خلق و عالم کے رلانے کے لیے کافی ہے اب شکوے کی جگہ رہی نہ شکایت کا موقع؛ اب وہ وقت آ گیا کہ بہ موجب اپنے وعدے کے جاؤں گا اور سینہ چیر کے دکھاؤں گا کہ کتنے زخم لگے ہیں۔ (۱۷)

امکان یہی ہے کہ یا تو خود آزاد نے کہیں اپنی ''وعدہ شدہ خاموشی'' کو سنین اسلام کے حوالے سے توڑا

اور جن لوگوں نے سنا انھوں نے لائٹنر کو جا بہکایا یا پھر حاسدین آزاد (۱۸) نے از خود کچھ باتیں گھڑ لیں۔ بہر حال تعلقات کا کسی نہ کسی وجہ سے خاتمہ ہوگیا۔ ان خطوط میں وہ سارا اُتار چڑھاؤ جو ان تعلقات میں آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آزاد کو آزار پہچانے کا ایک وسیلہ ہمائے پنجاب میں شائع ہونے والا ایک اداریہ تھا جو سیالکوٹ کے محکمہ ڈاک کے خلاف تھا۔ اسے سبب بنا کر آزاد کو لاہور سے باہر جانے سے بھی روک دیا گیا۔ آزاد کے خط کا لہجہ طنزیہ ہو جاتا ہے:

> آج تیسرا دن ہے اب تک انجمن سے جواب حاصل نہیں ہوا کہ سیکرٹری انجمن لاہور میں نہیں۔ میری اجازت فقط آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اگر روکیں تو کسی لفٹینٹ گورنر کو روکیں، کسی گورنر کو روکیں؛ محمد حسین عاجز غریب کا روکنا آپ کے لیے کچھ فخر نہیں۔ (۱۹)

یہ دور آزاد کی زندگی کا بے حد مشکل دور ہے اور لائٹنر اور (انھیں بہکانے والے) حاسدین آزاد انہیں طرح طرح سے تنگ کر رہے ہیں۔

> قسمیہ کہتا ہوں کہ آزاد ابھی بھی وہی بندۂ خدمت گزار ہے اور دل سے عہد پر قائم ہے۔ آپ کو یاد ہوگا آخر کے دنوں میں میں نے عرض کی تھی کہ جو کچھ سختیاں اپنے جانی دشمنوں پر آپ نے نہ کی ہوں، وہ آپ کے ہاتھ سے میرے دشمن مجھ پر کروا دیں گے اور آپ نہ سمجھیں گے۔ وہ اب خوشیاں کرتے ہیں اور ہنستے ہیں کہ دشمن کو دشمن کے ہاتھ سے ہی اس طرح مارتے ہیں۔ ہزاروں کتے کہ شیر کی کھالیں پہنے تھے، آپ نے انھیں مارا؛ مگر اب تک یہ آپ کو نہ معلوم ہوا کہ شیر فقط ایک ہی بات میں شکار ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضور نے مجھے چھٹی میں روک لیا، مگر کس نے روکا؟ وہی آزاد بندۂ احسان، قیدی بہ زنجیر۔ بجائے اس طول کلام کے فقط اتنا کہہ دیتے ہیں کہ جاؤ کالج کے کام کے سوا تمہیں اب کون روکتا ہے؛ واللہ کہ آزاد ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتا اور وہیں گر پڑتا۔ (۲۰)

چونکہ پہلے بھی اکثر یہ عمل نجس اوپر کے کمروں میں ہوتے ہیں، بلکہ یہ نجاست کا عمل صغیر تھا، وہ اعمال نجاست

> کبیرہ کے ہیں، پس اس لیے کہ بڑھتے بڑھتے یہ نوبت پہنچ گئی ہے اس لیے اطلاع حضور میں واجب ہے کہ آئندہ اس سے زیادہ ترقی نہ کریں، معاملہ نازک ہے۔
>
> حضور کو یہ بھی خیال رہے کہ عمل مذکور کسی طالب علم کا تنہا نہیں معلوم ہوتا، اس میں اور بھی تائید یں شامل ہوں گی، حضور تفتیش فرمادیں گے تو سب حال معلوم ہو جاوے گا۔ (۲۱)

آزاد کی دیوانگی کے اسباب میں سے ایک ڈاکٹر لائٹنر کے اس رویے کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔ بہر حال یہ آزاد کی زندگی کے مشکل ایام کی خود نوشت ہے۔ اپنے لازوال اسلوب میں وہ اپنے اور لائٹنر کے تعلقات کی داستان رقم کرنے کے ساتھ ساتھ نو آبادیاتی دباؤ کی تصویریں بھی بناتے نظر آتے ہیں۔ لالہ دنی چند آزاد کے شاگرد ہیں اور

استاد کے بے حد چہیتے ہیں، ان کے نام خطوط جہاں ایک طرف استاد اور شاگرد کے تعلقات کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہیں وہیں پر آزاد کی شخصیت کی کئی پرتیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں۔ آزاد دل سے دنی چند کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ اسے درست مشورے دے رہے ہیں۔ ذیل میں دیے گئے دو اقتباسات بے حد اہم ہیں ایک تو آزاد دنی چند کو بتانا چاہتے ہیں کہ یہ قدیم مشرقی خیال کہ استاد شاگرد کو سب کچھ سکھا سکتا ہے محض ایک غلط فہمی ہے اور دوسرا خط آزاد کی اپنے زمانے کے (یا شاید ہر زمانے) مولویوں کے بارے میں ہے:

انشا کا حقیقت میں تم کو وہم ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ اگر باپ چاہے کہ بیٹے کو سکھاؤں اور اس میں مادہ نہ ہو تو کبھی نہیں بتا سکتا۔ اور اس میں مادۂ قابل موجود ہے تو کتابیں بھی استاد کافی ہیں۔ میرے اوپر جو تمہیں خیال ہے یہ فقط بھرم ہی بھرم ہے۔ میں نے اس کام کی کبھی اصلاح نہیں لی، نہ عربی میں نہ فارسی میں، نہ اُردو میں۔ ہاں اچھے اچھے صاحب کمالوں کا کلام دیکھتا رہا۔ ان کے دیکھتے دیکھتے ایک رنگ ایسا بے رنگ پیدا ہو گیا کہ سب سے الگ ہے۔ اب چاہے کوئی اسے بے رنگ کہے چاہے خوش رنگ۔ بس یہی طریقہ استادی شاگردی کا ہے۔ اگر چند روز پہلے تم یہاں آ ؤ پھر اپنے سامنے چند کاغذ میں تم سے لکھواؤں اور انھیں تمہارے سامنے خود بناؤں، شاید اس کا اثر بہ نسبت اس کے جلد تر ہو۔ (۲۲)

لو صاحب! میں پنڈت جوالا ناتھ صاحب سے پھر مل آیا اور ان سے دونوں کی منظوری کروالی۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ پہلے ایک کو بھیجو۔ جب پندرہ بیس دن میں اس کے پاؤں جم جائیں تو دوسرے کو بھیجو۔ اور یہ تم کو اختیار ہے کہ جس کو چاہو بھیجو۔ اور اتنی بات اور بھی دیکھ لیجیے کہ وہ شخص نیک طبع ہو۔ نیک طبع کیا؟ اس سے یہ مطلب نہیں اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم مولوی، متقی، پرہیزگار ہو۔ پناہ بخدا! ایسے سے تو میں بڑا ڈرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ ضرور دغا دے گا۔ آپ نے مجھے دیکھا کہ ہنستا ہوں، ہر طرح سے تمسخر کرتا ہوں، مگر وہ خوشی اتنی ہی ہے، اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہتی۔ بس وہ بھی اس قدر شگفتہ مزاج ہو تو ہرگز عیب نہیں۔ یہ اس واسطے میں نے لکھا کہ مکان گھر کے پاس ہے، اور جب میرے پاس ہوگا تو اتفاق سے کبھی کبھی دروازے پر بھی آنا جانا رہا کرے گا۔ اس لحاظ سے جسے آپ مناسب سمجھیں اسے پہلے بھیجیں۔ (۲۳)

سید حسن بلگرامی کے نام مکتوبات بھی آزاد کے ذہنی سفر کی ایک روداد مرتب کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وہ دربار اکبری کو مدون کر رہے ہیں۔ ان خطوط میں گاہے بگاہے وہ اپنی اس تصنیف اور ڈراما اکبر کے حوالے سے بلگرامی کے ساتھ خیالات کا تبادلہ کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی استناد حوالہ جات کے باب میں، کبھی اکبر اور مغل درباری تصاویر کے سلسلے میں، ان خطوط میں پنجاب یونیورسٹی، گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج کے مسئلہ پر اپنی پنشن کے باب میں اور کبھی اپنی ذاتی پریشانیوں کے حوالے سے یہ وہ دور ہے جب آزاد آہستہ آہستہ اس ذہنی کیفیت کی

طرف بڑھ رہے ہیں جو ان کے دورِ جنوں پر منتج ہوتی ہے:

تسلیم! عنایت نامہ باعث اعزاز ہوا۔ رات کو دس بجے میں گھر پہنچا۔ اس وقت خطوط اور کارڈوں کا انبوہ سامنے ہے، دل دربار میں ہے اور دو دو حرفوں میں سب کو ٹال رہا ہوں۔ آپ کی تحریر کا جواب فرصت چاہتا ہوں، مجھے کہاں؟ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ مآثر الامراء اور سوانح اکبری کسی زمانے میں دیکھی تھیں۔ یہاں تلاش تھی اور نہیں ملتی تھیں؛ چند مقاموں میں پرانی کتابوں کا پتا لگایا تھا؛ چھن مُس بھاگا بھاگا گیا اور دوڑا دوڑا آیا؛ جو کچھ ہاتھ لگا اسے دیکھتا گیا اور یادداشتیں لیتا گیا۔ مآثر الامراء بھی مل گئی؛ شکر کا مقام ہے جو کچھ میں نے دانہ دانہ اور قطرہ قطرہ کر کے جمع کیا ہے وہ مآثر الامراء سے بہت زیادہ نکلا؛ پھر بھی حق سے گزرنا کفر ہے؛ ہر شخص کے حال میں تین تین چار چار نکتے مل گئے اور اچھے مل گئے۔ سب سے زیادہ یہ ہے کہ اب جو دربارِ اکبری کا مشاہدہ کرے گا یہ نہ کہہ سکے گا کہ آزاد کو مآثر ہاتھ نہ آئی۔ (۲۴)

اب معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ کالج بھی یونی ورسٹی کے حوالے ہو جائے گا۔ یونی ورسٹی کی یہ رائے ہے کہ علوم و فنون ریاضی وغیرہ سب کی تعلیم ترجموں کے ذریعے ہو جایا کرے گی۔ سردست اس قدر تو نہ ہوگا مگر اتنا تو ضرور ہوگا کہ یونی ورسٹی کے پاس کئی مسجدوں کے ملانے اور ہندو پنڈت نکمے بیٹھے ہیں؛ طلبا ے کالج کو یہ دیسی کتابیں پڑھالیا کریں گے۔ کالج کے مولوی و پنڈت دونوں تخفیف۔ تب مولوی کا کیا حال؟ یا گورنمنٹ کوئی عہدہ دے گی؛ اکسٹرا اسسٹنٹی؟ مشکل ہے؛ منصفی؟ تحصیل داری؟ شاید پنشن دے دے گی۔ (۲۵)

اگرچہ کورس کا جھگڑا پیچھے لگ گیا ہے، مگر میں مصروف کار ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ طبیعت محنت پسند واقع ہوئی ہے۔ انتخاب میں آسان بات یہ ہے کہ کتاب اٹھائی، لکھ دیا کہ فلاں صفحے سے فلاں صفحے تک؛ مگر اسے دل پسند نہیں کرتا۔ جی چاہتا ہے، ایسا انتخاب ہو کہ طلباء کے لیے باعثِ شگفتگی ہو۔ البتہ اس میں محنت بہت ہے۔۔۔ کالج کے باب میں ابھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا؛ میرا فیصلہ بھی اسی پر منحصر ہے۔ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرکار مجھے کو یہ نہ کوئی عہدہ دے گی؛ خواہ سررشتۂ تعلیم میں، خواہ سول لائن میں۔ اخیر درجہ پنشن کا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جس گھر میں ایک سو پچاس روپے مہینہ آتا ہو، اس میں پچاس روپے آئیں گے تو صورتِ حال کیا ہوگی۔ لیکن دل کی آزادی یہی کہتی ہے کہ قناعت کو رفاقت میں لو، تھوڑا کھاؤ اور اپنی کتابوں کو پورا کرو۔ خداے کریم کارساز ہے، وہ دینا چاہے گا تو اس کے ہزاروں ہاتھ ہیں؛ عہدے کے لیے کوشش نہ کرو۔ (۲۶)

ان خطوط کی دو اور جدید حوالوں سے اہمیت ہے ایک تو یہ کہ آزاد ڈرامے کے حوالے سے جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ ڈرامے کی تنقید کے ابتدائی نقوش میں شمار کی جا سکتی ہے اور دوسرے ان خطوط (حسن بلگرامی) اور اس سے ماقبل کے کچھ خطوط میں وہ ایک feminist کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ سرسید اپنے دور کے سب سے بڑے جدید فرد

ہونے کے باوجود عورتوں کی تعلیم کے باب میں یا تو خاموش ہیں یا پھر اس مسئلے کو چھیڑنا نہیں چاہتے لیکن آزاد کی یہ رائے اسے دورِ جدید کی نسوانی شعور کی تحریک کا پیش رو بنا دیتی ہے۔

تذکرۃ العورات کا حال جو آپ نے پہلے مرحمت نامے میں لکھا تھا معلوم نہیں کہ اس میں چاند بی بی کا بھی تذکرہ ہے یا نہیں: یہ بھی بڑی بالیاقت اور صاحب ہمت بی بی دکن میں ہوئی ہے: اسے نادرۃ الزمانی کہتے تھے۔ آپ وہاں سے اس کے حالات دریافت فرمائیں اور مجھے بھی عنایت کریں۔ (۲۷)

مکاتیب تو خارق العادت واقعات سے بھرے ہوئے ہیں لیکن جو مکاتیب آزاد نے مختلف اخبارات کو تحریر کیے ہیں ان میں جدید شاعری کے حوالے سے اور مقامی لوگوں کے سلسلۂ روزگار کے حوالے سے جو کچھ کہا ہے وہ مابعد نو آبادیاتی تصورِ نقد کے حوالے سے بے حد اہم ہے۔

اب خیال کرنا چاہیے کہ یہاں کی رعایا کے گھروں کا کیا حال ہوگا اور سفید پوشوں اور قدیمی اشرافوں پر دونوں وقت کیا گزرتی ہوگی خصوصاً جس حال میں کہ قدیمی عہد کے دیکھنے والے بھی ابھی بقیہ موجود ہیں۔ اور ان سے فارسی قلم کے سوا فولاد تو درکنار پر کا قلم بھی نہیں اٹھ سکتا۔ اس سبب سے ان کے دل افسردہ اور ہمتیں شکستہ ہو رہی ہوں گی اور یہ امر آئندہ ہونہاروں کے تحصیل علم و کمال اور ترقیات ظاہر و باطن میں کیسا سدِ راہ ہوتا ہوگا۔ (۲۸)

اس اقتباس کو اگر Stephon Howo کی اس رائے سے ملا کر دیکھا جائے تو کئی قابلِ قدر نتائج سامنے آتے ہیں:

The inferiority of the colonized might, of course be seen as the product of historical circumstances, implying that under different conditions Non-Europeans could achieve just as much as whites believed they did. It followed that the purpose and justification of empire was to create those conditions among the colonized; it was essentially an educational or civilizing enterprise or it might be that deference in culture or technological achievements reflected biological ones. Humanity was sharply and unalterably divided into racial groups, arranged in a clear hierarchy of superiority and inferiority. (۲۹)

آزاد کی خطوط کی دنیا بے حد مختصر ہے لیکن اسے طویل ہونا چاہیے تھا اور خاص کر وہ مکاتیب جو آزاد نے

آبِ حیات کی تدوین کے وقت اپنے وقت کے اہم ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو لکھے اگر وہ سامنے آجاتے تو پتا چلتا کہ آزاد اپنے مکتوبات میں تاریخ نویسی کے کن اُصولوں کو مدنظر رکھ کر رہے ہیں اور تاریخ ادب کی تشکیل میں نو آبادیاتی دباؤ ان کے ذہن پر کیا اثرات مرتب کر رہا ہے، حالی اور ذکاء اللہ وغیرہ کے دستیاب خط گواہی دیتے ہیں کہ آزاد نے آبِ حیات کی تدوین کے مرحلے پر بہت زیادہ خطوط لکھے ہیں لیکن یہ اسرار اپنی جگہ عجیب ہے کہ اس سلسلے کا کوئی بھی مکتوب سامنے نہیں آسکا۔

آزاد کے خطوط کی یہ دنیا اتنی رنگا رنگ نہ سہی جس کی آزاد کی باقی تخلیقات ہیں لیکن آزاد کے ذہن پر نو آبادیاتی دباؤ کی کہانی ان خطوط میں موجود ہے اور مابعد جدید تنقید ان خطوط میں موجود بصیرت کے کئی مخفی گوشوں کو وا کر وا سکتی ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1. Culler, Jonathan, Structuralist Poetics, 2002, London, Routledge, Preface, II

۲۔ خورشید الاسلام، تنقیدیں، ۱۹۶۲ء، علی گڑھ، انجمن ترقی اُردو (ہند)، ص

۳۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، غالب کے خطوط، ۱۹۹۳ء، دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، جلد اول، ص ۱۲۶، ۱۲۷

۴۔ ایضاً، ۱۳۲

۵۔ محمد طاہر، آغا، مکتوباتِ آزاد، لاہور، ص ۶، ۷

۶۔ فاضل، مرتضیٰ حسین، سید لکھنوی، مکاتیبِ آزاد، ۱۹۶۶ء، لاہور، مجلس ترقی ادب، ص ۱۴

۷۔ محمد طاہر، آغا، حوالہ مذکورہ، ص ۷

۸۔ فاضل، مرتضیٰ حسین، سید لکھنوی، حوالہ مذکورہ، ص ۲۵

۹۔ آزاد، مکاتیبِ آزاد، ص ۲۶، ۲۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۱، ۳۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۰

13. Culler, Jonathan, Literary Theory, 2005, Karachi, Oxford University Press, P.118,119

۱۴۔ مکاتیب آزاد،ص۵۸

۱۵۔ ایضاً،ص۵۹، ۶۰

۱۶۔ ایضاً،ص۷۷

۱۷۔ ایضاً،ص۷۶

۱۸۔ کہا جاتا ہے کہ آزاد کے حاسدوں اور دشمنوں کی کمی نہ تھی۔ یہاں تک کہ ان کے وہ رشتہ دار (محمد علی) جنھوں نے آزاد کو لاہور میں خوش آمدید کہا تھا، پناہ دی تھی وہ بھی آزاد کی شہرت کی وجہ سے ان کے خلاف ہو گئے اور آزاد کو تنگ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ عین ممکن ہے کہ کالج میں اور کالج سے باہر اُن کے حاسدین نے لائٹنر کو بھی سچی جھوٹی کہانیاں جا سنائی ہوں اور ان کے تعلقات میں دراڑ پڑ گئی ہو۔

۱۹۔ مکاتیب آزاد،ص۷۱

۲۰۔ ایضاً،ص۷۵، ۷۶

۲۱۔ ایضاً،ص۷۹

۲۲۔ ایضاً،ص۹۰، ۹۱

۲۳۔ ایضاً،ص۱۱۰

۲۴۔ ایضاً،ص۱۶۶، ۱۶۷

۲۵۔ ایضاً،ص۱۷۸

۲۶۔ ایضاً،ص۱۸۰، ۱۸۱

۲۷۔ ایضاً،ص۱۷۵

۲۸۔ ایضاً،ص۵۲، ۵۳

29. Stephen Howo, Empire, 2002, Karachi, Oxford Unievrsity Press, P. 85,86

آزاد کا سفرایران-ایک جائزہ

ڈاکٹر محمد کیومرثی جرتودہ

گشتہ ام محو سواد سبز خطان دکن
دلنشین افتاد نقش حیدر آبادی مرا

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد جیسی عظیم شخصیت کو برِ عظیم پاک و ہند کی علمی و ادبی محافل اور حلقوں میں جو شہرت اور دوام نصیب ہوا ہے اردو زبان و ادب کے آسمان کے چمکتے ہوئے تاروں میں کسی اور شخصیت کو شاید کم ملا ہو۔ آپ نے اردو نثر و نظم کو اپنے اسلوبِ تحریر سے جو حسن و کمال عطا کیا ہے وہ اردو ادب کا طرۂ ناز اور مایۂ فخر ہے۔

اردو ادب کے یہ نامور اور سحر طراز، انشاء پرداز، مدرس، صاحب طرز ادیب، شاعر، محقق، مورخ اور زبان دان ۱۸۳۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اردو کے مشاہیرِ علم و ادب کی طویل فہرست میں مولانا محمد آزاد جیسی ادبی شخصیت کو بہ انحاء مختلف سرفہرست رکھا جا سکتا ہے۔

رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو میں "اردو نثاروں کے حصے میں" مولانا آزاد کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> اردو نثر نگاروں میں آزاد کی ایک بہت وقیع اور بہت نمایاں ہستی ہے۔ بحیثیت بانیِ تحریک جدید ہونے کے، بحیثیت جدید طرز کے شاعر کے، بحیثیت ایک فارسی اسکالر کے، جو قدیم رنگ کے ساتھ جدید رنگ کے بھی بڑے ماہر تھے، بحیثیت ایک ماہرِ تعلیم کے جن کی وجہ سے پنجاب میں انگریزی کے ساتھ اردو و فارسی تعلیم نے بھی بڑا رواج پایا، بحیثیت ایک اعلیٰ مضمون نگار کے، بحیثیت ایک زبردست ناقد کے، بحیثیت ایک مشہور پروفیسر اور مصنف کے، بحیثیت حامی اردو کے، بحیثیت ایک مُقرر کے، آزاد اپنے زمانے میں عدیم المثال تھے مگر وہ چیز جس نے ان کو زندۂ جاوید کر دیا، وہ ان کا خاص طرزِ تحریر ہے جو لاثانی ہے اور جس کی تقلید محال ہے۔[1]

آزاد کی شخصیت، تخلیقی صلاحیتوں اور ذہنی نشو و نما کو نکھارنے میں دہلی کالج نے بڑا کردار ادا کیا۔ محمد ابراہیم ذوق دہلوی کے شاگرد ہوتے ہوئے، اُنھیں اپنے زمانے کے عصری تقاضوں سے کافی شعور و آگاہی ملی۔

محمد حسین آزاد نے دو سفرنامے یادگار چھوڑے ہیں، ایک وسط ایشیا کی سیاحت اور دوسرا سیر ایران۔ مرحوم آزاد کو اپنی زندگی میں اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ خود اپنے سفرناموں کو رسالے یا کتابی شکل میں مرتب کریں۔ انھوں نے ان سفرناموں میں اپنے تجربات و مشاہدات کو مخصوص انداز و اسلوب میں بیان کیا ہے اور انھیں چلتی پھرتی تصویروں کا روپ دیا ہے۔ اُن کی وفات کے بعد، آزاد کے نبیرہ محمد آغا طاہر نے اُن کی یادداشتوں کو سیر ایران کے نام سے مرتب کیا۔ مولانا آزاد کے سفرنامہ ایران کا جائزہ لینے سے پہلے، اردو زبان وادب کے ایک بڑے ماہر و متخصص کے بیانات قابل ذکر جانتا ہوں۔

جناب پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب اپنی کتاب معاصر اردو ادب، نثری مطالعات میں جمیل الدین عالی کی سفرنامہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے اس میں اب تک ڈیڑھ دو سو سفرنامے لکھے جا چکے ہیں، ان کے بقول اردو میں سفرنامہ نگاری کی تاریخ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے کسی صورت زیادہ نہیں، کمبل پوش کی تاریخ یوسفی، عجائباتِ فرنگ ۱۸۴۷ء اردو کا پہلا سفرنامہ ہی نہیں سفرنامے کا اہم ترین سنگ میل ہے۔ (۲)

اپنے مطالب جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بات غور طلب ہے کہ کیا جدید دور میں حقیقی سفرنامہ لکھنا ممکن ہے، پاسپورٹ کی پابندیاں، فرصت کی قلت، سیاح کے لیے مہلت قیام کا تعین اور اسی نوعیت کی دوسری پابندیاں ایک حقیقی سفر یا سیاحت میں رکاوٹ نہیں بنتیں؟

محترم ڈاکٹر صاحب تین سال کے لیے شعبۂ اردو تہران یونیورسٹی، ایران میں بطورِ استاد اعزامی رہ کر تدریس کر چکے ہیں اور اس مدت میں انھوں نے ایران کے مختلف شہروں کا دورہ بھی کیا ہے۔ میری استاد معظم سے درخواست یہ ہے کہ آپ ناممکن کو ممکن بنادیں اور موجودہ ایران کو ہمارے محترم پاکستانی و ہندوستانی ادباء، محققین خصوصاً برعظیم پاک و ہند کی علمی و ادبی محافل کے لیے بہتر انداز میں روشناس متعارف کرانے کے لیے، ایک سفرنامہ ایران ضرور لکھنے کا آغاز کریں۔

از کاخ و کو جدا و پریشان بہ کاخ و کو
کردم بہ چشمِ ماہ تماشائے این سرائے

مولانا محمد حسین آزاد ۲۳ دسمبر ۱۸۸۵ء، ۱۳۰۲ ہجری قمری، آذر ماہ ۱۲۶۴ ہجری شمسی، یوم سہ شنبہ ۶ بجے شام کو لاہور سے آتش فشاں اژدہے پر سوار ہو کر فرشِ خاک کو لپیٹا، دو دن اور رات میں کراچی جا اترا، وہاں نہنگ

دُخانی پر بیٹھ کر سطحِ آب کو طے کیا اور دسویں دن بوشہر جا پہنچا۔ (سیر ایران از محمد حسین آزاد)

جب آزاد شہر یور ماہ ۱۲۶۴ ہجری شمسی کو ایران میں پہنچتے ہیں تو اس وقت ایران میں قاچاری حکومت کا عہد تھا۔ محمد شاہ قاچار کی وفات ۱۲۶۴ ہجری قمری کے بعد ناصر الدین شاہ قاچار کی حکومت ۱۲۶۴ ہجری قمری سے ۱۳۱۳ ہجری قمری تک کا دور شروع ہوتا ہے۔ قاچاری عہد میں ایران میں ادبیات کے حوالے سے کچھ عظیم شعرا پیدا ہوئے۔ اُن سب نے زیادہ تر سعدی و حافظ کے اسلوب کی پیروی کی اور مثنویوں میں حماسۂ فردوسی کو اپنایا۔

ایران میں فتح علی شاہ قاچار کے عہدِ حکومت کے بعد ۱۲۱۲ ھ ق سے ۱۲۶۰ ھ ق تک، ایران و یورپ کے درمیان قریبی تعلقات کا آغاز ہوا اور ان میں تیزی سے وسعت آئی۔ (۳)

مولانا آزاد ناصر الدین شاہ قاچار کی حکومت کے قریباً آخری سالوں میں ایران میں آتے ہیں۔ جب وہ ایران کے پائے تخت تہران میں پہنچتے ہیں تو اس شہر کو علم و فنون و تہذیب کا مرکز بتاتے ہیں۔ آزاد قاچاری عہد کے ایک بادشاہ فتح علی شاہ کا نام لیتے ہیں جنھوں نے ملک کے مصالح کو مدنظر رکھتے ہوئے کوہِ دماوند کے پہلو میں ایک شہر بنا کر اُسے اپنا پائے تخت قرار دیا ہے۔ یہ موضوع اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مرحوم محمد حسین آزاد ایران کے قاچاری عہد کے بادشاہوں اور ان کی تواریخ پر کافی نظر رکھتے ہیں۔ خاص طور سے وہ تہران میں دارالفنون کا ذکر کرتے ہیں جسے میرزا تقی خان امیر کبیر، ناصر الدین شاہ قاچار کے وزیر اعظم نے تہران میں بنایا تھا۔ ایران کی پوری تاریخ خصوصاً قاچاری عہد میں امیر کبیر کو قابلِ قدر نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد میں ایران کے معاشرتی، معاشی، سیاسی و اقتصادی حالات بہت ہی خراب تھے۔ معاشرے میں رہتے ہوئے مختلف طبقوں کے لوگ اِس نابسامان حکومت سے دکھی تھے۔ برطانیہ اور روس، ایران کے اندرونی معاملات و مسائل میں دخل اندازیاں کر رہے تھے۔ لوگ بڑی تعداد میں اَن پڑھ تھے اور اُن کے پاس علمی صلاحیتوں کی کمی تھی۔ انھی حالات میں ایک بڑے سیاست دان اور خیر خواہ فرد (امیر کبیر) سامنے آئے۔ وہ نہ صرف سامراجی قوتوں کے خلاف کھڑے ہوئے بلکہ اُس وقت کے ایران کے حالات کے لیے ایک مرہم بنے۔ انھوں نے اصلاحی مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا پروگرام بنایا۔ امیر کبیر نے تہران میں دارالفنون کے نام سے ایک ایسا مدرسہ عالیہ (درسگاہ) بنایا جس سے ایرانیوں کو علوم جدید سے آشنائی کے بہتر مواقع ملے۔ اس مدرسے میں صحافت نگاری کا آغاز بھی ہوا۔ دارالفنون سے واقف ہو کر ایران اور ایران سے باہر ایرانی اصلاح پسندوں کے ایک گروہ نے اپنے سیاسی، سماجی نظریات سادہ زبان میں لکھنا شروع کیے۔ تقاضائے وقت کے تحت، سائنسی، تکنیکی اور درسی کتابوں کی تالیف بھی اسی مدرسے میں شروع ہوئی۔ اشاعت کی صنعت نے ایران کے لوگوں کے لیے مختلف ادبی آثار و افکار سے آشنائی ممکن بنائی۔ (۴)

مولانا آزاد کے اس سفر کی علمی نوعیت کو قبول کرتے ہوئے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تہران میں بھی ان

کا تنہا اور اصلی مقصد کتابوں کی جستجو تھا اور اُن کا یہ سفر، تلاشِ کتب و تکمیل الفاظ و اعتبارِ معنی کے سلسلے میں تھا۔ آزاد لکھتے ہیں:

مجھے اس سفر میں بڑی غرض کتابوں کی تلاش تھی اور اُس سے زیادہ یہ کہ جامع اللغات فارسی کے لیے سرمایہ جمع کروں۔ (سیر ایران از محمد حسین آزاد)

آزاد تہران میں پہنچتے ہی جناب معتمد الدولہ نواب فرہاد میرزا سے ملاقات کے لیے جاتے ہیں۔ آزاد کہتے ہیں کہ یہ صاحب، ناصر الدین شاہ قاچار کے چچا ہونے کے علاوہ ایک فاضل دانشور، شاعر، مصنف اور متدین حاکم ہیں۔ خوش مزاج اور بانشاط شخص ہیں۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ جب بھی وہ مجھے بُلاتے تو میں ضرور اُن کے ہاں حاضر ہو جاتا۔ دربار میں سلطنت کے متعلق امورات اور سارے علمی اور دشوار کام اُنھی کی زیرِ نگرانی انجام پاتے ہیں اور اہم بات یہ کہ اُن کا کتب خانہ پورے ایران میں بے ہمتا ہے اور اس کی مثال نہیں ملتی۔ فرہاد میرزا معتمد الدولہ ۱۳۰۵ھ ق میں فوت ہوئے۔

تیرھویں صدی ہجری قمری کو دراصل ایران میں شعور و آگاہی و بیداری کا دور سمجھا جاتا ہے۔ تہران میں رہتے ہوئے مولانا آزاد نے بڑی اہم ادبی و سیاسی شخصیات سے ملاقاتیں بھی کیں وہ، نواب مُخبر الدولہ امیر کبیر کے بھائی سے ملے جو بہت ہی صاحب کمالات اور اہلِ علم آدمی تھے۔ آزاد اِس شخص کی مروت اور محبت کو ستائش کے قابل سمجھتے ہیں۔ آزاد تہران میں تین مہینے رہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں روزانہ ہی اُن سے ملاقات کے لیے جاتا تھا۔ نواب مُخبر الدولہ، رضا قلی خان ملقب بہ (لَلِہ باشی) کے بڑے بیٹے ہیں۔

آزاد نے اپنے اس سفرنامے میں تہران کے لوگوں کی دانائی کو سراہا ہے اور وہاں کی علمی و ادبی شخصیات کی علمی لگن کی بھی تعریف کی ہے۔ آزاد کے اس سفرنامے میں اُن کی وسعتِ ذہن اور ان کی دقتِ نگاہ کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ شمس العمارہ کے محل، شہر تہران کے اسلامی فنِ تعمیر، دارالترجمہ، بغیر چھتوں کے بازار، کتب خانوں، عوام کی وطن دوستی اور فارسی الفاظ کے زیادہ استعمال وغیرہ پر مولانا آزاد نے کہیں کہیں خوب نکتہ طرازیاں کی ہیں۔

آزاد کا یہ سفرنامہ قدیم طرز کا ہونے کے باوجود اپنے اندر دلچسپیوں کے خاصے سامان رکھتا ہے اور اس میں جغرافیائی و تاریخی معلومات کی تفصیلات بھی شامل ہیں۔ درحقیقت سفرنامہ ایران میں آزاد ایک ایسے فاضل و عالم کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں جن کی اصلی خواہش محض طلبِ علم ہے۔ وہ جب بھی ایران کے مختلف شہروں کے علماء کی محافل میں جاتے ہیں تو اُن پر ایک عجیب خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور مولانا اُن کے خاکے یوں کھینچتے ہیں کہ پورا منظر زندہ ہو جاتا ہے۔ آزاد شہر شیراز یعنی گل و بلبل کے شہر میں پہنچ کر اپنے مصور قلم سے ایک محفل کی یوں تصویر کشی کرتے ہیں:

نواب میرزا علی خان صدر ایک امیر خاندانی کی زندگانی، شیراز کے لیے سرمایۂ آبادانی ہے اور ان کی مہمان نوازی اِس پاک مٹی کے لیے قدیم قبالہ ہے۔ مجھے بھی دو دن مہمان رکھا۔ باوجود دستگاہِ امارت اور پیرانہ سالی کے، جب دیکھو گرِد، کتابیں چنی ہیں۔ ایک دو ملا پاس بیٹھے ہیں، بیچ میں آپ مطالعہ میں مصروف ہیں۔ تصحیح کرتے ہیں، حواشی لکھتے ہیں۔ ایک خوشنویس کاتب، ناقص کتابوں کی تکمیل کر رہا ہے۔ مصور نقاشی کر رہا ہے۔ کھانے کا وقت ہوا۔ وہیں پہلو میں دستر خوان بچھا۔ اُٹھے پہلے سجدۂ شکرانہ بجالائے۔ ایک روٹی کو آنکھوں سے لگایا، پھر سب کے ساتھ کھانا کھایا۔ یہ بھی گویا فرض تھا کہ ادا کر لیا۔ پھر کتابوں کے حلقے میں جا بیٹھے۔ (۵)

آزاد اپنے سفرنامے میں شہر شیراز کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

شیراز کے دیکھنے کا ارمان تھا ایک عمر کے بعد خدا نے پورا کیا۔ اللہ اللہ! خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کا پیارا وطن، جس پر وہ لوگ تعریفوں اور دعاؤں کے پھول چڑھائیں۔ اُس کے دیکھنے کا ارمان کیوں نہ ہو۔ میں نے دیکھا اور تعجب کے ساتھ دیکھا کیونکہ جس شیراز پر نورانی بزرگوں نے نور برسائے تھے۔ اس کی رونق و آبادی اُن کے ساتھ ہی رحلت کر گئی۔ (سیر ایران از محمد حسین آزاد)

مولانا آزاد شیراز میں رہتے ہوئے جناب حکیم حاذق حاجی میرزا حسن کی یاد دلاتے ہیں جنھوں نے شیراز کی مفصل تاریخ پارس نامہ کے نام سے لکھی تھی۔

آزاد شیراز میں بھی کتب کی تلاش میں اتنے منہمک اور مصروف رہے کہ اُنھیں کھانے پینے کا ہوش تک نہ رہا۔ دراصل آزاد کو اس سفر میں کھانے کے لیے جو بھی ملتا وہ کھا لیتے اور خدا کا شکر بجالاتے۔ جناب انور سدید صاحب کا اس حوالے سے یہ معنی خیز اقتباس ملاحظہ ہو:

میرے پاس کھانے پینے کا سامان نہ تھا۔ وہیں بیٹھ کر کسی کے گھر سے روٹی مول لیتا، کہیں سے انڈے، کہیں سے گھی، اشکنہ یعنی انڈوں کا قلیہ پکاتا۔ اس میں روٹی ڈبوتا، کھاتا اور شکر الٰہی بجالاتا۔ (۶)

آزاد شیراز کے ثقافتی پہلو اور وہاں کے سماج کے نقشے اور فطری مناظر کی جھلکیوں کی طرف بلیغ اشارے بھی کرتے ہیں جبکہ اردو میں نام آور سفرنامہ نگاروں نے بھی اپنے سفرناموں میں ایسے عناصر کا ذکر کیا ہے۔ یہ نمونہ ملاحظہ ہو:

شیراز کے لوگ اب تک لباس و اوضاع میں اپنے بزرگوں کی تصویر ہیں۔ علماء و ثقہ لوگ عمامہ باندھتے ہیں۔ عبا پہنتے ہیں، خاندانی ترک، کلاہ پوستِ برہ کی پہنتے ہیں۔ تہران کے اوضاع جدید ابھی تک وہاں لذیذ نہیں ہوئے۔ شیراز میں چھوٹی چھوٹی نکیاں بکتی دیکھیں کہ ان سے لوگ سر اور ڈاڑھیاں دھوتے ہیں وہ ایک قسم کی

مٹی ہے جس کی کان شہر کے پاس ہے۔ اس میں خوشبو کے اُٹھانے کی قدرتی تاثیر ہے۔ اُسے پھولوں میں بسا کر صاف کرتے ہیں اور ٹکیاں بنا کر بیچتے ہیں۔ شہروں میں تحفہ لے جاتے ہیں۔ ''گلِ گُل'' اس کا نام ہے۔

(سیر ایران از محمد حسین آزاد)

محمد حسین آزاد اردو ادب کے ایک معتبر نثر نویس ہیں جن کی تحریروں کی خاص صفت یہ ہے کہ اس میں فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ و ترکیبیں اور دور دراز کے صنائع و بدائع جن کا آج رواج ہے، نہیں پائے جاتے۔ مولانا آزاد کی عبارتوں کی خاص شان، ان کی سادگی، بے تکلفی اور صاف گوئی ہے اور فارسی زبان کی رعنائی و خوبصورتی بھی ان کے اسلوب میں دکھائی دیتی ہے۔

آزاد شہر اصفہان کی راہ میں جہاں بھی چند لمحے آرام کرتے تو ان کے بقول وہ تب بھی تعلیم یافتہ، مہذب اور معتبر لوگوں سے ملتے۔ حتیٰ کہ وہ اصفہان کے لوگوں اور ان کے بچوں کو دارالفنون میں تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دلاتے تھے۔ دیار غیر میں انھوں نے اپنے علمی تشخص کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اُن کے اس سفرنامے میں آزاد کی انسان دوستی، نکتہ آفرینی اور نفسیات شناسی ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ وقت کے ہر لمحے سے فائدہ اُٹھا کر اُسے بڑی انمول چیز سمجھتے تھے۔

آزاد کے سیر ایران کے سفرنامے میں جا بجا سماجی، سیاسی، جغرافیائی معلومات اور مناسب تاریخی شعور و آگاہی دکھائی دیتی ہیں۔

مولانا اصفہان کے شہر کے بڑے دروازے تک پہنچتے ہیں اور شہر میں داخل ہوتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

رفتہ رفتہ دروازۂ شہر نمودار ہوا اور ایک وسیع سڑک سامنے آئی۔ جسے سفید دیواروں کی بلند قطاروں اور سربہ فلک چناروں اور دو نہروں میں پانچ متوازی خیابانوں میں تقسیم کیا ہے۔ بے اختیار زبان سے نکلا کہ زہے سلاطین صفویہ، بادشاہی ہو تو ایسی ہو۔ خیابان مذکور میں کئی میل چل کر وہ دریائے وسیع آیا جسے زندہ رود کہتے ہیں۔ اصفہان کا تمام علاقہ اُس سے زندہ ہے۔ یہاں کتابوں میں اس کا نام پڑھ کر مزے لیا کرتا تھا۔ اب دیکھا باوجودیکہ انگریز پلوں کو دیکھ کر کوئی پل نظر میں نہیں جچتا پھر بھی اُس کا پل دیکھنے کے قابل ہے۔ شہر اصفہان کی وسعت فی الحقیقت بہت فراخ ہے۔ اس نے فارسی مبالغہ کو درست موقع دیا کہ شعرا نے کہا:

جہان آفرین را جہانی نبود　　　جہان را اگر اصفہانی نبود

نیمہ ای وصفِ اصفہان گفتند　　　اصفہان نیمۂ جہان گفتند

آزاد کا یہ سفرنامہ اصل میں بڑے بے تکلف بیانیے ہیں اور اس میں سادگی و لطف، کمال پر ہے۔ وہ اصفہان سے بہت خوش نظر آتے ہیں اور اس میں زیادہ مدت رہنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اصفہان میں ملا

باقر مجلسی علیہ الرحمہ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لیے جاتے ہیں۔ اصفہان میں اچھی اچھی عمارتوں اور مختلف عجائب گھروں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ آزاد ہر مقام پر حقائق اور مناظر کا تعصبات سے دور رہ کر جائزہ لیتے ہیں اور اِس سے مرحوم آزاد کی متانت، ذاتی وقار اور قومی تشخص کی خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

آزاد مشہد میں پہنچ کر بارہ دن وہاں رہائش اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ مشہد میں رہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر یہاں کے مسائل و معاملات کو تفصیل سے بیان کرنا چاہوں تو ایک بڑی کتاب بن جائے گی۔ وہ خلاصے کے طور پر یوں لکھتے ہیں:

مختصر کہتا ہوں کہ سلاطین سلف سے جو دیہات اور املاک کے جاگیر چلے آتے ہیں وہ اب تک جاری ہیں۔ کوئی بادشاہ انھیں گھٹا نہیں سکا، بڑھانا اپنی سعادت سمجھا، آمدنی اُن کی، بارہ لاکھ روپیہ سالانہ سے کم نہیں۔ علماء وطلباء کے مواجب، غربا کے وظائف، وظیفہ خواروں کا کھانا روزانہ جاری ہے ہر زائر پندرہ دن حضرت کا مہمان ہوتا ہے اور ہندی کے لیے میعاد نہیں، جب تک رہے باورچی خانہ حضرت سے کھانا کھایا کرے۔ تقریباً تین سو آدمی روز کھانا کھاتے ہیں۔ ایک رکابی پلاؤ کی، ایک روٹی، ساتھ سالن، کتاب خانہ جو روضۂ حضرت سے متعلق ہے کتب عجیبہ وغریبہ سے علوم وفنون کا خزانہ ہے۔ سلاطین و امرائے سلف نے عمدہ عمدہ نایاب کتابیں بھیج کر ذخیرۂ آخرت جمع کیا ہے۔ ان کی فہرست لایا ہوں۔

(سیر ایران از محمد حسین آزاد)

مزید یہ کہ شہر مشہد میں آستان قدسِ رضوی کی لائبریری کا شمار آج کل وسط ایشیاء کی سب سے بڑی لائبریریوں میں ہوتا ہے اور ایران میں گئے ہوئے اکثر پاکستانی و ہندوستانی اہل علم اس سلسلے میں مجھ سے متفق ہوں گے۔ مولانا مشہد میں عیدِ نوروز کا ذکر کرتے ہیں۔ جشنِ نوروز زرتشتیوں کا اہم ترین اور ایرانیوں کا قومی تہوار ہے جو قدیم زمانے سے اس سرزمین میں رائج ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اِس تہوار اور جشن کا پانچ سو سال قبلِ مسیح آغاز ہوا اور اب تک کسی نہ کسی شکل میں موسم بہار میں منایا جاتا ہے۔ اسی لیے اُسے ''جشنِ بہاران'' بھی کہتے ہیں۔

نوروز صرف ایران و ایرانیوں کے لیے مختص نہیں بلکہ وسط و جنوبی ایشیا کے مسلمان ممالک پاکستان، ہندوستان، افغانستان، خلیج فارس کے ممالک اور خاص طور پر سے روسی تسلط سے آزادہ شدہ ریاستیں، اس مبارک دن کو شادمانی اور جوش وخروش سے مناتی ہیں۔ (۷)

راقم السطور نے خود آزاد کا سفرنامہ ایران پڑھ کر یہ محسوس کیا کہ واقعتاً مولانا نے اپنے سفرنامے میں اپنے اسلوبِ بیان میں سہولت اور سلاست سے حق گفتاری اور انصاف پسندی کا لحاظ کیا ہے۔

مجھے اُن کے اس سفرنامے میں خصوصاً دیارِ غیر میں رہتے ہوئے، ادیب پروری و ادب دوستی، لطافت

وظرافت، الفاظ کی روانی کا سچا احساس ہوا اور اس بات پر یقین پیدا ہوا کہ آزاد ایک حقیقی اور سچے مسلمان کی حیثیت سے عمل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آزاد شہرِ مشہد میں تاریخی، مذہبی و ادبی شخصیات کے ساتھ اکثر شاہوں اور شاہزادوں کے مقبروں کو نیچی آنکھوں سے نہیں بلکہ کھلی آنکھوں سے دیکھ کر متاثر ہوئے۔ اُن کے احوال کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

اکثر شاہوں اور شاہزادوں کی قبریں دیکھیں۔ ہارون الرشید سر حلقۂ خلفائے عباسیہ، گُنبدِ اَقدس میں سوتے ہیں۔ نادر کی قبر دیکھ کر عبرت ہوئی۔ اللہ اکبر وہ نادر جس کی تلوار کی امان نہ تھی۔ جس کے گھوڑے کی جھپٹ سے لشکر پھوس کی طرح اڑتے تھے۔ وہ ایک ٹوٹے ہوئے چبوترے پر پڑا ہے۔ وہاں اب قپان خانہ ہے۔ اسبابِ تجارت لکھا کرتا ہے۔ (قپان یعنی: بڑی ترازو) علماء میں شیخ بہاؤالدین عاملی، شیخ حر عاملی، شیخ طبری رَحمِ اللہ مدفون ہیں۔ ان بزرگوں کی قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھی اور کتبوں کی نقلیں لیں۔ شیخ بہائی علیہ الرحمتہ کی قبر پر روز دو تین دفعہ فاتحہ کا موقع حاصل ہوتا رہا۔ شعراء میں فردوسی، اسدیِ طوسی کا نام لینا ضروری ہے کہ وہیں مدفون ہیں۔ اس متبرک اور مقدس مقام میں بارہ دن قیام کیا۔ (سیر ایران از محمد حسین آزاد)

آزاد ایران کے جس شہر میں بھی جاتے تھے ایک روشن دماغ اور ایک وسیع القلب سیاح کی حیثیت سے ظاہر ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنے سفر میں زیادہ تر اپنی آنکھوں سے کام لیا ہے اور وہاں کے موسموں، پہاڑی و سمندری و میدانی علاقوں کے کوائف خاص طور سے مقامی رہنے والوں کی مزاجی کیفیات اور حاکمانِ وقت کے رویے اور ان کے طور طریقوں پر روشنی ڈالی ہے۔

مولانا آزاد اپنے سفرنامے میں اُس وقت کے ایران کے مختلف شہروں میں بوشہر، شیراز، اصفہان، کاشان، قم، تہران، مشہد، سمنان، دامغان، شاہرود، بسطام، سبزوار، نیشاپور، مشہد، تربت جام اور ہرات میں جاتے اور ٹھہرتے وقت، حقیقت کی نوعیت کا ادراک کر چکے تھے اور انھوں نے ہر شہر، جگہ یا علاقے کی معاشرت، رہن سہن، آداب، عادات، میلانات اور رسوم و رواج کے بارے میں مدرسانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

راقم السطور جناب ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کے آزاد کی سیر ایران کے بارے میں لکھی ہوئی تحریروں سے اتفاق کرتا اور سفرنامہ ایران اور اس کی غرض وغایت پر تفصیلی نظر ڈالنے کو ضروری جانتا ہے۔

جناب ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کے بقول:

یہاں ضروری تھا کہ قرونِ وسطیٰ کے کسی یوروپین سفرنگار سے آزاد کا موازنہ کیا جاتا۔ میں نے آزاد کے سفرِ ایران کا موازنہ فارسی کے مشہور انگریز عالمِ پروفیسر براؤن کے سفرِ ایران سے کیا ہے۔ (۸)

منابع و مآخذ

۱۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، (مترجم: مرزا محمد عسکری)، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۰۷ء ص ۵۴۵۔۵۴۴

۲۔ تحسین فراقی، پروفیسر ڈاکٹر، معاصر اردو ادب، (نثری مطالعات)، کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۰ء ص ۱۲۷۔۱۲۶

۳۔ ذبیح اللہ، صفا، ڈاکٹر، مترجم (عظمیٰ عزیز خان)، فارسی ادب کے ارتقاء کی مختصر تاریخ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۲۵

۴۔ ایضاً ص ۱۲۵

۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ص ۱۵۲

۶۔ ایضاً ص ۱۵۳

۷۔ مجلہ دریافت، شمارہ ۴۔ مقالہ: جشن نوروز اور وصفِ بہار (فارسی شاعری کے آئینے میں) از: ڈاکٹر رشیدہ حسن نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۵۹۹

۸۔ مجلہ بازیافت، نمبر (۳)۔ مقالہ: محمد حسین آزاد (فرمودات چغتائی کی روشنی میں)، از: ڈاکٹر اسلم فرخی، ناشر: ڈاکٹر تحسین فراقی، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۴۳۔۴۲

ایران میں آزادشناسی

ڈاکٹر علی بیات

مولانا محمد حسین آزاد کے نبیرۂ محترم آغا محمد طاہر نے آزاد کو ''تاجدار اردو'' کہا تھا، لیکن مولانا کو وہ شہرت عام اور بقائے دوام، جو برعظیم پاک و ہند حاصل ہے، شاید اس کا عشر عشیر بھی ایران اور دنیائے فارسی میں حاصل نہیں اور وہ اس طرح گوشۂ گمنامی میں رہے ہیں۔ اس بات کی یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ فارسی زبان وادب میں موجود منابع و مراجع اور کتابوں میں، اکثر ادیب ودانشور آزاد کے ضمن میں خاموش ہیں۔ کچھ فارسی دوائر المعارف اور دانشناموں کے علاوہ، آزاد اور ان کے علمی وادبی کارناموں کا ذکر کہیں نہیں ملتا اور نہ ہی کسی ایرانی ادیب ودانشور نے، ان کتابوں کے باقاعدہ مطالعے اور تنقید کو اپنا مطمحِ نظر بنایا ہے۔

اس سے پہلے کہ ایران میں آزادشناسی کے منابع کی فہرست اور ان کا جائزہ پیش کیا جائے، یہ بات ضروری ہے کہ ''دائرۃ المعارف'' اور ''دانشنامہ'' کی تعریف اور ان کا فرق بھی بتایا جائے۔ جیسا کہ دائرۃ المعارف کے لفظ سے ظاہر ہے، وہ مختلف موضوعات کے بارے میں، معلومات اور اطلاعات کا ایک مدوّن مجموعہ ہوتا ہے جبکہ عام طور پر دانشنامہ میں ایک ہی مشخص موضوع کے بارے میں تمام تر معلومات اور اطلاعات یکجا ہوتے ہیں اور اس طرح ایک موضوع کے بارے میں نہایت آگاہی فراہم ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ فارسی کے اکثر دوائر المعارف اور دانشناموں میں مذکورہ حدود کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ آزاد مرحوم اور ان کے علمی کارناموں کے بارے میں ایران میں کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی ہے اور آج کل جو معلومات موجود ہیں، وہ بعض دوائر المعارف اور دانشناموں کی حد تک ہیں یا بعض مترجم کتابوں کے بعض مقامات پر ان کے بارے کچھ معلومات موجود ہیں۔ افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آزاد مرحوم یا ان کی یادگار کتابوں کے بارے میں صرف ان دوائر المعارف، دانشناموں اور بعض کتابوں میں صرف کئی سطروں کی حد تک، ایک تعارفی انداز میں، کچھ باتیں ملتی ہیں۔ مذکور منابع میں جو مقالات اور تعارف مطالب موجود ہیں، ایک دو کو چھوڑ کر، باقی سب پاکستان اور ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں۔

پیش نظر مقالے میں ان ایرانی منابع کا جن میں مولانا آزاد کے شخصی حالات اوران کی کتابوں کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے، ذکر کیا جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ، ان میں آزاد کے تعارف کے انداز کے بارے میں اختصاراً کچھ باتیں عرض کی جائیں گی۔فہرست ملاحظہ ہو:

۱- دانشنامۂ ایران و اسلام ،جلد اول، زیر نظر احسانِ یار شاطر،طہران: ۱۳۵۴ش/۱۹۷۵ء

۲- دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی ،جلد اول، چاپ دوم، زیر نظر کاظم موسوی بجنوردی، ۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء

۳- دانشنامۂ ادب فارسی ،ادب فارسی در شبہ قارہ (ھند و پاکستان و بنگلادش)، بخش یکم، بہ سرپرستی حسن انوشہ، ۱۳۸۰ش/۲۰۰۱ء

۴- الذریعۃ الی التصانیف الشیعۃ، تالیف العلامۃ الشیخ آقا بزرگ طہرانی، الجزء الاول ۱۴۰۳ھ.ق/۱۹۸۳ء

۵- دائرۃ المعارف تشیع ،جلد اول، زیر نظر احمد صدر حاج سید جوادی، بہاؤ الدین خرمشاہی، کامران فانی، بہمن ماہ ۱۳۶۶ش/جنوری-فروری ۱۹۸۱ء

۶- دانشنامہ ادب فارسی ادب فارسی در شبہ قارہ، بہ سرپرستی محمد علی مؤذنی، زیر نظر فرہنگستان زبان و ادب فارسی، جلد اول، تہران، ۱۳۸۷ش/۲۰۰۷ء

۷- مجلّہ آیندہ، ترجمہ سیر ایران، سال ۱۶، فروردین- تیر ۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء، (بخش اول)، مترجم: ڈاکٹر عارف نوشاہی

۸- مجلّہ آیندہ، ترجمہ سیر ایران ،سال ۱۶، مرداد- آبان ۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء، (بخش دوم)، مترجم: ڈاکٹر عارف نوشاہی

۹- دستور نویسی فارسی در شبہ قارہ ہند و پاکستان، جہان خنک شفقت، مرکز نشر دانشگاہی، تہران، ۱۹۵۷ء

۱۰- نخستین سمینار پیوستگی ھای ایران و شبہ قارہ ،جلد اوّل، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، باہمکاری مرکز مطالعات و تحقیقات فرہنگی بین المللی، تہران ۱۳۷۲ش/۱۹۹۳ء

۱۱- تاریخ تفکر اسلامی در ہند، عزیز احمد، مترجمان: نقی لطفی- محمد جعفر یاحقی، انتشارات کیہان با ہمکاری شرکت انتشارات علمی و فرہنگی، تہران، ۱۳۶۷ش/۱۹۸۹ء

ذیل میں مذکورہ بالا فہرست میں آزاد کے بارے میں معلومات کے انداز کا جائزہ لیا جائے گا:

۱-دانشنامۂ ایران و اسلام، جلداول:

اس دانشنامہ میں، مولانا آزاد کا تعارف ان الفاظ میں کروایا گیا ہے: ''آزاد، محمد حسین، نویسندہ و شاعر مسلمان ہندی.''(۱) آزاد کے تعارف میں یہ الفاظ تقریباً ہر ایرانی کتاب میں ملتے ہیں۔ اگرچہ ان کی نثر نویسی اور شاعری کے بارے میں دیگر کتابوں میں نقادانہ آراء بھی قائم کی گئی ہیں۔ مذکورہ دانشنامہ میں ایک غلطی، مولانا کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں نظر آتی ہے۔ اس میں ۱۸۳۴ء کو ان کا سنہ پیدائش لکھا گیا ہے(۲)۔ جیسا کہ صاف ظاہر ہے، ان کا سنہ پیدائش، یہ نہیں بلکہ ۱۸۳۰ء ہے۔ آگے چل کر آزاد کے والد مولوی محمد باقر اور ان کی صحافتی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ اسی طرح مولانا کے اپنے والد کے اخبار میں، لکھنے کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا آزاد کی پیشہ ورانہ مصروفیتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے سفروں کے بارے میں اختصار کے ساتھ یوں لکھا گیا ہے: ''بہ ایران و آسیای مرکزی، سفرهایی کرد.''(۳) اس مختصر جملے سے، اس بات کا تعین نہیں کیا گیا ہے کہ آزاد نے کب اور کتنی دفعہ مذکورہ ممالک میں سفر کیا۔ اس اعتبار سے، ایک فارسی زبان کے محقق کے ذہن میں سوالیہ نشان باقی رہے گا۔ مذکورہ دانشنامہ میں آزاد کی تصانیف میں، آب حیات کو ان کی سب سے بڑی تصنیف لکھا گیا ہے۔ ''این کتاب بزرگ ترین و معروف ترین کتاب اوست کہ نہ تنہا بسبب موضوع آن مورد توجہ است، بلکہ بسبب سُبک زیبا وبیان توصیفی آن نیز موجب شهرتش شدہ است۔'' (۴) اس کے بعد سخندان فارس، نگارستان فارس، نیرنگ خیال، دربار اکبری اور قصص ہند کے نام دیے گئے ہیں۔ آخر میں مولانا آزاد اور مولانا حالی، دونوں کو جدید اردو شاعری کے پیشرو قرار دیتے ہوئے، ان پیشرووں کے ہاں خیال اور فکر کو لفظ وصورت پر ترجیح دینے کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا گیا ہے: ''او والطاف حسین حالی راپیشروان مکتب جدید شعرِ اردو می دانند کہ از خصوصیات آن، سادگی بیان وتنوع موضوع و ہم چنین ترجیح دادن فکر ومحتوی بر لفظ وصورت است.''(۵)

۲-دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، جلداول:

دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی میں آزاد کا تعارف ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ''آزاد، محمد حسین، مشہور بہ شمس العلما... نویسندہ و شاعر اردو زبان...''(۶) جیسا کہ مشہور ہے، یہاں بھی آزاد کا پہلے ایک مصنف کے طور پر، پھر ایک اردو زبان شاعر کے طور پر تعارف کیا گیا ہے۔ بعد ازاں آزاد کے تعارف میں، ان کو اردو ادب کے نئے اسلوب کے علمبرداروں میں شمار کیا گیا ہے۔ آزاد کے آباء واجداد اور ان کے خاندانی حالات کے ذکر کے بعد، انقلاب ستاون اور اس میں آزاد کے والد، مولوی محمد باقر کے مارے جانے سے اور مولانا آزاد کے

کچھ عرصے کے لیے خفیہ زندگی گزارنے کے بارے میں لکھا ہے: ''آزاد جوان پس از اعدام پدر، دہلی را ترک گفت ومدت ٦ سال در نواحی مختلف ھند، سرگردان و آوارہ زیست . از احوال او در این ٦ سال اطلاعی در دست نیست.''(۷)

جدید تحقیقات کی رو سے، ٦ سال کے بجائے، ۴ سال بتائے جاتے ہیں اور وہ شہر بھی معلوم ہو گئے ہیں جہاں جہاں آزاد نے ان دنوں زندگی گزاری ہے۔ اس دائرۃ المعارف میں آزاد کے سفروں کے بارے میں ایسا لکھا گیا ہے: ''در فاصلہ سال ھای ۱۸۶۵ء و ۱۸۶٦ء، بہ همراہِ پاندت من پھول؛ بہ آسیای مرکزی ، بخارا، خیوہ، سمرقند وتاشکند سفر کرد...''(۸) اس اقتباس میں توجہ طلب بات یہ ہے کہ مذکورہ سالوں کے سفروں میں ایران کا ذکر نہیں ظاہر بات ہے کہ اس عرصے میں آزاد نے صرف وسطی ایشیا کا سفر کیا اور ایران میں نہیں گئے۔ البتہ آگے جا کر جہاں آزاد کے کتب خانے کی بات ہوتی ہے تو یہ ذکر ملتا ہے کہ: ''آزاد در ۱۸۸۵ء کتابخانہ ای در لاھورتأسیس کرد...او در سفر خود بہ ایران با فراھم آوردن کتاب ھایی،این گنجینہ را غنی تر ساخت.''(۹) دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی میں، ''انجمن پنجاب'' کے سلسلے میں، آزاد کے کردار کے بارے میں خوبصورت انداز میں یہ لکھا گیا ہے کہ: ''کوشش ھای او برای پایہ گذاری سنت اد بی نوینی در شعر وادب اردو،در فعالیت ھای انجمن پنجاب؛بہ اوج خود رسید...انجمن ادبی نوآوری و اصلاحات اساسی شعرِ اردو را ھدف خود ساخت و با تشکیل سخنرانی ومشاعرۂ ماھانہ،این ھدف را دنبال کرد.''(۱۰) جیسا کہ ملاحظہ ہوا، انجمن پنجاب میں آزاد کے کلیدی کردار اور اس انجمن کے اہداف و مقاصد کا بخوبی تذکرہ کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں آزاد کی زندگی وسوانح، عصری مسائل اور ان کی تصانیف کا ذکر تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔ تصانیف کی فہرست تقریباً مکمل ہے۔ سخندان فارس، آب حیات اور قصص ہند کا، آزاد کی دیگر تصانیف کی بہ نسبت زیادہ تفصیل کے ساتھ، تعارف کیا گیا ہے۔ آب حیات کے بارے میں یوں لکھا ہے: ''این کتاب را بحث انگیزترین و ارزشمندترین کار آزاد دانستہ اند، زیرا نخستین کتاب در باب اردو ، بہ زبان اردو بہ روش جدید است کہ براساس معیارھای نو، نوشتہ شدہ است...''(۱۱) آزاد کی تصانیف میں، نظم آزاد کے ذیل میں مذکور ہے کہ: ''مجموعۂ اشعار و دیوان شعر اوست... آزاد در شاعری بہ پایہ الطاف حسین حالی نمی رسد، زیرا ذوق و استعداد او در نثر بہ حدّی قوی است کہ عالی ترین تخیلات و دقیق ترین احساسات خود را در قالب نثر،

درغایت زیبایی بیان می کند و ہمین خاصیت ،شاعری او را تحت الشعاع قدرت نثر نویسی قرار می دہد۔''[۱۲] آزاد اور حالی کا تقابل اور آزاد کی نثر نگاری کی تعریف وتمجید میں،اس سے بہتر اظہار خیال ممکن نہیں۔

۳-دانشنامۂ ادب فارسی ،ادب فارسی درشبہ قارہ (ہندو پاکستان و بنگلادش):

مولوی محمد حسین آزاد کا تعارف اس دانشنامہ میں،قبل کے منابع سے کچھ الگ ہے۔ دیکھیے:

''آزاد،مولانامحمد حسین، مشہور بہ شمس العلما...شاعر،داستان نویس ،منتقد و روزنامہ نگار شبہ قارہ ۔''[۱۳] اس سلسلے میں قابل غور بات یہ ہے کہ اکثر منابع میں، آزاد کا بطور ایک مصنف یا شاعر،تعارف کیا گیا ہے،لیکن جیسا کہ مشاہدہ ہو رہا ہے، یہاں وہ داستان نویس (افسانہ یا ناول نگار)،صحافی اور نقاد کے طور پر بھی شمار کیے گئے ہیں۔آزاد کے خاندانی حالات کے ذکر کے بعد،ذوق اور عیش کی شاگردی کا ذکر بھی موجود ہے۔اس بارے میں ایک چھوٹا سا نکتہ یہ ہے کہ ''آغا'' کا لفظ جو عیش کے نام سے منسلک ہے،اس دانشنامہ میں،''آقا'' کی شکل میں جو ایرانیوں کے نزدیک صحیح شکل ہے،لکھا گیا ہے۔[۱۴]

آگے جا کر ۱۸۵۷ء میں آزاد کی کچھ عرصہ کے لیے روپوشی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:''آزاد پس از مرگ پدر از دہلی گریخت و چند سالی را در جاہایی مانند بمبئی ،لکنؤ، سیالکوت وجیند گذراند ۔''[۱۵] مذکورہ بالا تمام کتابوں میں سے اس بارے میں صرف دانشنامہ ادب فارسی در شبہ قارہ میں ڈاکٹر سلیم مظہر صاحب نے شہروں کے نام دیے ہیں اور یہاں،اس مذکورہ دانشنامہ میں جیسا کہ مشاہدہ ہو رہا ہے، کچھ شہروں کے نام موجود ہیں۔اس میں خاص بات یہ ہے کہ خفیہ طور پر زندگی گزارنے کی مدت کا ذکر تو نہیں۔لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس دورانیے کو ۴ سال لکھا ہے۔یہاں ایک شہر''جیند'' کا نام بھی ذکر ہوا ہے جو دانشنامہ ادب فارسی درشبہ قارہ میں موجود نہیں ہے۔آزاد کا انگریزوں کے اہتمام اور نگرانی میں ۶-۱۸۶۵ء، پنڈت من پھول کے ساتھ ایک سفر کا ذکر بھی موجود ہے۔اس میں خاص بات یہ ہے کہ وسطی ایشیا (بخارا،خیوہ،خوقند،سمرقند وتاشقند) کے علاوہ،ایران کو بھی اس سفر کے مقاصد میں لکھا گیا ہے۔[۱۶]

لاہور میں محمد حسین آزاد کی علمی مصروفیات کے علاوہ، ان کے مختلف دفتری مناصب کے بارے میں بھی بات ہوئی ہے۔اس کے ساتھ انجمن پنجاب میں ان کے کلیدی کردار اور مولانا حالی کے ساتھ ان کے تعاون کے بارے میں اور مزید ان کی جدید اردو نظم اور نثر نویسی میں ان کی اثر گذاری کے بارے میں بات ہوئی ہے۔نیز ان کی لائبریری اور شمس العلما کا خطاب پانے کا بھی مختصر طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

اس دانشنامہ میں آزاد کا بطور ایک معاشرتی مصلح ،ادبی نقاد، معلم اور ماہر لسانیات تعارف کرایا گیا ہے۔

اردو نثر میں ان کی قابلیت کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے: ''...ذوق واستعداد اور در نثر نویسی چندان نیرومند است که عالی ترین تخیلات و دقیقی ترین احساسات خود را به نثر بیان سی کند وهمین سهارت در نثر نویسی، شاعری اور را تحت الشعاع قرار سی دهد.''(۱۷)

اس مقالے کے اس حصے کے مطالعے سے خیال آتا ہے کہ مقالہ نگار، الطاف حسین حالی کی ادبی سرگرمیوں اور خصوصیات کا اطلاق آزاد پر کر رہا ہے: ''آثارش زمینه ہای گوناگون، مانند تاریخ، زندگی نامه نویسی، روزنامه نگاری، نقد ادبی وداستان نویسی را در سی گیرد....''(۱۸) سوانح نگاری اور تنقید زیادہ تر حالی کی اوصاف میں شامل ہے۔ آزاد کی بیشتر تصانیف کا ذکر ہوا ہے۔ قندِ پارسی کے بارے میں یوں لکھا ہے: ''قند پارسی در محاورۂ روزمرۂ فارسی، که گویند آن را آزاد در ۱۸۸۵ء به ایران برد و پس از اصلاحاتی که به دست دانشمندی ایرانی به نام حاجی محمد شیرازی انجام گرفت نخستین بار در۱۹۰۷ء به چاپ رساند.''(۱۹) اس اظہارِ خیال کے بارے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ سیرِ ایران میں ایسے شخص کا ذکر موجود نہیں۔ مذکورہ سفر نامہ میں جہاں ایرانی دانشوروں سے آزاد کی ملاقاتیں رہی ہیں، انھوں نے بڑے والہانہ انداز میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر انھوں نے ایسے شخص سے اس سفر میں فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی کتاب کی اصلاح میں ان سے مدد لی ہے تو پھر کیوں حاجی محمد شیرازی کا ،کہیں نام نہیں ملتا؟ بہرحال یہ بات بہت غور طلب ہے۔

۴- الذریعة، الیٰ التصانیف الشیعة:

یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور اہلِ تشیع کی مشہور شخصیات اور ان کی ادبی اور علمی کارناموں کے ذکر میں ہے۔ آزاد کی مشہور کتاب، آبِ حیات کے ذیل میں یوں لکھا گیا ہے: ''آب حیات، فی تراجم شعراء الهند، بلغة الاردو، للمولوی محمد حسین، المشهور بشمس العلما والملقب بآزاد الدہلوی، المتوفی فی حدود سنة ثلثین وثلثمأته والف، طبع فی الهند کما طبع له ایضاً سخندان فارس، فی تراجم شعراء العجم.''(۲۰) چونکہ عربی زبان میں بہت مختصر الفاظ میں پہلے آبِ حیات اور پھر سخندانِ فارس کا ذکر کیا گیا تھا، اس لیے مکمل مطلب یہاں عیناً نقل کیا گیا ہے۔

۵- دائرة المعارف تشیع، جلد اول:

مولانا آزاد کا تعارف اس کتاب میں ان الفاظ میں ملتا ہے: ''آزاد، شمس العلما مولوی محمد حسین بن محمد باقر، متخلص به آزاد (۱۲۴۵ق-۱۳۳۰ق)، از نویسندگان وشاعران اردو و فارسی در قرن سیزدہم ہجری...''(۲۱) مختصر الفاظ میں آزاد کے خاندانی حالات کا

ذکر ہے اور پھر ان کی تعلیم کے بارے میں بات ہوئی ہے۔ ان کے استاد، ذوقؔ اور عیشؔ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ عیشؔ کا لفظ مذکور نہیں، بلکہ صرف ''حکیم آقا جان''[۲۲] لکھا گیا ہے۔ آزاد کے قیام لاہور اور عمر کے آخری چند سالوں میں ان پر جنون کی حالت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی صرف چند تصانیف کے نام دیے گئے ہیں اور باقی چھوڑ دیے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ سخندان فارس اور نیرنگ خیال جیسی اہم کتابوں کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا ہے۔ آخر میں آزاد کے بارے میں یہ مختصر جملہ بھی توجہ طلب ہے: ''مولوی محمد حسین آزاد، از نویسندگان بلند آوازہ و صاحب سبك اردوست۔''[۲۳]

۶-دانشنامہ ادب فارسی در شبہ قارہ:

اس دانشنامہ میں ''آزادؔ'' کے لفظ کے ذیل میں، دو مقالے موجود ہیں: ذیل میں ترتیب وار دونوں مقالوں کا جائزہ لیا جائے گا:

الف۔ آزاد، کتابخانہ:

اس مقالے کے مصنف ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب ہیں۔ انھوں نے اس لائبریری کے تعارف میں یوں لکھا ہے: ''کتابخانہ ای واقع در لاہور کہ در حدود ۱۳۰۴ ھ.ق/۱۸۸۷م، محمد حسین آزاد ملقب بہ شمس العلما (وفات ۱۳۲۸ ھ.ق) آن را بنیان کرد۔''[۲۴] فاضل مقالہ نگار نے ،آزاد مرحوم کی کتاب دوستی اور ان کے ہندوستان، وسطی ایشیا اور ایران میں، کتابوں کی فراہمی کے لیے کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے دیگر فارسی منابع اور مآخذ کے برخلاف، علانیہ الفاظ میں لکھا ہے کہ آزاد ۱۳۰۳ھ.ق میں ایران کے سفر پر گئے تھے۔ کتابخانہ کی عمارت کے بارے میں معلومات مہیا کرنے کے بعد، واضح الفاظ میں، کہتے ہیں کہ آزاد کو ایران کے سفر سے واپسی کے بعد، کتابخانہ قائم کرنے کا خیال پختہ ہو جاتا ہے اور لاہور میں ایک ایسی سرکاری زمین میں جو بلا استفادہ پڑی تھی، اپنی لائبریری کی عمارت قائم کرتے ہیں۔ آزاد کی لائبریری ۱۳۰۴ھ.ق سے ۱۳۰۸ھ.ق تک، عمومی استفادے کے لیے فعال رہنے کے بعد، بند کی جاتی ہے۔ بہر حال اس مختصر مقالے میں اس کتابخانے کی مجمل تاریخ بیان کی گئی ہے۔

ب۔ آزاد، محمد حسین:

اس نام کے ذیل میں دوسرا مقالہ اس دانشنامے میں موجود ہے، جسے ڈاکٹر محمد سلیم مظہر نے لکھا ہے۔ مذکورہ بالا کتابوں کی طرح، اس میں بھی آزاد کی سوانح اور حالات کا ذکر موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے آزاد کا تعارف ان الفاظ میں کیا ہے: ''...نویسندہ، شاعر و ادیب...''[۲۵] بلا شک یہ تینوں الفاظ ایک فارسی قاری کے لیے، آزاد کا ایک اچھا تعارف پیش کر سکتے ہیں۔ خاندانی حالات کے ذکر کے بعد، ان کے تعلیمی سلسلے کا ذکر ہے۔ اس کے

بعد، ذوق اور عیش کی شاگردی کی بات چلی ہے۔ آزاد کے والد، مولوی محمد باقر کے قتل کے بعد، ان کی روپوشی کی زندگی اور مدت و مقام کے بارے میں، اکثر فارسی منابع خاموش ہیں یا یقین کے ساتھ، کوئی اظہار خیال نہیں ملتا ہے، اور جیسا کہ اس سے پہلے، دانشنامۂ ادب فارسی ، جو حسن انوشہ کے زیر اہتمام، شائع ہوا ہے، کے جائزے میں کہا گیا ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر صاحب نے اس روپوشی کی مدت ۴ سال لکھی ہے: ''و پس از ۴ سال سرگردانی در بمبئی، لکھنؤ، سیالکوت بہ سال ۱۸۶۰، در لودیانہ در روزنامہ مجمع البحرین... مشغول بہ کارشد:''(۲۶)

محمد حسین آزاد کے وسطی ایشیا کے سفر اور اس سفر میں انگریزوں کا ساتھ دینے کے بارے میں ایک دلچسپ، لیکن حقیقت کے قریب، ایک جملہ توجہ طلب ہے: ''ہدف آزاد از این کار، جلب رضایت مقامات انگلیسی بود کہ نسبت بہ وی مشکوک بودند ''(۲۷) ''انجمن پنجاب'' میں آزاد کے اہم اور مؤثر اقدامات کے بارے میں وضاحت کے بعد، لاہور میں ان کے مختلف کالجوں میں علمی مناصب کا ذکر کیا گیا ہے۔ آخر میں آزاد کی تصانیف کا ذکر ہے۔ ان میں قصص ہند، سخندان فارس، نیرنگ خیال، آب حیات اور دربار اکبری کے بارے میں، مختصر توضیحات بھی دی گئی ہیں، لیکن آزاد کی دیگر تصانیف کا صرف نام دیا گیا ہے۔ یہ مقالہ آزاد مرحوم کے سلسلے میں لکھے گئے، تعارفی مقالوں میں بہتر معلومات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے، خاص اہمیت رکھتا ہے۔

۷- مجلّہ آیندہ، ترجمہ سیر ایران، سال ۱۶، فروردین تا تیر ۱۳۶۹ اش/۱۹۹۰ء:

''سیر ایران '' کا فارسی ترجمہ، دراصل، آزاد کی اس واحد تصنیف کا ترجمہ ہے، جو ایران میں شائع ہوا ہے۔ اگرچہ سخندان فارس کا بہت عرصہ پہلے، ۱۳۱۵ھ میں ایک افغانی شاعر اور ادیب، عبداللہ خان ملک الشعراء نے ترجمہ کیا تھا۔ اس بارے میں افسوس کے ساتھ یہ کہنا ضروری ہے کہ ایران میں اس کے نسخے بہت کمیاب ہیں اور اس سے افسوس ناک تر واقعہ یہ کہ یہ ترجمہ اب تک ایرانی ادیب اور برعظیم کے مطالعات میں مصروف ایرانی دانشوروں اور ادبیات اور لسانیات کے نقطۂ منظر سے اس کو مطالعے کرنے والوں کی نظرِ غائر سے محروم رہا ہے۔

مجلّہ آیندہ کے مذکورہ بالا شمارے میں، اس سفرنامے کا ایک حصہ، بخش اول کے تحت شامل ہے۔ مترجم نے ایک مختصر، تعارفی حصہ بھی، شامل کیا ہے۔ اس حصے میں، شروع سفر سے لیکر، کاشان کے سفر کا احوال شامل ہے اور باقی سفر کی تفصیلات دوسرے حصے میں، شامل کردی گئی ہیں۔ بخش اول میں مختصر الفاظ میں آزاد کا تعارف اور ان کے حالات زندگی کے ذکر کے بعد، ان کی اردو نثر اور اعلیٰ اسلوب کے بارے میں کچھ باتیں لکھی گئی ہیں۔ اس ''یادداشت (نوٹ) '' میں جہاں آزاد کی کچھ تصانیف کی فہرست دی گئی ہے، قند پارسی کے بارے میں ایسا لکھا گیا ہے: ''... آزاد

دست نوشته آن را با خود به ایران برده بود وحاجی محمد ایرانی در آن تجدید نظر کرد.''[۲۸] اس اقتباس میں قند پارسی کے مصحح کا نام ''حاجی محمد ایرانی'' لکھا گیا ہے، حالانکہ حسن انوشہ کے اہتمام میں شائع شدہ دانشنامہ ادب فارسی میں اس کا نام ''حاجی محمد شیرازی'' لکھا گیا ہے۔ اگرچہ وہ بھی ہر حال میں ایک ایرانی شخص ہے، لیکن تحقیق میں اس کے صحیح نام ونسبت کو معلوم کرنا ضروری نظر آتا ہے۔ مجھے اس دور کی معروف ادبی اور علمی شخصیات، جن کے ساتھ آزاد کی ملاقاتیں رہی ہیں، یا جن کے نام کسی بھی وجہ سے، سیر ایران میں موجود ہیں، مذکورہ بالا شخص کے بارے میں کوئی اطلاع حاصل نہیں ہوئی۔ ایک شخص ''میرزا محمد علی خان شیرازی'' کا نام ملا، جو ۱۲۶۸ھ میں وزیر برائے امور خارجہ تھا اور کچھ عرصے کے لیے مدرسۂ ''دارالفنون'' کا سربراہ بھی رہا تھا۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ ''میرزا محمد علی خان شیرازی'' بھی آزاد کے ایران میں سفر کرنے سے کم از کم ۳۵ سال پہلے ان عہدوں پر فائز تھا۔ کیا آزاد نے اس وزیر سے، ملاقات کی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو ضرور طہران یا شیراز کے وقایع میں اس کا نام مذکور ہوتا۔

بہرحال ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب نے، آزاد کے سفر ایران کے بارے میں بعض سوانح نگاروں کا خیال کہ:

''بعضی شرح حال نویسان آزاد معتقدند کہ کہ آزاد دو بار بہ ایران سفر کردہ است. یکبار در سال ۱۸۶۵م/۲-۱۲۸۱ وبار دیگر در ۱۸۸۳م/۱-۱۳۰۰ ه.ق بہ ایران سفر کردہ است. اما محققان معاصر نوشتہ اند کہ آزاد فقط یکبار در سال ۱۸۸۵م/۳-۱۳۰۲ ه.ق بہ ایران رفتہ وہ دہ ماہ در سفر بودہ است ومقالۂ حاضر گزارش ہمین سفر می باشد.''[۲۹] ڈاکٹر صاحب نے دانشنامہ ادب فارسی در شبہ قارہ میں بھی سنہ ۱۳۰۳ھ کو آزاد کے سفر ایران کا سال لکھا ہے۔

۸- مجلہ آیندہ، سال ۱۶، مرداد تا آبان ۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء، (بخش دوم):

بخش دوم میں، سفر قم سے لیکر، سفر قندہار تک کا احوال شامل کر دیا گیا ہے۔ اس ترجمے میں تعلیقات وحواشی موجود نہیں۔ لیکن رواں اور سلیس الفاظ میں، سیر ایران کا یہ ترجمہ، یقیناً ایک اچھا ترجمہ، ہونے کے ساتھ ساتھ، فارسی زبان قاری کو یہ احساس دلائے گا کہ مترجم کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر مہارت حاصل ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فاضل مترجم نے، آزاد کے انداز اور اسلوب کو فارسی میں منتقل کرنے کی کسی حد تک کوشش کی ہے۔

۹- دستور نویسی فارسی در شبہ قارہ ہند وپاکستان:

اس کتاب میں برعظیم میں لکھی گئی دیگر فارسی گرائمروں کے ساتھ آزاد کی کتاب جامع القواعد کا

تعارف کروایا گیا ہے: ''به زبان اردو نوشته شده است و در ۱۸۸۵ء در لاہور چاپ شده است و ہدف آن تدریس دستور فارسی در مراحل مختلف آموزش می باشد و به طور کلی برای کسانی که می خواہند در زبان اردو از دستور فارسی آگاہی به دست بیاورند، مفید است.''(۳۰) اس فقرے کے بعد، کتاب کے مختلف حصوں اور اہم نکات کے بارے میں تعریفی انداز میں مختصر تعارف ملتا ہے۔ مثال کے طور پر مصنف نے آزاد مرحوم کی ''لازم'' اور ''متعدی'' افعال کے بارے میں وضاحت کو سراہتے ہوئے یوں لکھا ہے: ''... مؤلف بحث جالبی دربارۂ افعال لازم و متعدّی می کند و افعال متعدّی را بر سه قسم بیان می کند ...''(۳۱) اور اس کے بعد جامع القواعد میں اس بحث کی وضاحت کی گئی ہے۔ آخر میں بتایا گیا ہے کہ اس کے باوجود کہ گرائمر کے مباحث میں جابجا یورپی اور خاص طور پر انگریزی گرائمر نویسوں کی بات ہوئی ہے اور ان کی آراء کا ذکر ہوا ہے، لیکن اس کتاب کا انداز، انگریزی نہیں، بلکہ عربی گرائمر سے متاثر نظر آتا ہے۔(۳۲)

۱۰- نخستین سمینار پیوستگی ہای ایران و شبه قاره، جلد اوّل:

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے صاف ظاہر ہے، یہ ایک سیمینار میں پڑھے ہوئے مقالوں کا مجموعہ ہے۔ اس سیمینار میں ڈاکٹر محمد ریاض مرحوم نے دو تین سطروں میں آزاد کا تعارف پیش کیا ہے۔ یقیناً کاتب کی غلطی سے آزاد کا سنہ پیدائش، اس کتاب ۱۹۰۱ء لکھا گیا ہے: ''محمد حسین آزاد دہلوی (۱۹۰۱ [کذا])، آزاد استاد زبان فارسی بود و مسافرتی به افغانستان و ایران انجام داد. کتابہای نگارستان و سخندان فارس وی (به اردو) حاکی از ایران شناسی وی است. در سخندان فارس؛ مباحثی در پیرامون روابط لسانی سانسکریت و زبانہای باستان ایران مانند اوستا را عرضه نموده است.''(۳۳) ڈاکٹر محمد ریاض جیسے فاضل محقق سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ آزاد کا تعارف پیش کرتے ہوئے، کچھ بہتر انداز میں یہ کام سرانجام دیتے مگر ایسا نہیں ہوسکا۔

۱۱- تاریخ تفکّر اسلامی در ہند، عزیز احمد:

یہ کتاب کو، عزیز احمد نے انگریزی زبان میں لکھی ہے اور اس کو ''نقی لطفی'' اور ''محمد جعفر یاحقی'' نے فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب میں تین چار مقامات پر آزاد کا ذکر نظر آتا ہے۔ ایک مقام پر آزاد کو الطاف حسین حالی کے ساتھ، جدید تعلیم کے سربراہوں میں شمار کیا گیا ہے(۳۴) ایک اور مقام پر آزاد کی شاعری اور اس میں جدّت کی بات کی گئی ہے اور خاص طور پر یہ جملہ بہت بجا طور پر خودنمائی کرتا ہے: ''شعر محمد حسین آزاد اغلب متکلّف و گاہی مثل نثرش آراسته به صنایع بدیعی است.''(۳۵) مولانا آزاد کی شاعری اور نثر کا یہ تقابل بہت

انوکھا ہے۔ایک اور مقام پر آزاد کا خاص طور ذکر کیا گیا ہے اور ان کی آب حیات، سخندان فارس، دربار اکبری اور نیرنگ خیال کے بارے میں مختصر طور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔شروع میں آزاد کا تعارف یوں کرایا گیا ہے:''محمد حسین آزاد(متوفی ۱۳۲۸/۱۹۱۰)طرفدار انشای مترسلانه بودو نثری سخت دلپذیر داشت که با جنبش سید احمد خان ہیچ گونه ارتباطی نداشت۔''(۳۶) ان کی نثر نگاری اور خاص اسلوب کی تعریف کے بعد، آب حیات کے بارے میں یوں لکھا گیا ہے:''کتاب آب حیات وی -نخستین تذکرۂ شعراردو- نسلهای متوالی شعرای اردو را زندگی می بخشد، ہرچند که محققان جدید در صحت انتساب آن به وی تردید کرده اند...''(۳۷) عزیز احمد جیسے جید محقق سے اس طرح کا بیان، دوراز کار نظر آتا ہے۔چونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آب حیات مولانا آزاد کی کتاب ہے اور اب تک کی تحقیقات میں سے کسی کتاب میں ایسا اشارہ نہیں ملتا ہے کہ اس کتاب کو آزاد کے سوا کسی دوسرے مصنف کی کتاب کہا گیا ہو۔بہ ہر حال مترجموں کی اس بارے میں غلط فہمی کا امکان بھی موجود ہے۔آگے جا کر سخندان فارس کا تقابل مولانا شبلی کی کتاب شعر العجم سے کیا گیا ہے اور مؤخر الذکر کو سخندان فارس پر ترجیح دی گئی ہے۔

ان تمام باتوں کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایران میں آزاد کے سلسلے میں جو مواد ملتا ہے، وہ اکثر برعظیم ہندو پاک کے محققین اور مصنفوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور ان ہی کے ذریعے وہ ایران میں متعارف ہوئے ہیں اور ایرانی محققوں کے لیے مزید تحقیقات کے دروازے اب تک کھلے ہیں۔ان کے لیے ضروری ہے کہ اردو زبان کے اس عظیم نثر نویس اور محقق کے خیالات کو ایران اور پوری دنیائے فارسی سے روشناس کرائیں۔

تعلیقات وحواشی

۱- دانشنامۂ ایران و اسلام، جلد اول، ص:۸۱

۲- ایضاً ص:۸۲

۳- ایضاً

۴- ایضاً

۵- ایضاً

۶- دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، جلد اول، ص:۳۱۶

۷- ایضاً

۸- ایضاً

۹- ایضاً

۱۰- ایضاً،ص:۳۱۷

۱۱- ایضاً،ص:۳۱۷

۱۲- ایضاً

۱۳- دانشنامۂ ادب فارسی،ادب فارسی در شبہ قارہ (هندو پاکستان و بنگلادش)،بخش یکم،ص:۱۵

۱۴- ایضاً

۱۵- ایضاً

۱۶- ایضاً

۱۷- ایضاً،ص:۱۶

۱۸- ایضاً

۱۹- ایضاً

۲۰- الذریعة،الی التصانیف الشیعة،تالیف العلامة الشیخ آ قابزرگ طہرانی،الجزء الاول،ص:۲

۲۱- دائرة المعارف تشیع،جلد اول،ص:۵۲

۲۲- ایضاً

۲۳- ایضاً

۲۴- دانشنامہ ادب فارسی در شبہ قارہ،جلد اول،ص:۴۱

۲۵- ایضاً،ص:۴۲

۲۶- ایضاً

۲۷- ایضاً

۲۸- مجلّہ آیندہ،ترجمہ سیر ایران،سال ۱۶،فروردین تا تیر ۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء،(بخش اول)،ص:۸۸

۲۹- ایضاً

۳۰- دستورنویسی فارسی در شبہ قارۂ ہندو پاکستان،ص:۱۹

۳۱- ایضاً،ص:۲۰

۳۲- ایضاً،ص:۲۱-۲۰

۳۳- نخستین سمینار پیوستگی های ایران وشبه قاره،ص:۳۴۲

۳۴- تاریخ تفکر اسلامی در ہند،ص:۱۴۶

۳۵- ایضاً،ص:۱۴۷

۳۶- ایضاً،ص:۱۵۴

۳۷- ایضاً،ص:۱۵۴

منابع ومآخذ

۱- الذریعة،الی التصانیف الشیعة،تالیف العلامة الشیخ آ قابزرگ طہرانی،الجزء الاول،۱۴۰۳ھ.ق/۱۹۸۳ء

۲- تاریخ تفکر اسلامی در ہند،عزیز احمد،مترجمان:نقی لطفی-محمد جعفر یاحقی،انتشارات کیہان باہمکاری شرکت انتشارات علمی وفرہنگی،تہران،۱۳۶۷ش/۱۹۸۹ء

۳- دانشنامۂ ایران و اسلام،جلداول،زیرنظر احسان یارشاطر،طہران،۱۳۵۴ش/۱۹۷۵ء

۴- دانشنامۂ ادب فارسی،ادب فارسی در شبه قاره (ہندوپاکستان وبنگلادش) بخش یکم،بہ سرپرستی حسن انوشہ،۱۳۸۰ش/۲۰۰۱ء

۵- دانشنامه ادب فارسی در شبه قاره،بہ سرپرستی محمد علی مؤذنی،زیرنظر فرہنگستان زبان وادب فارسی،جلداول، ۱۳۸۷

۶- دائرة المعارف بزرگ اسلامی،جلداول،چاپ دوم،زیرنظر کاظم موسوی بجنوردی،۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء

۷- دائرۃ المعارف تشیع،جلداول،زیرنظر احمد صدر حاج سید جوادی،بہاؤالدین خرمشاہی،کامران فانی،بہمن ماہ ۱۳۶۶ش/جنوری-فروری ۱۹۸۱ء

۸- دستور نویسی فارسی در شبه قاره ہند وپاکستان،جہان خٹک شفقت،مرکز نشر دانشگاہی،تہران، ۱۹۵۷ء

۹- مجلّہ آیندہ،ترجمہ سیر ایران،سال ۱۶،فروردین تا تیر ۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء،(بخش اول)،مترجم:ڈاکٹر عارف نوشاہی

۱۰- مجلّہ آیندہ،ترجمہ سیر ایران،سال ۱۶،مرداد تا آبان ۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء،(بخش دوم)،مترجم:ڈاکٹر عارف نوشاہی

۱۱- نخستین سمینار پیوستگی ہای ایران و شبہ قارہ،جلداوّل،مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان،اسلام آباد،باہمکاری مرکز مطالعات وتحقیقات فرہنگی بین المللی،تہران ۱۳۷۲ش/۱۹۹۳ء

آزاد کی نثر میں خاکے کے عناصر

مبین مرزا

مولانا محمد حسین آزاد ہمارے کلاسیکی ادب کا ایک ممتاز نام ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بیسویں صدی میں نئے ادب کے جن رجحانات اور اظہار و اسالیب کے جن تجربات نے فروغ پایا اُن کی تشکیل و ترویج میں اردو ادب کے جن ادیبوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا، اُن میں مولانا محمد حسین آزاد کا کام مسلّمات کے درجے میں آتا ہے۔ آج جب ہم اپنے ادب کی صدیوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو محمد حسین آزاد مشاہیر کے جھرمٹ میں ایک نیرِ تاباں کی حیثیت سے نمایاں نظر آتے ہیں۔

اپنے ادب، خصوصاً کلاسیکی ادب کے کسی بھی حوالے کا مطالعہ کچھ اسی انداز اور ایک ایسے ہی ذہنی رویے کے ساتھ کرنے کا عام رُجحان ہمارے یہاں پایا جاتا ہے بلکہ اب تو اکثر و بیش تر معاصر ادب کے بارے میں بھی ایسی ہی صورتِ حال دیکھنے میں آتی ہے، یعنی ہم عصری ادب تک کا اپنے زمانے اور تہذیبِ عصر کے سوالوں کی روشنی میں مطالعہ کرنے، اس کو معاصر فکری رُجحانات کی کسوٹی پر کس کر یا ان سے ٹکرا کر دیکھنے اور کھرے کھوٹے کو الگ کرنے کی بجائے ایک طرح کی تسلیم و رضا کی خو کے ساتھ اُسے دیکھنے اور ماننے کے عادی ہو چکے ہیں۔

چنانچہ یہ جو مجھے اپنی گفتگو کا آغاز سراسر پیش پا افتادہ انداز میں اور کلیشے قسم کے فقروں سے کرنا پڑا، اب اگر آپ برا نہ مانیں تو مجھے کہنے دیجیے کہ یہ میرا ہی نہیں بلکہ بذاتہٖ معاصر تنقید اور اُس کے پورے سسٹم کا مسئلہ ہے — اور یہ بھی کہ اس مسئلے سے ہم یعنی صرف اردو زبان و ادب کے لکھنے والے ہی دوچار نہیں بلکہ دوسری زبانوں کے اہلِ نقد کو بھی کسی نہ کسی سطح پر یہ مسئلہ پیش آتا رہا ہے۔ یہ دعویٰ بے دلیل نہیں بلکہ اس کا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔ جامعہ پنجاب شعبۂ اردو کے صدر نشین پروفیسر تحسین فراقی اور جامعہ کراچی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر سحر انصاری یہاں تشریف فرما ہیں، یہ دونوں حضرات گواہی دیں گے کہ گزشتہ بیس بائیس برسوں میں اُن سے اس موضوع پر گاہے بہ گاہے گفتگو ہوتی رہی ہے خصوصاً انگریزی ادب کے سیاق و سباق میں۔ اصل میں اس کی دو وجوہ تھیں، ایک تو یہ کہ انگریزی ادب و نقد

یکساں سہولت سے ہماری دسترس میں رہا ہے اور دوسری (مگر اہم ترین وجہ) یہ کہ انگریزی کے نقادوں نے اپنے ادب خصوصاً شاعری کی افادیت یا اُس کے جواز کے لیے جو کچھ قلم بند کیا ہے، وہ دُنیا کے تنقیدی ادب میں اپنی نوعیت کا بالکل الگ ذخیرہ ہے۔ ان مضامین کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جو مغرب نے نشاۃ ثانیہ کے بعد حقیقت کے مادّی تصور کو معاشرتی اور تہذیبی سطح پر حرزِ جاں بنایا تھا، اس کی بنیاد دراصل فکر ونظر کے اس سرمائے نے فراہم کی تھی جو انسانی زندگی کی ہر کارگزاری کو افادیت کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کا رُجحان رکھتا تھا۔ چنانچہ اُس کے نزدیک ادب وشعر یا کوئی بھی فنِ لطیف اگر فرد یا معاشرے کے لیے کسی مادّی منفعت کا باعث نہیں ہو سکتا تو اس کی افادیت یا اہمیت کی جواز جوئی کی ضرورت ہے۔ مغربی نقادوں نے تخلیقِ شعر کی جواز جوئی کے لیے جو دفتر کا دفتر قائم کیا وہ اسی ذہنی رویے کا عکاس ہے، تاہم کیا مضائقہ ہے جو میں آپ کو وہ واقعہ کسی قدر اختصار سے سنادوں جب پہلی بار اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ تنقید کے منہاج کو درپیش اس مسئلے کی طرف میرا دھیان گیا۔

یہ اب سے کم وبیش بائیس برس پہلے کی ایک خوش گوار شام تھی۔ احباب کی ایک محفل برپا تھی اور انگریزی محاورے کے مصداق چائے کی پیالی میں طوفان پر طوفان اٹھائے جا رہے تھے کہ یکا یک تحسین فراقی نے جانے کس کیفیت میں، انگریزی نقادوں کی حجامت بنانی شروع کر دی۔ خاکسار نے چند ماہ قبل ایم اے انگریزی ادب میں داخلہ لیا تھا، اس لیے انگریزی کے ادیبوں شاعروں سے ایک رومانی طرزِ تعلق کا سحر دل ودماغ طاری تھا۔ چناں چہ تحسین فراقی کی اس جرأتِ رندانہ پر پہلے تعجب ہوا اور اس کے بعد تشویش — اور یہ تشویش اُس وقت اشتعال کی حدوں کو جا پہنچی جب اپنے کچھ پسندیدہ نقادوں کی بھی مونڈن ہوتے دیکھی۔ اصل میں خاکسار اُس دور میں کچھ رومانیوں سے تعلق خاطر رکھتا تھا اور تحسین فراقی کی شمشیر صفت زبان اُن بے چاروں کے سر پر چمکتی ہی نہیں بلکہ رہ رہ کر پڑتی بھی جاتی تھی۔ تو بس ''بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق'' والی صورتِ حال ہوئی اور یہ خاکسار حضرتِ والا سے بھڑنے پر تُل گیا۔ بات بڑھی بلکہ بڑھتی ہی چلی گئی۔ اُس نشست نے طول کھینچا۔ پہلے گھنٹوں تک پھیلی اور پھر دنوں اور ہفتوں تک۔ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ہمارے مشترک دوست سراج منیر کو کہ ان کا دفتر اس پورے عرصے میں میدانِ کارزار بنا رہا اور مرحوم خود بہت دل دار ریفری کے فرائض انجام دیتے رہے کہ ہم دونوں ہی سے اخلاص ومحبت کا رشتہ رکھتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ اس ساری تگ وتاز کا نتیجہ یہ نکلا کہ طرفین بعض مضامین کو ازسرنو پڑھنے اور بعض نقادوں پر مشتعل ہوئے بغیر گفتگو پر آمادہ ہوئے۔ بعدازاں اُس طرح نشست درنشست گفتگو کی نوبت تو نہیں آئی البتہ یہ احساس اُس ساری مشق کا حاصل ٹھہرا:

کھلا کہ حسرتِ تعمیرِ بام ودر ہے فریب
بگولے قالبِ دیوار ودر میں ہوتے ہیں

یعنی یہ کہ یوں تو مغرب کا شعر وافسانہ بھی تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنی تہذیب واقدار کا منحرف گواہ بنتا رہا ہے لیکن تنقید نے تو کمال ہی کر دیا۔ قدم قدم پر انحراف کے وہ نقوش ثبت کیے ہیں کہ مغربی فکر کا چہرہ اور اُس کی قدروں کا ہر نقش بدل ڈالا یا اُس کے آگے سوالیہ نشان لگا دیا۔ آپ مغربی تنقید پر اک اجمالی نگاہ بھی ڈالیے تو آسانی سے اندازہ ہو جائے گا کہ وہ سارا سرمایہ نقد ونظر جو شعری مطالعے کے ضوابط کی تدوین یا اُن کی جواز جوئی کے طور پر یا پھر اُن کے دفاع میں لکھا گیا ہے — تمام کا تمام معذرت نامہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں، ایک کے بعد دوسرا نقاد آتا ہے اور پہلے کے مقدمے کو رد کر کے نیا مقدمہ قائم کرتا ہے یا پھر ادب وشعر کے جواز پر گفتگو کرتا ہے۔ تو یہ ہے وہ رویہ جس کی طرف میں نے تنقید کے پورے سسٹم کا مسئلہ کہتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔

آیئے اب واپس اپنے موضوع کی طرف چلتے ہیں۔ میں عرض کر رہا تھا کہ محمد حسین آزاد ایک طرف ہمارے کلاسیکی ادب کے روشن حوالوں میں ہیں تو دوسری طرف نئے ادب کے بنیاد گزاروں میں۔ لیکن کیا محض ایسی رسمی ستائش اُن کے کام کی اُس اہمیت کو اُجاگر کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے جو اُن کا ہمارے عہد سے معنوی ربط قائم کر سکے؟ نہیں، ہرگز نہیں — بلکہ ایسا صرف اُسی وقت ممکن ہوگا جب ہم اپنے ادبی سرمائے خصوصاً کلاسیک کا مروّجہ طریقِ کار سے الگ ہو کر مطالعہ کرنے پر آمادہ ہوں۔

اس بات کو ذرا یوں دیکھیے کہ مولانا محمد حسین آزاد کی تحریروں میں خاکہ نگاری کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ یہ بات ہم سب جانتے بھی ہیں اور مانتے بھی کہ وہ آبِ حیات کے مضامین ہوں یا دربارِ اکبری کا قصہ، چاہے نیرنگِ خیال کی تحریریں ہو یا سخن دانِ فارس کا تذکرہ — سب جگہ ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا آزاد کی طبیعت کو مرقع نگاری سے یک گونہ مناسبت ہے۔ وہ افراد کا ذکر اِس انداز سے کرتے ہیں کہ محض ہیولا ہمارے سامنے نہیں آتا بلکہ جیتی جاگتی شخصیت آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ اُس کا مزاج، طبیعت کا رنگ، شخصیت کا رکھ رکھاؤ، تہذیب کا رچاؤ غرض ہر پہلو اور ہر ایک رُخ یوں نمایاں ہو جاتا ہے کہ گویا تجسیم ہو گئی۔

یہ خوبی محض اُن شخصیات کے مرقعوں سے مخصوص نہیں جن سے آزاد کا دل قرب محسوس کرتا ہے بلکہ فن کا یہ جوہر اُن طبائع کے بیان اور اُن اشخاص کے اوصاف کے اظہار پر بھی یکساں دست گاہ رکھتا ہے جن سے مولانا آزاد نے رد وکد کا رشتہ اُستوار کیا تھا۔ گویا یہ فن مولانا آزاد کی تحریروں میں کہیں سپرداری کرتا ہے تو کہیں تیغِ آب دار کا کام۔ اصل میں بات یہ ہے کہ آزاد کا ذہن افراد، اشیا اور واقعات کو ان کی الگ الگ صورت میں دیکھنے کی بجائے ان کے باہمی ربط کو جاننے اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے واقعے اور زندگی کے تجربے کو سمجھنے کا ذوق رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد کے فن میں مرقع نگاری یا خاکہ نگاری کو بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ اُن کے یہاں ہم اشیا، عوامل اور افراد کو مسلسل تفاعل میں پاتے ہیں اور اُن کے احوال واعمال سے ان کے وجود کا اثبات کرتے ہیں۔ اثبات

کے اس عمل کو آزاد نے ہر دو صورت میں قائم رکھا ہے۔ خواہ کسی کی حیاتِ جاوید مقصود ہو یا کسی کو فنا کے گھاٹ اُتارنا، دونوں ہی صورتوں میں کام اُنھوں نے اپنے اسی ہنر سے لیا ہے۔

یوں دیکھیے تو سرسیّد اسکول کے سارے ہی نام ور ادیبوں نے تمثیل اور مرقع نگاری کے فن سے مطالب کی ادائیگی اور معنویت کے ابلاغ کے لیے بہ طورِ خاص کام لیا ہے۔ سرسیّد، مولانا حالی، شبلی، ڈپٹی نذیر احمد غرض سب کے یہاں ہنرکاری کا یہ رُخ نمایاں نظر آتا ہے لیکن اس کا اظہار جس طرح مولانا محمد حسین آزاد کے یہاں ہوا اور اس سے جو کام انھوں لیا، وہ کسی اور کے حصّے میں نہ آیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جن جن صورتوں اور جس جس انداز سے انھوں نے مرقع نگاری اور خاکہ نویسی کے فنی عناصر کو اپنی تحریروں میں برتا ہے، اُس کی کوئی مثال ماقبل ہی نہیں، اُس طور سے مابعد کے اردو ادب میں بھی ڈھونڈے نہیں ملتی۔ آگے چل کر اُردو میں خاکہ نگاری نے جس طرح باضابطہ صنفِ ادب کا درجہ پایا اُس میں مولانا محمد حسین آزاد کے طرزِ نگارش اور اندازِ بیان نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اُنھوں نے صرف انھی لوگوں کے خاکے نہیں لکھے جن سے رسم و رہِ الفت رہی اور چشم دل کشا سے جن کو دیکھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے خیالی خاکے (fictional pen portraits) اور تمثیلی خاکے (allegorical pen portraits) بھی قلم بند کیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے تہذیبی ادوار اور معاشرتی اقدار کی اپنی تحریروں میں جس طرح نقشہ کشی کی ہے اُس میں بھی تجسیم کی شان پیدا کر دکھائی ہے۔ آبِ حیات میں سوؔدا، میر تقی میرؔ، ناسخؔ، ذوقؔ، غالبؔ، اور سب سے بڑھ کر ''انشاء اللہ خاں انشاؔ'' کے خاکے پڑھیے تو اس قدر زندگی سے بھرپور ہیں کہ ایک بار مطالعے میں آجائیں تو حافظے پر دائمی نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ دربارِ اکبری میں اکبر، بیرم خاں، بیربل، ٹوڈرمل، مان سنگھ، فیضی اور ابوالفضل کے خاکے یادگار ہیں۔ ان کرداروں کا بیان مولانا آزاد کے قلم کی جولانی کا عجب نقشہ پیش کرتا ہے۔ اسی طرح تمثیلی خاکے نیرنگِ خیال میں اپنی انتہائی بلندی کو چھو رہے ہیں۔ یہاں انسانی اوصاف کی جس جس رنگ میں تجسیم کی گئی ہے وہ کچھ آزاد ہی کا کمال ہے۔ تجسیم کا ہنر اصل میں آزاد کے فن کا ایک ایسا وصف ہے کہ جس کی بہ دولت حال و قال کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اسی کے بل پر کیفیت خود اک قالب اختیار کر لیتی ہے اور عکسِ خیال امرِ واقعہ کے درجے پر آجاتا ہے، زمانے کی شخصیت کے نقوش اُجاگر ہو جاتے ہیں، معاشرے کا چہرہ روشن ہو جاتا ہے اور تصوّر و احساس مجسّم ہو جاتے ہیں۔ ذرا یہاں ''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا'' یا پھر ''شہرتِ عام و بقائے دوام کا دربار'' ایسے مضامین کو ذہن میں لائیے اور مولانا آزاد کے قلم کی معجز نمائی کا نظارہ کیجیے۔ دیکھیے بیان کی قوت کس طرح خیال کو حقیقت، تصور کو مظہر اور فکر کو مجسّم کر سکتی ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نئے ادب کے بنیاد گزاروں اور نئے طرزِ احساس کے پیش کاروں میں شمار ہوتے ہیں لیکن کیا ہمارے ادب، اُس کے اسالیبِ اظہار اور طرزِ احساس کی تشکیل و تعمیر میں اُن کا محض یہی حصہ ہے؟ بلاشبہ یہ

اعزاز بھی ایسا ہے کہ ہر کس و ناکس کے حصے میں نہیں آ سکتا ـــ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم ناانصافی کے مرتکب ہوں گے، اگر ہم یہ سمجھیں کہ مولانا محمد حسین آزاد کا یہی حصہ ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس شے پر ہم داد کے ڈونگرے برسا رہے ہیں، وہ تو اصلاً آزاد کی کارگزاری کی صرف اور صرف بائی پروڈکٹ ہے۔ اگر ہم اُن کی کلیت کار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس بنیادی نکتے کو سمجھنے کی کوشش کریں جس کو اپنا مطمحِ نظر بنا کر انھوں نے مختلف اسالیب کو برتتے ہوئے متعدد جہتوں میں ساری عمر کام کیا تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ہمارے زبان و ادب کی ترویج و تعمیر ہی میں نہیں بلکہ تہذیب و اقدار کی نقش گری اور پاس داری میں بھی دراصل ان کا حصہ اس سے کہیں بڑا اور اسی نسبت سے اُن کا مقام کہیں بلند ہے۔

تاہم اس معاملے کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ہمیں اک ذرا اپنا زاویۂ نظر بدلنا ہوگا۔ اس کا آغاز ہم اک سوال سے کرتے ہیں اور وہ یہ کہ مولانا محمد حسین آزاد نے آخر خاکہ نگاری کو اپنے فن میں اس درجہ اہمیت کیوں دی کہ بیان خواہ تہذیب کا مقصود ہو یا سماج کا یا پھر ادوار و احوال کا، ہر رنگ میں انھوں نے مرقع نگاری کو فوقیت دی اور personification کو وسیلۂ اظہار بنایا۔

دیکھیے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ جو کہا جاتا ہے کہ مشرق و مغرب کے رویوں میں absurdity اور reality کا فرق ہے تو اس صورتِ حال کو ادب کی سطح پر سمجھنے کے لیے ایک عمدہ مثال کے طور پر آزاد کی تحریروں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ مشرق absurd کو بھی real کے تناظر میں سمجھنے کا رُجحان رکھتا ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں آزاد کی تحریروں میں زندگی اور اُس کے مظاہر، تہذیب اور اُس کے رویے، زمانہ اور اُس کی صورتِ حال کا کوئی بیان کونیاتی زاویے کے بغیر معرضِ اظہار میں نہیں آتا۔ اُن کے یہاں انسان کائنات سے اور کائنات تقدیر سے بہر طور مربوط رہتے ہیں۔ یہاں absolute absurdity کا کوئی گزر ہی نہیں ہے۔ اس کے برعکس جو کچھ ظاہر ہو رہا ہے، وہ reality کے اور زندگی کے prism سے رنگ رنگ روشنی کی صورت رونما ہو رہا ہے۔ لہٰذا وہ تصور، خیال، فکر، رویہ، حال اور مظہر خواہ کچھ بھی ہو، زندگی کے قالب میں ہمارے سامنے آتا ہے، زندگی کے لہجے میں اپنا اظہار کرتا ہے اور بجائے خود زندگی کی طرح ہم پر منکشف ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خاکہ نگاری یا مرقع نگاری سے آزاد کی طبعی مناسبت محض احوال کے بیان سے دل چسپی کی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ اگر ہم غور کریں تو اس کے پس منظر میں ہمیں ایک اصولی اور فکری رویہ کارفرما نظر آئے گا۔ ماجرا اصل میں یہ ہوا کہ آزاد کا سابقہ صرف ۱۸۵۷ء کے بعد کے معاشرے اور اُس کی انسانی صورتِ حال سے نہیں ہوا تھا بلکہ اس سے پہلے کی دنیا کو بھی انھوں نے دیکھا اور برتا تھا۔ تو وہ جو معاشرے کی کایا کلپ ہوئی تھی، آزاد نے صرف ایک قاری یا ناظر کی حیثیت سے اُس کا مشاہدہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ اس جاں کاہ تجربے سے وجودی سطح پر بھی گزرے تھے۔ چناں چہ آگے چل کر یہی وجودی تجربہ اُن کے فکر و فن کی تشکیل و تعمیر میں سب سے اہم factor کا کردار ادا کرتا ہے۔

تب ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد کے یہاں اندازِ نگارش دراصل طرزِ زیست کا نعم البدل بن جاتا ہے۔ اب غور کیجیے کہ یہاں شخصیات کا تذکرہ، اُن کی وضع قطع، اسلوبِ حیات، رکھ رکھاؤ، بھید بھاؤ — یہ سب کا سب دراصل ایک نابود ہوتی تہذیب کو بچالے جانے کی کوشش نہیں تو اور کیا ہے۔ یہاں ہمیں وہ بات یاد آتی ہے جو ہارڈی کے ناولوں میں معاشرے اور تہذیبوں کی نقش گری کے سیاق وسباق پر بات کرتے ہوئے فرینک اوکانر نے کہی تھی، یہ کہ کم زور تہذیبیں جب فنا کی منزل سے دوچار ہوتی ہیں تو محض یہ نہیں ہوتا کہ دیکھتے ہی دیکھتے مٹتی چلی جاتی ہیں بلکہ اس عمل کے دوران وہ انسانی دلوں میں پناہ ڈھونڈ لیتی ہیں۔

خواتین وحضرات! وہ شخص جس کا نام محمد حسین آزاد تھا اور جس کے اعزاز میں آج ہم سب یہاں جمع ہیں، دراصل ایک ایسے ہی دل کا نام تھا جس نے اپنی تحریروں، اپنے خاکوں اور اپنی مرقع نگاری کے ذریعے یہی فریضہ ہمارے لیے سرانجام دیا تھا۔ پوری تہذیب کو اپنے دل میں پناہ فراہم کی اور اس طرح فراہم کی کہ اُس نے دل کو اور اُس کی ہر کیفیت ہی کو تہذیب بنا ڈالا۔

آزاد: اردو کا پہلا خاکہ نگار

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

خاکہ لفظوں سے تصویر تراشنے اور کسی شخصیت کی نرم گرم پرتیں تلاشنے کا وہ لطیف فن ہے، جو شوخی، شرارت، ذہانت، زندہ دلی اور نکتہ آفرینی کے ہم رکاب ہو کر میدان ادب میں بار پاتا ہے۔ خاکہ انگریزی لفظ sketch کا مترادف ہے، جس کے معنی ڈھانچہ یا لکیروں کی مدد سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں لیکن ادبی اصطلاح میں اس سے مراد وہ تحریر ہے جس میں نہایت مختصر طور پر، اشارے کنائے میں کسی شخصیت کا ناک نقشہ، عادات واطوار اور کردار کو فن کارانہ انداز اور روانی و جولانی کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ اس میں نہ جواب مضمون کی سی سنجیدگی درکار ہوتی ہے اور نہ ہی یہ سوانح کی سی باقاعدگی اور ذمہ داری کا متحمل ہو سکتا ہے بلکہ یہ تو کسی شخص یا شخصیت سے وابستہ عقیدت، احترام، محبت، دوستی، دلچسپی یا یادوں کی ایک ایسی لفظی تصویر ہوتی ہے جو کسی جگہ سے نہایت بے ساختہ انداز میں شروع ہو کے کسی مقام پر غیر روایتی انداز میں ختم ہو جاتی ہے۔

خاکہ عموماً کسی شخص یا شخصیت کے لیے دل سے اٹھنے والی تحریک کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خاکہ عام طور پر انھی شخصیات یا اشخاص کا لکھا جاتا ہے جن سے خاکہ نگار کو کوئی خاص انس، عقیدت یا دلچسپی ہوتی ہے۔ اس انس، عقیدت یا دلچسپی کا تناسب جتنا زیادہ ہوگا، خاکے کے نقوش اور اثرات اتنے ہی گہرے، نمایاں اور متاثر کن ہوں گے۔ ویسے تو کسی بھی ادب پارے کا اکھوا جب تک دل کی گٹھلی سے نہ پھوٹے، اس کے پھلنے پھولنے یا بار آور ہونے کی ضمانت نہیں دی جا سکتی لیکن خاکے کے ساتھ یہ شرط اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ نثری قبیلے کا فرد ہونے کے باوجود اپنے اندر شعری خصوصیات، نزاکتیں اور تقاضے رکھتا ہے۔ سوانح نگاری میں تو کسی شخصیت کے ظاہری احوال اور کارگزاریوں کے بیان سے بھی کام چل جاتا ہے، جب کہ خاکہ نگاری میں کسی شخص یا شخصیت کی نفسیات بینی اور باطن شناسی بھی ضروری قرار پاتی ہے۔ یہ مردم آشنائی سے زیادہ مردم شناسی کا متقاضی ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے خاکے کو شخصیت کی کھدائی کا عمل قرار دیا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر شمیم حنفی لکھتے ہیں:

کامیاب خاکہ نگار وہ ہے جس کی آستین میں روشنی کا سیلاب چھپا ہوا ہو، اور جو واقعات کی اوپری پرت کے نیچے، معمولات کے ہجوم میں کھوئی ہوئی ایسی حقیقتوں کو بھی اپنی گرفت میں لے سکے، جن تک عام لکھنے والوں کی نگاہ پہنچتی ہی نہیں۔ اس لیے ہر اچھا خاکہ ایک دریافت ہوتا ہے، کسی کہانی یا شعر کی طرح۔ ہم اس کے واسطے سے زندگی کی کسی عام سچائی تک پہنچنے کے بعد بھی محسوس کرتے ہیں کہ اس سچائی کو ہم نے آج ایک نئے زاویے سے دیکھا ہے اور یہ کہ معنی کی ایک نئی جہت ہم پر روشن ہوئی ہے۔ (۱)

خاکہ نگاری کا ایک وصف یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اسے تفصیل کے بجائے اجمال کی آب و ہوا زیادہ راس آتی ہے۔ اس لیے خاکہ نگار کو اشاروں کنایوں میں بڑے سے بڑا مفہوم ادا کر دینے کے فن پر بھی قدرت حاصل ہونی چاہیے۔ کسی مصور اور کارٹونیے کی طرح، جنھیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ پیش نظر شخصیت کے چہرے کے کون سے نقوش یا تاثرات ہیں جن کو واضح کرنے سے پوری شخصیت کا مجموعی یا اغلب تاثر ناظر کے سامنے آ جائے گا۔ خاکہ نگار کا راستہ تو ایک ذہین مصور اور شوخ کارٹونیے کے بین بین ہوتا ہے۔ وہ اپنی زیر تحریر شخصیت کی اصل تصویر بھی دکھاتا ہے اور اس کے بعض خفیہ یا ظاہری گوشوں کو حسب ضرورت مبالغے یا تجاہل عارفانہ کے ذریعے نمایاں کرتا چلا جاتا ہے۔ خاکہ کسی شخصیت سے متعلق معلومات کو جوں کا توں پیش کر دینے کا نام نہیں بلکہ خاکہ نگار ان معلومات کو اپنے تخیل کی کٹھالی میں نئے سرے سے گوندھتا ہے اور اپنے اسلوب کے چاک پہ شوخ و شنگ اور من مرضی کے مرقعے تیار کرتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اپنے ایک مضمون ''شخصیت اور خاکہ نگاری'' میں رقم طراز ہیں:

خاکہ نگاری ایک ایسی صنف ادب ہے، جس کا خام مواد کسی دوسری شخصیت کے داخلی اور خارجی مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے لیکن ایک عمدہ خاکہ نگار اس مواد کو من و عن پیش نہیں کرتا بلکہ زندگی اور شخصیت کے مختلف واقعات کو مشاہدہ کے تاثر اور تجزیے کے عمل سے گزارنا پڑتا ہے، اور یہی وہ مشکل مرحلہ ہے جہاں مصنف کے تخلیقی جوہر سے مس خام یا تو کندن بن جاتا ہے یا راکھ۔ (۲)

کہا جاتا ہے کہ اردو ادب میں خاکے کا ڈول مرزا فرحت اللہ بیگ (۱۸۸۴ء-۱۹۴۷ء) نے نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی (اول: ۱۹۲۷ء) کے ذریعے ڈالا۔ لیکن حالات و واقعات اس بات پہ بھی دلالت کرتے ہیں کہ اس کا بیج میرزا غالب (۱۷۹۷ء-۱۸۶۹ء) کے خطوط میں بویا جا چکا تھا (۳)۔ جب کہ اس کا ناک نقشہ کافی حد تک اسلوب کے بادشاہ مولانا محمد حسین آزاد (۱۸۳۰ء-۱۹۱۰ء) کی آب حیات (اول: ۱۸۸۰ء) میں تیار کیا جا چکا تھا۔ پروفیسر شمیم حنفی ہی کے بقول:

محمد حسین آزاد کے تذکرے آب حیات کا یہ وصف لائق توجہ ہے کہ اردو تذکرے، اردو تنقید، اردو میں ادبی تاریخ نویسی کے نہایت نمایاں اور منفرد عناصر بھی ہمیں اس کتاب میں ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ اس سے

انداز ہ ہوتا ہے کہ آزاد کی بصیرت میں کتنی ہمہ گیری تھی۔ خاکہ نگاری کے اعتبار سے بھی آب حیات ایک اہم دستاویز ہے کہ آزاد نے تنقید و تاریخ کے ساتھ ساتھ جا بجا شخصیتوں کے مرقعے بھی پیش کیے ہیں...... تصویر سازی سے آزاد ایک خصوصی مناسبت رکھتے تھے۔ ان کی خلاقی مجرد خیالات کو بھی شبیہوں میں منتقل کر سکتی تھی...... آب حیات میں کئی تصویریں ایسی ہیں جن میں شخصیت نگاری یا خاکہ نگاری کا کمال دیکھا جا سکتا ہے۔ (۴)

خاکہ نگاری کے لیے جو مزاج اور اسلوب درکار ہوتا ہے، مولانا آزاد کو قدرت کی طرف سے اس کی بے پناہ صلاحیت ارزانی ہوئی تھی۔ خالق کائنات کو اپنے مصور ہونے پہ بہت ناز ہے، اس نے اپنی یہ صفت بعض خاکی خالقوں کو بھی عطا کی ہے، جس کا معتد بہ حصہ جناب آزاد کو ودیعت ہوا تھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ آزاد کے افکار ان پر لفظوں کی صورت نازل نہیں ہوتے بلکہ وہ ان پر ہیولوں، عکسوں اور شبیہوں کے ڈھنگ میں ورود کرتے ہیں، جن کی وہ اسلوب کے اوزاروں سے تراش خراش کر کے لفظی مجسموں کے روپ میں قارئین ادب کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، مولانا آزاد کے اس ہنر کی یوں نشان دہی کرتے ہیں:

آب حیات میں تحقیق و تدقیق کے حوالے سے سو عیب سہی لیکن اتنی بات بہر حال طے ہے کہ شعرا و ادبا کے چلتے پھرتے اور جیتے جاگتے مرقعے اس میں جا بہ جا موجود ہیں۔ اس کتاب میں ان کے اخلاق و عادات پر روشنی پڑتی ہے، ان کے ادبی مشاغل بھی آئینہ ہوتے ہیں۔ ان کی رفاقتوں، مقابلوں، معرکوں، مجادلوں اور مباہلوں کی تصویر بھی سامنے آتی ہے۔ اس مرقع نگاری اور سراپا آرائی میں آزاد کا قلم بہت رواں نظر آتا ہے۔ (۵)

اردو کے بے شمار ناقدین اس بات پہ متفق ہیں کہ آزاد نے قلم سے موقلم کا کام لیا ہے۔ وہ اپنے نثری مرقعوں میں الفاظ و استعارات کے پیکر ہی نہیں تراشتے بلکہ ان میں اسلوب و تخیل کی روح بھی نہایت سلیقے سے پھونکتے دکھائی دیتے ہیں۔ جس زمانے میں اردو نثر ابھی پاؤں پاؤں چلنا سیکھ رہی تھی، انھوں نے نہ صرف اسے آب حیات کا بے مثال ٹانک فراہم کیا بلکہ اردو ادب کے بے آب و گیاہ خطے کو نیرنگی خیالات سے بھر دیا۔ یہ ان کے جادو صفت قلم ہی کا کرشمہ ہے کہ وہ تخیل و تفکر میں در آنے والی ہر کیفیت، منظر، ماحول، واقعے، اشیا اور اشخاص کو اپنی مثالی رومانویت اور جمالی اسلوب کی چھب دکھا کر متحرک و منفرد پیکر عطا کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بھی مولانا کے پُرفسوں تخیل سے نمو پاتی اس نوخیز صنف سخن کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

محمد حسین آزاد کے ہاں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ تاہم ان کے شخصی مرقعے خاکے نہیں کہلا

سکتے۔ آزاد کی انشا پردازی تلے دبے ہوئے یہ دھندلے نقوش اردو تذکرہ نگاری سے خاکہ نگاری کی طرف اہم قدم ہیں۔ (۶)

خاکہ نگاری کے حوالے سے مولانا آزاد کی سب سے اہم تصنیف آبِ حیات قرار پاتی ہے، جو بہ یک وقت تذکرہ، تاریخ، تحقیق، تنقید، انتخاب، لطائف وظرائف اور خاکہ نگاری کی صفات اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ہمارے یک رنگی پہ اصرار کرنے والے بعض ناقدین اسی رنگارنگی کو کتاب کا نقص قرار دیتے ہیں اور مولانا آزاد کے فن کی سہ جہتی کو غیر سنجیدگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی مسئلہ جناب مشتاق احمد یوسفی کی آبِ گم کے ساتھ بھی چلا آ رہا ہے کہ اس کی صنف کا تعین ہمارے ناقدین کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے کیونکہ وہ ایک ہی وقت میں ناول، آپ بیتی، افسانہ، خاکہ، جگ بیتی کے معیارات پر پورا اترتی ہے۔ یہ ہمارے ان صاحبانِ اسلوب کا کمال ہے کہ اردو کی بے شمار اصناف ان کے در پہ حاضری دینے آتی ہیں۔ اور یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ اگر اردو نثر میں کہیں صدیوں پہ محیط کتب کا انتخاب عمل میں آیا تو انیسویں صدی آبِ حیات کے نام لکھی جائے گی اور بیسویں صدی کا قرعہ آبِ گم کے نام پڑے گا۔ ڈاکٹر محمد صادق آبِ حیات کی ہمہ رنگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> آبِ حیات، شعرائے اردو کا تذکرہ ہے، اس میں اردو تنقید ایک ہی جست میں مغربی تنقید کے شانہ بشانہ کھڑی دکھائی دیتی ہے آبِ حیات میں حرکت اور زندگی ہے۔ ابتدا ہی سے آزاد قاری کے متخیلہ پر حاوی ہو جاتا ہے اور دورانِ مطالعہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ گویا عہدِ سلف کی یہ یادگاریں از سرِ نو زندہ ہو کر اپنی پرانی سرگرمیوں کا احاطہ کر رہی ہیں۔
>
> آبِ حیات ایک زندہ جاوید تصنیف ہے۔ پچھلے ستر اسی سال (۷) میں ہر وہ شخص جس نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس نے لامحالہ اس سے استفادہ کیا ہے اور ہر وہ نقاد جو آئندہ اس موضوع پر خامہ فرسائی کرے گا، اس کے لیے اس کا مطالعہ ازبس ضروری والابدی ہوگا۔ (۸)

ہم سمجھتے ہیں کہ آبِ حیات میں یہ وصف آزاد کی پیکر تراشی یا خاکہ نگاری ہی کی بدولت پیدا ہوا ہے، وگرنہ اردو کی تاریخ ادبی تذکروں سے بھری پڑی ہے۔ بعض ناقدین کو یہ بھی اعتراض ہے کہ مولانا آزاد نے آبِ حیات میں متعدد شخصیات کی صورت گری کے دوران معروضات کی کی کو رومانویت آمیز تخیل کے ساتھ پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ویسے تو ان کا یہ عمل بھی انھیں تحقیق کے خارزار سے خاکے کے گلستاں میں کھینچ لاتا ہے لیکن استاد الاساتذہ ڈاکٹر سید عبداللہ کو تو آزاد کے ان مرقعوں کے علمی استفادہ پر بھی اصرار ہے، جن کا فرمان ہے:

> آزاد کے یہاں تاریخ اپنی برہنہ سچائیوں اور سائنسی برہنگی کے باوجود تخیل کے ایسے رنگین لباس میں ملبوس ہو کر منظرِ عام پر آ رہی ہے کہ بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا واقعی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کو حقیقت کہیں یا افسانہ؟ کیوں

کہ وہ حقیقت ہونے کے باوجود افسانے سے کہیں زیادہ دل کش ہوتی ہے اور آزاد کا یہ ایسا تفوق ہے جس میں شبلی تو درکنار اردو کے اگلے پچھلے مورخوں میں سے کوئی بھی ان کا ہم سفر و شریک نہیں ہوتا۔ (۹)

آب حیات میں اردو زبان و ادب کی ایک رنگین دنیا آباد نظر آتی ہے، ان کے یہ خاکے ہماری دھند میں لپٹی لسانی و ادبی زندگی کا جیتا جاگتا مرقع ہیں۔ انھوں نے زبان و ادب سے وابستہ اہل ہنر کی نقش گری کے لیے خوب پیرایہ اظہار اختیار کیا ہے۔ مولانا آزاد جب بھی اپنی کسی پسندیدہ ہستی کا تذکرہ کرتے ہیں تو یہ حکایت لذیذ دراز سے درازتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ بھولی بسری یادوں کی سحر کاری ان دلچسپ مرقعوں سے پوری طرح عکس ریز ہونے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کی یہ ادبی تاریخ محض معلومات کا انبار گراں نہیں بنی بلکہ دل کشی کا جوہر ان تذکروں میں برق رو کی مانند سرایت کیے ہوئے ہے۔ انھوں نے اردو ادب کے بے حس ادبی تذکروں میں حسن خیال اور لطف بیان کی روح ڈال دی ہے۔ کتاب کے دیباچے میں انھوں نے دعویٰ کیا تھا کہ:

جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں انھیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں۔ (۱۰)

جب ہم مصنف کے اس دعوے کی روشنی میں آب حیات کے صفحات میں جھانکتے ہیں تو اردو شعر و ادب کے ان گنت کردار نہ صرف چلتے پھرتے اور بولتے چالتے بلکہ اٹھکیلیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ میر، انشا، آتش، جرات، مومن اور ذوق کے مرقعے تو جدید اردو خاکے کا بہت دور تک تعاقب کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ چہرہ نویسی، لباس کی تراش خراش، عادات و اطوار، نفسیاتی ژرف بینی، تخیل آفرینی، چابک دستی، لطائف و ظرائف اور سلیقہ شعاری ہی جدید خاکے کے اوصاف گردانے جاتے ہیں۔ مولانا آزاد کی یہ 'تصویریں' ان تمام صفات سے متصف ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے:

۱۔ مضمون تخلص، شیخ شرف الدین نام، شیخ فریدالدین شکر گنج کی اولاد میں تھے...... اصل پیشہ سپاہ گری تھا۔ تباہی سلطنت سے ہتھیار کھول کر مضمون باندھنے پر قناعت کی اور زینت المساجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کر اٹھے...... نزلہ سے دانت ٹوٹ گئے تھے اس لیے خان آرزو انھیں شاعر بیدانہ کہتے تھے۔ (۱۱)

۲۔ جب انھوں نے میر تخلص کیا تو ان کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو، ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے۔ اس وقت انھوں نے خیال نہ کیا، رفتہ رفتہ ہو ہی گئے...... میر صاحب میانہ قد، لاغر اندام، گندمی رنگ کے تھے، ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ، بات بہت کم، وہ بھی آہستہ، آواز میں نرمی اور

ملائمت سے۔ ضعیفی نے ان سب صفتوں کو اور بھی قوی کیا تھا...... ساتھ اس کے قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اطاعت تو درکنار، نوکری کے نام کی بھی برداشت نہ رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ فاقے کرتے تھے، دکھ بھرتے تھے اور اپنی بد دماغی کے سایہ میں دنیا و اہل دنیا سے بے زار گھر میں بیٹھے رہتے تھے...... ان کی اس ثابت قدمی کا وصف کسی زبان سے نہیں ادا ہو سکتا کہ اپنی بے نیازی اور بے پروائی کے ساتھ دنیائے فانی کی مصیبتیں جھیلیں اور جو اپنی آن تان تھی، اسے لیے دنیا سے چلے گئے اور جس گردن کو خدا نے بلند پیدا کیا تھا، سیدھا خدا کے ہاں لے گئے، چند روزہ عیش کے لالچ سے یا مفلسی کے دکھ سے اسے دنیا کے نااہلوں کے سامنے ہرگز نہ جھکایا۔ ان کا کلام کہے دیتا ہے کہ دل کی کلی اور تیوری کی گرہ کبھی کھلی نہیں...... خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے، کسی اور کی کیا حقیقت ہے؟...... میر قمر الدین منت دلی میں ایک شاعر گزرے ہیں کہ علوم رسمی کی قابلیت سے عمائد دربار شاہی میں تھے، وہ میر صاحب کے زمانہ میں مبتدی تھے۔ شعر کا شوق بہت تھا۔ اصلاح کے لیے اردو کی غزل لے گئے۔ میر صاحب نے وطن پوچھا۔ انھوں نے سونی پت علاقہ پانی پت بتلایا۔ آپ نے فرمایا کہ سید صاحب! اردوئے معلیٰ خاص دلی کی زبان ہے، آپ اس میں تکلف نہ کیجیے، اپنی فارسی وارسی کہہ لیا کیجیے...... لکھنؤ میں کسی نے پوچھا کہ کیوں حضرت آج کل شاعر کون کون ہے؟ کہا ایک تو سودا، دوسرا یہ خاکسار ہے اور کچھ تامل کر کے کہا: آدھے خواجہ میر درد۔ کوئی شخص بولا کہ حضرت! اور میر سوز صاحب؟ چیں بجبیں ہو کر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟ انھوں نے کہا کہ آخر استاد نواب آصف الدولہ کے ہیں۔ کہا کہ خیر! یہ ہے تو پونے تین سہی مگر شرفا میں ایسے تخلص ہم نے کبھی نہیں سنے۔ (۱۴)

۳۔ جب یہ ہونہار نونہال تعلیم کے چمن سے نکلا تو ہر ریشہ میں کونپل، پتے، پھول، پھل کی قوائے مختلفہ موجود تھیں، اس طرح کہ جس سرزمین پر لگے وہیں کی آب و ہوا کے بموجب بہار دکھلانے لگے۔ ایسا طباع اور عالی دماغ آدمی ہندوستان میں کم پیدا ہوا ہوگا۔ وہ اگر علوم میں سے کسی ایک فن کی طرف متوجہ ہوتے تو صدہا سال تک وحید عصر گنے جاتے۔ طبیعت ایک ہیولیٰ تھی کہ ہر قسم کی صورت پکڑ سکتی تھی۔ باوجود اس کے شوخی اس قدر کہ سیماب کی طرح ایک جا قرار نہ تھا۔ ان کی طبیعت شیر کی طرح کسی کا جھوٹا شکار نہ کھاتی تھی، پیشۂ آبائی پر نہ مائل ہوئی لیکن چونکہ ایسے رنگا رنگ خیالات کا سوائے شاعری کے اور فن میں گزارا نہیں، اس لیے شاعری کی طرف جھکے جس سے انھیں ربط خداداد تھا۔ اس کوچہ میں بھی اپنا رستہ سب سے جدا نکال کر داخل ہوئے...... شاہ عالم نے...... اس نوجوان پر خلعت

عزت کے ساتھ شفقت کا دامن اڑھایا۔ سید انشا اہل دربار میں داخل ہوئے۔ چنانچہ اپنے اشعار کے ساتھ لطائف وظرائف سے کہ ایک چمن زعفران تھا، گل افشانی کر کے محفل کو لٹا دیتے تھے اور یہ عالم ہوا کہ شاہ عالم کو ایک دم جدائی ان کی ناگوار ہوگئی...... سید انشا رنگت کے گورے، بدن کے فربہ، صورت کے جامہ زیب تھے...... جس کے سینہ میں علم وفنون کے زور بھرے تھے اور طراری اور براقی کے بازو اڑائے لیے جاتے تھے کسی کو خاطر میں کب لاتا تھا...... اسی مصاحبت سے ہنسی ہنسی میں مخالفت پیدا ہوگئی، جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ چہکتا ہوا بلبل اپنے گھر کے پنجرے میں بند کیا گیا اور وہاں سے اس کی گمنامی کے ساتھ زمین کا پیوند ہوا کہ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ (۱۳)

۴۔ چھریرا بدن، کشیدہ قامت، سیدھے سادے بھولے بھالے آدمی تھے۔ سپاہیانہ، رندانہ اور آزادانہ وضع رکھتے تھے اور اس لیے کہ خاندان کا تمغہ بھی قائم رہے، کچھ رنگ فقیری کا بھی تھا۔ ساتھ اس کے بڑھاپے تک تلوار باندھ کر سپاہیانہ بانکپن کو بھی نباہے جاتے تھے۔ سر پر ایک زلف اور کبھی حیدری پٹّا کہ یہ بھی محمد شاہی بانکوں کا سکہ ہے۔ اسی میں ایک طرہ سبزی کا بھی لگائے رہتے تھے اور بے تکلفانہ رہتے تھے۔ (۱۴)

۵۔ رنگین طبع، رنگین مزاج، خوش وضع، خوش لباس، کشیدہ قامت، سبزہ رنگ، سر پر لمبے لمبے گھنگھر والے بال اور ہر وقت انگلیوں میں سے ان میں کنگھی کرتے رہتے تھے، ململ کا انگرکھا، ڈھیلے ڈھیلے پائنچے، اس میں لال نیفا بھی ہوتا تھا۔ ایسی دردناک آواز سے دل پذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا۔ (۱۵)

غرض یہ کہ اس طرح کی مثالوں سے آب حیـــات لبالب بھری ہے۔ اس میں قدم قدم پر نہ صرف ہمارا کرداری خاکوں سے واسطہ پڑتا ہے بلکہ خود اردو زبان ایک جیتے جاگتے، سانس لیتے، نمو پاتے کردار کے روپ میں ہمارے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ ایک جھلک ملاحظہ ہو:

۱۔ تعجب ہوا کہ ایک بچہ شاہ جہانی بازار میں پھرتا ملے، شعرا اسے اٹھالیں اور ملک سخن میں پال کر پرورش کریں۔ انجام کو یہ نوبت پہنچے کہ وہی ملک کی تصنیف وتالیف پر قابض ہو جائے۔

۲۔ ادھر تو یہ چونچال لڑکا شعرا کے جلسوں میں اور امرا کے درباروں میں اپنی چپنی کی شوخیوں سے سب کے دل کو بہلا رہا تھا۔ ادھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعہ پر دوربین لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا، نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے مگر تربیت چاہتا ہے۔ (۱۶)

پھر اردو شاعری کا رنگ ڈھنگ ملاحظہ ہو:

نظم اردو کے عالم کا پہلا نوروز ہے۔ نفس ناطقہ کی روح یعنی شاعری عالم وجود میں آئی تھی۔ مگر بچوں کی نیند پڑی سوتی تھی۔ ولی نے آ کر ایسی میٹھی میٹھی آواز سے غزل خوانی شروع کی ہے کہ اس بچے نے ایک انگڑائی لے کر کروٹ لی۔ (۱۷)

یہ اور اس طرح کے ان گنت مقامات ہیں جہاں مختلف اشیا اور کیفیات کو بیان کرتے ہوئے آزاد میں ایک خاکہ نگار کی روح حلول کر جاتی ہے اور وہ اردو تذکرہ نگاری کی بے رنگ ڈھنگ روایت میں تخیل و تدبر کی چتر کاری کرنے لگتے ہیں۔ پھر یہ سلسلہ محض آب حیات تک محدود نہیں بلکہ ان کی کوئی بھی تصنیف ذوق نقش گری سے مبرا نہیں ہے۔ قصص ہند (اول: ۱۸۷۱ء) کہنے کو تو ہندوستان کی تاریخ ہے لیکن آزاد کی حسن ادا نے یہاں بھی قاری سے زیادہ ناظر کی تسکین کا سامان فراہم کیا ہے۔ چند نمونے دیکھیے:

۱۔ چھپن ستونوں پر گنبدی چھت بیضہ عنقا کی طرح دھری تھی کہ ہر ستون ایک ڈال سنگ مرمر کا تراشا ہوا تھا اور سر سے پاؤں تک جواہرات سے مرصع تھا۔ پچی کاری کی گل کاری چین کے نقش و نگار مٹاتی تھی اور کندن کی ڈلک ستاروں پر آنکھ مارتی تھی۔

۲۔ دوسرے دن جب مشرق کا شہسوار ستاروں کی فوج کو شکست دیکر شعاع کا نیزہ ہاتھ میں لیے نکلا۔

۳۔ مگر ایک رانی کہ پدمنی نام ہے کہ حسن و جمال میں دن کو مہر نیم روز اور رات کو ماہ تمام ہے ..... غرض اس کے جمال کو دیکھ کر بادشاہ آئینے کی طرح حیران رہ گیا بلکہ اشتیاق کا شعلہ ایسا بھڑکا کہ مہمان نے عہد و پیمان کو وہیں طاق پر رکھا اور مروت کے گھر کو آگ لگا دی۔ (۱۸)

علاوہ ازیں دربار اکبری (اول: ۱۸۹۸ء) اور سخندان فارس (اول: ۱۹۰۷ء) میں بھی آزاد کا تخیل نہایت آب و تاب سے ماہ رخوں اور شاہ رخوں کے لیے مصوری کرتا نظر آتا ہے اور نیرنگ خیال (اول: ۱۸۸۳ء) تو ہے ہی سچے رنگوں کی ریزہ کاری، جس میں بقول مولانا حالی:

اس میں معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکل میں کھینچی ہیں۔ (۱۹)

یہاں ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے:

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجا معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود مخمور، نشے میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا، اس کے نور جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ چاہتا تھا اسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا تھا، اس لیے بدمست بھی نہ ہوتا تھا، جب نشے سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ لیتا تھا، وہ جہانگیر

تھا۔[۲۰]

مجرد کیفیات کو محاکات کا درجہ عطا کرنے کا مولانا آزاد کو خاص سلیقہ عطا ہوا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ لمحہ موجود میں اپنے اردگرد کے احباب کی تصویر کاری کہ جن سے ہمارا روزمرہ کا میل جول ہے، نسبتاً آسان کام ہے۔ ویسے بھی عام کردار کی مٹی کو اپنی من مرضی سے گوندھا جا سکتا ہے، ڈاکٹر خورشید رضوی کے بقول:

> ان کے چاک پر مٹی نرم اور بے ہیئت ہوتی ہے، جس کے خط و خال وہ خود نکالتے ہیں جب کہ مشاہیر کے خط و خال بالعموم ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ ایک نئے زاویے سے انھیں دیکھ اور دکھا سکتے ہیں۔[۲۱]

یہ آزاد کی معجز نگاری اور خلاقی ہی کا کمال ہے کہ انھوں نے ادبی و تاریخی مشاہیر کے خال و خط اس انداز مہارت اور ہنرکاری سے تراشے ہیں کہ انھی کے ہاتھ سے زندگی پانے والے یہ نقوش ہی ادب و تاریخ کے ٹھہرے ہوئے نقوش قرار پاتے ہیں۔ یہ مولانا آزاد کا تخلیقی وفور ہی ہے جو کہیں دہلی اردو اخبار میں ادبی صحافت کے ابتدائی اور تیکھے نقوش سے جھانکتا دکھائی دیتا ہے، کہیں انجمن پنجاب کے مشاعروں میں جدید اردو شاعری کا مہاندرا ترتیب دیتا ہوا ملتا ہے اور کہیں سخن دان فارس کے پھٹے پرانے کپڑوں[۲۲] کی رفوگری میں مشغول دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آج بھی مولانا محمد حسین آزاد کی لفظی کائنات سے سر اٹھانے والے رنگا رنگ پیکروں کو دھیان میں لاتے ہیں تو احساس کی سطح پہ یہ شعر دستک دینے لگتا ہے:

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

حواشی

۱۔ پروفیسر شمیم حنفی، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، ص۱۰

۲۔ ڈاکٹر انور سدید، ماہنامہ صریر کراچی، مارچ ۱۹۸۸ء، ص۷۷

۳۔ چند سال قبل راقم نے میرزا غالب کی تحریروں سے سو سے زائد ایسے جملے اور اشعار تلاش کیے تھے جو خاکے کا مزاج رکھتے تھے۔ بعد ازاں ان جملوں اور اشعار کو اس انداز سے ترتیب دیا تھا کہ جس سے غالب کا ایک جیتا جاگتا خاکہ تیار ہو گیا تھا۔ یہ خاکہ ''آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے'' کے عنوان سے ۲۰۰۴ء میں سہ ماہی 'تادیب' انٹرنیشنل، راولپنڈی/لندن اور ادبی مجلہ 'سخن' شعبہ اردو جامعہ پنجاب لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔ نیز اردو کے خودنوشت خاکوں پر مشتمل راقم کی مرتبہ کتاب خود ستائیاں مطبوعہ ۲۰۰۵ء میں بھی شامل ہے۔

۴۔ پروفیسر شمیم حنفی، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، ص۱۲
۵۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، عبدالماجد دریا بادی - احوال و آثار، ص۵۰۱
۶۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، ص۱۷۳-۱۷۴
۷۔ اب ایک سوتیس سال
۸۔ ڈاکٹر محمد صادق، مقدمہ نیرنگ خیال، ص۴-۵
۹۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، وجہی سے عبدالحق تک، ص۲۲۵
۱۰۔ مولانا محمد حسین آزاد، دیباچہ: آب حیات، ص۴
۱۱۔ آب حیات، تذکرہ شیخ شرف الدین مضمون، ص۹۶
۱۲۔ آب حیات، تذکرہ میر تقی میر، ص۱۹۴-۲۰۸
۱۳۔ آب حیات، تذکرہ سید انشاء اللہ خاں انشا، ص۲۴۷-۲۵۶
۱۴۔ آب حیات، تذکرہ خواجہ حیدر علی آتش، ص۳۷۳
۱۵۔ آب حیات، تذکرہ مومن خاں مومن، ص۴۰۸-۴۰۹
۱۶۔ آب حیات، دونوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۱، ۲۴
۱۷۔ آب حیات، ص۸۱
۱۸۔ محمد حسین آزاد، قصص ہند (مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی) صفحات بالترتیب: ۲۷، ۲۳، ۴۱-۴۲
۱۹۔ کلیات نثر حالی (جلد دوم) مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی ص۱۸۱
۲۰۔ نیرنگ خیال، مضمون: شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار، ص۱۵۶
۲۱۔ پیش گفتار، بے نشانوں کا نشان از ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی ص۱۱
۲۲۔ سخن دان فارس کی تمہید مرقومہ ۱۵ اگست ۱۸۸۷ء میں مولانا آزاد نے ان کی اسی طرح نقشہ کشی کی ہے۔ ص۲۱

ذخیرۂ آزاد کے مخطوطات

ڈاکٹر عارف نوشاہی

شمس العلماء محمد حسین آزاد (۱۲۲۵-۱۳۲۸ھ / ۱۸۳۰-۱۹۱۰ء) عربی، فارسی اور اردو زبان و ادب کے نام ور محقق، زبان شناس اور ادیب تھے اور اپنی گوناگوں تصانیف آب حیات، دربار اکبری، سخن دان فارس، نیرنگ خیال وغیرہ کے باعث ادب کی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کا آبائی وطن دہلی تھا۔ ان کے والد محمد باقر کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شرکت اور انگریزوں کے خلاف اپنے اخبار میں جہاد کا فتویٰ شایع کرنے کی پاداش میں جب سزائے موت ہوئی تو آزاد دہلی چھوڑ کر مختلف شہروں میں پناہ لیتے ہوئے آخر کار ۱۸۶۱ء میں لاہور آبسے اور یہاں کے تعلیمی اور تدریسی اداروں سے وابستگی اختیار کی اور اپنی تصنیفات اور مقالات کے ذریعے سب کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ وفات لاہور ہی میں پائی اور بھاٹی دروازے کے باہر کربلا گامے شاہ میں پیوندِ خاک ہوئے۔

کتب خانۂ آزاد

آزاد کو نہ صرف اپنے علمی اور تحقیقی امور کی تکمیل بلکہ خاص اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے کتب جمع کرنے سے بے حد شغف تھا۔ نادر مخطوطات اور نایاب مطبوعات کی تلاش میں وہ دہلی سے نکلے اور اَلور، جے پور اور بھارت کے دیگر شہروں کا سفر کیا۔ ۱۲۸۲ھ-۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۵ء-۱۸۶۷ء کے عرصے میں وہ پنڈت من پھول کے ہمراہ وسطی ایشیا میں پھرتے رہے اور وہاں کے تاریخی شہروں بخارا، خیوہ، سمرقند اور تاشقند سے نایاب اور نفیس کتب جمع کر کے اپنے ساتھ وطن لائے۔ وہ اپنے دوستوں اور شاگردوں کو بھی اہم اور قیمتی قلمی اور مطبوعہ کتابیں مہیا کرنے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء میں جب وہ دس مہینوں کے لیے ایران کی سیر کو گئے تو سارے سفر میں کتب جمع کرتے رہے۔ اس سفر میں آزاد نے کئی ایرانی دانش وروں اور امراء سے ملاقاتیں کی، جو انھیں مالی اعانت

کے ساتھ ساتھ کتابوں کے تحائف بھی پیش کرتے رہے اور وہ کتابوں سے لدے پھندے لاہور لوٹے۔

انھیں کتب حاصل کرنے کا اس حد تک شوق تھا کہ اہم مخطوطات اگر قیمتاً یا ہدیۃً حاصل نہ ہوتے تو خود اپنے ہاتھ سے نقل تیار کر لیتے۔ خواجہ عبدالکریم بن عاقبت محمود کشمیری کی تصنیف بیان واقع کے انھیں دو نسخے کہیں نظر آئے تو انھوں نے اسے نقل کر لیا۔ جیسا کہ اس کے ترقیمے میں لکھتے ہیں: ''۲۷ جمادی الثانی روز پنجشنبہ ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۹ جولائی ۱۸۷۴ء بہ اتمام رسید و این نسخہ دو جا بہ نظر آمدہ، افسوس کہ تا ہمین جا بود، محمد حسین آزاد عفی عنہ۔'' (نسخۂ ذخیرۂ آزاد، نمبر Apf IV 6)

ایران سے لاہور واپس پہنچ کر آزاد کو اپنا ذاتی کتب خانہ قائم کرنے کی فکر ہوئی۔ بلدیہ لاہور نے (دہلی دروازہ اور اکبری دروازہ کے درمیان واقع) شاہ محمد غوث لاہوری کے مزار کے پاس انھیں ایک قطعۂ زمین دے دیا۔ وہاں آزاد نے اپنی گرہ سے، لاہور کے معروف ماہر تعمیرات رائے بہادر گنگا رام کی نگرانی میں کتب خانہ کی عمارت بنوائی، فرنیچر رکھوایا اور ''کتب خانۂ آزاد'' کی سنگی تختی نصب کی۔ ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۷ء میں پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر نے وہاں کا دورہ کیا اور پنجاب پبلک لائبریری، لاہور کا ڈائریکٹر جنرل ہونے کی حیثیت سے یہ منظور کیا کہ پنجاب پبلک لائبریری سے فالتو کتابیں خارج کر کے کتب خانۂ آزاد کو تحفۃً دے دی جائیں۔

محرم ۱۳۰۸ھ / اگست ۱۸۹۰ء تک کتب خانۂ آزاد بڑی آب و تاب سے کام کرتا رہا اور مولانا آزاد اس میں برابر قیمتی کتب کا اضافہ کرتے رہے۔ اسی سال آزاد جنون میں مبتلا ہوئے تو اُن کے لیے کتب خانہ چلانا ممکن نہ رہا۔ مولانا کے بیٹے آغا محمد ابراہیم نے، جو ملازمت پیشہ تھے اور کتب خانہ کا انتظام کرنے کے لیے وقت نہیں نکال سکتے تھے، کتب خانہ بند کر دیا۔ آخر بلدیہ نے عمارت خالی کروالی اور آغا محمد ابراہیم وہاں سے کتابیں اٹھا کر لے گئے جو ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء میں انھوں نے اپنے نئے مکان ''آزاد منزل'' واقع چوک نواب صاحب (اکبری دروازہ) میں سجا دیں اور یہ کتب خانہ اسی مکان میں قائم رہا۔ تا آنکہ ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء میں آزاد کا انتقال ہو گیا اور کتب خانہ بند کرنا پڑا۔

۱۸۹۰ء تا ۱۹۱۰ء کا زمانہ کتب خانۂ آزاد کے زوال کا زمانہ ہے۔ آزاد جنون کے باعث، ذاتی طور پر اس کتب خانے کی حفاظت سے معذور تھے۔ لہٰذا اس عرصے میں کتابیں مسلسل چوری ہوتی رہیں اور چوہے اور دیمک بھی اپنی خوراک ان سے حاصل کرتے رہے۔

۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۳ء میں آغا محمد ابراہیم نے تمام کتابیں جن کی تعداد اُس وقت ایک ہزار آٹھ سو سولہ (۱۸۱۶) تھی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کو تحفۃً دے دیں، جہاں مرکزی کتب خانے میں اب یہ ''ذخیرۂ آزاد'' کے نام سے موجود ہیں۔

مخطوطات ذخیرۂ آزاد

کتب خانۂ آزاد کی جو کتابیں پنجاب یونیورسٹی کو منتقل ہوئیں، ان میں مطبوعات کے ساتھ مخطوطات بھی تھے۔ یونیورسٹی کے جاری کردہ حالیہ اعداد وشمار کے مطابق ایک ہزار پانچ سو چھپن (۱۵۵۶) مطبوعہ اور تین سو اٹھانوے (۳۹۸) قلمی نسخے ہیں اور ان کا کوڈ نمبر A (یعنی Azad) ہے۔۔کتب خانے میں رجوع کرنے والوں کی راہ نمائی کے لیے ان مخطوطات کی دستی فہرست، یونیورسٹی کے ایک رجسٹر میں درج ہے۔ جب سے یہ نسخے یونیورسٹی منتقل ہوئے ہیں ان کی کوئی وضاحتی یا مستند فہرست تیار نہیں ہوئی ہے۔ ماسوا تاریخ اور فارسی شاعری کے ان چند نسخوں کے جو ڈاکٹر سید عبداللہ (۱۹۰۴-۱۹۸۶ء) کی تیار کردہ حسب ذیل فہرست میں آ گئے ہیں:

A Descriptive Catalogue of Persian ,Urdu & Arabic Manuscripts in the Punjab University Library, Vol. 1.

Persian Manuscripts, Fasciculus I History,University of the Punjab, Lahore,1942. Vol. 1

Persian Manuscripts,Fasciculus II Persian Poetry, University of the Punjab, Lahore, 1948.

حسب ذیل مقالات میں بھی اکاذکا مخطوطات متعارف ہوئے ہیں:

سید عبداللہ، ڈاکٹر: ''خزائن مخطوطات پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور''، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، مئی ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۶ء (۲۵ مختلف شمارے)

افضل ملک: ''اردو مخطوطات پنجاب یونیورسٹی لائبریری''، قومی زبان، کراچی، جنوری ۱۹۷۱ء، صفحات ۴۰-۵۲، مارچ ۱۹۷۱ء، ص ۶۴-۷۶، اپریل ۱۹۷۱ء ص ۳۶-۴۹، جون ۱۹۷۱ء، ص ۵۶-۶۰

۲۰۰۲ء میں راقم السطور نے پنجاب یونیورسٹی کے تمام ذخائر کتب میں ان فارسی مخطوطات کی فہرست تیار کرنے کا عزم کیا جن کی ابھی تک کوئی فہرست تیار نہیں ہوئی تھی یا ان کے کوائف مختلف فہرستوں میں شائع تو ہوئے ہیں لیکن وہ کافی نہیں ہیں یا ان کوائف میں تسامحات پائے جاتے ہیں۔ اس منصوبے کے تحت پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے حسب ذیل ذخیرہ ہائے مخطوطات کی فہرست تیار ہوگئی:

-ذخیرۂ آزاد (محمد حسین آزاد ۱۸۳۰-۱۹۱۰ء)، تمام فارسی مخطوطات،

-ذخیرۂ پیرزادہ (پیرزادہ محمد حسین عارف ۱۸۵۶-۱۹۲۸ء)، تمام فارسی مخطوطات،

-ذخیرۂ شیرانی (حافظ محمود خان شیرانی ۱۸۸۰-۱۹۴۶ء)، بعض فارسی مخطوطات،

-ذخیرۂ کیفی (برج موہن دتاتریا کیفی ۱۸۶۶-۱۹۵۵ء)، تمام فارسی مخطوطات،

-ذخیرۂ عام(General Collection) کے وہ فارسی مخطوطات جونمبر14482 تک فہرست نہیں ہوئے تھے۔

مذکورہ بالا تمام ذخائر کے فارسی مخطوطات کی جب الگ الگ فہرستیں تیار ہوگئیں تو انھیں آپس میں مدغم کردیا گیا اور موضوعی ترتیب دے کر اس سے ایک مشترک فہرست /Union Catalogue فارسی زبان میں تالیف کی گئی جو اس وقت فہرست نسخه ہای خطّی فارسی کتابخانۂ مرکزی دانشگاه پنجاب لاہور(پاکستان) (مجموعه ہای :آزاد، پیرزاده، شیرانی، کیفی و عمومی) کے نام سے، دو جلدوں اور تقریباً ۱۴۰۰ صفحات میں مرکز پژوہشی میراث مکتوب، تہران کی طرف سے زیر طبع ہے۔

فہرست مخطوطات ذخیرۂ آزاد

مئی ۲۰۰۹ء میں جب شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور نے جنوری ۲۰۱۰ء میں آزاد کی صد سالہ برسی کے موقع پر ایک بین الاقوامی سیمینار اور دیگر علمی تقریبات منعقد کرنے کا عزم کیا تو مجھ سے کہا گیا کہ میں ذخیرۂ آزاد کے فارسی مخطوطات کی فہرست مرتب کر کے اہل علم کی خدمت میں پیش کروں۔ شعبۂ اردو کے امتثال امر میں یہ فہرست اس یادگار موقع پر فہرست مخطوطات آزاد کے عنوان سے شائع کی گئی۔ اس میں فارسی، عربی اور اردو مخطوطات کے کوائف شامل ہیں۔ فارسی مخطوطات کا تعارف راقم السطور نے اور عربی و اردو مخطوطات کا تعارف محمد اکرام چغتائی نے لکھا ہے۔

یہ کل دو سو چھتیس (۲۳۶) فارسی مخطوطات کی فہرست ہے، جنھیں مختلف موضوعات پر تقسیم کر کے، کتب کے اسماء کی تہجی ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ہر اندراج (Entry) دو حصوں پر مشتمل ہے، جسے فہرست نگاری کی اصطلاح میں ''کتاب شناسی'' اور ''نسخہ شناسی'' کہتے ہیں۔ کتاب شناسی کے تحت صرف کتاب / متن (Text) سے متعلق بنیادی کوائف درج ہوئے ہیں، جیسے:

-کتاب کا نام، اگر ایک سے نام ہیں تو سب نام،

-مؤلف کا نام، پوری فہرست میں ''مؤلف'' ہی کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، خواہ وہ مصنف ہے یا مؤلف۔ بعض مقامات پر مؤلف کا سال ولادت و وفات اور مختصر تعارف بھی دیا گیا ہے، لیکن یہ اہتمام معروف مؤلفین کے لیے نہیں کیا گیا۔ اگر کتاب کسی دوسری زبان سے فارسی میں ترجمہ کی گئی ہے تو مترجم کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اگر کتاب کی تلخیص کی گئی ہے تو تلخیص کرنے والے کا نام بھی بتایا گیا ہے۔

-تاریخ تالیف یا عہد تالیف، ترجمہ کی صورت میں تاریخ ترجمہ، کہیں کہیں مادۂ تاریخ تالیف بھی،

-کتاب کا بنیادی موضوع، اگر کتاب غیر متعارف ہے تو اس کے دیباچے سے ماخوذ اس کا سبب تالیف اور ابواب و فصول (یا مؤلف نے جیسی بھی تقسیم کی ہو) کی تفصیل،

-''آغاز'' کے تحت کتاب کی ابتدائی سطور، اگر کتاب منظوم ہے تو اس کا مطلع۔

چونکہ یہ تمام کوائف اختصار کے ساتھ درج ہوئے ہیں، ان کے مؤلفین یا زیر بحث تصنیف کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے ہم نے دوسرے مآخذ کی طرف رجوع کرنے کے لیے کہا ہے۔ فہرست کے اندر ان مآخذ کا حوالہ ان کے مختصر نام کے ساتھ ہوا ہے، جب کہ مکمل کتابیات فہرست کے آخر میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ اِس وقت پاکستان میں فارسی مخطوطات کے جملہ کوائف کے لیے ایرانی فہرست نویس احمد منزوی کی فہرست مشترک نسخہ ہای خطّی فارسی پاکستان ایک طرح سے اُمّ الفہارس کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لیے ہم نے اپنی فہرست میں زیادہ تر اسی فہرست کا حوالہ دیا ہے۔ ذخیرۂ آزاد کے جو نسخے ڈاکٹر سید عبداللہ کی انگریزی فہرست (دو جلدیں) میں آگئے ہیں، صرف ان کی حد تک سید عبداللہ کی فہرست سے بھی رجوع کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ کہیں کہیں بعض کتابوں کی اشاعت کا ذکر بھی کر دیا ہے لیکن یہ التزام ہر کتاب کے بارے میں نہیں ہے، نہ اس کی ضرورت تھی۔ زیادہ تر غیر معروف کتابوں کی، یا غیر متعارف اشاعتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

حصّۂ ''کتاب شناسی'' یہاں پر ختم ہوجاتا ہے۔ حصّۂ ''نسخہ شناسی'' میں زیر بحث نسخے کے حسب ذیل پہلو واضح کیے گئے ہیں:

-تاریخ کتابت، جن نسخوں پر کتابت کی تاریخ درج نہیں ہے، تخمیناً کتابت کی صدی لکھ دی گئی ہے۔

-کاتب کا نام،

-مقام کتابت،

-خط

-تزئینات (لوح، جدول، تصاویر)

-تعداد اوراق

اس حصّے میں آپ کو ایک اور اہتمام بھی نظر آئے گا جو دیگر پاکستانی فہرستوں میں کم کم دیکھنے میں آیا ہے۔ ہم نے ہر نسخے کے ترقیمہ کی پوری عبارت، اس نسخے پر لگی مہروں کی عبارت اور مختلف یادداشتوں کو بلفظہٖ نقل کر دیا ہے۔

ترقیمہ

''ترقیمہ'' قلمی نسخے کا اہم جزو ہوتا ہے۔ ترقیمہ، متن کے اختتام پر اس دستخطی عبارت کو کہتے ہیں جو اس

نسخے کا کاتب اپنی طرف سے لکھتا ہے اور وہ عبارت کتاب کے متن کا حصہ نہیں ہوتی۔ ترقیمے میں درج باتوں کا دائرہ بہت وسیع ہوسکتا ہے لیکن عام طور پر اس میں کاتب کا نام اور تاریخ کتابت درج کیا جاتا ہے۔ بعض کاتب مقامِ کتابت اور جس شخص کے لیے نسخہ کتابت کیا گیا اس کا نام بھی درج کردیتے ہیں۔ میں نے اس فہرست میں نسخوں کے ترقیمے کی پوری عبارت بلفظہٖ درج کرنے کا التزام کیا ہے تاکہ اس میں درج اضافی معلومات بھی سامنے آجائیں۔ مثلاً شرف الدین یزدی کے ظفرنامہ (مخطوطہ Ape II 3) کا یہ ترقیمہ:

> بہ تاریخ پانزدہم ماہ متبارک ماہ رمضان روز یکشنبہ بہشتم؟ ۱۰۸۴ در شہور دارالضرب... بہ عہد... سلطان سکندر عادل شاہ... از ابتدا تا تسخیر آمل و ساری بر نسخہ [= از نسخۂ] شیخ باقر... [خالی جگہ] و از ساری و آمل تا بہ پایان بر نسخہ [= از نسخۂ] حکیم مظفر نبیرۂ حکیم ابوالفتح گیلانی کہ این نسخۂ مذکور ہم در یزد ثبت شدہ اند، ثبت نمود۔

اس ترقیمے میں جو اضافی معلومات آگئی ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ ایک، یہ کہ کاتب نے بتادیا ہے کہ اس نے اپنا نسخہ دو مختلف نسخوں سے نقل کیا ہے؛ دوسرا، یہ کہ وہ نسخے کس کی ملکیت تھے؛ تیسرا، یہ کہ وہ نسخے کہاں لکھے گئے تھے۔ یہ ضمنی معلومات بجائے خود اہمیت کی حامل ہیں۔ مثلاً ایک نسخہ کو حکیم مظفر نبیرۂ حکیم ابوالفتح گیلانی کی ملکیت بتایا گیا ہے۔ حکیم ابوالفتح گیلانی (م ۹۹۸ھ، مدفون حسن ابدال) اکبر کے دربار کے معروف طبیب تھے اور ان کا پورا خاندان صاحب حکمت و دانش تھا اور اس ترقیمہ سے بھی یہ بات سامنے آگئی کہ ان کا پوتا کتابوں کا شائق تھا۔ دونوں منقول عنہ نسخوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ یزد میں کتابت ہوئے تھے۔ یزد شرف نامہ کے مصنف کا وطن ہے۔ فن نسخہ شناسی میں ایسے نسخوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے جو مصنف کے مسکن یا مدفن میں بیٹھ کر لکھے جائیں، کیوں کہ احتمال یہ ہوتا ہے کہ کاتب کے پیش نظر نسخۂ مصنف یا مصنف کے عہد سے قریب تر کوئی نسخہ تھا۔

ظہریہ

''ظہریہ'' قلمی نسخے کے پہلے ورق کی پیشانی کو کہتے ہیں۔ یہ ورق اس لیے اہم ہوتا ہے کہ اس پر نسخے کے پرانے مالکان اور قارئین اپنا نام، مُہر اور کوئی بات (تاریخ، واقعہ، رائے) اختصار کے ساتھ لکھ دیتے ہیں۔ ہم نے یہ مہریں اور یادداشتیں بھی نقل کی ہیں کیوں کہ ان کا زیر بحث مخطوطہ سے گہرا تعلق ہے۔ اگر یہ مُہریں تاریخ کی اہم شخصیات کی ہیں تو ان کی اہمیت بالکل واضح ہے۔ بعض اوقات نسخہ کی تاریخ کتابت کی عدم موجودگی میں ان مُہروں میں کندہ سال، نسخہ کی قدامت تعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ان تمام مہروں کا ایک الگ اشاریہ آخر میں دیا گیا ہے

جو مہروں پر تحقیق کرنے والے محققین کے لیے کارآمد ہو سکتا ہے۔

یادداشتوں کے ضمن میں بھی نہ صرف ظہریہ پر درج ہونے والی یادداشتیں، بلکہ نسخے کے کسی بھی ورق یا حصے میں اگر کوئی اہم یادداشت درج ہوئی ہے تو اسے بتمام وکمال نقل کر دیا گیا ہے۔ ان یادداشتوں کے ذریعے سے ہمیں کئی ضمنی معلومات مل جاتی ہیں۔ بعض کا تعلق نسخے سے ہے۔ مثلاً نسخے کی کتابت وغیرہ کی اُجرت یا قیمت یا تقابل نسخ وغیرہ، جیسے مرج البحرین و جامع الطریقین کے ایک نسخے (Apc IV II) کے خاتمہ پر یہ یادداشت:

''تمام شد مقابله... روز پنجشنبه در ماه جماد الثانیه [کذا] ۱۱۴۴ھ برای خاطر مهربان میان مستقیم جیو به أجرتِ دوازده آنه بدون کاغذ نویسانده شد۔'' اس مختصر یادداشت میں نسخہ شناسی کے نقطۂ نظر سے کئی اہم باتیں موجود ہیں۔ نسخے کا مقابلہ کیا گیا، مقابلے کی تاریخ، جس کی خاطر یہ کام انجام دیا گیا، اس کی اجرت کی مقدار اور دل چسپ بات یہ کہ اس اجرت میں کاغذ شامل نہیں تھا! اس بات کا اظہار غالباً کاتب نے اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ پرانے زمانے میں جو افراد کسی سے نسخہ لکھواتے تھے وہ ساتھ کاغذ بھی مہیا کرتے تھے ۔ دوسری صورت میں اضافی اُجرت دینا پڑتی تھی۔

بعض یادداشتوں کا تعلق نسخوں کے اپنے موضوع سے ذرا ہٹ کر ہے۔ جیسے کسی تاریخی واقعہ کا بیان، کسی عزیز کی ولادت یا وفات کی تاریخ وغیرہ۔

جن نسخوں میں مختصر ''یادداشت'' نویسی کے ساتھ مفصّل ''ملحقات'' نویسی دیکھنے میں آئی ہے، ان کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ مثلاً طب کی ایک کتاب زاد المسافرین (Aph III 52) کے آخر میں کاتب نے طبّی یادداشتوں کے علاوہ ۱۳ ورق پر مشتمل تاریخی اور معاشرتی واقعات کا ایک ضمیمہ لگایا ہے۔ یہ تمام واقعات شیراز سے متعلق ہیں جو کاتب کے دور میں پیش آئے تھے۔ ان میں ایک اہم واقعہ ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء کے طاعون کا ہے۔ کاتب نے اس وبا سے شیراز میں ہلاکتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان ملحقات کی بنیاد پر ایک ایسا مقالہ تیار کیا جا سکتا ہے جس میں تیرہویں صدی ہجری میں شیراز کی تصویر پیش کی گئی ہو۔ گو اس نسخہ میں کاتب نے اپنا وطن نہیں لکھا، لیکن انھی ملحقات کے مضمون کی روشنی میں یقین سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ کاتب خود بھی شیراز کا رہنے والا تھا۔

طلب نمبر

ذخیرۂ آزاد کے قلمی نسخوں کا طلب نمبر / Call No ہر کتاب کے نام سے پہلے دیا گیا ہے۔ جو Ap سے شروع ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر اس نمبر کے نیچے بٹا لگا کر دوسرا نمبر بھی لکھا گیا ہے۔ وہ اس نسخے کا کتب خانے کے رجسٹر میں شمارۂ اندراج / Accesion No ہے۔ نسخہ طلب کرنے کے لیے صرف اوپر والے نمبر کا حوالہ دینا کافی

ہے۔ کسی کتاب کے ایک سے زائد نسخے ہونے کی صورت میں یہ طلب نمبر بجائے کتاب کے نام کے ابتدا میں دینے کے، حصہ نسخہ شناسی میں ہر نسخے کے تعارف سے پہلے دیا گیا ہے۔

فارسی مخطوطات کی اس فہرست کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ ایسے نسخوں کے تعارف پر مشتمل ہے جن میں ایک سے زائد کتابیں اور رسائل پائے جاتے ہیں۔ اسے فہرست نگاری کی اصطلاح میں ''فن مجامیع'' کہا گیا ہے۔ قلمی مجموعہ ہائے کتب ورسائل کی فہرست نویسی کا احسن طریقہ یہ ہے کہ مجموعے کو توڑا نہ جائے اور اسے یک جا فہرست کیا جائے۔ اس سے پورے مجموعے کی کیفیت ایک جگہ معلوم ہو جاتی ہے۔ البتہ کسی مشترک فہرست Union Catalogue/ میں روش اس کے برعکس ہوگی یعنی مجموعے کو توڑ کر ہر نسخے کا حال علیحدہ رقم کیا جائے گا۔

ہمارے ہاں مخطوطات کی فہرست نگاری کے کئی اسالیب رائج ہیں۔ توضیحی فہرست، جیسے مشفق خواجہ کی جائزہ مخطوطات اردو (جلد اول) یا قاضی عبدالنبی کوکب کی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نادر عربی مخطوطات کی فہرست مفصل؛ بنیادی معلومات کی حامل متوسط فہرست، جیسے ڈاکٹر سید عبداللہ کی دانشگاہ پنجاب میں فارسی، اردو اور عربی مخطوطات کی وضاحتی فہرست (بزبان انگریزی، محولہ بالا) یا دستی فہرست، جیسے ڈاکٹر محمد بشیر حسین کی فہرست مخطوطات شیرانی میں نے فہرست مخطوطاتِ آزاد میں درمیانی راستہ انتخاب کیا ہے۔ یعنی جو کتابیں پہلے فہارس میں بارہا متعارف ہو چکی ہیں، ان کے بارے میں تفصیل دینے سے گریز کیا ہے اور جو کتابیں پہلی بار متعارف ہوئی ہیں یا نسبتاً کم جانی جاتی ہیں، ان کے بنیادی کوائف درج کر دیے ہیں۔

ذخیرۂ آزاد کے بعض اہم مخطوطات

نسخوں کی اہمیت اور نُدرت کے تعین کے لیے اگرچہ کچھ ہمہ گیر اصول موجود ہیں، جیسے تاریخ کتابت کی قدامت، نسخہ کا بخط مؤلف ہونا، اس پر شاہی مواہیر کا ثبت ہونا، موضوع کا اہم ہونا، اس کتاب کے نسخے کم یاب ہونا، وغیرہ۔ بعض اوقات یہ معاملہ ذوقی بھی ہوتا ہے۔ کسی شخص کو اپنے ذوق اور مطلب کی کوئی چیز کہیں سے مل گئی، وہی اس کے لیے اہم اور نادر ہے۔ جیسے ذخیرۂ آزاد کی ایک بیاض (Ape III 4) جو میرے لیے اس لیے اہم ہے کہ اس میں ''نوشہ'' تخلص والا کلام اور نوشاہی بزرگوں کی تواریخ وفات درج ہیں۔ لیکن تیرھویں صدی ہجری کی لکھی ہوئی یہ بیاض ممکن ہے کسی دوسرے شخص کے لیے اتنی اہم نہ ہو۔ پھر بھی مندرجہ ذیل نسخوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ قابل توجہ ہیں:

اہم موضوعات پر کتب

-جنّت الولایت اورمطلع الولایت (Apf II 15)، ہندوستان میں مہدوی تحریک کے بانی اور مہدی موعود ہونے کے مدّعی سیّد محمد بن یوسف جونپوری (۸۴۷-۹۰۱ھ) کے حالات پر دو نادر رسالے ہیں۔

-رسالہ در احوال ابوعلی سینا (Aph I 1)، حکیم بوعلی سینا کے حالات پر بہت کم مستقل رسائل لکھے گئے ہیں۔ یہ انھی کم یاب تصانیف میں سے ایک ہے۔ اس میں بوعلی سینا کے فارسی کلام کا نمونہ بھی ہے۔

کسی معاشرے میں دینی، مذہبی اور مسلکی اقلیتیں جب مل جل کر رہتی ہیں تو ان کے اعتقادات اور نظریات میں اختلافات کا کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہونا فطری امر ہے۔ ان اختلافات کا اظہار اور مخالفین کو ''راہ راست'' پر لانے کے لیے مسلم معاشروں میں مناظروں اور ردّیہ نویسی کی روایت بہت مستحکم رہی ہے۔ ہمارے ادب کی تاریخ ردّیات سے بھری پڑی ہے۔ ذخیرۂ آزاد میں مخطوطات کی تعداد کم ہونے کے باوجود، ردّیات پر چند اچھے رسالے موجود ہیں۔ شاید مولانا آزاد کو اس موضوع سے دل چسپی تھی۔ حسب ذیل رسائل کی طرف اشارہ کافی ہے:

-ترجمۂ حجة الهند (Apc II 5)، ہندومت کے ردّ میں اس رسالے کی خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان کے دیہات میں مسلمان، ہندو معاشرت کی وجہ سے جن بدعات اور توہمات کا شکار ہو گئے تھے، ان کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے۔

-ردّ رسالۂ ارمنی از طرف نصاریٰ (Apc III 37)، عیسائیوں کے دو فرقوں کے اختلافات پر مبنی ہے۔

-ردّ المکاتیب (Apc III 17)، ہندوستان میں شیعہ سنّی تنازعات کے تناظر میں ہے۔

جب ہندوستان میں عیسائی مشنریاں فعّال ہوئیں تو مسلمان علما اور مسیحی پادریوں کے درمیان کئی مناظرے ہوئے اور ایک دوسرے کے ردّ میں کتابیں لکھی گئیں۔ تیرہویں صدی ہجری میں پادری فنڈر اس سلسلے میں پیش پیش تھا۔ رسالہ کشف الاستار عن وجوه الاسرار (Apc II 2)، ہمارے ہاں کے شیعہ علما کی طرف سے پادری فنڈر کے ردّ پر مبنی ہے۔

ایران میں صفوی حکومت اگرچہ خود ایک صوفی، صفی الدین اردبیلی سے منسوب ہے، لیکن وہاں تشیّع کو مملکت کا رسمی مذہب قرار دینے کے بعد تصوّف گریز رجحانات دیکھنے کو ملتے ہیں اور کئی ایرانی شیعہ علما نے ردِ تصوف پر کتابیں لکھی ہیں۔ ایسے ہی چند رسالے ذخیرۂ آزاد میں موجود ہیں جو یقیناً آزاد ایران سے لائے ہوں گے۔ اصول فصول التوضیح (Apc III 26A)، اعلام المحبین (Apc III 19A) اور سلوة الشیعة و قوة الشریعة (Apc III 26) ردّ تصوّف پر ایرانی نقطۂ نظر کے حامل رسائل ہیں۔

خود تصوف کی حمایت میں ذخیرۂ آزاد میں کئی اچھے مخطوطات موجود ہیں۔ آزاد اوران کا خاندان دہلی والے تھے۔ وہاں کے خواجہ محمد ناصر عندلیب (م۱۱۷۲ھ) اور خواجہ میر درد (م۱۱۹۹ھ) کے مشربِ تصوف پر انھوں نے چند ایک اچھے رسائل اپنے ذخیرہ میں جمع کیے ہیں۔ خود میر درد کے رسائل آہ سرد (Apc IV 16 V.2) اور نالۂ درد (Apc IV 16) کے علاوہ ایک کتاب چراغ ہدایت (Aph III 68) بھی اسی خاندان تصوف اور طریقۂ محمدیہ سے وابستہ ایک مرید کی تصنیف ہے جس میں اٹھارہویں صدی عیسوی میں دہلی کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے بارے میں چشم دید باتیں لکھی گئی ہیں۔

لسانیات پر سراج الدین علی خان آرزو کی وقیع تصنیف مثمر (Api II 15) کا واحد قلمی نسخہ اسی ذخیرے کی زینت ہے۔

قواعد زبان پر شاہ محمد ہانسوی کی کتاب مجمع الالفاظ (Api II 11) کا ذکر عام طور پر اس فن کی معروف کتابیات میں نہیں ملتا۔ یہ بھی نادر کا حکم رکھتی ہے۔

علم ہیئت پر ایک کتاب بدایع الخیال فی اثبات قاعدۃ القوم من المحال (Aph II 4) کا نسخہ، تیرہویں صدی ہجری کی ایک ایسی تصنیف ہے جب زمین کے سکون کا نظریہ عام تھا، لیکن ایک مسلمان سائنس دان نے زمین کی حرکت کے اثبات پر یہ رسالہ لکھا ہے۔

علم جفر سے وابستہ لاہور کے ایک خاندان کی تین پشتوں کی تصانیف بھی اس ذخیرے میں ہیں۔ جن کا ذکر اپنے مقام پر ہوا ہے۔

آزاد کو صوفیہ، شعرا، امرا کے تذکرے جمع کرنے کا خاص شغف رہا ہے۔ اس ذخیرے میں ان تینوں طبقات کے تذکرے موجود ہیں۔ شعرا کے جو تذکرے اس مجموعے میں موجود ہیں ان میں سے اب کوئی ایسا نہیں ہے جو شائع نہ ہو چکا ہو۔ لیکن سوائے مجموعۂ نغز (Apf I 18) کے نسخے کے، جو حافظ محمود شیرانی نے اپنی تدوین میں استعمال کیا تھا، دیگر تذکروں کی اشاعت میں آزاد کے کسی نسخہ کو استعمال نہیں کیا گیا۔

ذخیرۂ آزاد کا حصۂ تاریخ بھی تذکروں کی طرح بھرپور ہے۔ اگرچہ بیشتر کتابوں کے نسخے عام ملتے ہیں لیکن یہ سب امہات کتب ہیں۔ پنجاب کی تاریخ کے حوالے سے تاریخ بہاول خان (Ape II 15)، تاریخ پنجاب بوٹے شاہ (Ape II 8)، ظفر نامۂ رنجیت سنگھ (Ape II 32) قابل ذکر ہیں۔

قدیم نسخے بہ لحاظ تاریخ کتابت

مجموعی طور پر ذخیرۂ آزاد میں قدیم تاریخ کتابت کے حامل نسخے بہت کم ہیں۔ زیادہ تر نسخے دسویں صدی

ہجری کے بعد کے ہیں۔ صرف ایک نسخہ ایسا ہے جس کا ذکر ضرور ہونا چاہیے۔ حدائق الانوار فی حقائق الاسرار / جامع العلوم / ستینی (Aph I 2)، اگر چہ یہ نسخہ ناقص ہونے کے باعث تاریخ کتابت کا حامل نہیں ہے، لیکن رسم الخط سے صاف معلوم ہے کہ ساتویں یا آٹھویں صدی ہجری میں کتابت ہوا ہے۔ میرے خیال میں یہ ذخیرۂ آزاد کا قدیم ترین مخطوطہ ہے جو مولانا ایران یا وسطی ایشیا سے لائے ہوں گے۔

باتصاویر نسخے

-ترجمۂ عجائب المخلوقات و غرایب الموجودات (Aph III 19)

-معلومات الآفاق (Apg 2)

-احوال قواعد صاحبانِ انگریز (Aph III 40)

آزاد کے خاندان، بخط آزاد یا آزاد کی یادداشتوں والے نسخے

-ردّ المکاتیب (Apc III 17)، آزاد کے والد کو پیش کیا گیا۔

-چراغ ہدایت (Api I 10)، آزاد کے حواشی،

-فرہنگ رشیدی (Api I 7)، آزاد کی یادداشت،

-نوادر الالفاظ (Api I 11)، آزاد کے حواشی،

-تذکرۂ نشترعشق جلد اول (Apf I 15 V.1)، ورق ۲۲۹ب، آزاد کی یادداشت، جس میں انھوں نے اپنے سفر ایران (۱۳۰۳ھ) کا ذکر کیا ہے۔

-بیان واقع (Apf IV 6)، بخط آزاد

آزاد کی درسی کتب کا جائزہ

ڈاکٹر انجم رحمانی

(۱)

اس مختصر مقالے کا بنیادی مقصد محمد حسین آزاد کی ان کتب کی نشاندہی کرنا نیز ان کی خصوصیات کا جائزہ لینا ہے جو پنجاب کے تعلیمی اداروں میں بطور درسی کتب رائج رہیں۔

موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد کے تعلیمی اور کیریئر کے پس منظر کا مختصر جائزہ لیا جائے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ درسی کتب کی تصنیف و تالیف کے لیے وہ کہاں تک ماہر تھے۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے مولوی محمد حسین دہلی کالج سے اپنی تعلیم مکمل کر کے دہلی ہی میں اردو کے ایک اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب دہلی پر حکومت برطانیہ کا قبضہ ہو گیا تو مولوی محمد حسین روپوش ہو کر پہلے لکھنؤ اور بمبئی پہنچے اور پھر وہاں سے پھرتے پھراتے ۱۸۵۹ء میں سنگرور ریاست جیند (مشرقی پنجاب) میں آ کر مقیم ہو گئے اور بحیثیت محافظ دفتر فوجداری میں ملازمت اختیار کر لی۔ جگراؤں کے نامور شیعہ عالم سید رجب علی شاہ ارسطو جاہ کو جب مولوی محمد حسین کے جیند میں قیام کا پتہ چلا تو وہ وہاں آ کر انھیں لودھیانہ لے گئے اور اپنے اخبار مجمع البحرین کا ایڈیٹر اور پریس کا منتظم مقرر کر دیا۔ اسی زمانے میں پنجاب ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشنز پنجاب مسٹر فلر جگراؤں مولوی رجب علی سے خصوصی طور پر ملنے گئے تو مولوی ارسطو جاہ نے مولوی محمد حسین کا تعارف ان سے کرا دیا۔

۱۸۶۱ء میں مولوی محمد حسین لاہور چلے آئے۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد سیالکوٹ گئے اور وہاں سے سیاحت کشمیر پر چلے گئے۔ کشمیر سے واپس آ کر دوبارہ سیالکوٹ آ کر کچھ عرصہ کے لیے یہاں کتابوں کا کاروبار کیا۔ پھر لاہور چلے آئے اور مولوی ارسطو جاہ رجب علی شاہ میر منشی حکومت پنجاب کے دفتر میں فارسی کے فرمان نویس مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۱ء میں جنرل پوسٹ ماسٹر (لاہور) کے آفس میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ ۱۱ جولائی ۱۸۶۱ء کو باقاعدہ طور پر بہ

مشاہرہ تیس روپے ماہوار ڈیڈ لیٹر آفس میں ملازم ہوگئے۔ دسمبر ۱۸۶۲ء میں ملتان لائن پر بحیثیت اوورسیئر تبادلہ ہوا تو ملازمت سے استعفیٰ دے کر لاہور رہنا پسند کیا۔ ۱۲۷ کتوبر ۱۸۶۲ء میں پوسٹ ماسٹر جنرل پنجاب نے انھیں ڈائریکٹر تعلیمات کپتان فُلر کے نام تعارفی خط لکھ دیا۔ ۱۸۶۴ء میں معمولی سی ملازمت مل گئی۔ ۱۸۶۵ء میں پولیٹیکل مشن پر سنٹرل ایشیا گئے۔ ۱۸۶۷ء میں وہاں سوا سال قیام کے بعد واپس لاہور آئے تو اسی سال کلکتہ کا سفر کیا۔

اگر ہم یوں کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ مولانا محمد حسین آزاد محکمہ تعلیم میں آنے سے پہلے عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ نیز تحریر وادارت کا بھی کچھ تجربہ تھا۔ اسی طرح تصنیف وتألیف کا سلسلہ بھی جاری کر چکے تھے۔ ۱۸۶۱ء میں ان کی پہلی کتاب آئینہ صحت اور ۱۸۶۴ء میں دوسری کتاب نصیحت کا کرن پھول مکمل کر چکے تھے۔

(۲)

پنجاب پر حکومت برطانیہ نے اپنا اقتدار (۱۸۴۹ء) قائم کرنے کے بعد پنجاب میں محکمہ تعلیم ۱۸۵۶ء میں قائم کیا۔ مسٹر آرنلڈ اس محکمہ کے پہلے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشنز مقرر ہوئے جو ۱۸۵۹ء تک اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ اپنی ملازمت کے اس مختصر عرصہ کے دورانیے میں انھوں نے محکمہ تعلیم کے انتظامی ڈھانچے اور دوسری بنیادی ضرورتوں کے قیام کے لیے کام کیا۔ ۱۸۵۷ء میں پنجاب میں تعلیم کے نام سے انگریزی میں ایک رپورٹ مرتب کی جس میں اپنی حکومت کی پنجاب کے لیے آئندہ حکمت عملی کا عندیہ دیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی وجہ سے پنجاب میں ان کی تعلیمی سرگرمیاں یقیناً متاثر ہوئیں۔ لہٰذا وہ پنجاب میں نصاب اور درسیات کی تشکیل کے لیے کماحقہٗ توجہ نہ دے سکے۔

۱۸۵۹ء میں کیپٹن فُلر پنجاب کے نئے ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشنز مقرر ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے کام چلانے کے لیے برطانیہ کے زیر اقتدار باقی ہندوستان میں پڑھائی جانے والی بعض کتب کو پنجاب کے مدارس کے لیے نصابی کتب کا درجہ دے دیا۔ ۱۸۶۸ء میں کیپٹن فُلر راولپنڈی کے قریب ایک نالے میں ڈوب کر مر گئے تو کیپٹن ہالرائیڈ ان کی جگہ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشنز پنجاب مقرر ہوئے جو ۱۸۶۴ء تک اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی ملازمت کے آغاز میں پنجاب کے تعلیمی اداروں کے لیے خصوصی درسی کتب تیار کروانے کا تہیہ کیا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ماہرین مضامین پر مشتمل ایک کمیٹی بھی بنائی جس کا سربراہ اس وقت کے محکمہ تعلیم پنجاب کے راولپنڈی سرکل کے انسپکٹر مسٹر پیئرسن (Pearson) کو مقرر کیا۔ پیئرسن خود فارسی میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ اس عرصہ میں لاہور میں پیارے لال آشوب، مولوی عبدالکریم، مولوی محمد حسین جیسے اردو سے پیار کرنے والے لوگ موجود تھے۔

جون ۱۸۶۸ء میں کیپٹن ہالرائیڈ مری میں گرمیاں گزارنے کے سلسلے میں مقیم تھے۔ اسی دوران میں انھوں

نے مولوی محمد حسین کو مری بلایا اور اپنے منصوبے کے بارے میں مشورہ کیا۔ چنانچہ طے پایا کہ پہلے مرحلے میں پنجاب کے مدارس کے لیے درسیات کے سلسلے میں ہندوستان کی اردو میں ایک تاریخ لکھوائی جائے، نیز برنارڈ سمتھ کی انگریزی کتاب حساب(Arithmetic) کا زبدۃ الحساب کے نام سے اردو ترجمہ اور اردو کی پہلی کتاب کی حک واصلاح وغیرہ کرائی جائے۔ چنانچہ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے انھوں نے مولوی محمد حسین کو پیئرسن کے معاون کے طور پر کام کرنے کے لیے تیار کرلیا۔ اپنے منصوبے کو پایا تکمیل تک پہنچانے کے لیے اس سلسلے میں ۱۱ جولائی ۱۸۶۸ء کو حکومت پنجاب کے حکام بالا کو درج ذیل خط لکھا:

I have the honour to solicit the sanction of Government to appointment on special duty on a salary of Rs. 75/- p.m. of Maulavi Muhammad Husain whose name and qualifications you lately brought to my notice, for the purpose of assisting Mr. Pearson in the preparation of a new History of India, and in the revision of the *Zubdat-ul-Hisab* or translation of Bernard Smiths' *Arithmetic* which contains many faults in language and idiom, and for the compilation under my direction of an improved first Urdu Book and for such other works of similar kind as it may be found most advantageous to employ him. His salary can be paid out of the assignment for the 'Patronage of literature', and I anticipate great benefit from his assistance in the improvement of vernacular school literature.[1]

حکومت پنجاب نے اس تجویز کو منظور کر کے مسٹر کیپٹن ہالرائیڈ کو مورخہ ۱۱ جولائی ۱۸۶۸ء کو مطلع کیا:

Convey his honourable Lft. Governor's sanction to the employment of Maulavi Muhammad Husain on a salary of rupees 75/- p.m. to assist Mr. Pearson in preparing a new history of India and other works resumed for the Educational

Department. The expenditure will be charged out of the grant for the Patronage of literature.(۲)

گویا مذکورہ بالا سرکاری دستاویزات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مولوی محمد حسین درسی کتب کی تیاری کے خصوصی منصوبے کے سلسلے میں جولائی ۱۸۶۸ء میں محکمہ تعلیم سے منسلک ہوئے۔

(۳)

کیپٹن ہالرائیڈ نے محکمہ تعلیم حکومت پنجاب کو ۲۶ اکتوبر ۱۸۶۷ء کو ایک دوسرا خط لکھا جس میں غالباً مولوی محمد حسین کی تنخواہ کی ادائیگی کے لیے فنڈ کی مد کے سلسلے میں تجویز بھیجی جسے حکومت نے منظور کر کے اس بارے میں ہالرائیڈ کو ۱۱ نومبر ۱۸۶۹ء کو مطلع کیا:

With reference to previous correspondence and with G.O. No. 438 dated: 26 October 1868 (Regular) subject of Society of Punjab of P.A. at the usual rate Maulavi Muhammad Husain who is specialized in preparation Urdu book etc. be charged to the grant for 'Patronage of literature from which his salary is paid.(۴)

جیسا کہ مذکورہ بالا بیان کردہ حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی محمد حسین کا محکمہ تعلیم سے منسلک ہونے سے پہلے تدریس کا کوئی تجربہ نہ تھا اور نہ تدریس کے لیے ان کے پاس کوئی پیشہ وارانہ قابلیت تھی۔ تاہم یوں لگتا ہے کہ بچوں کے لیے کتابیں لکھنے کی صلاحیت ان میں فطری تھی۔ نیز وہ بچوں کی تعلیمی نفسیات کے بھی بخوبی ماہر تھے۔ چنانچہ ان کے خیال میں بچوں کی کتابیں لکھنے کے لیے استاد کو ذہنی طور پر بچوں کی سطح پر جانا پڑتا ہے اور اپنے اوپر وہی بچپنے کی کیفیت طاری کرنا پڑتی ہے۔ جیسا کہ وہ رقم طراز ہیں:

بڑا حصہ عمر گراں کا سر رشتہ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے انھوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ پھر انھیں بار بار کاٹنا اور بنانا، لکھنا اور مٹانا بڈھا ہو کر بچہ بننا پڑا۔ پھرتے چلتے جاگتے سوتے بچوں ہی کے خیالات میں رہا۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے جب وہ

بچوں کے کھلونے تیار ہوئے۔ (۵)

ان کے نزدیک بچوں کی درسی کتب میں انداز بیان کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

ابتدائی کتابوں میں انداز بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اسے بچوں کے لیے عام فہم ہونا چاہیے۔ (۶)

بعض حوالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرورِ ایام کے ساتھ مولوی محمد حسین بچوں کی درسی کتب کے ماہر ہو گئے تھے اور اس سلسلے میں ان کی رائے کو فائق سمجھا جاتا تھا۔ اس بات کا اندازہ مولوی محمد حسین کے درج ذیل خط بنام ڈاکٹر لائٹنر سے بخوبی ہوتا ہے:

اس کتاب کو میں نے اکثر جگہ دیکھا۔ بچوں کے مناسب حال ہے اور دیہاتی مدارس میں پڑھانے کے لیے خوب ہے۔ اگر چاہیں تو بعض جگہ توضیح کر کے دلچسپ کر سکتے ہیں۔ مثلاً

ملتان کی چھینٹ ایک زمانے میں اور شہروں میں جا کر اشرفی گز بکا کرتی تھی۔ اس کی آب و ہوا کو رنگ کی شوخی اور پختگی میں قدرتی تاثیر ہے۔ انگریزی چھینٹوں کے آنے سے وہاں کے کارخانے بند ہو گئے۔ مینا کاری کا کام بھی بہ نسبت اور شہروں کے اچھا ہوتا ہے۔ البتہ کشمیر کے برابر رنگ میں تیزی نہیں۔ شہر ملتان بہ سبب راہ گذار کے ہندوستان اور خراسان کی منڈی ہے۔ لیکن پشاور سے دوسرے درجہ پر۔ امیر تیمور اس رستے ہندوستان آیا تھا۔ اور بادشاہ بھی اسی رستے سے گزرتے رہے ہیں۔ (۷)

طریقہ تعلیم کی کتابیں اردو میں پہلے بھی دیکھی ہیں جو بات اس کتاب میں ہے کسی اور کتاب میں نہیں۔ مصنف نے مطالب کو خوبی سے ادا کیا۔ طرز ادا سہولت کے خط میں لیا ہے اور انہیں دلچسپ بنا دیا ہے۔ انگریزی میں پہلے بھی جا بجا جاری تھیں مگر جو لوگ اس سے بے بہرہ تھے وہ پوچھ پوچھ کر ترجمے کرتے پھرتے تھے۔ اب اردو ہو گئی۔ گویا ہر شخص کے حصے میں آ گئی۔ عبارت سلیس ہے اور الفاظ آسان سہولت سے مطلب سناتے ہیں اور طریقہ سمجھاتے ہیں۔ (۸)

مولوی محمد حسین تدریس کے دوران میں درسی کتب کے معائب و محاسن سے بخوبی واقف ہو گئے تھے اور ان کی نظر میں ایک درسی کتاب خصوصی خوبیوں کی حامل ہوتی ہے جیسا کہ ان کے درج ذیل بیان سے ظاہر ہوتا ہے:

آپ دیکھتے ہیں یہ علم کی چڑیل (پنجاب یونیورسٹی) تعلیم پنجاب کو ہضم کیے جاتی ہے کالج کا بھی کلیجا کھا چکی ہے چند مہینے میں سن لیجیے گا کہ نگل گئی۔ باوجود اس کے کورس بنانے کے لیے ہم پکڑے جاتے ہیں۔ فرسٹ آرٹ اور بی۔ اے کورس عربی و فارسی کے باب میں رائے طلب ہوئی۔ اب بنانے کے لیے حکم ہے کہ جلدی دو .... اگرچہ کورس کا جھگڑا پیچھے تک گیا ہے مگر میں مصروف کار ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ طبیعت محنت پسند واقع ہوئی ہے۔ انتخاب میں آسان بات یہ ہے کہ کتاب اٹھائی، لکھ دیا کہ فلاں صفحے سے فلاں صفحے تک، مگر

اسے دل پسند نہیں کرتا۔ جی چاہتا ہے ایسا انتخاب ہو کہ طلبا کے لیے مفید تعلیم بھی ہو اور پڑھنا اس کا ہر شخص کے لیے باعث شگفتگی ہو۔ البتہ اس میں محنت بہت ہے۔ بس اس وقت اتنا ہی کافی ہے۔[۹]

(۴)

اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ مولوی محمد حسین کی درسی کتب کی فہرست کیا ہے؟ ان میں سے ہر ایک درسی کتاب کس سطح تعلیم پر پڑھائی جاتی رہی اور کس عرصہ کے لیے؟ یہ چند ایسے بنیادی سوال ہیں جن کے حتمی جواب دینا ہمارے بس میں نہیں۔ اس مشکل صورتِ حال کی کئی وجوہ ہیں۔ اول پنجاب آرکائیوز اور محکمہ تعلیم کے ریکارڈ کا نامکمل اور غیر مرتب ہونا، دوسرے قومی لائبریریوں میں اس سلسلہ کے ریکارڈ کا موجود نہ ہونا۔ اگر کچھ موجود ہے تو وہ عام طور دیمک زدہ ہے یا پھر اس قدر شکستہ و دریدہ ہے کہ استعمال کے قابل نہیں۔ تیسرے خود سلسلہ وار درسی کتب کا مکمل طور پر دستیاب نہ ہونا۔ یاد رہے کہ ایسی کتابوں کا ایک معقول ذخیرہ برطانوی دور میں قائم ہونے والی پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے پاس موجود تھا جو ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ پنجاب کے موجودہ ٹیکسٹ بک بورڈ کو منتقل کر دیا گیا۔ لیکن افسوس کہ ادارے کے افسران بالا نے اس کی اہمیت کو نہ سمجھا اور اسے ردی میں فروخت کرا دیا۔ اس طرح محققین درسی کتب کی تاریخ لکھنے سے ہمیشہ کے لیے قاصر ہو گئے۔

البتہ مولوی محمد حسین کی درسی کتب کے بکھرے بکھرے ایڈیشن پنجاب کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔ پھر اس سلسلے میں تھوڑی بہت معلومات حکومت پنجاب کے گزٹ اور حکومت پنجاب کی تعلیمی رپورٹوں سے بھی مل جاتی ہیں۔ اسی طرح کچھ قلمی ریکارڈ پنجاب آرکائیوز میں بھی موجود ہے۔ تاہم اس تمام ریکارڈ کے مطالعہ کے بعد بھی مولوی محمد حسین کی درسی کتب کی مکمل تفصیلات مرتب نہیں ہو پاتی۔ اس صورتِ حال میں بعض محققین نے تخمین وظن سے مولوی محمد حسین کی درسی کتب کی ایک فہرست مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد اسلم فرخی کی کوشش نمایاں ہے۔ انھوں نے مولوی محمد حسین کی کتب کو ''تعلیمی کتب'' کا عنوان دے کر درج ذیل فہرست[۱۰] بنائی ہے:

(۱) اُردو کی پہلی کتاب (سلسلۂ قدیم)۔

(۲) اُردو کی دوسری کتاب (سلسلۂ قدیم)۔

(۳) فارسی کی پہلی کتاب۔ ۱۸۷۰ء میں لکھی گئی۔

(۴) فارسی کی دوسری کتاب۔ ۱۸۷۰ء میں لکھی گئی۔

(۵) اُردو کی پہلی کتاب۔

(۶) اُردو کی دوسری کتاب۔

(۷) اُردو کی تیسری کتاب۔
(۸) اُردو کی چوتھی کتاب۔
(۹) قصص ہند حصہ دوم۔۱۸۶۹ء میں لکھی گئی اور ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی۔
(۱۰) Translation of Arabic Entrance Course
(۱۱) جامع القواعد فارسی ۱۸۸۴ء۔

لیکن ان کے نزدیک یہ فہرست مکمل نہیں ہے لہٰذا وہ درج ذیل کتب کا مذکورہ بالا فہرست [۱۱] میں اضافہ کرتے ہیں:

(۱) آئینہ صحت۔۱۸۶۱ء میں لکھی گئی۔
(۲) نصیحت کا کرن پھول۔۱۸۶۴ء میں لکھی گئی۔
(۳) فارسی قواعد۔۱۸۶۹ء میں حکومت نے اس پر دوسو روپے کا انعام دیا۔
(۴) اُردو قواعد۔
(۵) قند پارسی۔۸۱-۱۸۸۰ء میں لکھی گئی۔
(۶) قواعد فارسی برائے مڈل۔۸۰-۱۸۷۹ء میں لکھی گئی۔
(۷) آموز گار پارسی۔
(۸) کائنات عرب۔ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔
(۹) تذکرۂ علماء ہند۔ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔
(۱۰) حکایت آزاد۔۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔
(۱۱) شہزادہ ابراہیم کی کہانی۔
(۱۲) لغت آزاد ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کی یہ فہرست کہاں تک مستند اور حتمی ہے اس کے بارے میں ہم آئندہ صفحات پر اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔البتہ مختلف منابع سے جو معلومات دستیاب ہوتی ہیں، ان کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولوی محمد حسین آزاد کی درسی کتب پنجاب میں پرائمری سطح کے تعلیمی اداروں سے لے کر یونیورسٹی کی تعلیمی سطح تک پڑھائی جاتی رہیں۔ ان کی ایسی درسی کتب زیادہ تر اردو اور فارسی نصابات میں شامل رہیں۔

پیشہ وارانہ نظر سے دیکھا جائے تو مولانا کی درسی کتب کو دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔اول قسم کی وہ کتابیں ہیں جو بطور خصوصی درسی کتب کے لکھی گئیں۔مثلاً اردو کی پہلی اور دوسری کتابیں اور فارسی کی پہلی اور دوسری کتابیں

وغیرہ۔ دوسری قسم کی کتابیں وہ ہیں جو انھوں نے اپنی ذاتی دلچسپی سے لکھیں لیکن بعد میں انھیں مختلف کورس کے لیے بطور درسی کتب اختیار کرلیا گیا۔ مثلاً سخندان فارس، آب حیات وغیرہ۔ علاوہ ازیں بعض ایسی درسی کتب بھی ہیں جن کے مصنف تو دوسرے لوگ تھے مگر مولوی محمد حسین نے ان کی حک و اصلاح کی۔ مثلاً اردو کی پہلی کتاب، قدیم سلسلہ، زبدۃ الحساب وغیرہ۔

یہاں ہم محمد حسین آزاد کی مختلف زبانوں میں لکھی گئی درسی کتب کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں۔

(۵)

فارسی درسی کتب

ڈاکٹر محمد اسلم فرخی کی مذکورہ بالا فہرست میں مولوی محمد حسین کی درج ذیل کتب کو فارسی درسیات میں شامل کیا گیا ہے۔

(۱) فارسی کی پہلی کتاب
(۲) فارسی کی دوسری کتاب
(۳) جامع القواعد فارسی
(۴) فارسی قواعد
(۵) قندِ پارسی
(۶) قواعد فارسی برائے مڈل
(۷) آموز گار پارسی

فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب

حکومت پنجاب کے سررشتہ تعلیم کی سالانہ کارکردگی کی تعلیمی رپورٹ برائے سال ۷۰-۱۸۶۹ء میں درج ہے کہ دوران سال فارسی کی پہلی اور دوسری کتابیں جلی رسم الخط میں طبع ہوئی ہیں اور یہ سال گذشتہ میں طبع ہونے والی اردو کی پہلی اور دوسری ریڈرز کی طرح صاف ستھری چھپی ہیں۔ اس سلسلے میں رپورٹ کی اصل عبارت یہ ہے:

The first and second Persian books are neatly printed in large characters and correspond with the first and second Urdu books which were published last year. [۱۲]

تاہم رپورٹ میں ان کتابوں کے مصنفین کا نام نہیں بتایا گیا۔

حکومت پنجاب کی تعلیمی رپورٹ برائے سال ۷۲-۱۸۷۱ء میں لکھا ہے کہ دوران سال فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب کے ری پرنٹ ایڈیشنوں کی فروخت سے حکومت پنجاب کو بالترتیب ۱۶۷۰۲ روپے اور ۱۲۹۳۵ روپے آمدنی ہوئی۔ (۱۳)

اس رپورٹ میں بھی ان دونوں کتابوں کے مصنفین کے نام نہیں بتائے گئے۔

حکومت پنجاب کی ایک سرکاری دستاویز سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں مولوی محمد حسین کی لکھی ہوئی تھیں اور ۷۰-۱۸۶۹ء سال کے دورانیے میں طبع ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کی اشاعت کے بعد کیپٹن ایم ڈبلیو ہالرائیڈ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشنز پنجاب نے ٹی۔ ایچ تھارنٹن سیکرٹری ٹو دی گورنمنٹ آف پنجاب کو ستمبر ۱۸۷۰ء میں ایک خط لکھا جس میں مولوی محمد حسین کو ان کتابوں کے بطور معاوضہ (Remuneration) ۴۰۰ روپے دینے کی منظوری کی درخواست کی۔ اس سلسلے کا نوٹ درج ذیل ہے:

I beg to state that the works of suitable elementary Persian books for beginners was long felt. The undersigned, therefore, employed Maulavi Muhammad Husain, . . . Pro. of Arabic, Government College, Lahore in the preparation of the first and second Persian books. The former contains short and easy sentences illustrating the grammatical construction and the idioms of the language and latter amusing little stories.

These books have a large sale, six thousand copies of the first book and . . . of 3500 of the second have been soled during the last six months.

I recommend a grant out of the current years assignment from 'Patronage of literature' of rupees 400 to the Maulavi of the both works. (۱۴)

مندرجہ بالا حقائق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب مولوی محمد حسین نے ۱۸۶۸ء کے اختتام یا ۱۸۶۹ء کے اوائل میں پایۂ تکمیل کو پہنچائیں جو اسی سال کے دوران میں طبع ہو کر بطور درسی کتب فروخت ہوئیں۔

(۱)فارسی کی پہلی کتاب

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ یہ کتاب ۱۸۶۸ء کے اواخر یا ۱۸۶۹ء کے اوائل میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور ۷۰-۱۸۶۹ء سال کے دوران میں طبع ہو کر مدارس میں پڑھائی جانے لگی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے ابتدائی ایڈیشنوں پر مولوی محمد حسین کا نام بطور مصنف موجود نہیں جیسا کہ اس کتاب کا ۱۸۷۱ء کا ایڈیشن ہماری نظر سے گذرا ہے۔ یہ کتاب چوتھی بار طبع ہوئی ہے۔ اس پر مولانا کا نام نہیں ہے۔ اس کے سرورق کی عبارت یہ ہے:

فارسی کی پہلی کتاب پنجاب کے سررشتۂ تعلیم میں تالیف ہو کر لاہور کے مطبع سرکاری میں چھاپی گئی ۱۸۷۱ء۔

لیکن جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں یہ انھی کی تصنیف ہے۔

فارسی کی پہلی کتاب کا اکیسواں ایڈیشن بھی ہماری نظر سے گزرا ہے جو ۱۸۷۵ء میں طبع ہوا۔ البتہ اس پر مولوی صاحب کا نام بطور مرتب موجود ہے۔ اس کے سرورق کی عبارت یہ ہے:

فارسی کی پہلی کتاب جس کو مولوی محمد حسین اسسٹنٹ پروفیسر عربی کالج لاہور نے مرتب کیا۔ حسب الحکم جناب میجر ہالرائیڈ صاحب بہادر ڈائریکٹر مدارس ممالک پنجاب وغیرہ۔ لاہور کے سرکاری مطبع میں ماسٹر پیارے لال کیوریٹر کے اہتمام سے چھپی۔

مذکورہ بالا دونوں ایڈیشنوں کے متن میں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

بقول ہالرائیڈ اس کتاب میں فارسی زبان کے مختصر اور آسان جملے درج ہیں جو کہ فارسی زبان کی گرامر کی ساخت اور محاورات کی تشریح کرتے ہیں۔ (۱۵)

(۲)فارسی کی دوسری کتاب

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ یہ کتاب ۱۸۶۸ء کے اواخر یا ۱۸۶۹ء کے اوائل میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور ۷۰-۱۸۶۹ء سال کے دوران میں طبع ہو کر مدارس میں پڑھائی جانے لگی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے ابتدائی ایڈیشنوں پر مولوی محمد حسین کا نام بطور مصنف موجود نہیں جیسا کہ اس کتاب کا ۱۸۷۰ء کا ایڈیشن ہماری نظر سے گذرا ہے۔ اس کے سرورق عبارت یوں ہے:

فارسی کی دوسری کتاب پنجاب کے سررشتۂ تعلیم میں تالیف ہو کر لاہور کے مطبع سرکاری میں چھاپی گئی۔ ۱۸۷۰ء۔ اسے سررشتہ کی بے اجازت کوئی نہ چھاپے۔

لیکن جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں یہ بھی مولوی محمد حسین کی تصنیف ہے۔

اس کتاب کا ۱۸۷۸ء میں چھپنے والا ایک ایڈیشن بھی ہماری نظر سے گزرا جس پر مولوی محمد حسین کا نام بطور مصنف موجود ہے۔ اس کے سرورق کی عبارت یہ ہے:

فارسی کی دوسری کتاب جس کو مولوی محمد حسین اسسٹنٹ پروفیسر عربی کالج لاہور نے مرتب کیا حسب الحکم جناب میجر ہالرائیڈ صاحب بہادر ڈائریکٹر مدارس ممالک پنجاب وغیرہ، لاہور کے سرکاری مطبع میں ماسٹر پیارے لال کیوریٹر کے اہتمام سے چھپی۔

اس کتاب میں دلچسپ لطائف اور کہانیاں درج ہیں۔ ابتدا میں درج لطائف کی تعداد ۶۲ ہے اور آخر میں بابر، ہمایوں اور اکبر وغیرہ کے حالات فارسی زبان میں درج ہیں۔ (۱۶)

(۳) قواعد فارسی

مولوی محمد حسین آزاد نے یہ کتاب کس کے ایماء پر لکھی، اس بارے میں تفصیل نہیں ملتی۔ مگر بعض شواہد کی بنا پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۸۶۸ء کے بعد کسی وقت لکھی گئی۔ اس بات کا ثبوت اس کے اس قلمی نسخے سے ملتا ہے جو مولانا محمد حسین آزاد کے اخلاف کے ذخیرہ میں موجود ہے۔ اس نسخے کے سرورق پر انگریزی میں پرشین گرامر لکھا ہے اور اس کے نیچے بطور مصنف 'مولوی محمد حسین سب ایڈیٹر سرکاری اخبار' لکھا ہوا ہے۔ نام کے نیچے ۱۳ اپریل ۱۸۶۹ء کی تاریخ درج ہے۔ سرورق کے ایک کونے پر لکھا ہوا ہے: 'انعام پایا'۔ (۱۷)

لگتا ہے کہ مولوی مرحوم نے یہ کتاب حکومت پنجاب کے اس اشتہار کے نتیجے میں لکھی ہوگی جو حکومت پنجاب نے شائع کروایا تھا اور عمدہ کتاب پر انعام کا وعدہ کیا تھا۔ پہلا انعام ایک ہزار روپیہ اور دوسرا انعام تین سو روپے تھا۔ (۱۸)

مولانا حالی نے بھی اس اشتہار کے جواب میں فارسی کی ایک قواعد لکھی جس کا دیباچہ اتفاق سے موجود ہے۔ اس دیباچہ میں اس سلسلے میں بعض مفید معلومات ملتی ہیں۔ دیباچہ کی عبارت یہ ہے:

"۔ ۔ ۔ ۔ اور ایک اشتہار گورنمنٹ پنجاب دام اقبالہ برائے ۱۸۶۸ء میں بوعدہ انعام جاری فرمایا ہے اس کا عمدہ مطلب یہ ہے کہ زبانِ فارسی کے اصول اردو زبان میں بعبارت روشن و واضح بیان کیے جائیں۔ اس لیے خاکسار هیچ مدان الطاف حسین انصاری پانی پتی خدا تعالیٰ کے بھروسے پر اس امر کا متصدی ہوا۔ ہر چند مجھ کو اپنی بے بضاعتی اور ہیچ مدانی سے توقع نہیں کہ میری تالیف گورنمنٹ دام اقبالہ میں پسندیدہ اور مقبول ٹھہرے۔" (۱۹)

مولانا کے اخلاف کے پاس محفوظ مسودے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ یہ کتاب ۱۸۷ صفحات پر مشتمل تھی۔ (۲۰)

(۴) جامع القواعد فارسی

اس کتاب کا موضوع فارسی زبان کی گرامر تھا اور زیور طبع سے بھی آراستہ ہوئی تھی۔ بعض محققین کا خیال ہے

کہ یہ کتاب قواعد فارسی کا اختصار ہے جو فارسی کے ابتدائی کورسز کے طلباء کو پڑھائی جاتی تھی۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ہماری نظر سے گزرا جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے سرورق کی عبارت درج ذیل ہے:

مولوی محمد حسین نے یہ کتاب سررشتہ تعلیم پنجاب کے ڈائریکٹر کرنل ہالرائیڈ کے حکم سے لکھی۔ جسے مولوی محمد حسین آزاد پروفیسر گورنمنٹ کالج، لاہور نے مدارس وسطیٰ واعلیٰ کے واسطے تصنیف کیا اور نیو امپیریل پریس، لاہور میں سید رجب علی شاہ پروپرائٹر و منیجر کے اہتمام سے چھپی: ۱۸۸۵ء اور انگریزی میں اس ایڈیشن پر پرشین گرامر فار مڈل اینڈ ہائی سکولز کی عبارت بھی درج ہے۔

اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ جامع القواعد کو پہلے ہائی اور مڈل سکولوں کے لیے لکھا گیا تھا مگر بعد میں اسے صرف ہائی سکولوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔

جامع القواعد کا نواں ایڈیشن بھی ہماری نظر سے گزرا ہے جسے ۱۸۹۸ء میں دو ہزار کی تعداد میں چھاپا گیا اور اس کے سرورق پر یہ عبارت تھی:

نو ترمیم فارسی کی جامع القواعد جس کو سررشتہ تعلیم پنجاب کے صاحب ڈائریکٹر بہادر کے حکم سے مولوی محمد حسین آزاد شمس العلما نے مدارس اعلیٰ کے واسطے تصنیف کیا اور رائے بہادر منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز گورنمنٹ پبلشرز سررشتۂ تعلیم پنجاب نے اپنے مطبع مفید عام میں چھاپا۔

جامع القواعد کا یہ نسخہ پنجاب پبلک لائبریری میں محفوظ ہے اور اس کے سرورق کی عبارت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ہائی سکولوں کے لیے ہے۔

۱۸۹۸ء کا ترمیمی ایڈیشن ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے جبکہ پہلے ایڈیشن کے ۲۰۲ صفحات ہیں اور اس کی قیمت ۷ آنے ۶ پائی ہے۔ جبکہ نو ترمیم ایڈیشن کی قیمت ۵ آنے ۴ پائی ہے۔ دونوں ایڈیشنوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایڈیشنوں میں بہت کم فرق ہے۔ مثال کے طور پر نو ترمیم ایڈیشن سے ص ۱۵۳ تا ۱۵۶ حذف کر دیئے گئے ہیں، ورنہ دونوں ایڈیشنوں کی عبارت میں بھی سر مو فرق نہیں ہے۔ ایک اور فرق یہ ہے کہ پہلے ایڈیشن میں مضامین کی فہرست نہیں ہے جبکہ ۱۸۹۸ء والے ایڈیشن میں چار صفحات پر مشتمل مضامین کی فہرست کا اضافہ ہے۔ [۲۰ الف]

(۵) قند پارسی

قند پارسی مولانا کے صاحبزادے محمد ابراہیم صاحب نے مرتب کر کے طبع کرائی تھی۔ اگرچہ یہ مولوی محمد حسین کی زندگی میں شائع ہوئی مگر مولانا اس وقت دماغی توازن کھو چکے تھے۔ اس کا ۱۹۰۷ء کا ایڈیشن ہماری نظر سے گزرا ہے۔ اسے نول کشور پرنٹنگ ورکس لاہور نے چھاپا تھا۔ جس کا عنوان قند پارسی یعنی روزمرہ گفتگو ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے اس کتاب کو مولوی محمد حسین آزاد کی درسی کتب میں شامل کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ۸۱-۱۸۸۰ء کے عرصہ میں طبع ہوئی مگر یہ نہیں بتایا کہ یہ کتاب کس جماعت کے طلبا کے لیے تھی۔ یہ کتاب فارسی روزمرہ گفتگو پر مشتمل ہے۔

(۶) آموزگار پارسی

یہ کتاب کن مدارس یا کس درجے کے طلبا کو پڑھائی جاتی تھی اس بارے میں نہ تو ڈاکٹر محمد اسلم فرخی نے کچھ ذکر کیا ہے اور نہ اس کا کوئی نسخہ دستیاب ہوا ہے جس کی بنا پر اس بارے میں یہ کہا جا سکے یہ واقعی پنجاب میں پڑھائی جانے والی فارسی کی درسیات شامل تھی۔

(۷-۸) آب حیات و نیرنگ خیال

یہ دونوں کتابیں ۱۸۸۳ء میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات کے نصاب میں شامل کر لی گئی تھیں۔ اور ٹریننگ کالج اور نارمل سکولوں میں زیر تربیت اساتذہ کو پڑھائی جاتی تھیں۔ [۲۱]

(۹) سخن دان فارس

یہ کتاب مولانا محمد حسین آزاد کے لیکچروں کا مجموعہ ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ لیکچر کن لوگوں کو دیے گئے۔ ممکن ہے کہ مولانا نے فارسی کے طلبا کے لیے تیار کیے ہوں۔ بعد میں ٹریننگ کالج کے پرنسپل کے ایماء پر نظر ثانی کی تھی تاکہ انھیں فارسی کے نصاب کے طور پر پڑھایا جائے۔

مولوی محمد حسین اپنے ایک خط میں میجر سید حسن بلگرامی کو ۲۵ مارچ ۱۸۸۴ء کو لکھتے ہیں:

> ...مجھے ایک اور مشکل پیش آئی۔ صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج نے فرمایا کہ آب حیات اور نیرنگ خیال کو ہم نے اپنے کالج اور نارمل سکولوں کی پڑھائی میں داخل کر دیا ہے۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ جس طرح اس میں تاریخ زبان اردو کی آپ نے لکھی ہے ایسی ہی تاریخ اور تحقیق زبان فارسی کی ہو کہ اسے فارسی کے کورس میں داخل کریں۔ میں نے عرض کی کہ زبان فارسی میں دس لیکچر میرے لکھے ہوئے رکھے ہیں۔ اس میں زبان فارسی، نثر فارسی، نظم فارسی پر بھی ایک ایک لیکچر ہے۔ پوچھا تیار ہے میں نے کہا سب تیار ہیں۔ تجویز مناسب یہ معلوم ہوئی کہ میں انھیں چھپوا دوں۔ تقریباً تین سو صفحہ سے زیادہ کی کتاب ہوگی۔ قیمت میں کم رکھوں گا۔ ہر طالب علم لے سکے گا۔ صاحب اپنے سکیم میں لکھ دیں کہ فلاں کتاب میں سے فلاں فلاں لیکچر طلبا بھی دیکھ لیں۔ یہ لیکچر میں نے ۱۸۷۴ء میں دیے تھے۔ ان پر بھی نظر ثانی واجب ہے۔ [۲۲]

مگر سخندان فارس کے مطبوعہ نسخہ میں ان کے لکھے جانے کی تاریخ یکم اکتوبر ۱۸۷۲ء دی ہوئی ہے دیباچے میں بھی لکھا ہے کہ یہ لیکچر پندرہ برس سے پڑے ہیں۔ دیباچہ ۵ اگست ۱۸۸۷ء کو لکھا گیا۔ اس سے ۱۸۷۲ء کا

سنہ برآمد ہوتا ہے۔ خط لکھتے ہوئے غالباً اندازے سے ۱۸۷۴ء لکھا گیا جو درست نہیں ہے۔ اسی طرح خط میں انھوں نے لیکچروں کی تعداد صرف دس بتائی ہے۔ استقلال پریس اور مکتبہ ادب اردو لاہور کے مطبوعہ نسخوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں تین لیکچر ہیں اور دوسرے حصہ میں گیارہ۔ غالباً دوسرے حصہ کا حوالہ خط میں دیا گیا ہے جس میں بعد میں ایک لیکچر کا اضافہ کر دیا گیا۔ سخندان فارس کا ۱۹۰۷ء کا نسخہ جسے رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور نے چھاپا۔ یہ بھی دو حصوں میں ہے۔ دوسرے حصہ میں گیارہ لیکچر ہی ہیں مگر پہلے حصہ کو ایک دو یا تین لیکچروں میں تقسیم نہیں کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظر ثانی کے وقت پہلا حصہ اور گیارہواں لیکچر اس میں بڑھا دیے گئے تھے۔

اُردو کی درسی کتب

ڈاکٹر محمد اسلم فرخی نے اپنی مذکورہ بالا فہرست میں مولوی محمد حسین آزاد کی اردو کی درج ذیل درسی کتب گنوائی ہیں:

(۱) اردو کی پہلی کتاب (قدیم سلسلہ)

(۲) اردو کی دوسری کتاب (قدیم سلسلہ)

(۳) اردو کی پہلی کتاب

(۴) اردو کی دوسری کتاب

(۵) اردو کی تیسری کتاب

(۶) اردو کی چوتھی کتاب

(۷) قصص ہند (حصہ دوم)

(۸) اردو قواعد

اردو ریڈریں

اردو کی مذکورہ بالا ریڈروں کا سب سے پہلے جائزہ اسد اریب نے اپنے پی۔ ایچ ڈی کے مقالے بعنوان بچوں کا ادب میں لیا جو انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے لیے لکھا اور انھوں نے مذکورہ بالا ریڈروں کو مولانا محمد حسین آزاد کی تصانیف قرار دیا اور ان پر یہ تبصرہ کیا:

اس سلسلے کی چند کتابوں پر مصنف کا نام نہیں۔ بعض ایسی ہیں جن پر نظر ثانی محکمہ تعلیم کے افسران بالا کے نام سے کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں اردو کی پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں کتاب زیادہ اہم ہیں۔ کل یہ آٹھ کتابیں ہیں۔ ان میں سے بعض کتابیں مولانا آزاد کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک خیال یہ بھی عام ہے کہ مولانا آزاد نے انھیں نہیں لکھا حال آنکہ ان میں آزاد کی تحریر صاف صاف نظر آتی ہے۔ اور وہ اسلوب جس

کی تقلید اگلے پچھلے لوگوں میں سے کوئی نہ کر سکا بالکل نمایاں ہے۔ مصنف مذکور کے نبیرہ محمد باقر نے وہ مسودے دکھائے جن کی مدد سے تعلیم المبتدی کا سلسلہ مشہور ہے۔ ان کتابوں کے تمام سبق ان مسودوں سے منطبق ہیں جو آغا صاحب محمد باقر نے پیش کیے۔ واقعات اسباق میں دیکھے گئے۔ صاحب موصوف محمد باقر کی لائبریری میں جا کر خود میں نے مذکورہ مسودات کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ تعلیم المبتدی کا سلسلہ مولانا آزاد کا ہی لکھا ہوا ہے۔ وہ ساری نظمیں جو ان کتابوں میں درج ہیں مولانا آزاد کی تصنیف کردہ ہیں۔ اور ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔ مولانا آزاد کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مسودہ جو اردو کی دوسری کتاب کا ہے۔ میں نے بچشم خود دیکھا۔ اس میں مصنف نے کہا ہے ''ہم پہلے حصے میں کہہ آئے ہیں'' جو کچھ کہہ آئے ہیں وہ لفظ بہ لفظ پہلے حصے میں موجود ہے۔ مصنف ایک جگہ لکھتا ہے وہ ہم آیندہ جلد میں اس بات کا ذکر کریں گے، وہ ذکر تعلیم المتبدی کی آیندہ جلد میں موجود ہے۔

ڈاکٹر اسدا ریب نے گویا اردو کی آٹھ ریڈریں بتائی ہیں جن میں سے بعض کے مصنف بقول ان کے مولوی محمد حسین تھے۔ لیکن انھوں نے اس سلسلے میں محمد حسین آزاد کی لکھی ہوئی ریڈروں کی نشاندہی نہیں کی۔ اسدا ریب کا یہ بیان کہ انھوں نے مولانا کا دوسری جماعت کا مسودہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جو بقول ان کے محمد حسین آزاد کی تصنیف ہے۔ محمد حسین آزاد کی لائبریری میں مسودات کی موجودگی اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ کتابیں بھی محمد حسین آزاد کی تھیں۔ مزید برآں ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے کہ انھوں نے محمد باقر کی لائبریری میں موجود مسودات کا تعلیم المبتدی کے سلسلے کی ریڈروں سے مقابلہ کیا ہے ان کے تمام سبق ان مسودوں سے منطبق ہیں لیکن ڈاکٹر حسن اختر کے بقول تعلیم المبتدی کے سلسلے کے ریڈروں کی تصنیف کا محمد حسین آزاد سے کچھ تعلق نہ تھا بلکہ یہ ایک نیا سلسلہ تھا جو کہ کرنل ہالرائیڈ نے مصنفین کے گروپوں سے لکھوائے تھے اور جن پر یہ الفاظ درج تھا: With the aid of native scholars

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ مسودے محمد حسین آزاد کی کتابوں کے نہیں تو یہ ان کے پاس کیونکر آئے۔ اس سلسلے میں ہماری رائے یہ ہے کہ تعلیم المبتدی سلسلے کی ریڈروں کے مصنف چونکہ مختلف لوگ تھے اور عین ممکن ہے کہ محمد حسین آزاد اس گروپ میں نمایاں مرتب ہوں یا مصلح ہوں لہٰذا یہ مسودے طباعت کے بعد انھی کے پاس رہ گئے ہوں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ محمد حسین آزاد کی اردو ریڈروں کا ایک قدیم سلسلہ اُردو کی پہلی اور دوسری کتب پر مشتمل تھا۔ جبکہ دوسرا اُردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتابوں پر مشتمل تھا اور اس سلسلے کو انھوں نے سلسلہ جدید کے نام سے مخصوص کیا ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

آزاد کی تعلیمی تصانیف میں دوسرا قابل ذکر سلسلہ اردو کی کتابوں کا ہے۔ آزاد نے اردو کی کتابوں کے دو سلسلے مرتب کیے تھے۔قدیم اور جدید۔ سلسلہ قدیم پہلی اور دوسری کتاب پر مشتمل تھا۔اس سلسلے کی کوئی کتاب اب دستیاب نہیں ہوتی۔ ان کا تذکرہ محکمہ تعلیمات پنجاب کی دستاویز مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۸۸۵ء میں ملتا ہے۔ سلسلۂ جدید پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتابوں پر مشتمل تھا۔ آغا محمد باقر کے بقول یہ کتابیں ۱۸۶۷ء سے لے کر ۱۸۶۹ء تک کے زمانے میں مرتب ہوئی تھیں۔لیکن آزاد کے ساتھ سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ یہ کتابیں ان کے نام کی بجائے ناظم تعلیمات کرنل ہالرائیڈ کے نام سے شائع ہوئیں۔ اس کے باوجود ان کتابوں کو آزاد کی تصنیف ماننے میں کبھی شبہ نہیں کیا گیا۔

پھر موصوف تاریخ گورنمنٹ کالج کے مولف پروفیسر گیرٹ کا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ:

تاریخ گورنمنٹ کالج لاہور کے یہ جملے اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں کہ ''پروفیسر صاحب (آزاد) کا ایک مضحکہ خیز پہلو بھی ہے جسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ چغہ پہنا کرتے تھے جس کی ایک آستین خالی رہتی تھی اور ان کے پاس سواری کے لیے ایک گھوڑا ہمیشہ ان کے پیچھے پیچھے آتا۔ یہی اردو پرائمر میں مولوی صاحب کا گھوڑا تھا۔ اس بیان سے واضح ہے کہ ہالرائیڈ کے نام کے باوجود لوگ ان کتابوں کو آزاد کی تصنیف سمجھتے تھے۔ قصص ہند کی طرح ان کتابوں نے بھی آزاد کی شہرت میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔ آزاد کی یہ کتابیں ہر اعتبار سے اہم تعلیمی کارنامہ کہلانے کی مستحق ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسلم فرخی نے مولانا آزاد پر اپنا پی۔ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھنے کے بعد اردو کی پہلی کتاب کے نام سے پہلی سے چوتھی کتاب کو ۱۹۶۳ء میں شائع کر دیا اور انھیں بلا تحقیق مولانا آزاد کی تصنیف قرار دیا۔ اس اشاعت میں ڈاکٹر اسلم فرخی نے اردو کی پہلی کتاب کے پیش لفظ میں دوبارہ ان چاروں کتابوں کو مولانا آزاد کی تصانیف قرار دیا۔ ڈاکٹر فرخی کی رائے سے متاثر ہو کر اردو کے مشہور محقق ممتاز حسن نے لکھا :

اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب محمد حسین آزاد کی اہم ترین تصانیف میں سے ہیں۔ اگر چہ میں نے ذاتی طور پر اس بات کی تحقیق نہیں کی لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ یہ اردو زبان کی سب سے پہلی درسی کتابیں ہیں جو ابتدائی مدارس کے لیے لکھی گئیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو اردو کی پہلی کتاب کو اردو کی پہلی درسی کتاب کہنا صحیح ہوگا۔

ممتاز حسن کے اس بیان پر ڈاکٹر حسن اختر نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

ممتاز حسن صاحب کا یہ قیاس غلط ہے کہ مولانا آزاد کی کتابیں اردو کی پہلی درسی کتب ہیں۔ بلکہ ان کا یہ قیاس بھی غلط ہے کہ جو کتابیں ڈاکٹر صاحب نے مرتب کی ہیں وہ مولانا آزاد ہی کی لکھی ہوئی ہیں۔ مولانا آزاد

نے درسی کتاب لکھی تھیں مگر وہ اور تھیں اور ان کو ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنی تعلیمی کتابوں کی فہرست میں سلسلہ قدیم کی کتب قرار دیا ہے۔ اسلم فرخی صاحب نے چونکہ سلسلہ قدیم کی کتب نہیں دیکھی تھیں اس لیے انھوں نے جو کتابیں شائع کی ہیں ان کو ہی سلسلہ قدیم کی کتب سمجھ لیا حال آنکہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ آزاد کی اصل کتب ان کی نظر سے نہ گزرنے کی وجہ سے انھیں کئی مغالطے ہوئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ تحریر فرمادیا کہ اردو کی پہلی دوسری تیسری اور چوتھی کتاب درسیات میں اولیت کا شرف رکھتی ہیں۔ اردو کی ان سے پہلے کی ایک درسی کتاب دستیاب ہوئی ہے یہ میجر فلر کی مرتب کروائی ہوئی ہے اور اس پر مصنف کا نام موجود نہیں ہے۔ تسہیل التعلیم کے سرورق کی عبارت ہم نقل کر چکے ہیں یہ پرائمری جماعتوں کے لیے لکھوائی گئی تھی۔ اور اس میں اردو کا قاعدہ بھی شامل ہے۔ شروع میں حروف تہجی سے شروع ہونے والی اشیا یا اشخاص کی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ پہلا سبق حروف تہجی سے شروع ہوتا ہے پھر حروف وصفی ہیں یعنی بھ، پھ وغیرہ پھر۔ حروف تہجی درہم برہم یعنی حروف کو آگے پیچھے بالترتیب لکھا ہے اس کے بعد حرکتیں با اعراب، حروف تہجی متحرک اور الفاظ کے جوڑے ہیں۔ یہ سب کچھ اکیس اسباق میں بیان ہوا ہے بائیسویں سبق سے دو حرفی جملے شروع ہوتے ہیں۔ تیسویں سبق میں چھ حرفی جملے بنائے ہیں۔ اس کے بعد گھوڑے، گائے، بھیڑ، بکری، اور ہرن کے بارے میں اسباق ہیں۔ آخر میں خوش خطی کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔

اردو کی پہلی کتاب

ڈاکٹر اسلم فرخی کا یہ دعویٰ کہ اردو ریڈروں کے قدیم سلسلے کی پہلی اور دوسری کتاب مولوی محمد حسین کی تصنیف تھی، ہمارا اس سے اتفاق نہیں۔ بلکہ قدیم وجدید کی یہ تقسیم دلیل کم نظری ہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہماری نظر میں کچھ اردو ریڈریں کیپٹن فلر کے زمانے ہی سے بطور درسی کتب رائج تھیں جس کا اشارہ ہمیں مولوی محمد حسین کی تقرری کے سلسلے میں جاری کیے جانے والا مذکورہ بالا ۱۱ جولائی ۱۸۶۸ء کے خط میں ملتا ہے۔ اس خط کے مطابق مولوی محمد حسین کو جہاں ہندوستان کی اردو میں تاریخ لکھنے اور زبدۃ الحساب کے نام سے اردو ترجمہ کی اصلاح کرنا تھا وہاں انھیں اردو کی پہلی کتاب کی حک و اصلاح میں مسٹر پیئرسن کی معاونت کرنا تھا۔ ظاہر ہے اردو کی یہ پہلی کتاب مولانا محمد حسین کی ہرگز نہ تو تصنیف تھی اور نہ تالیف۔

کیپٹن ہالرائیڈ نے مولوی محمد حسین کی تنخواہ وغیرہ کی ادائیگی کے سلسلے میں حکومت پنجاب کو ۲۶ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۴۳۸ کوئی تجویز بھجوائی جس کے جواب میں محکمہ تعلیم حکومت پنجاب نے درج ذیل منظوری عطا فرمائی:

With reference to previous correspondence and with G.O. No.

438 dated: 26 October 1868 (Regular) subject of Society of Punjab of P.A. at the usual rate Maulavi Muhammad Husain who specialized in preparation [of] Urdu book etc. be charged to the grant for patronage of literature from which his salary is paid..

چنانچہ ہالرائیڈ کی سرپرستی میں مسٹر پیئرسن کی ذاتی نگرانی میں اس منصوبے پر تیزی سے کام ہونے لگا۔ اسی اثناء میں ہالرائیڈ نے متوقع تاخیر کو پیش نظر رکھتے ہوئے محکمہ تعلیم پنجاب کے حکام کو ایک سرکلر کے ذریعے درج ذیل ہدایات جاری کیں:

جن حلقوں میں اردو رائج ہے وہاں بدستور فارسی کی تعلیم رائج رکھی جائے۔ یہ ایک غور طلب مسئلہ ہے۔ ابتداء میں فارسی بطور ایک مضمون کے پڑھائی جاتی تھی اور اسے لوگ پسند کرتے ہیں اس لیے میرے خیال میں اب بھی جہاں انگریزی تعلیم کا نفاذ نہیں ہوا یہ زبان بے حد مقبول ہے۔ اس کو ختم کرنے سے تعلیم کی تمام مقبولیت خصوصاً مسلمانوں میں ختم ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں فیصلہ کرنے سے قبل کل صوبہ میں علاقائی جذبات کا بہت احتیاط سے جائزہ لیا جائے اور اس وقت تک کوئی تعلیمی تبدیلی نہ کی جائے جب تک متعدد اردو ریڈریں مکمل نہ ہو پائیں۔

بظاہر اس سلسلے کی تیاری کا آغاز ۱۸۶۸ء میں ہو گیا تھا لیکن یہ منصوبہ کب اور کتنے عرصہ میں پایہ تکمیل کو پہنچا اس بارے میں معلومات تشنہ طلب ہیں۔ تاہم جیسا کہ اوپر ڈاکٹر محمد اسلم فرخی نے بیان کیا ہے کہ مولوی محمد آزاد کے پوتے آغا محمد باقر کے بقول یہ کتابیں ۱۸۶۷ء سے لے کر ۱۸۶۹ء تک کے زمانے میں تیار ہوئیں۔ ہماری نظر میں یہ رائے درست نہیں۔ کیونکہ ظاہراً ان کی تیاری کا آغاز کم از کم ۲۶ اکتوبر ۱۸۶۸ء کے بعد ہوا جبکہ مولوی محمد حسین کو اس خصوصی کام کو مکمل کرنے کے لیے دوبارہ ملازم رکھا گیا۔

مولوی محمد حسین کی اصلاح کردہ انھی اردو کی پہلی اور دوسری ریڈروں کے پہلے ایڈیشن ۶۹-۱۸۶۸ء میں چھپ کر منظر عام پر آ گئے۔ جیسا کہ حکومت پنجاب کی تعلیمی رپورٹ برائے سال ۶۹-۱۸۶۸ء کے درج ذیل بیان سے ظاہر ہوتا ہے:

(1) During the year 53,335 vernacular books of the value of Rs. 9,523 were lithographed. Amongst these were two new books, the "Urdu-ki-pahli Kitab" in 3 parts, and the "Urdu-ki-dusri

Kitab." 'Education Report for year 1868-69.) (p. 49)

(2) During the year two new books, the "Urdu-ki-pahli Kitab" and the "Urdu-ki-dusri Kitab,"" have been brought out; and the "Zubdat-ul-Hisab," a "School Arithmetic," has been thoroughly revised, and is now in the press. (p. 50)

اسی طرح حکومت پنجاب محکمہ تعلیم کی ایجوکیشن رپورٹ برائے سال ۷۲-۱۸۷۱ء سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سال گذشتہ میں شائع ہونے والی اردو کی پہلی، دوسری اور تیسری کتابوں کے ری پرنٹ ایڈیشن بھی منظر عام پر آ گئے تھے جو بحوالہ مذکورہ رپورٹ سال کے دوران میں بھاری رقوم پر فروخت ہوئے۔ اس سلسلے میں رپورٹ کا متن درج ذیل ہے:

Of the reprints of this year, valued at Rs. 20,261-7-9 the following are the most important.

Urdu I Book	26,991
Urdu II Book	14,650
Urdu III Book	14,194
Farsi I Book	16,702
Farsi II Book	12,935
Qawaid Urdu	7,505

مذکورہ بالا دونوں سالوں کی رپورٹوں میں اردو کی پہلی اور دوسری کتابوں کے مولفین یا مصنفین کے ناموں کا تذکرہ موجود نہیں اور نہ ان کے ابتدائی مطبوعہ ایڈیشنوں پر کسی مصنف کا نام موجود ہے۔ تعلیمی رپورٹ میں انھیں اردو کی نئی کتابوں (نیو بکس آف اردو) کہہ کر متعارف کرایا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۶۹-۱۸۶۸ء کے عرصہ میں ان دونوں کتابوں کے پہلے ایڈیشن مولوی محمد حسین کی حک و اصلاح کے بعد شائع ہوئے تھے اور کیپٹن فلر کے زمانے کی روایت کے مطابق ان پر مولوی محمد حسین کا نام بطور مصلحت درج نہ کیا گیا۔

پنجاب گزٹ برائے سال ۷۵-۱۸۷۴ء سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اردو کی اس پہلی کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۵ مئی ۱۸۶۹ء کو اشاعت کے بعد فروخت کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ رپورٹ میں اسے فرسٹ بک اور اردو کہا گیا ہے جو کہ ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف پنجاب کی طرف سے لاہور سے گورنمنٹ ایجوکیشنل پریس سے طبع ہوئی تھی۔

اس کے صفحات کی تعداد ۳۲ سائز Vo8 تعداد ۴۷۰۰ اور قیمت ۲ آنے ۶ پائی تھی۔ اس رپورٹ میں بھی مصنف کا نام ظاہر نہیں لکھا گیا۔

اردو کی اس پہلی کتاب کا چوتھا ایڈیشن ۹ ستمبر ۱۸۶۹ء کو طباعت کے بعد فروخت کے لیے جاری کیا گیا۔ یہ ریڈر بھی پنجاب ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے گورنمنٹ ایجوکیشنل پریس پنجاب لاہور سے ۴۷۹۵ کی تعداد میں شائع ہوئی تھی۔ 8VO سائز میں لیتھوگراف میں چھپے ہوئے اس قاعدے کی قیمت ۲ آنے ۶ پائی تھی۔ فہرست میں مصنف کا نام نہیں کیا گیا۔

اس کتاب کا پانچواں ایڈیشن ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ حکومت پنجاب کی طرف سے اشاعت کے بعد ۱۸ جنوری ۱۸۷۰ء کو فروخت کے لیے جاری کیا گیا۔ ۳۸ صفحات پر مشتمل یہ ریڈر ۴۷۰۰ کی تعداد میں شائع ہوئی۔ لیتھو گراف میں شائع ہونے والی اس کتاب کی قیمت ۲ آنے ۶ پائی تھی۔ گزٹ میں اس کتاب کے مصنف کا نام رپورٹ نہیں کیا گیا۔

اردو کی پہلی کتاب کا چوبیسواں ایڈیشن ہم نے دیکھا ہے یہ ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔ اس پر مولانا کا نام نہیں ہے اور نہ کرنل ہالرائیڈ کا نام ہے اس کے سرورق کی عبارت یہ ہے:

اردو کی پہلی کتاب۔ سررشتہ تعلیم میں تالیف ہوکر لاہور کے سرکاری مطبع میں چھپی۔

اسی طرح ۱۸۷۵ء کے اردو کی پہلی کتاب کے ایڈیشن پر مولانا کا نام موجود ہے۔ یہ کتاب کا چونتیسواں ایڈیشن ہے اور اس کے سرورق کی عبارت یہ ہے:

اردو کی پہلی کتاب — جس کو مولوی محمد حسین اسسٹنٹ پروفیسر عربی کالج لاہور نے مرتب کیا حسب الحکم جناب میجر ہالرائیڈ صاحب بہادر ڈائریکٹر مدارس ممالک پنجاب وغیرہ ترمیم ہوکر لاہور کے سرکاری مطبع میں ماسٹر پیارے لال قائمقام کیوریٹر کے اہتمام سے چھپی۔

پنجاب میں رجسٹر کی گئی کتابوں کی فہرست (ضمیمہ پنجاب گورنمنٹ گزٹ ۱۱ مارچ ۱۸۷۵ء) میں اُردو کی پہلی کتاب مطبع سرکاری سے ۲۰ مارچ ۱۸۷۴ء کو جاری ہوئی۔ فہرست میں مولانا کا نام بطور مصنف دیا ہے۔

اس کتاب کا چھیالیسواں ایڈیشن بھی دستیاب ہے جو ۱۸۷۶ء میں چھپا۔ اس پر بھی مولانا آزاد کا نام موجود ہے۔ یہ ۱۸۷۵ء اور ۱۸۷۶ء والے ایڈیشن ۱۸۷۳ء والے ایڈیشن سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ ۱۸۷۳ء والی کتاب میں پہلے اُردو کا قاعدہ ہے۔ اُردو کا قاعدہ پانچ اسباق پر مشتمل ہے۔ تین اسباق اور ہیں جن میں سہ حرفی لفظ دیے ہیں۔ نواں سبق وہی ہے جو ۱۸۷۵ء کی کتاب میں پہلا سبق ہے۔ ۱۸۷۳ء کے ایک سبق میں بعض جگہ ۱۸۷۶ء والی کتاب کے دو سبق سمو دیے ہیں۔ بہرحال باقی کتاب میں اختلاف نہیں ہے سوائے اس کے کہ ۱۸۷۳ء کی درسی کتاب میں سترہ

لطیفے ہیں جبکہ ۱۸۷۵ء کی کتاب میں کچھ ترمیم ۱۸۷۴ء میں بھی کی گئی کیونکہ اس اشاعت کے سرورق پر ''بعد ترمیم سرکاری مطبع میں چھپی'' لکھا ہے۔ ۱۸۷۴ء کی اشاعت پر بھی مولانا کا نام نہیں ہے لہٰذا یہ طے ہو جاتا ہے کہ ہالرائیڈ نے نصابی کتابوں پر مصنفین کے نام لکھنے کا سلسلہ اس کے بعد شروع کیا۔

اردو کی دوسری کتاب

اردو کی دوسری کتاب کا تیسرا ایڈیشن فروری ۱۸۷۰ء میں فروخت کے لیے جاری کیا گیا۔ ۴۷۸۵ کی تعداد میں یہ کتاب ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ محکمہ تعلیم حکومت پنجاب کی طرف سے لیتھوگراف میں طبع ہوئی جس کی قیمت ۲ آنے ۶ پائی تھی۔ مگر اس ایڈیشن پر بھی مصنف کا نام موجود نہیں۔

اردو کی دوسری کتاب کے دو نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں جو ۱۸۷۲ء اور ۱۸۷۳ء میں طبع ہوئے۔ ان پر مولانا کا نام نہیں ہے مگر یہ مولانا ہی کی تصنیف ہیں۔ ان میں اکسٹھ لطائف ہیں۔ پنجاب گزٹ ضمیمہ مورخہ ۱۸ جنوری ۱۸۷۶ء میں اُردو کی دوسری کتاب کو مولانا کی تصنیف بتایا گیا ہے یہ ۱۳ جولائی ۱۸۷۵ء کو پریس سے جاری ہوئی۔

کیپٹن ہالرائیڈ کے زمانے میں چھپنے والی اردو کی پہلی اور دوسری ریڈریں یقیناً مولوی محمد حسین آزاد کی تصانیف تھیں۔ ان کی اشاعت کا کام غالباً ۷۲-۱۸۷۱ء کے عرصہ میں شروع ہو گیا تھا۔ جیسا کہ ہم ۱۸۷۵ء کا پنجاب گزٹ (ضمیمہ) کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں پر ان دونوں کتابوں کا مصنف مولوی محمد حسین کو بتایا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پہلی اور دوسری اردو ریڈر مولوی محمد حسین آزاد کی کوشش تھی۔

پنجاب گزٹ برائے سال ۱۸۷۵ء ضمیمہ میں اردو کی پہلی اور دوسری کتابوں کا مصنف مولوی محمد حسین کو بتایا گیا ہے۔ اس کے مطابق اردو کی پہلی کتاب کا ری پرنٹ ایڈیشن ۲۰ مارچ ۱۸۷۴ء کو طباعت کے بعد فروخت کے لیے جاری کیا گیا۔ ۲۶ صفحات پر مشتمل یہ قاعدہ مذکورہ بالا سائز میں ایجوکیشنل پریس سے طبع ہوا تھا۔ پانچ ہزار کی تعداد میں لیتھو پرنٹ میں چھپے ہوئے اس قاعدے کی قیمت ۱ آنے ۶ پائی بتائی گئی ہے۔

مولانا آزاد کی اردو کی دوسری کتاب کا مطبوعہ نسخہ بھی ملتا ہے یہ بھی ۱۸۷۳ء کا چھپا ہوا ہے اور اس کا آٹھواں ایڈیشن ہے۔ اس کے سرورق کی عبارت یوں ہے:

اردو کی دوسری کتاب — پنجاب کے سررشتہ تعلیم میں تالیف ہو کر لاہور کے سرکاری مطبع میں چھپی۔

اسی طرح پنجاب کے ۱۸۷۵ء کے پنجاب گزٹ (ضمیمہ) سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کی دوسری کتاب کا تیسرا ایڈیشن ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ پنجاب کی طرف سے گورنمنٹ ایجوکیشنل پریس لاہور سے شائع ہوا تھا۔ ۸۰

صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۳۵۷۰ کی تعداد میں لیتھوگراف میں طبع ہوئی اور ۲۴ اگست ۱۸۶۹ء کو فروخت کے لیے جاری کردی گئی۔ اس کی قیمت ۴ آنے تھی۔ اس ایڈیشن پر مصنف کا نام موجود نہیں ہے۔

اردو کی تیسری کتاب

جہاں تک اردو کی تیسری کتاب کا تعلق ہے اسے مولوی محمد حسین آزاد کی تصنیف کہنا درست نہیں کیونکہ حکومت پنجاب کی تعلیمی رپورٹ برائے سال ۷۰-۱۸۶۹ء میں درج ہے کہ اردو کی یہ کتاب اس سال کے دوران میں تیاری یا طباعت کے مرحلے میں تھی۔ اس سلسلے میں رپورٹ کا متن یہ ہے:

The following books are in course of preparation or actually in the Press, and most of them should be published by the end of the current year:-

1. Third Urdu Book.
2. First Hindi Book.
3. Physical Geography.
4. Urdu translation of the Student's Hume.
5. Do. do. Taylor's Manual of Ancient History (just commenced).
6. Urdu translation of Collier's History of the British Empire (in the Press).
7. First Arts Arabic Course of the Calcutta University, with Urdu translation and notes (in the Press).
8. B. A. Arabic Course of the Calcutta University, with translation and notes (in the Press).
9. Urdu Grammar prepared under the direction

of Mr. Alexander (in the Press).

10. Urdu translation of Potts' Euclid, by Mr. Cooks (in the Press).

11. Translation of elementary book of exercise for translation into Sanskrit by Monier Williams.

12. Annotated edition of the Diwan-i-Hafiz.

13. Translation into Urdu of Longman's Readers (the series used in zil' schools).

14. Translation of Fowler's Logic.

15. Translation of an elementary work on Physical Geography.

البتہ اس رپورٹ سے ظاہر نہیں ہوتا کہ اردو ریڈر کا مصنف کون تھا۔ مگر حکومت پنجاب کی تعلیمی رپورٹ برائے سال ۷۲-۱۸۷۱ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کی یہ کتاب زیر رپورٹ سال میں ۱۴۱۹۴ روپے میں فروخت ہوئی۔

پنجاب گزٹ ضمیمہ مورخہ ۱۸ جنوری ۱۸۷۶ء میں اُردو کی تیسری کتاب کا ذکر بھی ملتا ہے جو ۱۸۷۳ء میں طبع ہوئی۔ اس پر بھی مصنف کا نام نہیں ہے مگر اس پر ترمیم شدہ لکھا ہے۔ اس کے آغاز میں اُردو زبان کی حقیقت کے عنوان سے چھے صفحات لکھے ہیں جن میں اُردو زبان کی ابتدا کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب پیارے لال کی تصنیف ہے۔ اس کے ۱۸۷۶ء والے ایڈیشن کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے ''اُردو کی تیسری کتاب مرتبہ ماسٹر پیارے لال کیوریٹر سنٹرل بک ڈپو گورنمنٹ پنجاب حسب الحکم میجر ہالرائیڈ صاحب بہادر ڈائریکٹر مدارس ممالک پنجاب وغیرہ لاہور کے سرکاری مطبع میں بابو چندر ناتھ قائم مقام کیوریٹر کے اہتمام سے چھپی ۱۸۷۶ء۔ اس سررشتہ کے بے اجازت کوئی نہ چھاپے۔ دفعہ ۶۔ تعداد ۵۰۰۰۔ قیمت ۴''

حقائق بالا کی روشنی میں ڈاکٹر اسد اریب کی یہ رائے کہ یہ کتاب ۱۸۷۶ء میں تصنیف ہوئی۔ درست نہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ کتاب دوران سال ۷۲-۱۸۷۱ء میں اپنی اشاعت کے بعد فروخت ہو رہی تھی۔ ۱۸۷۳ء سے بھی پہلے کی تصنیف ہے۔

پنجاب گورنمنٹ گزٹ (ضمیمہ) مورخہ ۸ جون ۱۸۷۶ء اور ۲۴ جون ۱۸۷۶ء میں شائع ہونے والی مختلف

کتب کی فہرست میں اُردو کی تیسری اور چوتھی کتاب کو پیارے لال کی تصنیف بتایا گیا ہے۔

اردو کی چوتھی کتاب

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ پنجاب گورنمنٹ گزٹ (ضمیمہ) مورخہ ۸ جون ۱۸۷۶ء اور ۲۴ جون ۱۸۷۶ء میں اُردو کی تیسری اور چوتھی کتاب کو پیارے لال کی تصنیف بتایا گیا ہے۔

لہٰذا ڈاکٹر اسد اریب، ڈاکٹر اسلم فرخی اور ممتاز حسن کا یہ کہنا درست نہیں کہ اردو کی تیسری اور چوتھی کتاب کے مصنف مولوی محمد حسین تھے۔ خود ڈاکٹر اسلم فرخی بھی ان کتابوں کے بارے میں اپنے بیان سے مطمئن نہ تھے چنانچہ انھوں نے اپنے مقالہ میں ان کتابوں کے تجزیے کے دوران میں جا بجا اقرار کیا ہے کہ ان کتابوں کی بہت سی باتیں ایسی ہیں جو مولانا محمد حسین آزاد کے اسلوب سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

اگر ہم مولوی آزاد کی مذکورہ بالا درسی کتب بالخصوص اردو ریڈروں کا جو برطانوی دور میں پنجاب کے مدارس میں رائج رہیں جائزہ لیں تو وہ برطانوی دور کی اس پالیسی کی مظہر ہیں جس کے مطابق درسی کتب میں بچوں کا ماحول اور نیچر کا سماں موجود ہونا چاہیے چنانچہ جانوروں اور نیچر کے موضوعات کو درسی کتب میں سمونا انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کا حصہ تھا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان بزرگان دین اور اسلامی اقدار کے بیان سے کٹ کر جذبہ ایمانی سے محروم ہو جائیں اور ''نیچر اور جانوریات'' جیسی کہانیوں میں منہمک ان کی ثقافت اور کلچر کے رنگ میں رنگے جائیں۔ ان کی اس پالیسی کا ثبوت ان درسی کتب کے ابتدائی نوٹ میں بھی ملتا ہے جو درج ذیل ہے:

> اردو کی پہلی دوسری تیسری کتابوں میں دو باتوں کا بڑا خیال رکھا ہے۔ اول تو عبارت ایسی ہو کہ لڑکے آسانی سے پڑھنے لگیں۔ دوسرے ابتداء میں ان چیزوں کا بیان ہو جو ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں اور بیان اس طرح ہو جس کے پڑھنے سے ان چیزوں کے باب میں سوچنے کی عادت پڑے تا کہ جب نئی چیزیں دیکھیں تو آگے غور کرنے کا رستہ دلوں میں پیدا ہو۔ اس طرح آہستہ آہستہ حیوانات، نباتات، معدنیات کا علم حاصل کریں۔ زراعت اور دنیا کے کاروبار کی مفید مفید باتیں معلوم ہوں اور قدرتی ظہور مثلاً صبح، شام، سورج، چاند، ہوا، ابر، مینہ، برف وغیرہ کے حالات روشن ہوں اور لڑکے سمجھنے لگیں کہ موسم کیوں بدلتے رہتے ہیں دن اور رات کیوں گھٹتے بڑھتے ہیں۔ بادل کیوں کر بنتے ہیں۔ مینہ کیوں برستا ہے۔ ہوا کیوں چلتی ہے۔ اس کے علاوہ جو ملک نہیں دیکھے ان کے حالات آسان آسان بیانوں میں بتائے جائیں۔ بیان کا ڈھنگ ایسا رکھا ہے جس سے لوگوں کو راستی کی طرف توجہ ہو اور نیک اور پاکیزہ باتوں کی محبت دل میں بیٹھے۔ ان سب کتابوں میں بہت سی تصویریں ہیں کہ آپ اپنے بیان کی حالتیں دکھاتی ہیں۔ یورپ کا بچہ بچہ فقط تصویر کے دیکھنے سے بہت سی باتیں سمجھ جاتا ہے اور جو لوگ سفر نہیں کرتے وہ گھر بیٹھے تصویروں ہی سے ملکوں کی اصل

کیفیت معلوم کر لیتے ہیں۔ لیکن اہل ہند کو تصور کی باریکیاں سمجھنی اتنی مشکل ہے جیسے غیر زبان کی کتابیں۔ ایک پہلو یا گھوڑے یا کتے کا صاف صاف خاکہ کھینچا ہو تو فقط اتنا پہچان لیتے ہیں کہ یہ اس جانور کی تصویر ہے لیکن اگر وہ کسی جگہ کی تصویر ہو تو اتنا نہیں بتا سکتے کہ اس میں زمین کہاں ہے، پانی کہاں ہے، بادل کون سا ہے، پہاڑ کون سا ہے، کس کس قسم کے درخت ہیں، کیا چیز پاس ہے کیا دور ہے؟ جب یہاں بھی یورپ کی طرح بچپن میں تصویروں کا رواج ہو جائے گا تو سب اسی طرح سمجھنے لگے گے اور اس کا لطف اٹھائیں گے۔

عبارت صاف اور صحیح پڑھنے کے واسطے ان باتوں کی رعایت رکھی ہے۔ ایک ایک لفظ الگ الگ لکھا ہے اپنے اپنے موقعے پر وقف کی علامتیں دی ہیں۔ املا میں تمیز رکھی ہے۔ لفظوں پر کہیں کہیں اعراب دیے ہیں۔ مگر اعرابوں کے قاعدے ایسے باندھے ہیں کہ جہاں اعراب نہیں لکھے وہاں بھی سمجھ میں آتے ہیں۔ گویا سارے حرفوں پر اعراب آ گئے ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق سے صاف ظاہر ہے کہ اردو ریڈروں کی قدیم سیریز کی پہلی اور دوسری کتابیں مولوی محمد حسین کی حک و اصلاح کے بعد کرنل ہالرائیڈ کے زمانے میں ۶۹-۱۸۶۸ء میں طبع ہو کر بطور درسی کتب رائج ہوئیں۔ اردو ریڈروں کا جدید سلسلہ پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب پر مشتمل تھا اور یہ سلسلہ بھی کرنل ہالرائیڈ کی ذاتی نگرانی میں مکمل ہوا تھا۔ اس سلسلے کی پہلی اور دوسری ریڈریں مولوی محمد حسین کی تصنیف تھیں جبکہ تیسری اور چوتھی ماسٹر پیارے لال آشوب کی۔ اردو ریڈروں کا یہ سلسلہ کوئی چھ سات سال تک درسی کتب کے طور پر پڑھایا گیا جبکہ ازاں بعد تعلیم المبتدی اردو ریڈروں کا سلسلہ مصنفین کی اجتماعی کوشش سے تیار کیا گیا اور سال ہا سال پنجاب کے تعلیمی مدارس میں بطور درسی کتب رائج رہا۔

ہماری نظر میں اردو ریڈروں کا یہ سلسلہ کرنل ہالرائیڈ کے زمانے میں ۶۹-۱۸۶۸ء سے شروع ہو کر ۷۷-۱۸۷۶ء تک جاری رہا۔ غالباً ہالرائیڈ ان ریڈروں سے مطمئن نہ تھے لہٰذا انھوں نے تعلیم المبتدی کے نام سے اردو ریڈروں کا ایک نیا سلسلہ لکھوایا جسے ایک کے بجائے مصنفین کے ایک بورڈ نے مرتب کیا اور ان کی اشاعت لندن سے ہوتی رہی جس میں السٹریشن وغیرہ جان لاک ووڈ کپلنگ اور مسز سٹیلز میو سکول آف آرٹس کے اساتذہ نے بنائی تھیں۔

(۱۰)
متفرق

قصص ہند

قصص ہند حصہ دوم کا ۱۸۷۳ء کا ایڈیشن ہماری نظر سے گزرا ہے اس پر مصنف کا نام نہیں ہے۔ صرف

یہ لکھا ہے کہ "پنجاب کے سررشتہ تعلیم میں تالیف ہو کر لاہور کے سرکاری مطبع میں چھپایا گیا" اس زمانے میں مصنفین کے نام کتب پر نہیں چھاپے جاتے تھے بعد میں مولانا کا نام قصص ہند حصہ دوم پر بطور مصنف دیا جانے لگا تھا۔ قصص ہند حصہ دوم کا دسواں ایڈیشن بھی پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں موجود ہے جو ۱۸۷۸ء میں چھپا۔ اس کے سرورق کی عبارت ملاحظہ یہ ہے:

قصص ہند حصہ دوم کی ضخامت حصہ اول سے تقریباً تین گنا ہے۔ پھر آزاد نے کئی عنوان قائم کر کے تاریخی تسلسل کو قائم رکھا ہے۔ وہ اسے غزنوی خاندان سے شروع کرتے ہیں۔ اور مغلیہ خاندان پر ختم کرتے ہیں۔ آخر میں انھوں نے سیواجی اور بابا نانک کا بیان بھی شامل کیا ہے۔ آزاد نے یہ حصہ بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب نصابی ضرورت کے تحت لکھی گئی چنانچہ اس کے پندرہویں ایڈیشن کو جو ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا جو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے دریسی زبانوں کے مدارس کی چوتھی جماعت کے لیے سررشتہ تعلیم پنجاب نے مقرر کیا تھا۔

قصص ہند حصہ دوم مرتبہ مولوی محمد حسین آزاد پروفیسر عربی لاور کالج حسب الحکم جناب میجر ہالرائیڈ صاحب بہادر ڈائریکٹر مدارس ممالک پنجاب وغیرہ لاہور کے سرکاری مطبع میں ماسٹر پیارے لال آشوب کیوریٹر کے اہتمام سے چھپی۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر اسلم فرخی نے مذکورہ بالا درسی کتب کی فہرست میں تذکرۂ علماء، اور کائنات عرب، کو قواعد عربی اور قواعد اردو کو بھی مولوی محمد حسین کی درسی کتب میں شامل کیا گیا ہے۔

تذکرۂ علماء مولانا آزاد کے نوٹس پر مشتمل ہے اور کوئی مستقل تصنیف نہیں چنانچہ آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد نے اس کے آخر میں لکھا ہے کہ:

کتابوں کے مطالعہ کرتے وقت جس عالم کے حالات پڑھے ہیں اس کا کچھ نہ کچھ حال اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا ہے۔

ان نوٹس کو آغا صاحب نے خواجہ حسن نظامی کے دیباچہ کے ساتھ ۱۹۲۲ء میں چھپوا کر ان کا نام تذکرۂ علما رکھ دیا۔ یہ کبھی بھی درسی کتابیں نہیں رہیں۔

اسی طرح کائنات عرب بھی درسی کتاب نہیں ہے کیونکہ یہ طلبا کے لیے تحریر نہیں کی گئی تھی اور بقول نبیرۂ آزاد یہ سنین الاسلام کا مقدمہ تھی جو ڈاکٹر لائٹنر کو پسند نہ آیا۔ یہ مقدمہ بھی مکمل نہ تھا بلکہ نوٹس کی شکل میں تھا۔ ان پرچوں کو آغا محمد طاہر نے جمع کر کے کائنات عرب کے نام سے ۱۹۲۲ء میں چھپوا دیا تھا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے نصیحت کا کرن پھول، آیینہ صحت، آموز گار پارسی،

حکایت آزاد، شہزادہ ابراہیم کی کہانی، لغت آزاد کو بھی مولانا آزاد کی درسی کتب میں شامل کیا ہے۔ مگر انھوں نے اس سلسلے میں مزید تفصیل درج نہیں کی۔ حکایات آزاد، شہزادہ ابراہیم کی کہانی اور نصیحت کا کرن پھول مولانا آزاد کی زندگی میں شائع نہ ہوسکیں اور ان کی وفات کے کافی عرصہ بعد زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔ یہ کتابیں بطور درسی کتب کے استعمال ہوئیں یا نہیں دیگر منابع سے بھی اس سلسلے میں کچھ معلومات نہیں ملتیں۔ بعض محققین نے ترکی کی گرامر، رسالۂ عروض، تاریخ ہند وغیرہ بھی مولوی محمد حسین کی غیر مطبوعہ تصانیف بتائی ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے طلبا کی تدریس کے مقصد سے لکھی گئیں لیکن نہ تو ان کی اشاعت ہوئی اور نہ ان کے بطور درسی کتب استعمال ہونے کا کوئی حوالہ ملتا ہے۔

مولوی محمد حسین کی آیا کوئی قواعد اردو کسی سطح تعلیم پر پڑھائی جاتی رہی اس سلسلے میں ہمیں کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد اسلم فرخی نے محمد حسین آزاد (جلد دوم) میں اول الذکر کتاب کا نام حکایات آزاد لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔ حکایات آزاد کو ۱۹۶۱ء میں مکتبہ نوائے وقت نے دو جلدوں میں شائع کیا۔ دوسرے حصے میں کچھ ایسی حکایات بھی ہیں جو پہلے حصہ میں شامل ہیں۔ یہ حکایات کرنل ہالرائیڈ کو سنائی گئی تھیں کیونکہ ایک حکایت کے مسودے پر یہ لکھا ہے کہ ''کل پر موقوف رکھو''۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کرنل ہالرائیڈ کو یہ حکایات پسند نہیں آئی ہوں گی ورنہ یہ بھی شائع ہو جاتیں۔ یہ کہانیاں بہت مختصر ہیں اور آزاد کی زبان بھی نہیں ان کہانیوں پر داستانی رنگ غالب ہے اور شاید اسی لیے کرنل ہالرائیڈ نے ان کا چھپوانا مناسب نہ سمجھا ہوگا۔

حوالہ جات

1. Letter No. 124 A, dated 11 July 1868. From Captain W.R.M. Holride, Director of Public Instructions Punjab to T.H. Thoronton Secretary to Government of Punjab- File No. 18-20.
2. Letter No. 303, , dated 16 July 1868. From Education Department Government of the Punjab to Director of Public Instructions Punjab, Lahore.
3. Letter from the Supreme Court Home Department No. 3101 , dated October B File No. 47-48, October 1868. Original letter could not be traced, therefore, detail of the contents of letter could not be

determine.

4. Letter No. 254, dated 11 November 1869 and also be file No. 47-8-October 1868. Education Department Government of the Punjab..

۵۔ مکتوبات آزاد، مرتبہ آغا محمد طاہر، آزاد بک ڈپو، لاہور، ص ۱۹۰۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۱۶ تا ۲۱۷۔

۷۔ بحوالہ مولانا محمد حسین کی درسی کتابیں مولفہ ڈاکٹر حسن اختر، مجلہ راوی، مولانا محمد حسین آزاد نمبر لاہور: گورنمنٹ کالج لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۶۳۔

۸۔ ایضاً۔

۹۔ مکتوبات آزاد، مرتبہ آغا محمد طاہر، ص ۱۹۰۔

۱۰۔ بحوالہ مولانا محمد حسین کی درسی کتابیں مولفہ ڈاکٹر حسن اختر، ص ۱۶۴۔

۱۱۔ محمد اسلم فرخی، ڈاکٹر، محمد حسین آزاد، حیات و تصانیف، حصہ دوم، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۵ء ص ۶۰۸-۶۰۶۔

12. W.R.M Holride, Captain, Report on Popular Education in the Punjab and its dependencies for year 1869-70, Lahore: Printed at the Albion Press, 1870, p. 47.

13. J. G. Cordery, Report on Popular Education in the Punjab and its dependencies Simla, Printed by J. Elston at the Station Press, 1872, p. 47.

14. Letter No. 189, dated 5 September 1870, From Captain W.R.M. Holride, Director of Public Instruction Punjab to T.H. Thoronton Secretary to the Government of Punjab- (Unpublished)

15. Ibid.

16. Ibid.

۱۷۔ مولانا محمد حسین دہلوی [پمفلٹ] مطبوعہ عجائب گھر لاہور، ۱۹۷۱ء ص ۴۔

۱۸۔ کلیات نثر حالی، جلد اول، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، پنجاب مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۴۴۴۔

۱۹۔ ایضاً۔

۲۰۔ مولانا محمد حسین دہلوی [پمفلٹ] عجائب گھر لاہور، ص۴۔

۲۰۔(الف) اس کتاب کا ایک اڈیشن سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ لاہور نے بھی شائع کیا۔ ۱۹۵۷ء میں شائع ہونے والا یہ اڈیشن ۲۳۲ صفحات پر مشتمل تھا اور نسخ ٹائپ میں چھپا تھا۔ (مرتبین)

۲۱۔ حسن اختر، مولانا محمد حسین آزاد کی درسی کتابیں، ص۱۶۴۔

۲۲۔ ایضاً، ص۳۷۳۔

آبِ حیات کا انگریزی ترجمہ-ایک تجزیہ

ڈاکٹر تحسین فراقی

آب حیـــات اردو شاعری کی ایک دلچسپ تاریخ ہونے کے ناتے اور اپنے بعض لسانی مباحث ہی کے اعتبار سے قابل توجہ نہیں، اپنے زندہ اسلوب بیان کے ضمن میں بھی ایک ناقابل فراموش کتاب ہے۔اس کا ایک بڑا حصہ اپنے حد درجہ تخلیقی اور تشبیہ واستعارہ اور تمثالوں میں لپٹے سحر کار اسلوب کی بنا پر کسی دوسری زبان میں ترجمے کا متحمل ذرا مشکل ہی سے ہوسکتا ہے۔ یہ مشکل اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب مترجم کسی ایسے تہذیبی اور لسانی منطقے سے تعلق رکھتا ہو جو زیر ترجمہ تصنیف کے مولف کے ثقافتی اور لسانی حیطۂ حوالہ سے بے حد مختلف اور متغائر ہو۔

آب حیـــات اس اعتبار سے تو خوش قسمت ہے کہ پچھلے ایک سو تیس برس سے ادیبوں کی ہر نسل کو اپنے جادوئی ہالے میں سمیٹ لپیٹ لینے والی یہ کتاب بالآخر ۲۰۰۱ء میں انگریزی میں ترجمہ ہو کر آکسفرڈ، انڈیا سے شائع ہو گئی مگر ایک اور پہلو سے ذرا کم نصیب ہے کہ اس کے بعض حصے اپنے ناقص اور بعض صورتوں میں مضحکہ خیز ترجمے کی بنا پر کچھ سے کچھ ہو گئے۔ ایسے مقامات شدت سے نظر ثانی کے محتاج اور متقاضی ہیں۔ اگر چہ کتاب کے مترجمین میں فرانسس پریچٹ کے ساتھ ممتاز نقاد و دانشور جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا نام بھی شامل ہے مگر میرا احساس ہے کہ اس کتاب کے ترجمے میں شمس الرحمٰن فاروقی کا حصہ کم ہے۔اس کا اندازہ بعض ان مثالوں سے ہوگا جو ذرا آگے چل کر پیش کی جائیں گی۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ پیش نظر انگریزی ترجمے کے بعض حصے بڑے کامیاب بلکہ نہایت تخلیقی ہیں اور اصل متن سے کامل انصاف کرتے ہیں۔ مجھے گمان ہے کہ یہی وہ حصے ہیں جو فاروقی صاحب کی گہری لسانی صلاحیت، غیر معمولی مہارت ترجمہ اور تہہ رس تیز نگاہی کے فیض یافتہ ہیں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ترجمے کے بعض اور مقامات کا، جو حد درجہ مضحکہ خیز اغلاط کے باعث کم وقعت قرار پاتے ہیں، ذمہ دار فاروقی صاحب کو نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ فرانسس پریچٹ سے فطری طور پر برعظیم یا وسیع تر معنی میں مشرق کے ثقافتی پس منظر اور اس کے بطن سے

ظہور کرنے والے اردو ادب کی لسانی تہہ داریوں اور اسلوبی تنوعات کے کامل فہم کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ وہ بلاشبہ نہایت محنتی اور مطالعے کی وسعت رکھتی ہیں۔ انگریزی ان کی مادری زبان ہے مگر بعض مخصوص مشرقی ثقافتی اوضاع، لسانی نزاکتیں اور محاوراتی پیچیدگیاں ان کی گرفت سے بالا رہی ہیں۔ ان کا ہاتھ کوتاہ اور برعظیم کی بھید بھری تہذیب اور شعری زبان کا نخل بہت بلند ہے۔ ایسے میں ثمریابی کی توقع ذرا کم ہی کی جا سکتی ہے۔

آب حیات کے پیش نظر انگریزی ترجمے کا ایک قابل لحاظ حصہ اصل متن سے بے حد قریب ہی نہیں اس کا تخلیقی متبادل بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں دو ایک اردو انگریزی اقتباسات کا تقابلی مطالعہ قارئین کے لیے یقیناً مسرت اور طمانیت کا باعث ہوگا۔ آب حیات کے پہلے دور کی ''تمہید'' کا ایک اقتباس اور اس کا عمدہ تخلیقی ترجمہ ملاحظہ کریں:

''پس انسان وہی ہے کہ جس پیرایہ میں خوبصورتی جوبن دکھائے، یہ اس سے کیفیت اٹھائے نہ کہ فقط حسینوں کے زلف و رخسار میں پریشان رہے۔ خوش نظر اسے نہیں کہتے کہ فقط گل و گلزار ہی پر دیوانہ پھرے۔ نہیں، ایک گھاس کی پتی بلکہ سڈول کانٹا خوش نما ہو تو اس کی نوک جھوک پر بھی پھول ہی کی طرح لوٹ جائے۔'' (آب حیات نسخہ لاہور ۱۹۰۷ء، ص ۸۲)

"Thus he alone is fully human who can relish the mood of any guise in which beauty shows its youthful vigor and who is not driven to distraction only by the curls and cheeks of beautiful ones. He cannot be called a good observer who wanders around like a madman only for sake of the rose and the garden. No! If a blade of grass, or even a well-shaped thorn, should seem attractive, he can be as much ravished by its prickly tip as by a flower" (Ab-e-hayat, p. 110)

گئے زمانے کے لوگوں کے ذوقِ مطالعہ میں گہرائی کے عنصر کی کارفرمائی کا اپنے (اور شاید ہمارے) زمانے کے لوگوں کی قشر پرستی اور سطحی بینی سے تقابل کرتے ہوئے آزاد جو کچھ لکھتے ہیں اس کا انگریزی میں بڑا کامیاب ترجمہ کیا گیا ہے۔ ذیل کے اقتباس سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ آزاد ماضی کے قابلِ تعریف پہلوؤں کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیتے

''پہلے جو لوگ کتاب دیکھتے تھے تو اس کے مضمون کو اس طرح دل و دماغ میں لیتے تھے جس سے اس کے اثر

درج کیا جاتا ہے اور سرتاپالفظی ترجمے کو خط کشیدہ کیا جاتا ہے:

۱) ''اور وہی شودر کہلاتے ہوں گے چنانچہ اب تک بھی ان کی صورتیں کہے دیتی ہیں کہ یہ کسی اور بدن کی ہڈی ہیں'' (ایضاً ص ۷)

"......And these very people must have been called Shudras. Thus even now their appearance declares the Shudras <u>to be bones from some other body</u>." (p. 58)

۲) ''...... می پرد رنگم حباب گر بدریا بشکند'' (ایضاً ص ۱۱۲)

"My color flies away if the bubble bursts in the ocean" (p. 128)

۳) ''چمن میں گل نے جو کل دعوے جمال کیا
جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا'' (میر) ایضاً ص ۲۳۱)

"Yesterday in the garden, when the rose made a claim to beauty the beauty of the beloved made its face good and red" (p. 214)

۴) ''باتیں کہانیاں ہو گئیں'' ص ۴۰۹

"All those things became stories" (p. 333)

۵) ''آج یہاں کل وہاں گزرے یونہی جگ ہمیں
کہتے ہیں سب سبزہ رنگ اس سے ہری چگ ہمیں'' (ایضاً ص ۴۳۱)

"Here today, there tomorrow, that's how ages have passed for me. Green young people, call me harichug." (p. 349)

پہلی اور چوتھی مثالیں قابل وضاحت نہیں۔ تیسری مثال میں ''منہ اس کا خوب لال کیا'' سے مراد ہے ''خوب خبر لینا''، ''زور سے طمانچہ مارنا''، ''منہ پر تھپڑ مار کر چہرہ سرخ کر دینا''۔ ''خوب'' کا لفظ یہاں شدت کو ظاہر کر رہا ہے جسے ''good'' کے مضحکہ خیز متبادل سے واضح نہیں کیا جا سکتا نیز "made its face good and red" سے زور کے طمانچے کا قرینہ بالکل نہیں نکلتا۔

پانچویں مثال میں ''سبزہ رنگ'' کا ترجمہ "Green young people" خندہ آور ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ''سبزہ رنگ'' سے یہاں ''نوخیز سبزہ خط'' مراد ہیں جن کے ذکر سے کلاسیکی فارسی اردو شاعری بھری پڑی ہے۔

دوسرے یہ کہ شعر میں ''گزرے یونہی جگ ہمیں'' کا معنی ہے کہ ایک مدت ہوئی۔ ایک عرصہ بیت گیا۔ میرا نہیں خیال کہ انگریزی میں "Ages have passed for me" قسم کے اظہارات موجود ہوں۔ ایسی بوالعجبیاں ابلاغ کے رستے کا روڑا ہیں۔

میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ متن کے حذف و اختیار کے باب میں مترجمین کا موقف قابل قبول نہیں۔ بعض جگہ ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض سطریں یا شعر حذف کر دینے سے مفہوم کے ابلاغ میں رکاوٹیں حائل ہوگئی ہیں۔ صرف ایک دو مثالوں سے میرے موقف کی وضاحت ہو جائے گی:

آب حیـــات کے آغاز میں ایک جگہ آزاد ہندی میں فارسی، عربی الفاظ اور فارسی میں ہندی الفاظ کی آمیزش کا ذکر کرتے ہیں۔ فارسی میں ہندی الفاظ کے اختلاط کے ضمن میں انھوں نے ''تزک جہانگیری'' سے ایک بڑی دلچسپ مثال پیش کی تھی جس میں اکبر نے جہانگیر کو ایک طرح سے اپنی چھوٹی بہن آرام بانو بیگم سے حسن سلوک کی وصیت کی تھی۔ انگریزی ترجمے میں اس مثال کو حذف کر دیا گیا ہے جس کے باعث آزاد کا موقف بالوضاحت قاری تک نہیں پہنچ پاتا۔

اسی طرح کی ایک اور دلچسپ مثال سید انشاء اور میرزا مظہر کی ملاقات کے ضمن میں ہے جو آب حیـــات کے صفحات ۱۳۵، ۱۳۶ پر دیکھی جا سکتی ہے اور جس میں انشاء نے کمال عقیدت کے ساتھ میرزا مظہر کی شخصیت اور لباس کی جزئیات مہیا کی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ نہایت دلچسپ جزئیات کے حامل اس فارسی اقتباس کے انگریزی میں ترجمہ کرنے سے کتاب میں کیا خلل واقع ہو جاتا۔ اس طرح کی مثالیں اتنی کثیر ہیں کہ یہ مقالہ ان کی تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

اب آیئے ان مقامات کی طرف جہاں ترجمہ غلطِ محض ہے:

آب حیات میں نصاب الصبیان کے ذکر میں ''خالق باری'' کو امیر خسرو سے منسوب کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

> ''خالق باری بھی انہی کے مخلوقات فکر سے ہے۔ باریک بیں اشخاص اس سے بھی بہت سے الفاظ اور فقرے دیکھ کر یہ نکتے سمجھ سکتے ہیں: بیا برادر آ ؤ رے بھائی۔ بنشیں مادر بیٹھ ری مائی۔'' (ایضاً ص ۱۶)

انگریزی ترجمے میں: بیا برادر آؤ رے بھائی...... الخ کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

"Like father, like son, like mother, like daughter" (p. 65)

قاری حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ اس ترجمے کا اصل شعر سے کیا تعلق ہے۔

آب حیـــات میں غلام مصطفیٰ خاں یک رنگ کے زیر عنوان لکھتے ہوئے ایک جگہ آزاد نے ''دریائے

لطافت'' کا ایک طویل دلچسپ مکالماتی اقتباس نقل کیا ہے۔ جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

''اور سنیے کہ سعادت یار طہماسپ کا بیٹا، انوری ریختہ اپنے آپ کو جانتا ہے۔ رنگین تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے۔ میر حسن پر زہر کھایا ہے۔ ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں'' (ایضاً ص ۱۰۴)

انگریزی ترجمہ ملاحظہ ہو:

"Let me tell you one more: Saadat Yar Tahmasp's son considers himself the Anvari of Rekhtah. His pen-name is Rangin. He has composed a qissah. He has called that "Masnavi Dilpazir" and in it he has used the language of whores. He is dying of love for Mir Hasan. Although the late Mir Hasan did not have what he was doing either - He did not really compose the masnavi of Badr-e-Munir, it is as if he was just selling aphrodisiac snake-oil." (p. 119, 120)

اب فرانسس پریچٹ کو کون بتائے کہ انشاء اور رنگین کے زمانے میں بلکہ کسی قدر بعد تک ''رنڈی'' کا لفظ طوائف کے لیے نہیں، عورت کے لیے بولا جاتا تھا۔ رہا یہ جملہ کہ ''میر حسن پر زہر کھایا ہے'' تو ''زہر کھانا'' رشک کرنے یا حسد سے جلنے سے کنایہ ہے یا پھر بغض نکالنے کے معنوں میں آتا ہے۔ کسی استاد کا شعر ہے:

سبھوں کو مے، ہمیں خوناب دل پلاتا تھا
فلک ہمیں پہ تجھے کیا یہ زہر کھانا تھا؟

علاوہ ازیں ''سانڈے کا تیل'' کا صحیح ترجمہ "Sand-lizard oil" ہے مگر خیر اس آخری شق سے فرانسس پریچٹ کی بے خبری قابل معافی ہے۔

آب حیات کے دور سوم میں ایک جگہ آزاد نے بعض لفظوں کے بارے میں لکھا ہے کہ میر و سودا کے عہد تک ان کی تذکیر و تانیث متعین نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے اس ضمن میں میرزا سودا کے کچھ شعر درج کیے تھے۔ شعر یہ تھے:

کہا طبیب نے احوال دیکھ کر میرا	کہ سخت جان ہے سودا کا، آہ کیا کیجیے

بتاں کا دید میں کرتا ہوں شیخ جس دن سے　　　حلال تب سے ہے مے، مو بمو مرے دل پر

کریں شمار ہم، دل کے، یار، داغوں کا　　　تو آ کہ سیر کریں آج دل کے باغوں کا

اب آزاد کی بدقسمتی کہ انھوں نے ''جان''، ''دید'' اور ''سیر'' تینوں لفظوں کی تذکیر کو نمایاں کرنے کے لیے نہ صرف انھیں خط کشیدہ کیا بلکہ جدول کے باہر حاشیے پر بھی یہ تینوں لفظ اوپر نیچے لکھ دیے۔ محترمہ پریچٹ نے جان، دید اور سیر تینوں کو خلعت فن عطا کر کے انھیں شاعر قرار دے ڈالا اور لکھا "Illustrative verses by Jan, Did and Sair" (p. 169)

آزاد نے درد کی ابتدائی تعلیم کے ضمن میں ایک جگہ لکھا تھا کہ انھوں نے ''کئی مہینے مفتی دولت صاحب سے مثنوی کا درس حاصل کیا تھا۔'' (ایضاً، ص ۷٦)۔ مراد یہ ہے کہ انھوں نے رومی کی مثنوی کا درس لیا تھا۔ پریچٹ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"Mufti Daulat Sahib instructed him in the art of the Masnavi."

(p. 174)

میرے نزدیک "in the art of..." بالکل زاید ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ رومی کی مثنوی برعظیم کے صوفی حلقوں میں ایک عرصے سے متداول تھی۔ لہٰذا درد جیسے صوفی خانوادے سے تعلق رکھنے والے شخص کو اس کا درس دیا ہی جانا تھا۔

میر کے بہتر نشتروں کا ذکر کرتے ہوئے آزاد نے لکھا ہے:

''اردو زبان کے جوہری قدیم سے کہتے آئے ہیں۔ ستر اور دو بہتر نشتر ہیں۔ باقی میر صاحب کا تبرک ہے۔''

(ص ۱۹۸)

اوپر کے جملے میں آزاد نے ''تبرک'' سے مراد قدر قلیل یا کم حیثیت کلام مراد لیا ہے۔ پریچٹ نے تبرک کو کنایۃً لینے کے بجائے اس کا لفظی ترجمہ کر دیا: "The rest is [only] Mir Sahib's blessing" (p. 189)

"blessing" کا لفظ یہاں بے معنی اور گمراہ کن ہے۔

اگلے صفحے پر آزاد نے میر کی بے نیازی اور گہرے انانیتی شعور کا ذکر کرتے ہوئے ان کا یہ شعر درج کیا تھا:

مجھ کو دماغِ وصفِ گل و یاسمن نہیں

میں جوں نسیم، باد فروش چمن نہیں

(ص ۱۹۹)

اس شعر کا انگریزی ترجمہ یہ دیا گیا ہے:

"I am not minded to praise the rose and the jasmine

I am not like the breeze, a fragrance-merchant for the garden

(p. 189)

فرانسس پریچٹ یہ نہیں جان پائیں کہ ''بادفروش'' سے مراد باتونی اور خوشامدی ہے اور اسی معنی کو پیش نظر رکھ کر میر کے شعر کی معنویت سمجھی جاسکتی ہے۔

آزاد نے ایک جگہ میر کے معاصر بقا کا ایک ہجو یہ وطنزیہ شعر بہ سلسلہ میر درج کیا ہے:

لے کے دیواں پکارتے پھریے ہر گلی کوچہ، کام شاعر کا

(ص ۲۱۲)

قصہ یہ ہے کہ برعظیم کے کوچہ و بازار میں بعض کم مایہ و کم درجہ پیشہ ور مثلاً بڑھئی، قلعی گر وغیرہ اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے آواز لگاتے پھرتے تھے: ''کام بڑھئی کا، برتن قلعی کرالو'' وغیرہ وغیرہ۔ بقا نے میر کو اسی طرح کا کم درجہ شاعر کہہ کران پر چوٹ کی ہے۔ شعر کا انگریزی ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

"To take your volume and go around hawking

In every street and have your services as a poet"

(p. 201)

یہ ترجمہ مبہم ہے۔ صحیح ترجمہ یوں ہوسکتا ہے:

And say: "My services for improvement of poems are at your disposal."

آب حیات کے دور چہارم میں بعض قلمی معرکوں کا بڑا دلچسپ، جیتا جاگتا اور ناقابل فراموش احوال ملتا ہے۔ ان میں معرکہ انشا و مصحفی بھی معروف معلوم ہے جس میں ہجو در ہجو کا ایک سلسلہ یہ تھا: ''حور کی گردن، ستقور کی گردن، لنگور کی گردن۔'' اس زمین میں انشا کا ایک مصرع تھا:

محفل میں تری شمع بنی موم کی مریم --- محترمہ نے ''مریم'' کو ''مرہم'' پڑھا اور یہ نہ سمجھ پائیں کہ ''موم کی مرہم'' ایک بے معنی شے ہے اور ترجمہ کردیا:

"In your gathering, the wax of the candle became salve"

(p. 263)

یہ معلوم ہے کہ ''موم کی مریم'' نہایت نازک اندام عورت کو کہتے ہیں۔ سوء اتفاق سے چونکہ آب حیات میں بھی ''موم کی مرہم'' چھپ گیا تھا لہٰذا سہو نظر ہوا۔[۲]

اسی دور چہارم میں مصحفی کے ذکر میں ہجویات اور انشاء کے ساتھ معرکوں کے بیان میں لکھا ہے:

''یہ روایتیں بھی مختلف ہیں اور مختلف زبانوں پر پریشان ہیں'' (ص ۳۰۳)۔ مراد یہ تھی کہ مختلف زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔ انگریزی ترجمہ یہ ہے:

"These stories too are various, and are disordered on various tongues." (p. 260)

''پریشان'' کو "Disordered" لکھ دینے سے ترجمہ تو ہو گیا مگر مفہوم مترجم کے بطن ہی میں رہ گیا۔

اسی صفحے پر آگے چل کر مرزا سلیمان شکوہ کے جلسے میں مصحفی کی پیش کردہ غزل ''زہرہ کی جو آئی کف ہاروت میں انگلی'' ......الخ کا ذکر ملتا ہے۔ اس غزل کا مقطع یہ تھا:

تھا مصحفی یہ مائل گریہ کہ پس از مرگ   تھی اس کی دھری چشم پہ، تابوت میں انگلی

(ص ۳۰۳)

دوسرے مصرعے کا انگریزی ترجمہ یہ کیا گیا ہے:

"In the coffin, there was stuck in his eye-a finger"

یہاں "stuck in his eye" کے بجائے "placed on his eye" کا محل تھا۔

خیر ذکر ہو رہا تھا ہجو در ہجو کا۔ سید انشاء نے جواب آں غزل کے طور پر جو غزل لکھی تھی اس کا مطلع تھا:

توڑوں گا خم بادۂ انگور کی گردن
رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن

اسی غزل میں وہ شعر بھی تھا جس میں ''موم کی مریم'' کا ذکر آتا ہے۔ مصحفی نے اسی بحر میں انشاء کا جواب لکھا۔ اس طویل ہجو میں ایک شعر وہ تھا جس میں انشاء کو حقیر اور بے بس چیونٹی قرار دیا گیا تھا:

منصف ہو تو پھر نام نہ لے دعوے کا ہرگز
یہ بوجھ اٹھا سکتی نہیں مور کی گردن

(ایضاً، ص ۳۰۶)

اس شعر میں بوجھ اور مور میں جو رعایت ہے، بالکل ظاہر ہے۔ پریچٹ نے ''مور'' کا ترجمہ "ant" کے

بجائے "peacock" کر ڈالا:

"The burden cannot be lifted by a peacock's neck" (p. 265)

دور پنجم میں ناسخ کی بے رس نازک خیالیوں کے ذکر میں یہ جملہ ملتا ہے: ''شیخ صاحب کی اکثر نازک خیالیاں ایسی ہیں کہ کوہ کندن وکاہ برآوردن'' ص ۳۴۲

اس کا انگریزی ترجمہ فارسی کے بجائے اس اردو ضرب المثل کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے: ''کھودا پہاڑ نکلا چوہا'':

"Sheikh Nasikh is so fond of delicate thoughts, it is as though

the mountain had labored and brought forth a mouse. (p. 288)

سچ ہے کہ اگر ''کاہ'' کا ترجمہ "mouse" ہو سکتا ہے تو پہاڑ کو درد بھی لگ سکتے ہیں!

انشاء و مصحفی کی طرح آتش و ناسخ کے معرکے بھی معروف ہیں۔ ناسخ پر یہ اتہام مشہور تھا کہ وہ اکابر کے مضامین چرا لیتے ہیں۔ آتش نے اسی تناظر میں یہ شعر کہا تھا:

مضموں کا چور ہوتا ہے رسوا جہان میں
چکھی خراب کرتی ہے مال حرام کی
ص ۶۴۳

اس شعر کا انگریزی ترجمہ ملاحظہ ہو:

"The thief of a theme is disgraced in the world

Forbidden property destroys the taste" (p. 292)

''چکھی'' وہی ہے جسے ''چکوتھی'' بھی کہتے ہیں۔ مراد ہے ''خورش خوش مزہ'' یعنی مزیدار کھانا۔ "taste" یہاں بے محل ہے۔ ترجمہ یوں ہوتا تو بہتر تھا:

"The delicious food of iniquitous wealth destroys man."

ناسخ کے ذکر میں آب حیات میں روایت ہے کہ زندگی کے ایک مرحلے پر ناسخ ''فساد خون'' کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ پریچٹ نے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے "Because of a skin condition" کے الفاظ رقم کیے ہیں۔ حال آنکہ ''فساد خون'' کا ترجمہ "septicemia" زیادہ مناسب ہے۔

ص ۳۷۲ پر آزاد میر خلیق کے دو شعر درج کرتے ہیں اور تاسف کا اظہار کرتے ہیں کہ پوری غزل ہاتھ نہ آئی۔ ان میں سے ایک شعر یہ تھا:

ہنس دیا یار نے جو رات خلیق
کھا کے ٹھوکر اُس آستاں سے گرا

اب اس کا انگریزی ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

"The beloved burst out laughing last night, Khaliq when I stumbled and fell down against the doorway" (p. 310)

خلیق کے شعر سے بالکل واضح ہے کہ گرنے کا عمل پہلے نہیں بلکہ محبوب کی استہزائیہ ہنسی کے نتیجے میں ہوا۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ شعر محض ایک بے رس بیان ہے اور سطحی مفہوم کا حامل۔ اگر "when" کے بجائے "whereupon" آجائے تو ترجمہ درست اور زیادہ بامعنی ہو جاتا ہے۔

خواجہ حیدر علی آتش کے قلندرانہ رنگ کا نقشہ آزاد نے اس طرح کھینچا ہے:

''سر پر ایک زلف اور کبھی حیدری پٹا کہ یہ بھی محمد شاہی بانکوں کا سکہ ہے۔ اسی میں ایک طرّہ سبزی کا بھی لگائے رہتے تھے اور بے تکلفانہ رہتے تھے'' (ایضاً ص ۳۷۳)

اب اس اقتباس کا انگریزی ترجمہ دیکھیے:

"And sometimes a thick curly braid in the Haidri style, for that too was the hallmark of the dandies of the Mohammad Shahi time. And with it he wore a green turban-ornament, and a casual manner." (p. 311)

محترمہ یہ سمجھنے سے قاصر رہیں کہ ''سبزی کا طرّہ'' بھنگ کے گھونٹ کو کہتے ہیں، پگڑی کے کسی سبز رنگ زیور کو نہیں۔ صبا کا شعر ہے:

فقیر مست ہیں ہر وقت کیفیت میں رہتے ہیں
کبھی طرّہ ہے سبزی کا، کبھی گھولا ہے افیون کا

کتاب کے ص ۳۱۴، ص ۳۱۵، اور ص ۳۱۶ پر بھی ایسی ہی بوالعجبیاں نظر آتی ہیں۔ آتش کے مشہور شعر:

دختر رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے
میں جہانگیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے

کے پہلے مصرعے کا ترجمہ یوں ہے:

"The daughter of the grape is a woman, she is my companion."

''مری مونس ہے'' کا ترجمہ:"is a woman" کس قدر بے معنی اور بے رس ہے۔
اگلے صفحے پر آتش کے ایک اور مشہور شعر:

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی سو بگڑی تھی، خبر لیجیے دہن بگڑا

کا یہ ترجمہ نظر پڑتا ہے:

"Sahib, you have begun to make faces too while giving abuse...if your language is damaged, it is damaged...look and see if your face is damaged!" (p. 315)

''زباں'' کا ترجمہ یہاں language کے بجائے "tongue" اور ''دہن'' کا ترجمہ "face" کے بجائے "mouth" ہونا چاہیے تھا۔ علاوہ ازیں ترجمے میں دو جگہ "if" کا استعمال ہوا ہے جو قطعی بے محل اور ناموزوں ہے۔ اسی زمین میں مصحفی نے دو شعر کہے جن میں دوسرا یہ تھا:

نہ ہو محسوس جو شے کس طرح نقشے میں ٹھیک اترے
شبیہہ یار کھنچوائی، کمر بگڑی، دہن بگڑا
(ایضاً، ص ۳۸۱)

دوسرے مصرعے کا انگریزی ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

"I made an image of the beloved - the waist was damaged, the mouth was damaged." (p. 316)

یہاں "made" کے بجائے "got prepared" کا محل تھا۔ تب جا کر ہی پہلے مصرعے کے اس کی کامل مطابقت پیدا ہوتی ہے۔

آب حیــــات میں شاہ نصیر کے ذکر میں لکھا ہے کہ حریفوں میں سے ایک نے ناسخ کا مصرع طرح دے دیا۔ انھوں نے مصرع تو لے لیا مگر اتنا کہا کہ ''ان سے کہنا کہ چکس پر گلدم لڑانے کی صحیح نہیں ہے۔ پالی میں آئیے کہ دیکھنے والوں کو بھی مزا آئے'' (ص ۳۹۰)

مندرجہ بالا اقتباس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

"Please tell him that it is not done to set a nightingale to fight <u>while you yourself are sitting on your perch</u>. Please enter the

arena yourself, so that the spectators too can enjoy the sight."

(p. 320)

مترجم کو یہ نہ سوجھا کہ ''چکس'' بلبل کے اڈے کو کہتے ہیں۔ شاہ نصیر کی مراد یہ تھی کہ بلبل کو اس کے ٹھکانے سے نیچے اتار کر لڑانا چاہئے یعنی حریفوں کو اکھاڑے میں اتر کر اپنے جوہر دکھانے چاہییں۔

اسی صفحے پر ''تظلّم'' کا ترجمہ "lament" کیا گیا ہے حالانکہ تظلّم فریاد کرنے کو کہتے ہیں یعنی: "cry for help or redress"

آزاد نے آبِ حیات میں شاہ نصیر کا ایک حسبِ حال شعر درج کیا ہے:

بیاباں مرگ ہے مجنون خاک آلودہ تن کس کا

سیے ہے سوزن خار مغیلاں تو کفن کس کا

(ص ۳۹۱)

اس شعر کے پہلے مصرعے کا جو انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے وہ غلط محض ہے۔ ترجمہ یہ ہے:

"Oh Majnun with the dust-smeared body, whose body is now dead in this wilderness? (p. 321)

جبکہ شعر کے پہلے مصرعے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ مجنون خاک آلودہ تن کس کے عشق میں بیاباں میں موت سے ہمکنار ہوا یعنی عالم بے بسی میں مرا۔ ظاہر ہے کہ لیلیٰ کے عشق میں جس کا ذکر مقدر ہے۔

آبِ حیات کا ایک ناقابل فراموش اور زندہ بیان وہ ہے جہاں ''ہدہد الشعراء'' کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ آزاد نے اس کے چار شعر درج کیے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

جو آ کے ریز کرے میرے آگے موسیقار

تو ایسے کان مروڑوں کہ بے سُرا کر دوں

(ص ۴۶۶)

اس شعر کا انگریزی ترجمہ ملاحظہ ہو:

"If the Musician-bird should preen himself before me

I will twist his ears and make him sing a different tune"

(p. 380)

"Preen" دراصل پرندے کا اپنے پروں کو چونچ سے کھجلانا اور مرتب کرنا ہے جس کا مذکورہ بالا ترجمے

میں کوئی محل نہیں جبکہ ''ریز کرنا'' کا معنی ہے ''چہچہانا'' لہٰذا یہاں "preen" کے بجائے "chirp" کا محل تھا۔ اسی طرح ''بے سرا کردوں'' کا ترجمہ بھی ناقص بلکہ غلط ہے۔

مختصر یہ کہ متعدد مقامات اور بھی ہیں جہاں تراجم یا تو کلیتہً یا جزواً غلط ہیں یا خالصۃً لفظی ہو کر مضحکہ خیز ہو گئے ہیں لیکن بہ خوف طوالت ان سے قطع نظر کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں اور بھی متعدد غلطیاں ہیں مثلاً سبد چین کو ''سبدِ چین'' لکھا گیا ہے۔ یا مثلاً کتاب کے ص ۳۵۵ پر حاشیے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ لفظ ''تغلیب'' بطور اصطلاح کے وجود نہیں رکھتا۔ حال آنکہ ''تغلیب'' بطور اصطلاح لسانی معروف ہے اور اس کا معنی ہے کسی کلمے کو وسیع تر مفہوم میں استعمال کرنا مثلاً ابوین (یعنی ماں باپ) حال آنکہ ''ابو'' صرف باپ کو کہتے ہیں مگر اس کو پھیلا کر جب تثنیہ بنایا گیا تو اس میں باپ کے علاوہ ماں کا مفہوم بھی آ گیا یا مثلاً والدین، قمرین (یعنی چاند اور سورج) وغیرہ۔

آب حیـــات کے اس انگریزی ترجمے میں بعض اور موارد بھی نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ بعض جگہ تاریخی یا واقعاتی غلطیاں ہیں مثلاً کتاب کے ص ۲۸۷ پر مانی و بہزاد کو مغل منیاتور کے ماہر کہا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اردشیر کے زمانے کے مشہور مصور مانی کا، جس کی کتاب ارژنگ بہت معروف ہے، مغل منیاتور سے کیا تعلق ہے؟ بہزاد بھی اواخر عہد تیموری کا ایک مشہور ایرانی مصور تھا۔ ص ۳۰۹ پر میر انیس کا ذکر ہے جبکہ وہاں میر انس کا محل تھا۔ (ر۔ک آب حیات ص ۳۷۱)

کتاب کے ص ۳۶۴ پر منطق کی مشہور کتابوں کے ضمن میں ''الکبیر'' اور ''الصغیر'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں یہاں منطق کی دو اصطلاحوں صغریٰ اور کبریٰ کو صغیر و کبیر سے خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ عربی قواعد میں البتہ صرف صغیر اور صرف کبیر موجود ہیں۔

ترجمہ شدہ کتاب میں بعض مقامات پر حواشی کی ضرورت بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے مثلاً آتش کا مشہور مطلع ہے:

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں
ہمارے گنجفے میں بازی غلام نہیں

''لاخیر'' کی وضاحت میں قرآن حکیم کی سورۃ النحل اور سورۃ النسا سے استشہاد کیا جا سکتا ہے۔ سورہ النحل سے لاخیر کی وضاحت اس آیت سے ہوتی ہے جہاں اللہ دو شخصوں کی مثال دیتا ہے جن میں سے ایک گونگا اور لایعقل ہے اور دوسرا ہوشمند، بولنے والا اور راست رو ہے۔ پہلے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ

اَیْنَمَا یُوَجِّھْهُ لَا یَاْتِ بِخَیْرٍ ۱۶:۷۶

''اور وہ (مالک) جہاں بھیجتا ہے وہ کام درست کر کے نہیں لاتا''

دوسری آیت سورۃ النساء سے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

لاَ خَیرَ فِی کَثِیرٍ مِنْ نَّجْوَاھُم ......الخ ۴:۱۱۴

(سرگوشیاں بہت سی ایسی ہیں جن میں کوئی بھلائی نہیں)

آب حیات کے انگریزی ترجمے کے ابتدائیے میں جو "Constructing a Literary Theory...." کے زیر عنوان شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے، بڑے فکر افروز نکات ملتے ہیں۔ البتہ ایک جگہ حاشیے میں انھوں نے لکھا ہے کہ دیباچہ غرۃ الکمال (امیر خسرو) صرف ایک مرتبہ دہلی سے شایع ہوا اور بس۔ یہ درست نہیں۔ خسرو کا یہ فکر افروز دیباچہ، ''دیباچہ دیوان غرۃ الکمال'' کے زیر عنوان نیشنل کمیٹی برائے ہفت صد سالہ تقریبات امیر خسرو کے موقع پر اکتوبر ۱۹۷۵ء میں لاہور سے شایع ہو چکا ہے۔ اس کے مرتب فارسی کے ممتاز عالم سید وزیر الحسن عابدی تھے۔

آب حیات کا پیش نظر انگریزی ترجمہ متعدد خوبیاں رکھنے کے باوجود شدت سے نظر ثانی کا محتاج ہے۔ شعراء کے منتخب کلام اور بعض دیگر نظائر کے آمرانہ حذف کے نتیجے میں یہ ترجمہ صرف آدھا سچ بولتا ہے۔ نیز بعض مقامات پر تو آب حیات کے اس ترجمے کو پڑھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے:

اے خضر دستے کہ آب از سر گذشت!

حواشی

۱۔ اردو متن کے لیے آب حیات کے نسخہ لاہور ۱۹۰۷ء کو اس لیے پیش نظر رکھا گیا ہے کہ اس میں صحت متن کا بہت حد تک اہتمام کیا گیا ہے۔ یہی نسخہ آب حیات کے انگریزی ترجمے میں برتا گیا ہے۔

۲۔ اسی طرح کا ایک لطیفہ انگریزی متن کے ص ۲۴۲ پر بھی ہوا ہے جہاں ''مولوی تجن'' کو ''مولوی سخن'' لکھا گیا ہے اور یہ نہ دیکھا گیا کہ انشاء نے ''تجن'' ہی کی رعایت سے یہ رباعی کہی تھی:

ترخیم کے قاعدے سے تجنا لکھیے
اور لفظ خروجنا کو نجنا لکھیے
گر ہم کو ''اجی نہ لکھیے'' ہووے لکھنا
تو کر کے مرخم اس کو اجنا لکھیے

(ایضاً، ص ۲۷۵)

ضمیمہ

آزاد صدی دوروزہ عالمی سیمینار

شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی نے اردو کے ممتاز ادیب محمد حسین آزاد کی پہلی صد سالہ برسی کی مناسبت سے ۲۰، ۲۱ جنوری ۲۰۱۰ء کو آزاد صدی دوروزہ عالمی سیمینار کا انعقاد کیا۔ آزاد صدی تقریبات کے سلسلے میں یہ پورے برعظیم میں پہلا عالمی سیمینار تھا جس میں پاکستان بھر سے نامور اور ممتاز ادباء کے علاوہ بھارت، ایران، ترکی اور جاپان سے بھی مندوبین شریک ہوئے۔ بھارت سے پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر قاضی افضال حسین، ایران سے ڈاکٹر محمد کیومرثی اور ڈاکٹر علی بیات، ترکی اور جاپان سے بالترتیب پروفیسر خلیل طوق اَر اور پروفیسر سویامانے نے سیمینار میں شرکت کی اور مقالات پیش کیے۔

سیمینار کا آغاز ۲۰ جنوری ۲۰۱۰ء کو صبح ساڑھے دس بجے ہوا۔ افتتاحی سیشن کی صدارت ڈاکٹر مجاہد کامران، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے کی۔ مہمانان اعزاز میں بیرون ملک سے تشریف لائے ہوئے ادبا شامل تھے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر جمیل انور، پرو وائس چانسلر اور ڈاکٹر محمد نعیم رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی بھی افتتاحی اجلاس کے خصوصی مہمان تھے۔ اس سیمینار کی نظامت جناب مرغوب حسین طاہر نے کی۔ قاری قمر علی زیدی، استاد شعبہ عربی نے تلاوت کی اور شعبہ اردو کی سابق طالبہ حنا نصر اللہ نے نعت پڑھی۔

اس کے بعد ڈاکٹر تحسین فراقی صدر شعبہ اردو کو خیر مقدمی کلمات کہنے کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے محمد حسین آزاد کی ادبی عظمت کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بنیادوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ آسمانِ ادب پر محمد حسین آزاد کی حیثیت سلطان الکواکب کی ہے۔ انھوں نے سیمینار کے مقاصد کی وضاحت کی اور سیمینار کے مندوبین اور شرکا کو خوش آمدید کہا۔ بعدازاں ڈاکٹر مظہر معین پرنسپل اورینٹل کالج نے تعارفی کلمات ادا کرتے ہوئے اورینٹل کالج کی مختصر تاریخ بیان کی اور کالج سے آزاد کی وابستگی کا اجمالاً ذکر کیا۔ ان کلمات کے بعد کراچی سے تشریف لائے ہوئے معزز مہمان اور ممتاز آزاد شناس ڈاکٹر اسلم فرخی نے کلیدی مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ خاکے کے انداز میں لکھا گیا تھا۔ اس میں آزاد کی زندگی کے تمام اہم واقعات کو طرزِ آزاد میں نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا۔ حاضرین نے نہایت توجہ اور ذوق وشوق سے

اس طویل مقالے کو سنا اور سراہا۔

ان کے کلیدی خطاب کے بعد ڈاکٹر مجاہد کامران وائس چانسلر اور ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس سیمینار کے موقع پر شعبہ اردو سے شائع ہونے والی کتب کی رونمائی کی۔ شعبہ اردو نے اس موقع پر فہرست مخطوطات آزاد (مرتبہ عارف نوشاہی و محمد اکرام چغتائی) لغت آزاد، (مرتبہ معین نظامی)، آزاد صدی سیمینار کتابچہ اور تحقیقی و تنقیدی مجلے باز یافت کا نیا شمارہ شائع کیا جس میں آزاد پر خصوصی گوشہ شامل ہے۔ صدر شعبہ اردو نے ان کتب کا مختصر تعارف پیش کیا۔

بعد ازاں ڈاکٹر مجاہد کامران کو صدارتی کلمات کے لیے بلایا گیا۔ انھوں ے شعبہ اردو کو اس سیمینار کے انعقاد پر مبارک باد دی اور مستقبل کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ پنجاب یونیورسٹی میں اورینٹل کالج اپنی تحقیقی سرگرمیوں کے حوالے سے سب سے زیادہ فعال ہے۔ کلمات تشکر کی ذمے داری ڈین فیکلٹی آف اورینٹل لرننگ ڈاکٹر سلیم مظہر کے سپرد تھی۔ انھوں نے مہمانان، انتظامیہ اور طلبہ و طالبات کا شکریہ ادا کیا کہ جن کی مساعی کے نتیجے میں اس سیمینار کا انعقاد ممکن ہوا۔ اس کے بعد صدر مجلس کی اجازت سے آزاد صدی دو روزہ عالمی سیمینار کا افتتاحی سیشن اختتام کو پہنچا۔

سیمینار کا پہلا سیشن چائے کے وقفے کے بعد شروع ہوا۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر ضیاء الحسن کے سپرد تھی۔ اس سیشن کی مجلس صدارت کے اراکین میں بھارت سے تشریف لائے ڈاکٹر شمیم حنفی، ڈاکٹر عبدالحق اور کراچی کے پروفیسر سحر انصاری شامل تھے۔ سب سے پہلے شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر عزیز ابن الحسن نے 'حالی اور شبلی کی آزاد سے اثر پذیری' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ چونکہ وقت کی کمی کے باعث مقالہ خواں حضرات سے درخواست کی گئی تھی کہ دس منٹ کے وقت میں اپنا مقالہ یا مقالے کی تلخیص پیش کریں لہذا اکثر حضرات نے اپنے مقالوں کی تلخیص ہی سامعین کے گوش گزار کی۔ ڈاکٹر عزیز ابن الحسن نے شعر العجم اور مقدمہ شعر و شاعری پر آب حیات کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ان کتابوں کے متعدد مباحث آب حیات سے ماخوذ ہیں یا پھر ان تینوں نقادوں کے خیالات کا سرچشمہ یکساں ہے۔ اس کے بعد کراچی سے تشریف لائے ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے اپنا مقالہ بہ عنوان 'آزاد اور تحقیق لغات' پیش کیا۔ انھوں نے آزاد کی ان لسانی کاوشوں کو موضوع تحقیق بنایا جن کے تحت آزاد نے سنسکرت اور فارسی کے اشتراکات دریافت کیے۔ ان کے بعد اوسا کا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استاد سویامانے یاسر نے آزاد کی انشا پردازی کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ اس مقالے میں انھوں نے آزاد کی انشا کی اس خصوصیت پر بہ طور خاص روشنی ڈالی جو مغربی اور مشرقی اسالیب کے امتزاج سے پیدا ہوئی تھی۔

ان کے بعد آغا سلمان باقر نے 'آزاد کا سفر ایران' کے زیر عنوان مقالہ پڑھا۔ آغا سلمان باقر، آزاد کے

پڑپوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالے میں آزاد کے سفرِ ایران کے محرکات اور سفر کے احوال و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی اور ایران سے آزاد کی محبت کی توجیہ پیش کی۔ ان کے بعد شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری نے 'تخلیق شعر کے نظری مباحث اور آزاد' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

ان مقالات کے بعد ڈاکٹر ضیاء الحسن نے بھارت کے ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کا بھیجا گیا پیغام پڑھ کر سنایا جس میں فاروقی صاحب نے شعبہ اردو کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا اور اردو ادب پر آزاد کے اثرات کا مختصراً تذکرہ کیا تھا۔ اس کے بعد محمد اکرام چغتائی نے 'آزاد اور لائٹنر کے علمی روابط' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے دونوں شخصیات کے ایک دوسرے پر علمی اثرات کے حوالے سے اپنی تحقیقات پیش کیں۔ پھر بھارت سے آئے فاضل نقاد ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے اپنا مقالہ 'جدید اردو تنقید' محمد حسین آزاد اور نو آبادیاتی مضمرات' کے عنوان سے پڑھا۔ مقالے میں انھوں نے واضح کیا کہ آزاد کی اطلاقی تنقید کا انداز مشرقی مگر ان کی نظری تنقید مغربی ہے۔ آزاد کی تنقید کی نظری اور عملی صورتوں میں مغائرت ہے، جس کی وجہ نو آبادیاتی دباؤ ہے۔

آخر میں صدارتی کلمات کے لیے مجلس صدارت کی نمائندگی ڈاکٹر شمیم حنفی نے کی اور اس سیشن میں پڑھے گئے مقالات پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ انھوں نے رائے دی کہ پہلے سیشن میں پیش کیے گئے مقالات آزاد سے متعلق نئے نکات کو روشن کرتے ہیں اور ایک سیمینار کی کامیابی یہی ہے کہ وہ نئی باتوں، نئی بصیرتوں کو سامنے لائے اور اس سیشن کے مقالات میں نئی بصیرتوں کا اظہار ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قریباً تین بجے سہ پہر یہ سیشن اختتام کو پہنچا۔

سیمینار کے پہلے روز کا دوسرا سیشن ۴ بجے شام شروع ہوا۔ اس سیشن کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد کامران نے انجام دیے۔ مجلس صدارت کے اراکین میں ڈاکٹر قاضی افضال حسین (بھارت)، ڈاکٹر خلیل طوق آر (ترکی)، پروفیسر فتح محمد ملک (اسلام آباد) اور ڈاکٹر سلیم اختر (لاہور) شامل تھے۔ اس سیشن کا پہلا مقالہ بھارت سے آئے معروف محقق ڈاکٹر اصغر عباس نے 'سرسید اور آزاد: رابطے اور اثرات' کے عنوان سے پیش کیا۔ اس مقالے میں انھوں نے اس عمومی تاثر کو غلط ثابت کیا کہ ان دونوں شخصیات میں روابط موجود نہیں تھے۔ انھوں نے دستاویزی شہادتوں سے ثابت کیا کہ آزاد، سرسید سے رابطے میں رہے، ان سے مشورہ کرتے رہے اور سرسید آزاد کی علمی کاوشوں پر آرا لکھ کر انھیں بھیجتے رہے۔ ڈاکٹر اصغر عباس کے بعد ڈاکٹر انور سدید نے 'آزاد، خطوط کے آئینے میں' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ انھوں نے آزاد کی شخصیت اور سوانح کو آزاد کے مکاتیب سے دریافت کیا۔ ان کے بعد شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر اور کراچی سے آئے مبین مرزا نے بالترتیب 'آزاد کی افسانہ طرازیاں' اور 'آزاد کی نثر میں خاکے کے عناصر' کے عناوین کے تحت مقالے پڑھے۔ ان حضرات کے بعد بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی سے آئے ڈاکٹر قاضی عابد نے 'آزاد کی مکتوب نگاری' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ اس مقالے میں انھوں نے مکتوب نگاری کی شعریات اور

مابعد جدیدیت کی روشنی میں آزاد کی مکتوب نگاری کی مختلف جہات کا تجزیہ پیش کیا۔ان کے بعد ایران سے آئے مہمان ڈاکٹر علی بیات نے 'ایران میں آزاد شناسی' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔اس مقالے میں انھوں نے ایران میں آزاد کی حیات وخدمات پر ہونے والے کام کا جائزہ اور نقد پیش کیا اور مستقبل میں اس سلسلے میں امکانات پر روشنی ڈالی۔

مقالات کے بعد پروفیسر فتح محمد ملک ریکٹر بین الاقوامی یونیورسٹی ،اسلام آباد نے مجلس صدارت کی نمائندگی کرتے ہوئے صدارتی کلمات ادا کیے۔انھوں نے ڈاکٹر اصغر عباس کے مقالے کے بعض مندرجات سے اختلاف کیا اور آزاد کے خیالات کو سرسید کے افکار سے مختلف قرار دیا، تاہم اس سیشن میں خواندہ دیگر مقالات کی تحسین کی اور انھیں آزاد شناسی میں اضافہ قرار دیا۔شام کے چھے بجے کے آس پاس اس سیشن کا اختتام ہوا۔

آزاد صدی دوروزہ عالمی سیمینار کے دوسرے روز چار سیشن منعقد ہونا تھے۔لہٰذا پہلے سیشن کا آغاز صبح کے دس بجے ہوا اور اس سیشن کی نظامت شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر عزیز ابن الحسن کے سپرد تھی۔اس سیشن کی مجلس صدارت کے اراکین میں ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی (بھارت)، ڈاکٹر اصغر عباس (بھارت)، انتظار حسین (لاہور)، شہزاد احمد (لاہور) اور ڈاکٹر سلیم اختر (لاہور) کے اسماء شامل تھے۔

اس سیشن کا آغاز ڈاکٹر ناصر عباس نیر، استاد شعبہ اردو کے مقالے سے ہوا۔ان کے مقالے کا عنوان 'آزاد کے لسانی نظریات، مابعد نوآبادیاتی مطالعہ' تھا۔یاد رہے کہ سیمینار کے سیکرٹری ہونے کے ناطے ڈاکٹر ناصر عباس نیر انتظامی ذمہ داریوں کی ادائی میں مسلسل مصروف اور متحرک رہے۔اس مقالے میں انھوں نے آزاد کے لسانی نظریات کے روابط انگریز مستشرقین کے لسانی نظریات سے جوڑے اور آزاد کے لسانی نظریات کو انیسویں صدی کی اورینٹل لرننگ کی یورپی تحریک سے وابستہ قرار دیا۔ان کے بعد ڈاکٹر انجم رحمانی اور ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے بالترتیب 'آزاد کی درسی کتب' اور 'اردو کا پہلا خاکہ نگار: آزاد' کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔انجم رحمانی نے آزاد کی مرتبہ درسی کتب کا تحقیقی جائزہ لیا اور کچھ غلط منسوبات کی تحقیقی وضاحت کی۔

ان کے بعد ملتان سے آئے ڈاکٹر ابرار عبدالسلام نے 'آزاد اور تدوین دیوان ذوق' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔انھوں نے آزاد کی تدوینی خصوصیات کا تنقیدی جائزہ لیا۔ان کے بعد ایران سے مہمان مندوب ڈاکٹر محمد کیومرثی نے 'آزاد کا سفر ایران: ایک جائزہ' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ اس کے بعد بزرگ دانش ور اور نقاد ڈاکٹر وزیر آغا کا بھیجا گیا پیغام، شعبہ اردو میں ایم اے سال دوم کے طالب علم شاہد بلال نے پڑھ کر سنایا۔اس پیغام میں آزاد کے تنقیدی تصورات اور ان کی ثقافتی جہت کو بہ طور خاص اجاگر کیا گیا۔

اس پیغام کے بعد بھارت سے تشریف لائے دو معزز مہمانوں ڈاکٹر قاضی افضال حسین اور ڈاکٹر عبدالحق

نے بالترتیب دربار اکبری اور 'مقالات آزاد: ایک مطالعہ' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر قاضی افضال حسین نے دربار اکبری کا تاریخ نویسی کے معاصر تصورات کی روشنی میں محققانہ تجزیہ کیا اور اکبر اور آزاد کی ذہنی مماثلتوں پر روشنی ڈالی۔ ان کی رائے تھی کہ آزاد واقعے سے زیادہ بیان واقعہ میں دل چسپی لیتے تھے۔ یہی ان کی تاریخ نویسی کی کم زوری اور بڑی خصوصیت ہے۔ ان حضرات کے بعد ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، شہزاد احمد اور انتظار حسین نے یکے بعد دیگرے صدارتی کلمات سے سامعین کو نوازا۔ انھوں نے سیشن کے مقالات کے مندرجات پر گفتگو کی اور انھیں سراہا صدارتی کلمات کے ساتھ دوسرے روز کا پہلا سیشن اختتام پذیر ہوا اور چائے کا وقفہ آغاز ہوا۔

چائے کے وقفے کے بعد دوسرے روز کا دوسرا سیشن شروع ہوا۔ اس سیشن کی نظامت شعبہ اردو کے استاد مرغوب حسین طاہر کے سپرد تھی۔ اراکین مجلس صدارت میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور آغا سلمان باقر تھے۔ اس سیشن میں چار مقالے پڑھے گئے۔ مقالہ نگار حضرات میں ڈاکٹر معین نظامی، صدر شعبہ فارسی، پنجاب یونیورسٹی، ڈاکٹر تحسین فراقی، صدر شعبہ اردو، کراچی سے تشریف لائے ڈاکٹر آصف فرخی اور پروفیسر سحر انصاری شامل تھے۔ ان حضرات نے 'لغت آزاد'، 'آب حیات کا ایک انگریزی ترجمہ از فرانس پریچٹ'، 'آزاد کا اسلوب جنوں' اور 'آزاد کی تمثیل نگاری' پر بالترتیب مقالے پیش کیے۔ پہلے مقالے میں ڈاکٹر معین نظامی نے آزاد کی مرتبہ لغت کی خصوصیات گنوائیں۔ دوسرے مقالے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے 'آب حیات' کے ایک انگریزی ترجمے از فرانس پریچٹ بہ اشتراک شمس الرحمان فاروقی کے خصائص اور نقائص پر روشنی ڈالی۔ ان خامیوں کی ایک بڑی وجہ ڈاکٹر صاحب نے یہ بیان کی کہ امریکی ترجمہ نگار مختلف تہذیبی پس منظر کی حامل ہے جس کے باعث محترمہ پریچٹ 'آب حیات' کی بعض عبارتوں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہی ہیں اور ترجمے میں کئی مقامات پر مضحکہ خیز صورتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ ڈاکٹر آصف فرخی نے آزاد کی زندگی کے زمانہ جنوں میں تصنیف کردہ تحریروں کا جائزہ لینے کی ضرورت پر زور دیا کہ اس مطالعے سے آزاد کی شخصیت کے کئی اور پہلو بھی سامنے آنے کا امکان ہے۔ ان کا موقف تھا کہ آزاد کے جنوں کے محرکات کے بجائے جنوں کی مظہریات پر توجہ کی ضرورت ہے۔

اس سیشن کے آخر میں مجلس صدارت کے نمائندگی کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے صدارتی کلمات ادا کیے اور یہ سیشن اختتام کو پہنچا۔ اس سیشن کے بعد چیئرمین گورننگ باڈی لاہور آرٹس کونسل جناب عطاء الحق قاسمی کی جانب سے معزز مندوبین کے اعزاز میں ظہرانہ تھا لہٰذا تمام مہمان حضرات یونیورسٹی ٹرانسپورٹ کے ذریعے الحمرا پہنچے اور وہاں لاہور آرٹس کونسل کی میزبانی سے لطف اندوز ہوئے۔

دوسرے روز کا تیسرا سیشن، اس دو روزہ سیمینار کا آخری سیشن تھا۔ اس سیشن کی نظامت مرغوب حسین طاہر اور ڈاکٹر عزیز ابن الحسن نے مشترکہ طور پر کی۔ اراکین مجلس صدارت میں ڈاکٹر خورشید رضوی، محمد اکرام چغتائی، ڈاکٹر آفتاب اصغر اور ڈاکٹر اسلم انصاری تھے۔ چونکہ یہ آخری سیشن تھا اور وقت کی کمی کا سامنا تھا لہٰذا مقالہ خواں حضرات سے درخواست کی گئی کہ وہ مختصر وقت میں اپنے مقالے کا تعارف پیش کریں۔ اس سیشن کے آغاز میں شعبہ اردو کے تین اساتذہ ڈاکٹر ضیاء الحسن، ڈاکٹر بصیرہ عنبرین اور ڈاکٹر محمد کامران نے بالترتیب 'جدید اردو نظم کے فروغ میں آزاد کی خدمات'، 'شعر آزاد کی فنی جہات' اور 'آزاد آن لائن تنقید کی روشنی میں' کے عناوین سے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر ضیاء الحسن نے جدید اردو نظم کی تحریک کو آزاد کی اہم ادبی خدمت قرار دیا اور ان نقادوں سے اختلاف کیا جو آزاد کے خیالات کا نوآبادیاتی تناظر میں مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے بعد تہران یونیورسٹی کی لیکچرر شعبہ اردو وفا یزداں منش نے 'نیرنگ خیال اور اسلوب کی نیرنگی' کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔

وفا یزداں منش کے بعد ڈاکٹر اسلم انصاری نے اپنا مقالہ بعنوان 'آزاد کی جذبہ آمیز اور تاثر آفریں نثر' پیش کیا۔ اس خاصے طویل مقالے میں انھوں نے کئی ایک نکات اٹھائے جو آزاد کی بے مثال نثر کی مختلف جہات پر روشنی ڈالتے تھے۔ انھوں نے آزاد کی نثر کی اس خصوصیت کو اجاگر کیا کہ اس میں لفظ کا استعمال حوالہ جاتی نہیں، جذبہ آفریں (emotive) ہے۔

ڈاکٹر رفاقت علی شاہد نے 'سنین اسلام کی تسوید میں آزاد کا حصہ' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ اس مقالے میں لائٹنر اور آزاد کے اشتراک سے تصنیف شدہ کتاب 'سنین اسلام' کی مختلف اشاعتوں کا تقابلی جائزہ لیا گیا اور سنین الاسلام اور سنین اسلام میں تمیز روا رکھنے پر زور دیا گیا۔ اول الذکر کتاب لائٹنر اور آزاد کے باہمی تعلقات خراب ہونے کے بعد شائع ہوئی تھی۔

ان کے بعد اسلام آباد سے آئے ڈاکٹر سہیل عباس بلوچ نے 'آزاد بطور قواعد نگار' کے موضوع پر مختصر سا تعارف ہی سامعین کے گوش گزار کیا کہ وقت کی قلت آڑے آ رہی تھی۔ ان کے بعد خیر پور سندھ سے آئے ڈاکٹر یوسف خشک نے 'قصص ہند اور تاریخ نویسی کے تقاضے' کے عنوان کے تحت تاریخ نویسی کے تقاضوں اور اصولوں کی روشنی میں قصص ہند کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد ڈین فیکلٹی آف اورینٹل لرننگ ڈاکٹر سلیم مظہر نے 'آزاد کے غیر ملکی اسفار' کے عنوان کے تحت آزاد کے غیر ملکی اسفار کا جائزہ لیا اور ان اسفار میں پیش آمدہ واقعات کا تذکرہ کیا، جن کا اظہار بعد ازاں آزاد نے مختلف جگہ کیا تھا۔

اس سیشن کے آخری مقالہ خواں ترکی سے مدعو کیے گئے ڈاکٹر خلیل طوق آر تھے۔ ان کو 'دربار اکبری؛ تہذیبی و ثقافتی مطالعہ' کے عنوان سے مقالہ پیش کرنا تھا مگر وقت کی کمی کے باعث یہ اپنے موضوع کے متعلق محض تعارفی

باتیں ہی کر پائے۔اس سیشن میں دیگر مقالہ خواں حضرات میں ڈاکٹر شمیم حنفی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر عارف نوشاہی کے اسماء شامل تھے۔

دریں اثنا لاہور میں واقع ایرانی قونصلیٹ کے قونصل سعید خرازی بھی تشریف لے آئے۔ لہٰذا سیشن کے آخر میں صدارتی کلمات سے قبل سعید خرازی نے بھی سامعین کو نوازا اور چند کلمات پاک و ایران اور فارسی و اردو تعلقات کے باب ادا کیے۔

اس سیشن کا اختتام ڈاکٹر خورشید رضوی کے صدارتی کلمات پر ہوا۔ انھوں نے نہایت لطیف اور شگفتہ انداز میں اس سیشن کی کارروائی کا جائزہ لیا اور خصوصاً اس سیمینار کے روحِ رواں ڈاکٹر تحسین فراقی اور ان کے رفقاء کو مبارک باد پیش کی۔

اس صدارتی تقریر کے ختم ہوتے ہی اگلا سیشن یعنی اس دو روزہ سیمینار کا اختتامی سیشن شروع ہوا۔ صدارت جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال فرزند اقبال کر رہے تھے۔ اس سیشن کا ایجنڈا مہمانوں کے تاثرات کے اظہار پر مشتمل تھا۔ مگر ان تاثرات سے پہلے حنا نصر اللہ نے کلامِ اقبال ترنم سے پیش کیا اور سماں باندھ دیا۔ بعد ازاں غیر ملکی مندوبین نے اس سیمینار کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کیے۔

ایران سے ڈاکٹر محمد کیومرثی اور ڈاکٹر علی بیات، ترکی سے ڈاکٹر خلیل طوق آر اور بھارت سے ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر شمیم حنفی، ڈاکٹر قاضی افضال حسین اور ڈاکٹر عبدالحق نے مختصراً اپنے تاثرات پیش کیے اور اس سیمینار کے انعقاد پر شعبہ اردو کی کارکردگی کو سراہا۔ یہ بات بالخصوص کہی گئی کہ اس سیمینار کے تمام سیشن حاضری کے اعتبار سے بھرپور رہے کہ جس قدر سامعین افتتاحی سیشن میں تھے اسی قدر بعد کے سیشن میں بھی نظر آئے۔

ان تاثرات کے بعد کچھ قراردادیں نفاذ اردو اور قومی زندگی میں اردو کے مقام و مرتبے کے بارے میں پیش کی گئیں جنھیں سامعین نے منظور کیا۔ ان میں سے ایک قرارداد شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی میں محمد حسین آزاد چیئر قائم کرنے کے ضمن میں بھی تھی۔ قرارداد میں لکھا گیا تھا کہ شعبہ اردو میں موجود پروفیسر کی خالی اسامی کو آزاد چیئر کا نام دیا جائے مگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر اردو، ڈاکٹر قاضی افضال حسین نے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ شعبہ اردو میں ایک نئی مسند تخلیق کر کے اسے آزاد مسند کا نام دیا جائے۔ اس تجویز کو تمام حاضرین جلسہ نے منظور کیا۔

اس سیشن کے صدر ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے صدارتی خطبے میں اس سیمینار کے انعقاد کو سراہا اور شعبہ اردو کی کوششوں کی تعریف کی اور اس سے قبل پیش کی گئی قراردادوں پر عمل درآمد کے لیے زور دیا۔ ان صدارتی کلمات کے بعد ڈاکٹر تحسین فراقی صدر شعبہ اردو نے کلمات تشکر ادا کیے اور ان کلمات میں انھوں نے اپنے رفقاء، دفتری اہل کاران، طلبہ و طالبات، یونیورسٹی انتظامیہ اور کالج انتظامیہ کے اراکین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان سب کے تعاون کے بغیر اس

عظیم الشان اور بے نظیر سیمینار کا انعقاد ناممکن تھا۔ ان کلمات تشکر کے بعد اس سیشن کی کارروائی کا اختتام ہوا اور یہ دو روزہ سیمینار بھی اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس کے بعد چائے کا وقفہ تھا اور پھر ایک شعری نشست کا اہتمام تھا۔

شعری نشست کی صدارت ممتاز شاعر ظفر اقبال کر رہے تھے اور دیگر مہمان شعراء میں خورشید رضوی، مشکور حسین یاد اور امجد اسلام امجد موجود تھے۔ جبکہ مشاعرے کی نظامت مرغوب حسین طاہر کے سپرد تھی۔ اس شعری نشست کے آغاز میں امجد اسلام امجد نے اپنی تازہ غزل اور کچھ منظومات سنائیں۔ ان کے بعد مشکور حسین یاد نے اپنے مخصوص لب و لہجہ کے ساتھ اپنی شاعری سے سامعین کو محظوظ کیا۔ پھر خورشید رضوی نے اپنے خوب صورت اشعار پیش کیے اور آخر میں اس شعری نشست کے صدر ظفر اقبال نے کئی ایک چیزیں سنائیں جن میں سے چند ایک فرمائشی تھیں اور اس کے ساتھ اس شعری نشست کا بھی اختتام ہوا۔

اس دو روزہ سیمینار میں ۳۸ مقالات پیش کیے گئے۔ بھارت، ایران، ترکی اور جاپان کے علاوہ ملک بھر کے نامور مندوبین اور ممتاز حضرات نے اس سیمینار میں شرکت کی۔ اس سیمینار کے موقع پر پنجاب یونیورسٹی، مرکزی لائبریری میں آزاد کے عطیہ کردہ ذخیرۂ کتب میں سے چند منتخب کتب بھی نمائش کے لیے رکھی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ کی تصانیف کی بھی نمائش کی گئی۔

☙

قراردادیں

آزاد صدی دو روزہ عالمی سیمینار کے دوسرے روز کے آخری سیشن میں حسب ذیل قراردادیں پیش کی گئیں۔ اس سیشن کی صدارت جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال نے کی:

''آزاد صدی بین الاقوامی سیمینار منعقدہ ۲۰، ۲۱ جنوری ۲۰۱۰ء (بہ مقام اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور) کے موقع پر اہل علم کا یہ وقیع، منتخب اور نمائندہ اجتماع درج ذیل قراردادیں منظور کرتا ہے اور حکومت پاکستان اور حکومت پنجاب سے مطالبہ و درخواست کرتا ہے کہ:

۱۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں اردو زبان کو دی گئی آئینی حیثیت و مرتبہ کو بعینہٖ بحال کیا جائے اور اسے پاکستان کی قومی زبان کے طور پر اس کا جائز آئینی، قانونی، ثقافتی اور سرکاری مقام دیا جائے۔ نیز سرکاری اداروں میں اس کے نفاذ کے ٹھوس اقدام کیے جائیں اور مرکزی و صوبائی امتحانات مقابلہ میں اسے ذریعۂ امتحان بنایا جائے۔

۲۔ پاکستانی زبانوں کی سرپرستی کی جائے اور عربی و فارسی کو، جو پاکستانی تہذیب و ثقافت میں اساسی اہمیت رکھتی ہیں، ان کا جائز مقام دیا جائے۔

۳۔ تمام سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں علوم انسانی اور خصوصاً زبانوں اور ادبیات کے فروغ و تدریس کا خصوصی اہتمام کیا جائے اور ان زبانوں سے وابستہ افراد کے بارے میں حکومتی پالیسیوں کا تفاوت اور امتیازی سلوک ختم کیا جائے۔

۴۔ شعبہ اردو میں موجود پروفیسر کی اسامی کو مولانا محمد حسین آزاد چیئر کے نام سے موسوم کر دیا جائے۔ ☆

۵۔ مولانا محمد حسین آزاد کے لاہور میں واقع گھر ''آزاد منزل'' کو قومی یادگار کے طور پر محفوظ کر کے اسے ''آزاد عجائب گھر'' کی حیثیت دی جائے۔

☆**نوٹ:** مندرجہ بالا قراردادوں میں سے نمبر ۱، ۲، ۳ اور ۵ اتفاق رائے سے منظور کر لی گئیں، تاہم چوتھی قرارداد کے بارے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ممتاز مندوب ڈاکٹر قاضی افضال حسین نے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ مولانا محمد حسین آزاد چیئر کو شعبے میں موجود پروفیسر کی اسامی سے مشروط نہ کیا جائے بلکہ اس مقصد کے لیے باقاعدہ اور باضابطہ مسند تخلیق کی جائے۔ انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ کچھ عرصہ پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں سرسید کی جو مسند تخلیق کی گئی، وہ شعبۂ اردو میں پہلے سے موجود پروفیسر کی کسی اسامی سے مشروط نہیں تھی، بلکہ اس مقصد کے لیے ایک نئی اسامی شعبے کو تفویض کی گئی تھی۔ چنانچہ قرارداد نمبر ۴ درج ذیل صورت میں حاضرین اجلاس نے بالاتفاق منظور کی:

> ''شعبۂ اردو میں محمد حسین آزاد چیئر قائم کی جائے اور اس کے لیے شعبے کو پروفیسر کی نئی اسامی تفویض کی جائے۔''

آزادِ صدی مقالات

مرتبین

ڈاکٹر تحسین فراقی

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر

UNIVERSITY OF THE PUNJAB

شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور